چاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز

MEMBER
APNS
CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

بیادِ ابنِ انشاء

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

واٹس ایپ
0317 2266944

کرن کتاب

مستقل سلسلے

جنوری 2021
جلد 42 شمارہ 10
قیمت 70 روپے

خط وکتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اُردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

ایک اور سال کا سفر اختتام کو پہنچا۔ وقت ریت کی مانند مٹھی سے پھسلتا جارہا ہے۔ ابھی سال کا آغاز ہوا تھا کہ اختتام آپہنچا۔
وقت کے ساتھ ہم سب کا ایک عجیب سا تعلق ہے۔ کبھی سال پلک جھپکتے گزر جاتے ہیں اور کبھی صبح کرنا شام کا عذاب بن جاتا ہے۔ زندگی دکھ سکھ کا کھیل ہے۔ اچھا وقت نہیں ٹھہرتا تو برا وقت بھی گزر جاتا ہے۔ کامیابی یہ ہے، وقت اس طرح گزرے کہ پچھتاوے مقدر نہ بنیں۔
سال گزشتہ پر نظر ڈالیں تو کہیں کوئی خوشیوں بھرا لمحہ لبوں پہ مسکراہٹ لے آتا ہے تو کہیں اداسی دل کو گھیر لیتی ہے۔ مجموعی طور پر پوری دنیا کے لیے یہ آلام و مصائب کا سال تھا۔ عالمی وبا نے دنیا کو اس طرح گھیرے میں لیا کہ چاند پہ کمند ڈالنے والے، خود کو سپر پاور سمجھنے والے اس وبا کے سامنے بے بس نظر آئے۔
تیسری دنیا کے ممالک تو کسی گنتی میں ہی نہیں۔ مہنگائی اور بے روزگاری جو پہلے ہی کم نہ تھی، عروج کو جا پہنچی۔
نئی امیدوں کے ساتھ نئے سال کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔
قارئین کو نیا سال مبارک
دعا ہے کہ نیا سال دھرتی کے لیے امن اور خوش حالی کا سال ہو۔ سال گزشتہ میں جن کٹھن لمحات سے گزرے، نئے سال میں ان کا سامنا نہ ہو۔ نئے سال کا سورج ہم سب کے لیے خوشیاں لے کر آئے، آمین۔

سالگرہ نمبر

مارچ کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ سالگرہ نمبر کی مناسبت سے قارئین بہنوں سے سروے بھی اس شمارے میں شامل ہوا۔ سروے کے سوالات یہ ہیں۔

دل میں امنگ اور ارادہ کوئی تو ہو
بے کیف زندگی میں تماشا کوئی تو ہو

1۔ کیا آپ سالگرہ مناتی ہیں یا بھی تقریب، کوئی بہر ملاقات کے لیے دوستوں، رشتہ داروں کو مدعو کرتی ہیں؟
2۔ اپنی یا اپنی کسی دوست کی سالگرہ کا احوال، جس کو آپ بھول نہیں پائیں۔ اس کا مینو کیا تھا یہ بھی بتایئے؟
3۔ اس سال آپ کو کرن کی کون سی تحریر پسند آئی۔ آپ اپنی پسندیدہ مصنفہ کو کیا پیغام دینا چاہیں گی؟
4۔ ''کرن'' کی وہ کون سی تحریریں جو آپ کو ہمیشہ یاد رہیں گی؟

اس شمارے میں

☆ بیادِ ابن انشاء۔
☆ ''نئے سال کی سرحد پر کھڑے ہم لوگ'' نئے سال کے حوالے سے شاہین رشید کا سروے۔
☆ اداکارہ ''زینب احمد'' کہتی ہیں ''میری بھی سنیے''۔ ☆ اس ماہ ''عائشہ کیانی'' کے ''مقابل ہے آئینہ''
☆ ''دامنِ سحاب'' مہوش افتخار کا سلسلہ وار ناول۔ ☆ آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا''
☆ ''کنارِ خواب جو'' فرح بخاری کا مکمل ناول۔ ☆ ام ہانی کا مکمل ناول ''سیماب''
☆ ''کانچ سے سائباں'' مصباح علی سید کے ناولٹ کی آخری قسط۔
☆ میمونہ صدف کا ناولٹ ''آدم اور حوا''
☆ زارا مبجرا، ام اقصیٰ، حوریہ بتول، خوش بخت مشتاق، کنیز زہرہ اور لبنیٰ جمشید کے افسانے اور مستقل سلسلے۔
''کرن کتاب'' معلوماتی مضامین اور مزے دار ریسپیز کے ساتھ۔

بھر دے جھولی کر دے مرادیں پوری یا الٰہی
عاصی مبتلائے حسنِ ظن ہے کہ سمیع تو ہے

رکھ لینا بھرم بنا کاسہ، بنا پیالہ یا الٰہی
حشر میں نشر سے بچاتا کہ ستار تو ہے

فکرِ فرداں میں رہوں کیوں مبتلا یا الٰہی
حاجت روائی ہے وصف تیرا کہ رزاق تو ہے

کیوں ہو رازِ دل افشاء میرا یا الٰہی
بن کہے سن لینا حالِ دل کہ علیم تو ہے

گرمیٔ محشر میں سایہ عرش ہو عطا یا الٰہی
ڈھارس دل یہی ہے کہ رحمٰن تو ہے

کیسے ہو عصیاں سے کنارا یا الٰہی
تن من ہے لرزاں کہ قہار تو ہے

گنبدِ دل سے آتی ہے صدا یا الٰہی
دلِ مضطر ٹھہر جا کہ ودود تو ہے

خوشی۔ سرائوالی

آپ جیسا دو جہاں میں دوسرا کوئی نہیں
آپ سا ذی مرتبہ یا مصطفیٰؐ کوئی نہیں

اک اشارے سے کیا ہے آپ نے شق القمر
آپ سا کونین میں معجزہ نما کوئی نہیں

میری سانسوں میں بسی ہے شہرِ طیبہ کی ہوا
گنبدِ خضرا سی دنیا میں فضا کوئی نہیں

آپ کے جلووں کی تابانی سے دل سرور ہے
یا نبیؐ اب تیرگی سے رابطہ کوئی نہیں

ہے تلاطم میں سفینہ کیجیے آ کر مدد
آپ سے بڑھ کر ہمارا آسرا کوئی نہیں

بے کسوں ناداروں کے حاجت روا بس آپ ہیں
آپ جیسا یا نبیؐ مشکل کشا کوئی نہیں

روضۂ اطہر کی جالی چوم لے اقبال بھی
یہ فقط ہے آرزو اور مدعا کوئی نہیں

اقبال آرزو

جنوری کی سرد راتیں ہیں طویل

ابن انشا

دل بہلنے کی نہیں کوئی سبیل
جنوری کی سرد راتیں ہیں طویل
ڈالتا ہوں اپنے ماضی پر نگاہ
گاہے گاہے کھینچتا ہوں سرد آہ
کس طرح اب دل کو دوں بہلاؤں میں
کس بہانے سے اسے بہلاؤں میں
سب کو محوِ خوابِ راحت چھوڑ کے
نیند آتی ہے شبستاں میں مرے
مجھ کو سوتے دیکھ کر آتا ہے کوئی
میرے سینے سے چمٹ جاتا ہے کوئی
دیکھتا ہوں آ کے اکثر ہوش میں
کوئی ظالم ہے میری آغوش میں
خود کو تنہا ہی مگر پاتا ہوں میں

پھر گھڑی بھر بعد سو جاتا ہوں میں
پھر کسی کو دیکھتا ہوں خواب میں
اس دفعہ پہچان لیتا ہوں تمہیں
بھاگ جاتے ہو قریب صبح دم
چھوڑ دیتے ہو رہین رنج و غم
مجھ کو تم سے عشق تھا مدت ہوئی
ان دنوں تم کو بھی الفت مجھ سے تھی
کم نگاہی اقتضائے سال و سن
کیا ہوئی تھی بات جانے ایک دن

بند اپنا آنا جانا ہو گیا
اور اس پر ایک زمانہ ہو گیا
تم غلط سمجھے، ہوا میں بدگماں
بات چھوٹی تھی مگر پہنچی کہاں

جلد ہی میں تو پشیماں ہو گیا
نشۂ پندار میں لیکن تھے مست
تھی گراں دونوں پہ تسلیم شکست
ہجر کے صحرا کو طے کرنا پڑا
مل گیا تھا رہنما امید سا
ہے میری جرأت کی اصل اب بھی یہی
دل یہ کہتا ہے کہ دیکھیں تو سہی
جس میں اترا تھا ہمارا کارواں
اب بھی ممکن ہے وہ خالی ہو مکاں
آج تک رہتے رہے دل کو قریب

اب نہیں ممکن ذرا تابِ شکیب
آؤ میرے دیدۂ تر میں رہو
آؤ اس اُجڑے ہوئے گھر میں رہو
حوصلے سے میں پہل کرتا تو ہوں
دل میں اتنا سوچ کر ڈرتا بھی ہوں
تم نہ ٹھکرا دو میری دعوت کہیں
میں یہ سمجھوں گا اگر کہہ دو "نہیں"
گردشِ ایام کو لوٹا لیا
میں نے جو کچھ کھو دیا تھا پا لیا

نئے سال کی سرحد پر کھڑے ہم لوگ

شاہین رشید

اے نیا سال بتا تجھ میں نیا کیا ہے

کچھ بھی نیا نہیں ہے وہی ماہ وسال، وہی دن رات، وہی بدلتی تاریخیں، وہی سورج چاند، سب کچھ تو وہ ہی ہے جو صدیوں سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ سال کے ہندسے کی تبدیلی سال بعد آتی ہے۔ تب لگتا ہے کہ ہم نئے سال میں داخل ہوگئے ہیں جس طرح سالگرہ منانے پر لوگ ایکسائیٹڈ ہوتے ہیں۔ شاید اسی طرح سال بدلنے پر بھی ہوتے ہیں...... اور جب ایسا کچھ ہوتا ہے تو تجربے بھی دہرائے جاتے ہیں اور آنے والے سال کے لیے پلاننگ بھی کی جاتی ہے۔ تو بس اسی حوالے سے ہر نئے سال پر ایک سروے جو ہم کرتے ہیں وہ اس سال بھی حاضر ہے۔

سوال:-

1- کیا نئے سال کی ایکسائٹمنٹ اسی طرح ہوتی ہے جس طرح ٹین ایج میں ہوتی تھی؟

2- ذاتی طور پر 2020ء کیسا گزرا، خوشیوں اور پریشانیوں کا کیا تناسب رہا؟

3- 2021ء میں اپنا فیوچر اور پاکستان کا فیوچر کیسا دیکھتے/دیکھتی ہیں؟

سید عارض الدین احمد

1۔ ٹین ایج میں اتنی ایکسائٹمنٹ نہیں ہوتی تھی جتنی اب ہوتی ہے اور اب بہت کچھ کرنے کی

پاسیبلیٹیز نظر آتی ہیں۔ اس لیے اب ایکسائٹمنٹ زیادہ ہوتی ہے۔

2۔ 2020ء میں اللہ کا بڑا احسان رہا ہے اور میں کوئی شکایت کرنے کے قابل نہیں ہوں کیونکہ 2020ء کچھ ایسا گزرا ہے۔

3۔ اپنا اور اپنے ملک کا فیوچر بہت اچھا دیکھ رہا ہوں۔ اور نہ صرف اچھا دیکھ رہا ہوں بلکہ ایک مضبوط پاکستان دیکھ رہا ہوں۔

عباس اشرف :- آرٹسٹ (ثبات فیم)

1۔ نہیں۔ ویسی ایکسائٹمنٹ نہیں ہوتی جیسی ٹین ایج میں ہوتی تھی، کیونکہ جب انسان میچور ہو جاتا ہے تو پھر یہ سب میٹر نہیں کرتا بس یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ ہم نئے سال میں داخل ہو رہے ہیں۔

2۔ میرے لیے 2020ء بہت اچھا رہا۔ بہت کام کیا ماشاء اللہ جو اللہ نے دیا شکر کیا اور جو نہیں دیا اس پر صبر کیا۔ پریشانیاں بہت کم آئیں خوشیاں زیادہ ملیں۔ اللہ نے خوشیاں زیادہ دی ہیں اور ان شاء

اللہ 2021ء بھی اچھا گزرے گا۔

3۔ 2021ء میں اپنا فیوچر ان شاء اللہ بہت اچھا ہوگا یقیناً اللہ نے میرے لیے اچھا ہی سوچا ہوگا۔ کیونکہ انسان کے لیے اللہ ہر چیز اچھی ہی سوچتا ہے اور امید ہے کہ ملک کا فیوچر بھی برائٹ ہوگا۔

صائمہ قریشی:۔(آرٹسٹ)

1۔ جو ایکسائٹمنٹ تھی وہ تو اسی سال ختم ہوگئی کیونکہ کووڈ نے تو اچھے اچھوں کی ایکسائٹمنٹ کو ختم کر دیا ہے۔ دوسروں کا تو مجھے نہیں پتا لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ 2021ء دنیا کے لیے بہت اچھا سال ثابت ہوگا اور اللہ میری بات کو قبول کرے اور سچ مچ 2021ء سب کے لیے اچھا ثابت ہو ......اور ایکسائٹمنٹ ٹین ایج کی ہو یا آج کل کی۔ اس کی کیفیات بدلتی رہتی ہیں۔

2۔ بہت جانفشانی والا سال تھا 2020ء لیکن اگر آپ کووڈ کو ہٹا دیں تو الحمدللہ 2020ء ذاتی طور پر اچھا تھا اور اچھی اور بری چیزیں تو سب کے ساتھ ہر سال ہی ہوتی ہیں۔ تو شکر ہے کہ جدوجہد میں گزرا مگر اچھا گزرا۔

3۔ 2021ء میں میں اپنا فیوچر تو بہت برائٹ دیکھتی ہوں اور ان شاء اللہ ملک کا بھی فیوچر بہت برائٹ ہوگا۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ 2021ء پوری دنیا کے لیے اچھا ثابت ہوگا۔ اور میں اپنے لیے اور اپنے ملک کے لیے بہت پوزیٹو سوچ رکھتی ہوں اور میری دعا ہے کہ پوری دنیا سے یہ کووڈ کی وبا ختم ہو جائے لوگ پہلے کی طرح امن وسکون کے ساتھ رہنے لگیں۔ اللہ پاک سب کے لیے آسانیاں پیدا کرے اور لوگ 2020ء کو بھول جائیں۔

اریج محی الدین (آرٹسٹ)

1۔ اس سال کورونا کی وجہ سے سال کا پتا ہی نہیں چلا اس لیے کچھ خاص ایکسائٹمنٹ نہیں ہے اور نہ ہی ایسا کچھ احساس ہو رہا ہے کہ سال گزر رہا ہے لیکن اس کے باوجود مجھے نئے سال کا انتظار ہے اور نئے سال کے لیے ایکسائٹیڈ ہوں۔

2۔ کورونا کی وجہ سے کچھ عجیب سی صورت حال رہی اور میں نے کافی ٹائم اکیلے گزارا، لیکن اپنی فیملی کے ساتھ کینکٹ رہی اور اگر دیکھا جائے تو یہ سال اچھا رہا سرپرائز اور تھرل کے حساب سے اور الحمدللہ

کہ میرے لیے یہ سال اچھا رہا۔
3۔سب سے پہلے تو دعا کروں گی کہ پرانے سال کے اختتام پر کورونا کا بھی اختتام ہوجائے میں اپنے ملک کا فیوچر برائٹ دیکھ رہی ہوں اور آنے والے سالوں میں پاکستان ان شاء اللہ ترقی کرے گا اور اپنا فیوچر بھی برائٹ دیکھ رہی ہوں۔ بس اللہ ہم سب کو سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور 2020ء کے کوئی اثرات نئے سال پر نہ پڑیں۔

ڈاکٹر سید آصف علی

(جنرل اینڈ لیپرواسکوپک سرجن)

1۔نہیں،.....بالکل نہیں۔
2۔2020ء ایک چیلنجنگ سال تھا کورونا کے حوالے سے۔ 2 ماہ گھر پر گزارے کیونکہ اٹ واز ایئر آف انزائٹی (خوف و پریشانی کا سال)
3۔میں اپنا فیوچر اچھا دیکھ رہا ہوں اور امید ہے کہ اچھا ہی ہوگا اور اس طرح ملک کا فیوچر بھی اچھا دیکھ رہا ہوں۔

کنول خان:۔(آرٹسٹ)

1۔میں ہمیشہ سے ہی نئے سال کے لیے بہت ایکسائیٹڈ ہوتی ہوں۔ اس سال بھی ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔ مجھے نئے سال کو ویلکم کرنا اچھا لگتا ہے۔
2۔2020ء بہت سارے سرپرائزز اور صبر و تحمل کے ساتھ گزرا۔ کوشش کی کہ اللہ کو راضی کرسکوں اور اگر گزشتہ سال سے اس سال کا موازنہ کروں تو یہ سال بہت اچھا رہا۔
3۔ان شاء اللہ...... اللہ کے کرم اور حکم سے بہت سی کامیابیاں حاصل کرنی ہیں مجھے۔ اپنے ملک کے لیے بس یہی دعا ہے اور امید ہے کہ آنے والے سال کو ہمارے لیے امن کا گہوارہ بنا دے اور اسے ترقی کی راہ پر گامزن کردے۔ (آمین)

عمران نذیر

رائٹر (نالائق+محبوب آپ کے قدموں میں)
1۔سب سے پہلے تو میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس سروے کے قابل سمجھا (بلاشبہ عمران نذیر بہترین رائٹر ہیں) میرے لیے نیا شمسی سال کسی بھی عمر میں ایکسائٹمنٹ کی وجہ نہیں

چھوٹی چھوٹی خوشیوں نے اپنے ہونے کا احساس دلایا مگر مجموعی طور پر یہ سال تکلیف دہ رہا۔

3۔ 2020ء میں کورونا اور لاک ڈاؤن نے ہر شخص کی زندگی کو کسی نہ کسی طرح سے متاثر کیا...... میری اپنی زندگی میں بہت سے لمحے ایسے بھی آئے جب مایوسیاں پر پھیلائے میرے اردگرد منڈلاتی رہیں مگر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہمیشہ پرامید رہنے کی طاقت اور ہمت عطا فرمائی...... آنے والے پل کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اگر زندگی رہی تو اپنی غلطیوں اور ناکامیوں سے سیکھ کر کامیابیوں کے لیے کوشش جاری رکھوں گا۔ وقت کی قدر کروں گا اور ہمیشہ پرامید رہوں گا۔ ان شاء اللہ......اور جہاں تک ہمارے پیارے ملک پاکستان کے فیوچر کا سوال ہے تو کلمہ حق کے نام پر حاصل کیے گئے اس ملک پر ہمیشہ اللہ کا خاص کرم رہا ہے......میرا ایمان کی حد تک یقین ہے کہ اللہ اس ملک کو تاقیامت قائم و دائم رکھے گا اور یہ ہمیشہ ترقی کی راہ پر گامزن رہے گا۔

سدرہ سحر عمران :۔(رائٹر+ڈرامہ رائیٹر جلن)

1۔ میرا خیال ہے کہ جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی

رہا......ہاں البتہ نیا تعلیمی سال ہمیشہ ہی بہت خوشی کا باعث بنتا......وہ اس لیے کہ ہر نئے تعلیمی سال کے شروع ہوتے ہی کورس کی نئی کتابیں ملا کرتی تھیں......نیا یونیفارم ......نئی اسٹیشنری......نیا کلاس روم ......نئے اساتذہ ......اور کچھ نئے دوست ......

موجودہ عمر میں یقیناً بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اب مجھے ایسی خوشی تب ملتی ہے جب میرے بچوں کی زندگیوں کا نیا سال شروع ہوتا ہے۔ ان کی خوشی میں خوشی ملتی ہے......اور اس وقت کا شدت سے انتظار رہتا ہے جب میرے بچے زندگی کے امتحانات میں کامیابیاں سمیٹ کر نئی منزلوں کی کھوج میں اپنا پہلا قدم رکھنے کے لیے ایکسائیٹڈ ہوا کریں گے۔

2۔ دنیا کے کروڑوں لوگوں کی طرح میرے لیے بھی 2020ء بہت پریشان کن رہا...... میرے بہت سے عزیز، رشتے دار......کولیگز اور سب سے بڑھ کر میرے والد اور میرے بھائی اس دنیا سے چلے گئے......اندھیرے بڑھ جائیں تو روشنی کی ہلکی سی کرن بھی اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے......ایسے ہی بہت سارے غموں اور پریشانیوں کے دوران

کے لیے اس کے پہلے سیریل کی مقبولیت اور کامیابی کسی اعزاز سے کم نہیں ہوتی ......سو میں اپنے تخلیق کار کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے میرے اس پروجیکٹ نے مجھے ڈرامہ ہی نہیں دنیا کو بھی مزید سمجھنے پرکھنے اور سیکھنے کا موقع دیا......میری شاعری کی کتاب Deth`s Rehearsal امریکہ سے شائع ہونے جارہی ہے اس کے حوالے سے بھی امید افزا توقعات وابستہ ہیں۔
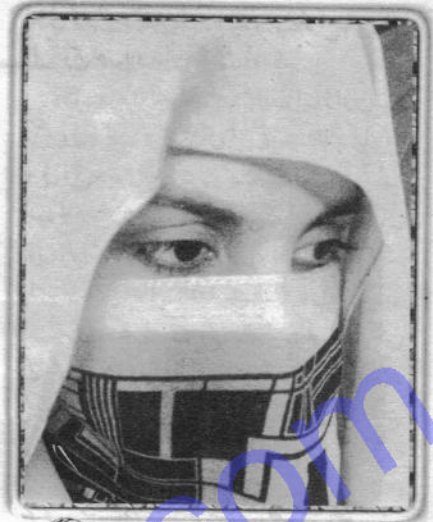
3۔ 2021ء کے آغاز پر صدق دل سے دعا ہے کہ کورونا جیسی موذی وبا سے پوری دنیا کو نجات مل جائے سب کچھ پہلے کی طرح نارمل ہوجائے ...... ہمارا اور پاکستان کا فیوچر اسی وبا کے تناظر میں دیکھا جائے گا کیونکہ زندگی جمود کا شکار ہورہی ہے۔ باقی کوشش یہی ہے کہ نئے سال میں بھی کوئی بہت ہی اچھا پروجیکٹ دوں۔ خدا کرے 2021ء کا سورج ہمارے ملک کے لیے ہی نہیں پوری دنیا کے لیے خوشی اور امید کے ساتھ طلوع ہو......(آمین)

اعتصام الحق :-(براڈ کاسٹر+صداکار)

1۔ نئے سال کی ایکسائٹمنٹ نہ بچپن میں تھی نہ

ہے انسان کی ایکسائٹمنٹ فکرمندی میں بدلنے لگتی ہے کیونکہ آگے کی طرف کا سفر زندگی کو موت کے قریب کرتا جاتا ہے۔ اب سال گزر جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنی جلدی وقت گزر گیا۔ 2020ء کے بارے میں کورونا کی وجہ سے کوئی اچھی رائے تو نہیں ہے کیونکہ ایسا زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے کہ انسان گھروں میں قید ہوکر رہ جائے۔ ایک دوسرے سے ملنے ملانے میں خوف کا عنصر شامل ہوگیا ہے۔ جتنا ایک دوسرے سے فاصلے پر اتنے محفوظ ۔اور جو لوگ بھی اس وبا کا شکار ہوئے ان کے لیے گہرے دکھ اور غم کی کیفیت سارا سال ہی رہی۔

2۔ زندگی میں خوشی اور غمی کا تناسب کم زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے میرے لیے خوشی کی وجہ میرے پہلے سیریل "جلن" کی بے پناہ کامیابی ہے...... جلن سترہ جون سے آن ایئر ہوا اور اب اس کی آخری اقساط چل رہی ہیں ...... میرے اس پروجیکٹ کو جہاں تنقیدی حلقوں میں نشانہ بنایا گیا وہیں اس کی پذیرائی نے اس رائے کو بدلنے پر مجبور کر دیا جسے تنازع کی وجہ بنایا گیا تھا......کسی بھی نئے ڈرامہ رائٹر

اور بدقسمتی سے مجھے کوئی حوصلہ افزاء نظر نہیں آ رہا...... ملک کے جو حالات ہیں وہ کوئی اچھے نہیں ہیں، بے روزگاری بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے۔ پھر کورونا کی وبا نے مزید کمر توڑ دی ہے عام آدمی کی، مڈل کلاس کے لوگ اور غریب لوگ بہت زیادہ مشکلات کا شکار ہیں...... اور اب چونکہ کورونا کی دوسری ''لہر'' آ گئی ہے تو یہ مشکلات اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ اللہ کرے کہ حکومت نے جو وعدے کیے تھے وہ انہیں پورا کرے تا کہ عام آدمی کے حالات بہتر ہو جائیں اور میں بھی ایک عام آدمی ہی ہوں۔ تو ملک کے حالات بہتر ہوں گے تو ہمارے بھی بہتر ہوں گے۔

حرا انور :-(ڈرامہ پروڈیوسر ہم ٹی وی)

1۔ نئے سال کی ایکسائٹمنٹ بالکل نہیں ہوتی، بس دعا ہوتی ہے۔ کہ اللہ خیریت کے ساتھ گزار دے۔

2۔ مکس گزرا، 2020ء سب سے زیادہ یادگار سال رہے گا کہ اس میں کورونا ہوا اور کورونا کی وجہ سے سال کا زیادہ وقت پریشانی میں گزرا۔

ٹین ایج میں، اور نہ ہی اب ہے۔ میرے لیے میرے گولز اہم ہوتے ہیں، میرے کام اہم ہوتے ہیں...... تو بس نئے سال کی ایکسائٹمنٹ نہیں ہوتی۔

2۔ ذاتی طور پر سال 2020ء بہت اچھا رہا اور وہ پہچان ملی جس کی وجہ سے آپ مجھ سے مخاطب ہیں اور ''ارطغرل غازی'' چونکہ اسی سال 2020ء میں آن ایر ہوا اور میں نے اس میں صداکاری کی تو یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ اسی سال میں نے اپنا اردو کا یوٹیوب چینل شروع کیا۔ مختلف برانڈز کے ساتھ کام کیا۔ کراچی فیسٹول اور اسلام آباد فیسٹول آکسفورڈ یونیورسٹی کے ساتھ کام کیا...... آفس میں بھی کامیابیاں ملیں۔ تو اللہ کا شکر ہے کہ کامیابیوں کے اعتبار سے ذاتی طور پر 2020ء بہت اچھا سال رہا...... البتہ کچھ دوستوں کے چلے جانے اور کچھ بہت ہی اچھی شخصیات کے دنیا سے چلے جانے کا افسوس ہے۔ وہ کووڈ کی وجہ سے رخصت ہوئے۔ ان کا ہونا میری زندگی کے لیے بہت اہم تھا۔ اوور آل سال اچھا رہا۔

3۔ میرا فیوچر میرے ملک سے ہی وابستہ ہے

3۔ 2021ء میں پاکستان کے فیوچر کے بارے یہی کہوں گی کہ کچھ نہیں ہونے والا اور ویسے بھی آگے کا حال اللہ بہتر جانتے ہیں۔ ہم صرف امید رکھ سکتے ہیں۔ اپنے فیوچر کے بارے میں بھی یہی کہوں گی۔

سعیدہ اختر (رائٹر دیوانگی فیم)

1۔ نئے سال کی ایکسائٹمنٹ تو ٹین ایج میں بھی کوئی خاص نہیں ہوتی تھی۔ امتحانات کی وجہ سے سارا فوکس پڑھائی کی طرف ہی رہتا تھا۔ نئے سال کی بس یہ سیلیبریشن ہوتی تھی کہ چند دوستوں کزنز وغیرہ کو نئے سال کے کارڈ بھجوانے ہوتے تھے۔ اور جو کرسچن دوست ہوتے تھے انہیں کرسمس کے کارڈ بھیجا کرتے تھے۔ کیک اور تحائف کا تبادلہ ہوتا تھا...... مگر اب وقت بدل گیا ہے...... ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا ہے...... تو آنے والے سال کی باقاعدہ پلاننگ کی جاتی ہے کہ کیا کام سرانجام دینے ہیں اور کون سے گولز اچیو کرتے ہیں۔ کون سے مقاصد حاصل کرتے

دعا ہے کہ اللہ پاکستان کو اپنے حفظ و اماں میں رکھے...... اور اپنے بارے میں تو یہی کہوں گی کہ مجھے آنے والے سال سے بہت سی توقعات ہیں...... کوشش کروں گی کہ اپنے گولز کو اچیو کروں اور کچھ مختلف لکھ کر دکھاؤں۔

ریحان آفاق :-(شاعر+کالم نگار+صداکار)

1۔ جی ابھی بھی جب نیا سال آتا ہے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ جیسے بچپن میں لگتا تھا...... منصوبہ بندی کی جاتی ہے نئے سال میں کچھ نیا اور اچھا کرنے کی کوشش کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ نئے سال کو پہلے سے بہتر گزارا جائے۔

2۔ میں سمجھتا ہوں کہ 2020ء میرے لیے ایک اچھا سال تھا...... خود کو پہچاننے کی کوشش کی...... شاعری کے علاوہ کالم نگاری کا سلسلہ پھر سے شروع کیا۔ ریڈیو پروگرام کے ساتھ ساتھ ادبی سرگرمیاں بھی جاری رکھی...... لاک ڈاؤن میں کتابوں سے لطف اندوز ہوا...... موویز دیکھیں...... اور ایک بڑی کامیابی تو یہ ہوئی کہ میں نے باقاعدہ

3۔ 2021ء میں پاکستان کے فیوچر کے بارے یہی کہوں گی کہ کچھ نہیں ہونے والا اور ویسے بھی آگے کا حال اللہ بہتر جانتے ہیں۔ ہم صرف امید رکھ سکتے ہیں۔ اپنے فیوچر کے بارے میں بھی یہی کہوں گی۔

سعیدہ اختر (رائٹر دیوانگی فیم)

1۔ نئے سال کی ایکسائٹمنٹ تو ٹین ایج میں بھی کوئی خاص نہیں ہوتی تھی۔ امتحانات کی وجہ سے سارا فوکس پڑھائی کی طرف ہی رہتا تھا۔ نئے سال کی بس یہ سیلیبریشن ہوتی تھی کہ چند دوستوں کزنز وغیرہ کو نئے سال کے کارڈ بھجوانے ہوتے تھے۔ اور جو کرسچن دوست ہوتے تھے انہیں کرسمس کے کارڈ بھیجا کرتے تھے۔ کیک اور تحائف کا تبادلہ ہوتا تھا...... مگر اب وقت بدل گیا ہے...... ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا ہے...... تو آنے والے سال کی باقاعدہ پلاننگ کی جاتی ہے کہ کیا کام سرانجام دینے ہیں اور کون سے گولز اچیو کرتے ہیں۔ کون سے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔

2۔ کرونا پینڈیمک کی وجہ سے زیادہ وقت گھر پر ہی گزارا خوب آرام کیا، کھایا پیا کوکنگ میں نئے نئے تجربات کیے، خوب وزن بڑھایا اور پھر آدھا سال وزن گھٹانے میں لگ گئے۔ ڈائٹ کنٹرول کی جم جوائن کیا۔ بہت سالوں بعد اسکرپٹ رائٹنگ سے ایک لمبی بریک لی......اور خود کو وقت دیا۔

3۔ کورونا کی وجہ سے پوری دنیا کو معاشی دھچکا پہنچا ہے۔ جس کے اثرات آنے والے سالوں میں بھی رہیں گے۔ اس کے باوجود میں آنے والے نئے سال 2021ء میں پاکستان کو آگے بڑھتا ہوا دیکھ رہی ہوں۔ معاشی مشکلات تو رہیں گی۔ لیکن باقی شعبوں میں ان شاء اللہ بہتری آئے گی۔ دعا ہے کہ ہمارا ملک بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہو...... پاکستان میں سیاسی استحکام نظر آ رہا ہے اور امن و امان کی صورت حال بھی بہتر ہوتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاکستان کو اپنے حفظ و اماں میں رکھے ......اور اپنے بارے میں تو یہی کہوں گی کہ مجھے آنے والے سال سے بہت سی توقعات ہیں ......کوشش کروں گی کہ اپنے گولز کو اچیو کر وا اور کچھ مختلف لکھ کر دکھاؤں۔

ریحان آفاق:-(شاعر+کالم نگار+صداکار)

1۔ جی ابھی بھی جب نیا سال آتا ہے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ جیسے بچپن میں لگتا تھا...... منصوبہ بندی کی جاتی ہے نئے سال میں کچھ نیا اور اچھا کرنے کی کوشش کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ نئے سال کو پہلے سے بہتر گزارا جائے۔

2۔ میں سمجھتا ہوں کہ 2020ء میرے لیے ایک اچھا سال تھا...... خود کو پہچاننے کی کوشش کی...... شاعری کے علاوہ کالم نگاری کا سلسلہ پھر سے شروع کیا۔ ریڈیو پروگرام کے ساتھ ساتھ ادبی سرگرمیاں بھی جاری رکھی...... لاک ڈاؤن میں کتابوں سے لطف اندوز ہوا...... موویز دیکھیں...... اور ایک بڑی کامیابی تو یہ ہوئی کہ میں نے باقاعدہ واک wallk شروع کردی...... جس سے مجھ میں بڑا اعتماد آیا۔

3۔ ان شاء اللہ 2021ء بھی بہترین گزرے گا۔ کوشش کروں گا کہ آنے والا سال گزرے سال سے بہتر بلکہ بہترین گزرے اور ملک کے لیے بھی یہی دعا ہے کہ اللہ پاک اسے قائم دائم رکھے۔ آمین۔

☆

میری بھی سنیئے

زینب احمد

شاہین رشید

1 ''پورا نام؟''

''زینب احمد۔''

2 ''پیار کا نام؟''

''دوست ''وکی'' کہتے ہیں اور گھر والے ''جنیا'' کہتے ہیں۔''

3 ''جنم دن تاریخ سال؟''

''دن کا پتا نہیں تاریخ پانچ فروری اور سال کور نہ دیں۔''

4 ''بہن بھائی؟''

''ہم دو ہی بہنیں ہیں، بہن بڑی ہیں۔''

5 ''تعلیمی قابلیت؟''

''فلم، تھیٹر، ٹی وی اور فلم ڈائریکٹر کی تعلیم حاصل کی ہے۔''

6 ''تعلیم کا فائدہ اٹھایا؟''

''ڈائریکٹر کے لیے تو فائدہ نہیں اٹھایا لیکن باقی سیکھا ہوا تو کام آرہا ہے۔ تعلیم کے دوران جو اداکاری کی ٹریننگ لی تھی وہ کام آرہی ہے۔''

7 ''کتنی عمر میں اداکاری شروع کی؟''

''صرف 14 سال کی عمر میں اور یہ بھی بس اتفاق سے ہی ہوا۔ ہوا یہ کہ اسلام آباد سے لاہور تعلیم کے لیے آئی تو اتفاق سے ''سٹ کام'' میں ایک بہت ہی چھوٹے سے کردار کے لیے آفر آئی۔ وہ کام سب کو اتنا پسند آیا کہ فوراً ہی اگلے ڈرامے کے لیے آفر آگئی۔ اور یہ بھی بتاؤں کہ وہ چھوٹا کردار ڈرامہ کا مستقل کردار بن گیا...... ٹی وی اسکرین پہ آنے پر گھر والے بھی بہت خوش ہوئے اور مجھے کچھ بھی نہیں کہا۔''

8 ''صبح اٹھتے ہی پہلی فرمائش؟''

''کوئی اچھی سی ''کافی'' پلادے۔''

9 ''مجھے وقت لگتا ہے...... کس کام کے لیے؟''

''جی مجھے وقت لگتا ہے اپنے آپ کو تبدیل کرنے میں اپنی عادات کو تبدیل کرنے میں...... اور یہ عادت بچپن سے ہی ہے۔ اب دیکھیں نا میں پنکچوئل ہونا چاہتی ہوں۔ مگر نہیں ہو پائی، تو بس یہ خامیاں ہیں چھوٹی چھوٹی۔''

10 ''زیادہ بھوک لگے تو؟''

''نڈھال ہونے لگتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں؟''

11 ''ٹریولنگ کا موقعہ ملے تو کہاں جانا چاہوں گی؟''

''اٹلی...... بہت پسند ہے۔''

12 ''پرس یا بیگ کی تلاشی اگر کوئی لے لے تو؟''

''تو کارڈز نکلیں گے۔ جیسے اے ٹی ایم کارڈ۔ ڈیبٹ کارڈ، کلب کارڈ، این آئی سی اور ڈرائیونگ لائسنس کے علاوہ بہت سارے سکے۔ جو میں کے ہے۔

گا ہے دیتی رہتی ہوں فقیر فقراء کو۔"
13 "مجھے کھانے میں لازمی چاہیے ہوتا ہے؟"
"پانی اور سلاد ......ورنہ کھانے کا مزا نہیں آتا۔"
14 "کھانا کہاں بیٹھ کر کھاتی ہوں؟"
"مجھے ذرا رکھ رکھاؤ کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل چیئر پر بیٹھ کر کھانا کھانے میں مزا آتا ہے۔"
15 "ایک کھانا جو بہت پسند ہے؟"
"پاپا کے ہاتھ کی پکی "بریانی" اور پاپا کے ہاتھ کا کھانا اور ناشتا بھی بہت پسند ہے۔"
16 "میرا ایک مقبول کردار؟"
"ماں صدقے سیریل کی "ماں" کا کردار بہت مقبول ہوا تھا۔"
17 "میں خوش ہوتی ہوں؟"
"اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ کر......اور پھر اللہ کا بھی بہت شکر ادا کرتی ہوں کہ کتنا اچھا بنایا ہے میرے رب نے مجھے۔"
18 "تعریف سنتی ہوں تو؟"
"بہت زیادہ خوشی ہوتی ہے اور اپنے رب کا بہت شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے اتنی عزت دی ہے مجھے۔"
19 "پسندیدہ مارننگ شو؟"
"مارننگ شو مجھے بہت برے لگتے ہیں۔ اس لیے پسند ناپسند کیا بات کروں۔"
20 "فریش ہو جاتی ہوں؟"
"جب صبح اٹھ کر کافی پیتی ہوں تو بہت فریش ہو جاتی ہوں۔"
21 "بارش میں دل چاہتا ہے کہ؟"
"ساڑھی پہن کر ڈانس کروں۔"
22 "بچپن میں کون سے کھلونے پسند تھے؟"
"مجھے ٹیڈی بیئر بہت پسند تھا اور وہ ابھی تک میرے پاس ہے۔"
23 "کام سے واپس آ کر کیا کھانے کو دل چاہتا ہے؟"
"کچھ نہیں صرف اور صرف چائے پینے کو دل چاہتا ہے۔"
24 "زندگی کا سکھایا ہوا سبق؟"
"یہ کہ نہ وقت سے پہلے کچھ مل سکتا ہے اور نہ ہی قسمت سے زیادہ کچھ مل سکتا ہے۔"
25 "پاکستان کا پسندیدہ شہر؟"
"اسلام آباد......جب موقع ملتا ہے چلی جاتی ہوں۔"
26 "بہت نروس تھی؟"
"جب پہلی بار کیمرے کے سامنے آ کر آڈیشن دیا اور جب پہلا "سین" کیا بہت ایکسائیٹڈ تھی ......اور اللہ کا شکر ہے کہ "سین" ایک ہی ٹیک میں اوکے ہو گیا۔"
27 "جب بیمار ہوتی ہوں تو؟"
"تو بہت زیادہ پریشان ہو جاتی ہوں۔ اپنی بیماری کو بہت سیریس لیتی ہوں۔"
28 "کبھی برا وقت گزارا؟"
"بہت بار......مگر اب اللہ کا بڑا کرم ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔"
29 "اپنے اور دوسرے ملکوں میں کیا فرق ہے؟"
"بہت زیادہ فرق ہے دوسرے ممالک میں آزادی بہت ہے۔ جبکہ یہاں ایسا نہیں ہے۔"
30 "میں خرچ کرتی ہوں؟"
"ٹریولنگ پر......کیونکہ مجھے ٹریولنگ کا بہت زیادہ شوق ہے۔"
31 "میں شوق سے پکاتی ہوں؟"
"مجھے کوکنگ سے زیادہ پیکنگ کا شوق ہے۔ ویسے کوکنگ بھی اچھی کر لیتی ہوں۔"
32 "ایک کردار جو کرنے کی خواہش ہے؟"
"میں طوائف کا رول کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میں یہ رول یعنی "طوائف" کا اچھی طرح

کرلوں گی۔"

33 "میرا فیوچر؟"

"مجھے لگتا ہے کہ میرا فیوچر بہت برائٹ ہوگا۔ کیونکہ مجھے صرف اور صرف کام سے لگاؤ ہے اور محنت کرنے والوں کا فیوچر برائٹ ہی ہوتا ہے۔"

34 "میں بچت کرتی ہوں؟"

"ہاہاہا...... بچت...... وہ تو مجھ سے ہوتی ہی نہیں ہے...... بہت فضول خرچ ہوں۔"

35 "طبیعت خراب ہوجاتی ہے؟"

"جب اسٹریس لیتی ہوں۔ بی پی ہائی ہو جاتا ہے۔"

36 "میرا رات کا ضروری کام؟"

"نائٹ کریم لگا کے سونا۔"

37 "موجودہ حکومت کے لیے میرے تاثرات؟"

"سیاست سے دلچسپی نہیں۔ لیکن حالات بہت خراب ہیں پاکستان کے۔ ڈری رہتی ہوں کہ مزید خراب نہ ہوجائیں ۔ بہت دعائیں کرتی ہوں پاکستان کی سلامتی کے لیے۔"

38 "کن چیزوں کے بھول جانے پر دوبارہ گھر آتی ہوں؟"

"موبائل فون پرفیوم اور لپ اسٹک ۔ ویسے کوشش کرتی ہوں کہ سوائے موبائل کے باقی چیزیں بیگ سے نہ نکالوں۔"

39 "محنت اور قسمت کس پر یقین ہے؟"

"مجھے تو قسمت پر یقین ہے قسمت اچھی ہو تو سب کچھ مل جاتا ہے۔"

40 "موڈ خراب ہوجاتا ہے؟"

"جب بغیر کام کے وقت گزارنا پڑے۔ مجھے تو زندگی بھی بری لگنے لگتی ہے۔ کام کے بغیر بھی بھلا کوئی زندگی ہے۔"

41 "شادیوں میں اس لیے شرکت ہوں کہ؟"

"کہ مجھے شادی کی رسمیں پسند ہیں، خاص طور پر "ڈھولکی" بہت انجوائے کرتی ہوں۔"

42 "محبت کے بارے میں میرا نظریہ؟"

"میرا کیا نظریہ ہوگا۔ محبت کے بارے میں تو مشہور ہے کہ "محبت اندھی ہوتی ہے" تب ہی اکثر کو گدھوں پر بھی دل آتے دیکھا ہے۔"

43 "بدلہ لیتی ہوں؟"

"بالکل نہیں ...... دل چاہتا ہے کہ جس نے میرے ساتھ برا کیا ہے میں بھی کروں ...... مگر پھر سوچتی ہوں کہ اس میں اور مجھ میں کیا فرق رہ جائے گا۔"

44 "گھر کے کس کمرے میں سکون ملتا ہے؟"

"امی کے کمرے میں...... بڑا سکون ہوتا ہے وہاں۔"

45 "دل کی بات کس سے کرتی ہوں؟"

"اپنی امی سے ہر اچھی بری خبر، بات انہی سے شیئر کرتی ہوں۔ انہیں ہی اپنے دل کا احوال بتاتی ہوں۔"

46 "اگر کبھی سیاست میں آئی تو؟"

"تو پھر اپنی پارٹی بناؤں گی۔ کسی کی پارٹی میں نہیں جاؤں گی کہ کسی سے مجھے کوئی دلچسپی کوئی لگاؤ نہیں ہے۔"

47 "شوبز میں رہنے کے لیے کیا ضروری ہے؟" "محنت، لگن، خود اعتمادی اور خودداری۔"

48 "دوسروں کے تجربے سے فائدہ اٹھاتی ہوں؟"

"نہیں کیونکہ میں اپنے تجربے سے سیکھنے کی قائل ہوں۔ اپنی غلطیوں سے انسان زیادہ سیکھتا ہے۔"

49 "کس کے لیے اپنی نیند خراب کرسکتی ہوں؟" "کسی کے لیے نہیں...... کیونکہ مجھے اپنی نیند بہت پیاری ہے۔ کسی کے لیے اس کو برباد نہیں کرسکتی۔"

50 "غصے میں میرا ردعمل؟"

"ہاہاہا...... نہ پوچھیں تو اچھا ہے۔ منہ سے وہ سب کچھ نکلتا ہے جو انٹرویو میں بتایا نہیں جاسکتا۔"

☆

مقابل ہے آئینہ

عائشہ کیانی

رِدارہ

☆ "اصلی نام کیا ہے؟ گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟"

ج "آداب عرض ہے۔ جناب اصلی نام عائشہ کیانی ہے اور فرینڈز پیار سے عاشو کہتی ہیں۔"

☆ "آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟"

ج "جب کبھی لش پش ہو کر آئینہ دیکھوں تو آئینہ کہتا ہے "ہائے میں صدقے" اور کبھی کام وام کرتے ہوئے آئینے سے نظر مل جائے تو آئینہ بڑے پیار سے اپنے پاس بلا کر کان میں کہتا ہے "دُر فٹے منہ" ہاہاہا۔"

☆ "حسین صورتیں دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟"

ج "ان حسین صورتوں کو بنانے والی ہستی کا خیال آتا ہے۔"

☆ "اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو؟"

ج "ہاہاہا...... میرے پرس میں سے ضرورت کی چیزوں کے علاوہ سب کچھ ملے گا۔ (کچرا)۔"

☆ "بھوتوں سے ڈرتی ہوں؟"

ج "ہاہاہا...... بھوت تو خود مجھ سے ڈرتے ہوں گے۔"

☆ "مہمان کیسے لگتے ہیں؟"

ج "ہی ہی ہی...... مہمان وہ اچھے لگتے ہیں جو آتے ہوئے بہت سی چیزیں لے کر آئیں اور جاتے ہوئے پیسے دے کر جائیں۔ (مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں)۔"

☆ "کھانے میں کیا پسند ہے؟"

ج "سب کچھ کھا لیتی ہوں سوائے (ٹنڈے، لوکی، مٹر، آلو، کریلے) ہاہاہا۔"

☆ "اگر آپ کو حکومت مل جائے تو کیا کریں گی؟"

ج "تو تو...... میں بہت سارے اکاؤنٹس اوپن کروا کر ان کو انہیں بھرنا شروع کر دوں گی (جیسا آج کل ہو رہا ہے) ہاہاہا۔"

☆ "پسندیدہ شاعر؟"

ج "وصی شاہ اور بابا بلھے شاہ کے کلام۔"

☆ "مزاجاً لڑاکا ہیں؟"

ج "نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ میں بہت زیادہ لڑاکا نہیں ہوں مگر غلط بات اور جھوٹ ہر گز برداشت نہیں ہوتا۔"

☆ "کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟"

ج "مجھے نرم گفتار اور ہنس مکھ لوگ پسند ہیں۔ وہ لوگ بہت برے لگتے ہیں جو ہر وقت منہ پھلائے رکھتے ہیں۔"

☆ "اگر لوڈ شیڈنگ نہ ہوتی تو؟"

ج "تو کیا؟ حکمران عوام کو سکون میں کیسے دیکھ سکتے ہیں۔"

☆ "اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟"

ج "ویسے تو ہم ہر وقت ہی اللہ کو یاد رکھیں تو بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کر سکتے۔ لیکن جو اس نے ہمارے لیے اپنی بارگاہ میں حاضری کے لیے ہر روز پانچ بار کا جو وقت مقرر کیا ہے، اس پر ہی اگر ہم پابندی کریں تو بھی وہ ہم سے خوش ہو جاتا ہے۔"

☆ "آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟"

ج "میں بہت کنجوس ہوں۔ ہاہاہا۔ سوچ سمجھ کر پیسے

استعمال کرتی ہوں۔"

☆ "کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟"

ج "جی۔ میرے خیال میں تو ہوتا ہے۔"

☆ "وہ کون سا کام ہے جس کو کرتے ہوئے سوچ آتی ہے کہ دنیا کیا کہے گی؟"

ج "آپ اگر دنیا کا سوچیں گے تو کبھی بھی آگے نہیں بڑھ پائیں گی، کیونکہ دنیا کا تو کام ہی باتیں بنانا ہے اس لیے "سنو سب کی لیکن کرو اپنی" ہاہاہا (باقی جاوٴ ڑ بھاڑ وچ)"

☆ "آپ سنسان راستے سے گزر رہی ہوں اور کتا پیچھے لگ جائے تو؟"

ج "تو میں کسی درخت پر چڑھ جاؤں گی جو کہ میں با آسانی کر سکتی ہوں۔ بچپن میں کھیلے جانے والے کھیل نے ٹرینڈ کر دیا جس کھیل کا نام "لکڑ چھو" تھا، ہاہاہا۔"

☆ "آپ کی نظر میں محبت؟"

ج "کچھ لوگ محبت کے جذبے سے واقف ہی نہیں ہوتے۔ وہ محبت کو مذاق سمجھتے ہیں یا ٹائم پاس۔ لیکن مجھے محبت ہوئی ہے (وہ بھی اسماء نامی لڑکی سے) لڑکی کو لڑکی سے پیار عجیب تو ہے لیکن بالکل سچ ہے (آئی لو یو اسماء)۔"

☆ "کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟"

ج "میں صرف اپنے والدین اور اپنے بھائیوں کی احسان مند ہوں اور خاص طور پر اپنے اویس بھائی کی جنھوں نے ہمارا اتنا خیال رکھا ہے۔ "مائی برادر مائی ہیرو" (آئی لو یو بھائی)۔"

☆ "اپنی تعریف سن کر خوش ہوتی ہیں؟"

ج "مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مجھے کوئی برا کہہ رہا ہے یا اچھا۔ میں خود اپنی ذات سے مطمئن ہوں اور میرے والدین بھی۔ اور کسی کی مجھے پروا نہیں۔"

☆ "ڈرامے دیکھتی ہیں؟"

ج "پہلے بہت زیادہ دیکھتی تھی لیکن اب نہیں۔ لیکن اب بھی جس کی فرسٹ ایپی سوڈ اچھی لگ جائے پھر وہ پورا دیکھ کر ہی سکون کا سانس لیتی ہوں۔"

☆ "ہم گرد دوست ناراض ہو جائے تو؟"

ج "بغیر ناراضی کی وجہ جانے منا لوں گی کیونکہ میں ہمیشہ ہی ایسا کرتی ہوں۔ جو بھی ناراض ہو منانے میں پہل کرتی ہو، چاہے میری غلطی ہو یا نہ ہو۔"

☆ "حقیقی خوشی کس وقت حاصل ہوتی ہے؟"

ج "جس وقت میری ماں خوش ہوتی ہے۔"

☆ "زندگی سے کیا سبق سیکھا؟"

ج "کچھ زندگی نے سبق سکھائے اور کچھ وقت نہ سکھائے اور وقت نے جو سبق سکھایا، وہ یہ ہے کہ کسی پر بھی برا وقت آئے تو سب ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔"

☆ "ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟"

ج "رکھتی تو ہوں مگر بہت کم۔"

☆ "کوئی آخری بات؟"

ج "انسان کی زندگی کتاب کے تین صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلا صفحہ "پیدائش" اور آخری صفحہ "موت" کا اور درمیان والا خالی ہوتا ہے۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ اس درمیانی صفحے کو کیسے پُر کرتی ہیں۔"

☆

طیبہ کو آٹھ سال، دو ماہ اور تین دن بعد اس وقت اپنا گھر چھوڑنا پڑا جب ان کے ساتھ ان کا ہم سفر نہ رہا۔ نام نہاد اپنوں نے ان کی کم عمری کو بہانہ بنا کر ان کا مشترکہ سسرال میں رہنا غیر مناسب قرار دیا۔ ان کے بھائی خلیل غوری اپنی بہن اور بھانجی حیا کو اپنے گھر لے آئے۔

گردیزی ہاؤس میں شاہ مخدوم گردیزی اپنے دو بیٹوں حاتم گردیزی اور سبحان گردیزی اور بہوئیں زینب اور منیرہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی ”گردیزی کنسٹرکٹرز“ کے نام سے کنسٹرکشن کمپنی ہے۔ بنیادی طور پر ان کا تعلق ایک بڑے زمین دار گھرانے سے ہے۔

حاتم گردیزی کے دو بیٹے جرار اور ہادی اور ایک بیٹی خولہ ہے جبکہ سبحان گردیزی کی ایک بیٹی سلوی ہے۔

زینب کو اپنے بیٹے جرار کے مغرورانہ انداز سخت ناپسند ہیں۔ وہ اپنے دادا کا بے حد لاڈلا ہے بلکہ عادت واطوار میں بھی ان ہی کا پرتو ہے۔

عباس چچا کے بیٹے نصر نے جو منیرہ کا بھائی ہے، اپنے سالوں کے ساتھ مل کر شاہ مخدوم گردیزی کے آموں کے باغات پر قبضہ کرلیا ہے۔ شاہ مخدوم گردیزی نے اپنے بیٹوں کو عدالتی کارروائی کرنے کا حکم دے دیا ہے۔

دوسری قسط

"جی۔" طیبہ کو لگا جیسے سامنے بیٹھے شخص کی بات سمجھنے میں ان سے کوئی غلطی ہو گئی ہو۔" کیا۔کیا کہا آپ نے؟"

ان کی بات پہ ڈاکٹر رضوی نے ترحم آمیز نگاہوں سے ان کا زرد پڑتا چہرہ دیکھا۔

"نرس ان کے لیے پانی لے کر آؤ۔"

ڈاکٹر صاحب کی بات پہ قریب کھڑی نرس تیزی سے باہر کو لپکی مگر طیبہ کے لیے تو اس وقت سوائے ڈاکٹر رضوی کے دوسرا کوئی کمرے میں موجود ہی نہیں تھا۔

"ا......ایک منٹ......آپ......آپ کہہ رہے ہیں کہ میرے بھائی کو برین...... برین ٹیومر ہے؟" ان کی آواز یوں ڈوبی تھی گویا اب کبھی نہ ابھر سکے گی۔

"بدقسمتی سے یہی سچ ہے۔" ڈاکٹر رضوی دھیرے سے بولے تو طیبہ کی نظروں میں پورا کمرا گھوم گیا۔ انہوں نے بے اختیار اپنا چکراتا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"نہیں......نہیں۔"

تبھی نرس پانی کا گلاس لیے بھاگی چلی آئی۔ جونہی اس کی نظر طیبہ پر پڑی اس نے لپک کر ان کے لرزتے وجود کو سنبھالا۔ بند آنکھیں، دیوانہ وار بہتے آنسو اور سر سے ڈھلکتا آنچل وہ اس وقت غم و یاس کی تصویر بنی ہوئی تھیں۔ اس نے زبردستی پانی کا گلاس ان کے لبوں سے لگایا۔

"ہمت سے کام لیں بی بی۔" نرس کی نرم آواز پہ انہوں نے بامشکل تمام آنکھیں کھولیں۔ اگلے ہی لمحے وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے اس شدت سے روئیں کہ پاس بیٹھی نرس کی اپنی آنکھیں بھر آئیں۔

ڈاکٹر رضوی نے انہیں جی بھر کے اپنا دل ہلکا کرنے دیا۔ اور جب آنسوؤں میں کمی آنے لگی تو خاموشی سے ٹشو پیپر کا ڈبا ان کے سامنے رکھ دیا۔

"خود کو سنبھالیں مس طیبہ۔ اگر آپ یوں کمزور پڑ گئیں تو خلیل صاحب کو کون حوصلہ دے گا؟" ڈاکٹر صاحب کی بات پہ طیبہ کو لگا جیسے ان کا دل درد سے پھٹ جائے گا۔

"کیسے سنبھالوں ڈاکٹر صاحب؟ میں تو جیتے جی مر گئی ہوں۔ میں اپنے بھائی کو حوصلہ نہیں دے سکتی۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا ڈاکٹر صاحب۔ کسی طور نہیں ہو سکے گا۔" وحشت سے نفی میں سر ہلاتے ان کی آنکھیں نئے سرے سے برسنے لگی تھیں۔

"دیکھیں مس طیبہ۔ مؤثر علاج کے لیے مریض کے گھر والوں اور خود مریض کے لیے اس کے مرض سے آگہی بہت ضروری ہوتی ہے۔ ہم اتنی بڑی بات ان سے کسی طور نہیں چھپا سکتے۔"

"تو آپ خود ان سے بات کریں۔...... میں اس امتحان سے نہیں گزر سکتی۔" وہ متوحش سی اپنی جگہ سے اٹھیں تو ڈاکٹر رضوی نے اک گہری سانس لی۔

"ٹھیک ہے۔ آپ وہاں بیٹھیں۔" انہوں نے کمرے کے ایک جانب رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

طیبہ بے قراری ایک کرسی پر جا ٹکیں اور رگڑ رگڑ کر ہاتھ میں پکڑے ٹشو سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ مگر آنسو تھے کہ نکلے چلے آ رہے تھے۔ اسی کشمکش میں نرس کے پیچھے خلیل غوری کمرے میں داخل ہوئے تو طیبہ کی سانس اچانک جیسے ساکن ہو گئی۔ یک لخت ان کے لیے، سوائے اپنے عزیز از جان بھائی کے، سب کچھ جیسے پس منظر میں چلا گیا۔

کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں انہوں نے انہیں آگے بڑھتے اور ڈاکٹر صاحب کے مقابل کرسی سنبھالتے دیکھا۔ ڈاکٹر رضوی نے ان سے کیا کہا کیا نہیں، طیبہ کو کچھ سنائی نہیں دیا۔ وہ بس ایک ٹک اپنے ماں جائے کا چہرہ

دیکھ رہی تھیں جو محض چند لمحوں کے لیے متغیر ہوا تھا اور پھر وہاں گہری خاموشی نے ڈیرے ڈال دیے تھے۔

"کس اسٹیج پر ہے میرا مرض؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد ان کی بے تاثر آواز وہاں چھائے سناٹے میں ابھری، طیبہ نے مارے اذیت کے اپنی آنکھیں سختی سے بند کرلیں۔ آنسو سیل رواں کی طرح ان کی آنکھوں سے جاری تھے۔

"میرے اندازے کے مطابق سیکنڈ اسٹیج پر ہے۔" ڈاکٹر رضوی دھیمے لہجے میں بولے۔

"کیا یہ قابلِ علاج ہے ڈاکٹر صاحب؟" ان کا حوصلہ عروج پر تھا۔ طیبہ نے اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹنے کے لیے لب سختی سے دانتوں تلے دبالیا۔

"کیوں نہیں۔ آپ دل چھوٹا مت......"

"پلیز ڈاکٹر صاحب! مجھے طفل تسلیاں نہیں چاہئیں۔ میں حقیقت کو اس کی تمام تر تلخی کے ساتھ جاننا چاہتا ہوں۔" انہوں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر رضوی کی بات کاٹی تو وہ ایک لمحے کو چپ ہو گئے۔

"ففٹی ففٹی چانس ہے۔ میں اس معاملے میں کوئی بھی حتمی رائے نہیں دے سکتا۔ اس سلسلے میں آپ کو کسی اسپیشلسٹ سے رابطہ کرنا ہوگا۔" ڈاکٹر صاحب کی بات پر خلیل غوری نے اک گہری سانس لی۔

"کیا آپ کسی اچھے ڈاکٹر تک میری راہ نمائی کر سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔ میرے ایک بہت اچھے اور قابل دوست ہیں۔ ان کا تعلق اسی فیلڈ سے ہے۔ میں آپ کو ان کا نام اور پتا لکھ دیتا ہوں۔" ڈاکٹر رضوی اپنی میز پر جھک گئے۔

خلیل صاحب نے پہلی بار اپنے بائیں طرف دیکھا جہاں دیوار کے ساتھ لگی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھے ہوئے طیبہ، آنکھوں پر ہاتھ رکھے زار و قطار رو رہی تھیں۔ بے اختیار انہیں لگا جیسے ان کا سارا حوصلہ، ساری ہمت ریت بن کر مٹھی سے پھسلنے لگی ہو۔ وہ اپنی ذات پر تو ہر دکھ جھیلنے کا حوصلہ رکھتے تھے مگر اپنے پیاروں کے درد کا محض احساس ہی ان کا ضبط بکھیرنے لگا تھا۔

"یا اللہ! میری مدد فرما۔ مجھے اس کڑی آزمائش سے نبرد آزما ہونے کی ہمت اور طاقت عطا فرما میرے مولا۔" جلتی آنکھیں سختی سے بند کرتے ہوئے انہوں نے دل کی گہرائیوں سے اپنے رب کو پکارا تھا۔ مگر باوجود کوشش کے، کتنے ہی خاموش آنسو ٹوٹ کر ان کے جھکے چہرے پر بہہ نکلے تھے۔

☆☆☆

"اچھا آقا جان، اجازت دیں۔" اگلی صبح حاتم گردیزی اور سبحان گردیزی دونوں گاؤں نکلنے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

"جاؤ اللہ کی امان میں دیا......" انہوں نے فرداً فرداً بیٹوں کی پشت تھپتھپائی۔ "واپسی کتنے بجے تک ہو گی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتے۔ لیکن کوشش ہو گی کہ وہاں سے ذرا جلدی نکلیں۔" حاتم صاحب نے مبہم انداز میں جواب دیا۔ اب وہ باپ کو کیا بتاتے کہ پانچ گھنٹے تو انہیں صرف آنے جانے کے لیے چاہیے تھے۔ جبکہ وہ انہیں کہہ چکے تھے کہ انہیں یہیں ایک قریبی علاقے میں جانا ہے۔

"ہوں......کوشش کرنا کہ مغرب سے پہلے نکلو تاکہ رات میں سفر نہ کرنا پڑے۔"

"جی بہتر۔"

انہوں نے فرمانبرداری سے سر ہلایا تو بے اختیار زینب اور منیرہ نے پریشان نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سب جانتے تھے کہ شاہ مخدوم گردیزی کو غلط بیانی اور حکم عدولی سے کتنی چڑ ہے۔ ایسے میں یہ جو کچھ بھی

ہونے جا رہا تھا وہ کس حد تک صحیح تھا وہ نہیں جانتی تھیں۔
ڈھائی گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد ان کی لینڈ کروزر چوہدری بخت کے گاؤں کی حدود میں داخل ہوئی تو ان کی گاڑی کے پیچھے چوہدری کے متعین کردہ گارڈز کی گاڑی دوڑنے لگی جسے حاتم اور سبحان صاحب دونوں باخوبی پہچانتے تھے۔
"بخت نے بھی اس معاملے میں ثالث کی حامی بھر کے اپنے سر اچھی خاصی مصیبت مول لے لی ہے۔" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے سبحان گردیزی نے بدمزگی سے سر جھٹکا۔ "اب اگر یہاں کسی کو کچھ ہو جائے تو وہ بے چارہ بیٹھے بٹھائے ایک نئی مشکل میں گرفتار ہو جائے گا۔"
"سارے فساد کی جڑ ہی یہ نصر ہے۔ عمر کے ہر دور میں یہ دوسروں کے لیے مشکل بنا رہا ہے۔" حاتم صاحب نے دانت پیستے ہوئے نصر گردیزی کو کوسا۔ "تم نے پسٹل رکھی ہے ناں؟" انھوں نے اچانک بھائی کی طرف پلٹتے ہوئے سوال کیا۔
"بے فکر رہیں۔ ایسے بے ایمانوں پر بھلا کب آنکھیں بند کر کے بھروسا کیا جا سکتا ہے۔" انہوں نے گاڑی چوہدری بخت کی حویلی کے کھلے پھاٹک سے اندر داخل کرتے ہوئے جواب دیا اور سبک رفتاری سے چلاتے ہوئے وہاں موجود دیگر گاڑیوں کے پیچھے کھڑی کر دی۔
"دیکھیے، پہلے سے ہی آئے بیٹھے ہیں۔" انہوں نے سامنے کھڑی نصر کی گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ حاتم گردیزی غصے سے سر جھٹکتے باہر نکل آئے۔ تب ہی مہمان خانے کا دروازہ کھلا اور ایک پر خلوص سا چہرہ باہر آیا جسے دیکھ کر حاتم صاحب کے لب مسکرا دیے۔
"او میرا یار آ گیا۔ جی آیاں نوں سرکار۔" چوہدری بخت بانہیں کھولے ان کی جانب آئے تو حاتم گردیزی نے آگے بڑھ کر انہیں خود سے گلے لگا لیا۔
"چھوڑ یار۔ تو بھی ہماری وجہ سے پتا نہیں کس مشکل میں پھنس گیا ہے۔" ان سے الگ ہوتے ہوئے حاتم صاحب شرمندہ سے بولے۔
"او تیرے لیے تو جان بھی حاضر ہے جگر۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔" ان کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے وہ اسی خوشدلی سے سبحان گردیزی سے ملنے لگے۔
"یہ بتا اندر کیا چل رہا ہے؟" حال احوال کے بعد حاتم صاحب نے مہمان خانے کی طرف اشارہ کیا تو بخت دھیرے سے ہنس پڑے۔
"چور بھلا کتنے پُراعتماد ہو سکتے ہیں؟" انھوں نے الٹا ان سے سوال کیا تو حاتم گردیزی استہزائیہ انداز میں مسکرا دیے۔
"ان چوروں کو کم نہ جاننا۔ بہت ہی بے غیرت اور سینہ زور قسم کے واقع ہوئے ہیں۔"
"اس میں تو کوئی شک نہیں...... " بخت نے سر ہلاتے ہوئے تائید کی۔ "مگر میں یہ بھی دیکھ چکا ہوں کہ نصر کی ڈور اس کے سالوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ خود تو اندر سے خاصا گھبرایا ہوا ہے مگر اس کے تینوں سالے ایک نمبر کی ڈھیٹ چیز ہیں۔ خاص کر کے سب سے بڑا والا۔ ملک دلاور۔ یہ باغ دراصل اسی کے قبضے میں ہیں۔ باقی سارے تو یونہی اس کے آگے پیچھے گھوم رہے ہیں۔ ان کا کرتا دھرتا اصل میں وہی ہے۔"
"ہوں...... " حاتم گردیزی نے پرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔ "چل دیکھتے ہیں اس کرتے دھرتے کو۔ ان گھٹیا لوگوں کو ان کی اوقات یاد نہ دلائی تو حاتم نام نہیں۔" وہ اندر کی جانب بڑھتے ہوئے بولے تو بخت اور سبحان بھی ان کے ساتھ چل پڑے۔

☆☆☆

گاڑی کی بوجھل خاموشی میں طیبہ کی گھٹی گھٹی سی سسکیاں سوگوار سا ارتعاش برپا کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر رضوی سے ان کے دوست کا نام پتا لے کر خلیل صاحب مزید کوئی بات کیے بنا اپنی گاڑی میں آبیٹھے تھے۔ طیبہ بھی آنسو پونچھتی چپ چاپ سی ان کے پیچھے چلی آئی تھیں۔ دونوں کے درمیان لفظوں کی جیسے اچانک ہی بڑی شدید قلت پڑ گئی تھی۔ نہ طیبہ کے پاس اتنا حوصلہ تھا کہ بھائی سے کچھ کہہ سکیں اور نہ ہی خلیل غوری خود میں اتنی ہمت محسوس کر رہے تھے کہ بہن کو کوئی جھوٹا دلاسا دے سکیں۔ مگر جب گم صم سی بیٹھی طیبہ کے اشک نئے سرے سے بہنا شروع ہوئے تھے تو خلیل صاحب کو لگا تھا جیسے کسی نے ان کا دل مٹھی میں لے لیا ہو۔ آخر کو وہ ان کی اکلوتی، لاڈلی بہن تھیں جو انہیں اپنی اولاد کی طرح پیاری تھیں۔ انہیں روتا دیکھنا ان کے لیے کبھی بھی آسان نہیں رہا تھا۔

''اگر تمہیں پتا چل جائے ناں، کہ تمہارا ایک ایک آنسو مجھے کتنی تکلیف دے رہا ہے تو شاید تم اپنی آنکھوں میں کبھی نمی نہ اترنے دو بیا۔'' سڑک پر نگاہیں جمائے وہ دل گرفتہ سے بولے تو طیبہ کا صبر جیسے جواب دے گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے اس شدت سے روئیں کہ خلیل غوری کی اپنی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

''بیا...... بچے۔'' ان کے لیے مزید ڈرائیو کرنا ممکن نہ رہا تو انھوں نے گاڑی ایک جانب روک دی۔ اور اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بہن کی طرف پلٹے۔

''ہائے بھائی۔ یہ کیا ہو گیا، ہمارے ساتھ...... کیا ہو گیا بھائی؟'' وہ دیوانہ وار روتی ان کی جانب پلٹیں تو خلیل غوری کو اپنا کلیجہ کٹتا ہوا محسوس ہوا۔

''بس بیٹا۔ بس! خود کو سنبھالو میری جان۔'' انھوں نے ان کی پشت سہلائی۔

''کیسے سنبھالوں؟ ہائے، میں بھابھی کو کیا جواب دوں گی؟ م...... میں ان سے ک...... کیا کہوں گی؟ ہائے میں کیا کروں گی؟'' وہ روتے روتے نڈھال سی ہو چلی تھیں۔ خلیل صاحب کو یک لخت طیبہ کی فکر نے آن گھیرا۔

''بیا۔'' لب بھینچے انہوں نے انہیں دونوں شانوں سے پکڑ کر جھنکا۔ ''ادھر دیکھو میری طرف۔'' ان کے پکارنے پر طیبہ جیسے ہوش میں آئیں۔ ''میری طرف دیکھو۔''

طیبہ نے بامشکل تمام اپنی متورم آنکھیں کھولیں۔

''تم مونا سے کچھ نہیں کہو گی، سمجھیں۔ میں خود اس سے بات کروں گا۔''

''م...... مگر بھائی......''

''بس۔ اور اب تم مزید ایک آنسو نہیں بہاؤ گی۔ میں ابھی مرا نہیں ہوں۔ تمہارے ساتھ، تمہارے پاس ہوں۔ یوں رو کر مجھے جیتے جی مت اذیت دو بیا۔ پلیز۔'' ان کا لہجہ یک لخت ملتجی ہو گیا۔ طیبہ نے اپنی آنکھوں میں تیرتے آنسو حلق میں اتارتے ہوئے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''شاباش! میری بہادر گڑیا۔ اب اپنی آنکھیں صاف کرو اور خود کو سنبھالو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری بھابھی تمہیں اس حال میں دیکھ کر پریشان ہو جائیں۔'' انھوں نے شفقت سے ان کا سر تھپتھپایا۔

طیبہ اک گہرا سانس لیتے ہوئے اپنے بھائی کے لیے خود کو مضبوطی اور ہمت کا ایک نیا درس دینے لگیں۔

☆☆☆

''السلام علیکم بھاجی۔'' ان تینوں کو مہمان خانے میں داخل ہوتا دیکھ کر وہاں بیٹھے چاروں افراد اپنی جگہ سے اٹھے تھے۔ نصر اپنے تئیں ماحول خوشگوار بنانے کو بڑی گرم جوشی سے سلام کرتا ان کی طرف بڑھا تھا مگر حاتم اور سبحان صاحب کے سپاٹ چہرے دیکھ کر اس کے اٹھتے قدم اپنی جگہ پر رک گئے تھے۔

''دیر سے ہی سہی، مگر رتی بھر عقل آ ہی گئی ہے تمہیں نصر۔'' طنزیہ نظروں سے اسے دیکھتے حاتم گردیزی نے

مسکراتے ہوئے چوٹ کی تو نصر عباس کا چہرہ مارے خفت کے سرخ پڑ گیا۔ سب کے سامنے اس عزت افزائی پر جہاں بخت چوہدری اپنی اُمڈتی مسکراہٹ چھپانے کو لبوں پر مٹھی رکھ گئے وہیں اس کے "سگے" اپنی جگہ پر تپ اٹھے۔

"وہ تو آپ کو عزت دینے چلے تھے مگر شاید آپ ہی......"

"آپ کی تعریف؟" حاتم گردیزی نے تمام لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے انتہائی سرد و سپاٹ لہجے میں مقابل کی بات کاٹی تو ایک پل کو ارد گرد سناٹا چھا گیا۔

"میں بھا نصر کا سب سے چھوٹا سالا، نعیم ملک ہوں۔" ناگواری کی سرخی لیے وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد بولا۔

حاتم گردیزی محض ہنکارا بھرتے مقابل رکھے صوفے پر جا بیٹھے۔ ان کا انداز اتنا تحکمانہ اور بے باک تھا کہ پورے ماحول پر ان کی شخصیت اچانک چھا سی گئی تھی۔ ملک دلاور نے ایک نظر اپنے بھائیوں کو دیکھا اور خود بھی نشست سنبھال لی۔ بخت اور سبحان ساتھ ساتھ رکھے سنگل صوفوں پر بیٹھ گئے۔

"یہ تو ہو گیا نصر کا چھوٹا سالا۔" انہوں نے شہادت کی انگلی سے نعیم ملک کی طرف اشارہ کیا۔ "اور آپ دونوں؟" انہوں نے نصر کے برابر بیٹھے ملک دلاور اور ان کے بھائی کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا تو ان کے چہروں پہ چھائی ناگواری مزید گہری ہو گئی۔

"آپ تو یوں بات کر رہے ہیں جیسے کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔" ملک دلاور استہزائیہ انداز میں بولے۔ حاتم گردیزی ٹھنڈا سا مسکرا دیے۔

"سچ کہہ رہے ہیں۔ میری آپ لوگوں سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔"

"کیوں نصر کی شادی میں بھی نہیں ملے تھے کیا؟" ملک دلاور نے بھنویں اچکائیں۔

"میں بہت مصروف بندہ ہوں صاحب۔ ہر تقریب میں شامل نہیں ہوتا۔" ان کی آنکھوں میں دیکھتے وہ بے نیازی سے بولے۔

سبحان صاحب اور بخت چوہدری کے لیے اپنی مسکراہٹ چھپانا مشکل ہو گیا۔ اس درجہ ہتک کے بارے میں تو شاید ان ملکوں نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا۔

"پھر تو آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔ ہمیں سیدھا مدعے پر آنا چاہیے۔" ملک دلاور کاٹ دار انداز میں بولے مگر حاتم صاحب نے ان کے طنز کو مکمل طور پہ نظر انداز کر دیا۔

"بالکل۔ میں خود بھی سیدھی بات کرنے کا قائل ہوں۔" انہوں نے ٹانگ پر ٹانگ جمائی۔ ملک دلاور ناچار دانت پیس کر رہ گئے۔

"تو سیدھی بات یہ ہے حاتم گردیزی، کہ اگر تم لوگوں کو تمہارے باغ واپس چاہئیں تو تمہیں ہمیں دو کروڑ ادا کرنے ہوں گے۔"

"دو کروڑ......! مگر کس لیے؟" حاتم صاحب بنا کسی تاثر کے بولے۔

"قبضہ چھوڑنے کے۔" ملک دلاور نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔

"اچھا! تو یہ کاروبار ہے تم لوگوں کا۔"

حاتم صاحب کی چوٹ پر مقابل ڈھٹائی سے مسکرا دیا۔

"جو مرضی سمجھ لو۔"

"تو پھر تم بھی ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔" ملک دلاور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ یک لخت آگے کو

جھکے۔ ''ہم تمہیں ایک پھوٹی کوڑی نہیں دینے والے۔ رہا قبضہ، تو وہ عدالت تم سے خود چھڑوالے گی۔''
''عدالت کا باپ بھی ہم سے اس زمین کو خالی نہیں کرواسکتا۔'' وہ دوبدو بولے تو حاتم صاحب استہزائیہ انداز میں مسکرادیے۔
''اچھا!! اگر ایسی بات ہے تو آج یہاں کیوں دوڑے چلے آئے ہو؟ ڈٹے رہتے اپنی جگہ پر۔''
''ہم اپنی جگہ پر ہی ڈٹے ہوئے ہیں صاحب بہادر۔'' طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے انہوں نے صوفے کی پشت پر بازو پھیلائے۔ ''یا تو پیسہ دو یا پھر عدالت کے چکر کاٹنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ کیونکہ میں اس کیس کو اتنا لٹکا دوں گا کہ تم تو کیا تمہاری اگلی نسل بھی اس کیس کا فیصلہ نہیں کروا پائے گی۔''
''دھمکی دے رہے ہو کیا؟'' حاتم گردیزی کی آنکھوں سے لپٹیں سی نکلنے لگیں۔
''نہیں، سمجھا رہا ہوں۔ نہ اپنا وقت کھوٹا کرو اور نہ ہمارا۔ پیسہ دو اور اپنی جگہ واپس لے لو۔'' انہوں نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔
''اوہ! میں تو سمجھا تھا کہ شاید صورت حال کی نازکی نے تم لوگوں کا دماغ ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔ مگر تم نے تو یہاں ہمیں تصفیے کے نام پر لوٹنے کے لیے بلایا ہے۔ بہت خوب۔'' حاتم صاحب نے نگاہوں کا زاویہ اپنے عم زاد کی طرف کیا۔ ''اچھا باپ دادا کا نام روشن کر رہے ہو نصر۔'' ان کی چوٹ پر نصر عباس خجالت سے نظریں چراتا سیدھا ہو بیٹھا۔
''بھاجی۔ سمجھنے کی کوشش کریں۔ ان باغوں کی اصل مالیت کے سامنے تو دو کروڑ کچھ بھی نہیں۔ آپ کیوں خواہ مخواہ بات کو بڑھا رہے ہیں؟''
''میں تو واقعی بات کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا نصر۔ مگر تم لوگوں نے ثابت کر دیا کہ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ بجائے اس کے کہ آج تم لوگ اپنی گری ہوئی حرکت پر نادم ہوتے، ہم سے معافی مانگتے۔ تم ہم سے بھاؤ تاؤ کرنے کھڑے ہو گئے ہو؟ ہمیں دھمکیاں دے رہے ہو؟'' پیشانی پر بل لیے انہوں نے غصے سے اسے دیکھا تو نصر گردیزی نے سرعت سے پینترا بدلا۔
''ایسا نہیں ہے بھاجی۔ مگر دیکھیں ناں، قبضے میں آئی ہوئی چیز یونہی تو نہیں واپس کر دی جاتی۔ کچھ دو اور لو کا اصول تو ساری دنیا میں لاگو ہے۔''
''صحیح کہہ رہے ہو۔ مگر وہ کیا ہے ناں کہ شاہ مخدوم گردیزی اور اس کی اولاد نے نہ تو کبھی کسی کا حق کھایا ہے اور نہ ہی کبھی کسی کو اپنا حق کھانے دیا ہے۔ اس لیے اگر اپنی چیز کے حصول کے لیے ہمیں تمہارے حلق میں بھی ہاتھ ڈالنا پڑا تو ہم ڈال کر رہیں گے۔'' برف سے ٹھنڈے لہجے میں اپنی بات مکمل کرتے وہ ایک جھٹکے سے اٹھے تو سبحان صاحب کے ساتھ ساتھ بخت چوہدری بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔
میں نے تم سے کہا تھا نصر، کہ اپنا دماغ ٹھکانے پر رکھنا مگر تم نے میری بات پر شاید دھیان نہیں دیا۔ اس لیے اب ہماری اگلی ملاقات عدالت میں ہی ہوگی۔ میں بھی دیکھتا ہوں کون مائی کا لال اس کیس کو میری اگلی نسلوں تک گھسیٹتا ہے۔'' شعلے برساتی نظروں سے ان چاروں کو دیکھتے وہ اپنے دوست کی جانب پلٹے۔ ملک دلاور نے لب بھینچے اپنے بھائی بندوں کی طرف دیکھا۔ وہ تو یہ سمجھے ہوئے تھا کہ ان شہری بابوں کو ڈرا دھمکا کر اپنا مطالبہ پورا کروا لیں گے مگر وہ تو الٹا انہیں ہی پورا پڑ گئے تھے۔
''اچھا بخت، اجازت دو ہمیں۔''
''ایسے کیسے اجازت دوں۔'' بخت چوہدری نے ان کا ہاتھ تھاما۔ ''کھانا تیار ہے۔ کھا کر جانا۔''
''پھر بھی۔ آج یہاں ان گدھ نما انسانوں کی موجودگی میں، جو اپنوں کو ہی نوچ کھانے پر اتر آئے

ہوں، مجھ سے بیٹھا نہیں جائے گا۔" کاٹ دار لہجے میں اپنی بات مکمل کرتے وہ تیز قدموں سے باہر نکل گئے تو سبحان صاحب بھی قہر برساتی نظروں سے اپنے سالے کو گھورتے بھائی کے پیچھے چل دیے۔

☆☆☆

میمونہ کی بے چینی عروج پر تھی۔ بچوں کو دیکھتے، گھر کے کام نپٹاتے ان کا دھیان مسلسل باہر کی جانب تھا۔ کبھی لگتا جیسے سب کچھ بالکل ٹھیک ہو جائے گا اور کبھی بالکل اچانک ہی کوئی وہم اس طرح سے دامن گیر ہوتا کہ ان کے لیے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانا مشکل ہونے لگتا۔ ایسے میں جب خدا خدا کر کے گیٹ پر گاڑی رکنے کی آواز آئی تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تیز قدموں سے باہر کی جانب بھاگیں۔

"کہاں رہ گئے تھے آپ لوگ؟"

خلیل صاحب کا بیل کی طرف بڑھتا ہاتھ ہوا میں ہی رہ گیا تھا جب دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تھا۔ شوہر کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی میمونہ کی پریشانی غصے میں ڈھل گئی تھی۔ خلیل غوری نے ایک نظر ان کے بکھرے ہوئے پریشان حال حلیے پر ڈالی تھی اور ان کا دل تیزی سے ڈوب سا گیا تھا۔ وہ اس خبر کو کیسے جھیلنے والی تھیں ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

"ارے بھئی اندر تو آنے دو۔" خشک پڑتے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ بامشکل تمام مسکرائے۔

میمونہ بے قراری ایک طرف کو ہٹیں اور مضطرب نظروں سے خلیل صاحب کو گیٹ کھولتے اور گاڑی اندر لاتا دیکھتی رہیں۔

طیبہ کی نظر جونہی اپنی بے تاب کھڑی بھابھی سے ٹکرائی ان کے دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو گئیں۔

"کیا کہا ڈاکٹر نے؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟" دونوں کے باہر آتے ہی وہ تیزی سے ان کی طرف لپکیں۔

لیکن جونہی ان کی پریشان نظریں خلیل صاحب سے ہوتے ہوئے طیبہ پر آئیں تو ان کا دل دھک سے رہ گیا۔

"تم...... تم روئی ہو کیا؟"

"ارے نہیں بھابھی۔" طیبہ کی جیسے جان پر بن آئی۔ "راستے میں اچانک پتا نہیں کیا اڑ کر میری آنکھ میں پڑا کہ میرے لیے آنکھیں کھولنا محال ہو گیا۔"

"اف توبہ! میں تو پریشان ہو گئی تھی۔" میمونہ نے اک گہری سانس لی اور طیبہ کو اپنا دل مارے درد کے پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

"میں...... میں ذرا آنکھ میں پانی ڈال کر آتی ہوں۔" ان کے لیے مزید وہاں کھڑے رہنا ممکن نہ رہا تو وہ تیز قدموں سے اندر کی جانب بڑھ گئیں۔ میمونہ نے بے چینی سے شوہر کو دیکھا۔

"بتائیں ناں، کیا کہا ڈاکٹر نے؟"

"ارے یار سب ٹھیک ہے۔ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔"

"سچ کہہ رہے ہیں ناں؟" ان کی امید بھری نگاہیں خلیل غوری کو نظریں چرانے پر مجبور کر گئیں۔

"بالکل۔"

"یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" آنکھیں بند کیے انھوں نے بے اختیار اپنے رب کا شکر ادا کیا تو خلیل صاحب خالی نظروں سے انہیں دیکھ کر رہ گئے۔ "آپ کو پتا نہیں میں کتنی پریشان تھی۔" دھیرے سے بولتی وہ ان کے سینے سے آلگیں۔ خلیل صاحب کے لیے سانس لینا مشکل ہو گیا۔

"اتنا پیار کرتی ہو مجھ سے؟" اپنی حیات کو بازو کے گھیرے میں لیے انھوں نے نم آنکھوں سے سوال کیا تو ان کے سینے میں منہ چھپائے کھڑی میمونہ نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اس سے بھی زیادہ۔"
خلیل غوری پوری جان سے لرز اٹھے۔ بے اختیار چہرہ جھکا کر انہوں نے ان کا سر چوم لیا۔
"آؤ اندر چلتے ہیں۔" انہیں ساتھ لگائے وہ بوجھل لہجے میں بولے۔ اپنے دھیان میں گم مطمئن سی میمونہ ان کا بازو تھامے ان کے ساتھ چل دیں۔

☆☆☆

"مجھے یقین نہیں آ رہا۔ نصر اتنی پستی میں اتر سکتا ہے میں نے سوچا نہیں تھا......" ڈرائیو کرتے سبحان گردیزی نے لحظہ بھر کو سڑک پر سے نگاہ ہٹاتے ہوئے برابر بیٹھے بھائی کی طرف دیکھا۔ "وہ تو باقاعدہ بلیک میلر بن چکا ہے۔"
"ایسا ویسا۔ میں نے سوچا تھا کہ مقدمے میں اپنی کمزور پوزیشن دیکھ کر ان کے کس بل نکل گئے ہوں گے۔ جبھی مفاہمت کی بات کر رہے ہیں۔ مگر یہ لوگ تو کھلی بدمعاشی پر اترے ہوئے ہیں۔"
"آپ فکر مت کریں بھائی جان۔ میں کل ہی پیرزادہ کو کال کرتا ہوں۔ ہمارا کیس اب وہ لڑے گا۔"
سبحان صاحب نے اپنے دوست اور شہر کے جانے مانے وکیل کا نام لیا۔ "اب تک تو میں عباس چچا اور چچی کے منہ کو چپ تھا مگر اب میں نے ان کمینوں کو نہیں چھوڑنا۔ میں نے پیرزادہ کو خاص تاکید کرنی ہے کہ نا صرف ان سے باغ نکلوائے بلکہ تین چار سال کی ٹھیک ٹھاک سزا بھی دلوائے۔ جب انہیں مول تول کرتے اور دادا گیری دکھاتے شرم نہیں آئی تو اب ہم بھی کسی رشتے داری کا لحاظ نہیں کریں گے۔ ایسا سبق سکھائیں گے کہ ان جیسے غاصب یاد رکھیں گے۔" انہوں نے غصے سے سر جھٹکا۔
"ہم جو بھی کریں گے لیکن تمہیں ایک بات کا خاص خیال رکھنا ہے سبحان۔"
حاتم صاحب کی بات پر سبحان گردیزی نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔
"کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے تمہیں اپنی بیوی اور ساس سسر کو اعتماد میں لینا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس گھٹیا انسان کی وجہ سے تمہاری ذاتی زندگی کسی چپقلش کی نظر ہو۔ عباس چچا کا حق بنتا ہے کہ وہ ساری صورت حال سے آگاہ ہوں تاکہ کل کو انہیں ہم سب سے اور خاص طور پر تم سے کسی قسم کا کوئی گلہ نہ ہو۔"
"آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ ویسے بھی انہوں نے جب سے مقدمے کا سنا ہے ان کی پریشانی مزید بڑھ گئی ہے۔ ان کی تسلی کروانا اب ضروری ہو گیا ہے۔ منیرہ خود بھی اس معاملے کو لے کر دن رات پریشان ہے۔"
"کتنا بدنصیب ہے نصر۔" حاتم گردیزی نے تاسف سے سر ہلایا۔ "کس طرح اپنے پیاروں کو تکلیف دے رہا ہے۔ پتا نہیں اس بدبخت کا کیا انجام ہوگا۔"
"اس کا تو جو انجام ہوگا سو گا بھائی جان۔ لیکن اب کم از کم مجھے آقا جان کا ساتھ دیتے ہوئے کسی قسم کی کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوگی۔ وہ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کے ساتھ نرمی سے پیش آیا جائے۔"
"بالکل۔ اب تو اس معاملے میں کوئی دو رائے نہیں رہی۔" قطعی لہجے میں کہتے وہ باہر دیکھنے لگے تو سبحان صاحب نے بھی سر جھٹکتے ہوئے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔

☆☆☆

"آقا جان۔" شاہ مخدوم گردیزی عصر کی نماز ادا کر کے اپنے کمرے سے باہر آئے تو لاؤنج میں زینب کے پاس بیٹھ کر ہوم ورک کرتا جرار اپنا کام چھوڑ کر میتھس کی کاپی اٹھائے ان کی جانب بھاگا۔
"ارے، میری جان۔" انہوں نے جھک کر شفقت سے اپنے لاڈلے کا سر چوم لیا۔
"یہ دیکھیں۔ آج مجھے سرپرائز ٹیسٹ میں تین میں سے تین ملے ہیں۔" جرار نے ہاتھ میں پکڑی کاپی فخر

سے ان کے سامنے کی تو شاہ صاحب کا چہرہ کھل اٹھا۔
''شاباش میرے شیر۔'' انہوں نے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔ ''اسپورٹس کی کیا رپورٹ ہے؟'' وہ اسے خود سے لگائے باہر کی جانب بڑھے۔
زینب دادا پوتے کی اس گفتگو پر مسکرا کر سر ہلاتی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔
''منیرہ! آجاؤ۔ آقا جان نماز سے فارغ ہو گئے ہیں۔'' کچن کی طرف جاتے انہوں نے رک کر دیورانی کے کمرے میں جھانکا جہاں وہ اپنی بیٹی سلوئی کے ساتھ خولہ اور ہادی کو بھی ہوم ورک کروانے میں مصروف تھیں۔
زینب کی بات پہ جہاں بچے اپنی کتابیں چھوڑ چھاڑ باہر کو بھاگے وہیں منیرہ اک پریشان نظر گھڑی پہ ڈالتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔
''قسم سے بھابھی! میرا تو سر میرے ساتھ نہیں۔ سوچ سوچ کر ہول اٹھ رہے ہیں کہ پتا نہیں وہاں کیا ہو رہا ہوگا۔''
''میں تو خود بے حد پریشان ہوں۔ آقا جان کی طرف سے الگ دھڑکا لگا ہوا ہے۔ پتا نہیں یہ لوگ کب تک واپس آئیں گے۔'' جھنجلائی سی زینب آگے بڑھتے ہوئے بولیں تو منیرہ اک بوجھل سانس لیتی ان کے ساتھ چل دیں۔
چائے اور دیگر لوازمات تیار کر کے وہ دونوں جس وقت ملازمہ کے ہمراہ لان میں آئیں، شاہ صاحب اپنے چاروں پوتے پوتیوں کے ساتھ مگن تھے۔
''بہو! یہ لوگ رابطے کے لیے کوئی نمبر دے کر گئے تھے؟'' انہوں نے اچانک سے زینب کو مخاطب کیا تو وہ بری طرح گھبرا گئیں۔
''ن...... نہیں آقا جان۔'' لیکن اگلے ہی لمحے انھوں نے سرعت سے خود کو سنبھالا۔ ''دراصل وہ یہی کہہ رہے تھے کہ وہاں سے جلدی نکلیں گے اس لیے میرے ذہن سے بھی یہ بات نکل گئی کہ ان سے رابطے کا کوئی نمبر لے لیتی۔''
''ہوں۔'' انہوں نے پرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔
زینب کی گھبرائی ہوئی نظریں منیرہ کی پریشان نظروں سے جا ٹکرائیں جنہوں نے قصداً بچوں کو اسنیکس اور چائے کی طرف متوجہ کرتے ہوئے سب کا دھیان بٹا دیا۔
چائے اپنے اختتامی مراحل میں تھی جب ملازم ہاتھ میں کارڈلیس لیے باہر چلا آیا۔
''آقا جان آپ کا فون ہے؟'' اس نے احترام سے فون شاہ صاحب کی جانب بڑھایا جسے انہوں نے بے نیازی سے تھام کر کان سے لگا لیا۔
''وعلیکم السلام۔ کیسے ہو فضل داد؟'' اور فضل داد کا نام سن کر زینب اور منیرہ دونوں گھبرا گئیں۔ فضل داد عرف فضلو، شاہ صاحب کے منشی کا نام تھا جو گاؤں میں ان کی ساری زمینوں اور فصلوں کی دیکھ بھال اور حساب کتاب پر مامور تھا۔
''اچھا...... ہوں۔'' شاہ مخدوم پوری توجہ سے دوسری طرف کی بات سن رہے تھے۔
منیرہ نے پریشان نظروں سے زینب کو دیکھا۔
''کیا؟'' معا الجھ کر بولتے وہ تیزی سے سیدھے ہوئے تو دونوں کے دل دھک سے رہ گئے۔ ''ہماری گاڑی؟'' اور انھیں لگا جیسے کسی نے ان کی جان نکال لی ہو۔

☆☆☆

خلیل غوری اپنے کمرے کی تنہائی میں خاموشی سے سر کے نیچے بازو دیے اپنے بیڈ پر دراز تھے۔ان کی نظریں بظاہر چھت پر مرکوز تھیں مگر ذہن جیسے بہت سے خانوں میں بٹ کر بہت سی باتوں کو بیک وقت سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔یوں جیسے تھوڑے سے وقت میں ہر مسئلے کا حل ڈھونڈ لینا چاہتا ہو۔تا کہ کل کو جب وہ اس دنیا میں نہ رہیں تو ان کے اپنوں اور جگر کے ٹکڑوں کو کوئی پریشانی، کوئی تکلیف کبھی چھو کر بھی نہ گزرے۔مگر کیا کہنے ان آرزوؤں کے، ان کی کوئی حد نہیں اور انسان کی بے بسی کا کوئی عالم نہیں۔وہ بھی اس پل خود کو اتنا ہی لاچار اور بے بس محسوس کر رہے تھے۔ان کے پیاروں کو ان کے بنا جو سختیاں دیکھنی تھیں سو دیکھنی تھیں۔جو خوشیاں پانی تھیں سو پانی تھیں۔پھر چاہے وہ کتنے ہی پیش بندی انتظامات کیوں نہ کر لیتے۔انھیں بحر کیف ایک دن سب کچھ اللہ کی امان میں سونپ کر اس دنیا سے جانا ہی تھا۔کیونکہ بالآخر وہی خالق اور وہی مالک ہے۔اسی کو دوام ہے باقی تو ہر وجود، ہر سہارا فانی ہے۔

''کیا بات ہے؟ کن سوچوں میں گم ہیں آپ؟''میمونہ کی آواز ان کے قریب سے آئی تو وہ چونک کر جیسے خود میں لوٹ آئے۔بے اختیار انھوں نے اپنی دائیں طرف دیکھا جہاں میمونہ دودھ کا گلاس لیے کھڑی تھیں۔وہ اک گہری سانس لیتے اٹھ بیٹھے۔

''بچے سو گئے کیا؟''

''جی۔''میمونہ گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھتی ان کے پاس بیٹھ گئیں۔''آپ جب سے آئے ہیں چپ چپ سے ہیں۔طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی؟''متفکر نظروں سے ان کا جائزہ لیتے ہوئے وہ دھیرے سے بولیں۔

خلیل غوری خاموش ہو گئے۔ان کے دل و دماغ میں ایک عجیب سی تکرار جاری تھی۔دل فی الوقت اس راز کو راز رکھنے پر ہی مصر تھا۔جبکہ دماغ اس بات پر زور دے رہا تھا کہ سچائی کو چھپانا، اسے ٹالنا حقیقت کو مزید تلخ اور مشکل بنا دے گا۔جبکہ انھیں اس لڑائی کے لیے بہت سا حوصلہ اور ہمت درکار تھی۔جو انھیں اپنوں کے بھرپور ساتھ اور مضبوطی سے ہی ملنی تھی۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جو میں تم سے ڈسکس کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ کہیں میں سن رہی ہوں۔''میمونہ نرمی سے بولیں تو انھوں نے محبت سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

''دیکھو مونا! زندگی میں انسان جیسا سوچے، جیسا چاہے ہر بار ویسا ہی ہو، ایسا نہیں ہوتا۔کیونکہ گھوم پھر کے سچائی یہی ہے کہ قسمت انسان کے تابع نہیں بلکہ انسان قسمت کے تابع ہے۔آپ چاہیں کچھ بھی کر لیں قسمت کے پھیر سے نہیں بچ سکتے۔اب بیا کی مثال تمہارے سامنے ہے۔کتنے لاڈ اور پیار سے اسے ابا اور اماں نے پالا تھا۔کتنی خوشیوں سے اسے ہم سب نے مل کر اس آنگن سے رخصت کیا تھا۔تب بھلا ہم میں سے کس نے سوچا تھا کہ وہ فقط چند سالوں بعد ہی اپنی زندگی کا ساتھی کھو کر دوبارہ یہاں لوٹ آئے گی۔یقیناً اس نے اور سکندر نے مل کر حیا کے لیے بہت سے خواب دیکھے ہوں گے بالکل ویسے ہی جیسے ہم نے اپنے بچوں کے لیے دیکھ رکھے ہیں۔مگر کیا ہوا؟ حکم ربی جب آیا تو سکندر کو اپنے ہر خواب سے دستبردار ہونا پڑا اور ہماری بیا کو چار و ناچار اس چھوٹی سی عمر میں ہی بہت مضبوط، بہت بہادر بننا پڑا۔کیونکہ یہ وقت اور حالات کا تقاضا تھا۔اور جو لوگ وقت کے، حالات کے تقاضوں کو نہیں نبھاتے وہ اپنی تکلیفوں اور اپنی الجھنوں کو مزید بڑھا لیتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ تم ایسی کوئی غلطی کرو۔''

''آپ......آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''انہوں نے خوف زدہ نظروں سے شوہر کو دیکھا۔

''مونا۔''ان کے چہرے پر نگاہیں جمائے خلیل غوری نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔''مجھے ٹیومر ہے۔برین ٹیومر۔''اور میمونہ خلیل کو لگا جیسے کمرے کی چھت ان پر آ گری ہو۔

"نہیں! یہ...... یہ نہیں ہوسکتا۔" بے یقینی سے سر ہلاتے وہ زرد چہرہ لیے پیچھے کو ہٹیں مگر خلیل صاحب کی گرفت ان کے ہاتھ پر مزید مضبوط ہوگئی۔

"یہ سچ ہے زندگی۔" ان کی بات پہ میمونہ اپنی جگہ پر ساکت ہوگئیں۔ان کی آنسوؤں بھری نظریں خلیل غوری کے چہرے پر جمی کی جمی رہ گئیں۔یہاں تک کہ قطرہ قطرہ کرتے وہ آنسو تیزی سے ان کے چہرے پر بہنے لگے۔اگلے ہی لمحے وہ کسی ٹوٹی شاخ کی طرح ان کے سینے سے جالگیں اور اس شدت سے روئیں کہ خلیل غوری کی پوری ہستی اپنے مدار سے ہل کر رہ گئی۔

☆☆☆

"تمہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی ناں فضل داد؟" انہوں نے اپنے ازلی رعب دار انداز میں سوال کیا۔جواباً فضلو نے انہیں کیا کہا کیا نہیں، زینب اور منیرہ کچھ اندازہ نہ لگا پائیں۔ہاں لیکن وہ تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ شاہ مخدوم کا چہرہ دیکھے گئیں جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ رنگ بدل رہا تھا۔بے اختیار منیرہ نے ڈر کر زینب کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ہوں...... ٹھیک ہے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے مختصر ترین الفاظ کے ساتھ رابطہ منقطع کر دیا۔اور لب بھینچے ان دونوں کو دیکھنے لگے۔ان کی نگاہیں خود پر مرکوز پا کر منیرہ اور زینب کی ہتھیلیاں پسیج گئیں۔

"اپنے بھائی کے گھر کا نمبر ملاؤ بہو۔" کارڈلیس درمیان میں رکھی میز پر رکھتے ہوئے انھوں نے سرد لہجے میں حکم دیا تو منیرہ سرتاپا لرز اٹھیں۔

"آ...... آقا جان......"

"نمبر ملاؤ۔" ان کی بات کاٹتے ہوئے انہوں نے قطعیت سے اپنی بات دہرائی۔

منیرہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے فون اٹھایا اور نصر عباس گردیزی کا نمبر ملانے لگیں۔زینب دم سادھے ساری کارروائی دیکھتی رہیں۔منیرہ نے نمبر ملا کر فون سسر کی جانب بڑھایا۔شاہ مخدوم گردیزی نے فون لے کر کان سے لگالیا اور ٹانگ پر ٹانگ جما کر بیٹھ گئے۔

"ہیلو۔" دوسری طرف سے نصر عباس کی آواز آئی تو شاہ صاحب کے لب نفرت سے سکڑ گئے۔

"میں نے بڑے بڑے بے غیرت دیکھے ہیں نصر...... مگر تجھ سا بے حمیت انسان نہیں دیکھا۔تو نے مجھے، شاہ مخدوم گردیزی کو، قانونی کارروائی کی دھمکی دی تھی۔سو اب مرد بن اور اپنے الفاظ پر قائم رہ۔یہ چوہوں کی طرح چھپنے کے لیے کیوں نئے بل ڈھونڈ رہا ہے؟" وہ کاٹ دار انداز میں بولے تو نصر، شاہ صاحب کی آواز سن کر بری طرح چونک گیا۔

"تایا جی! آپ......"

"خبردار! جو مجھے تایا کہا۔" وہ اتنی زور سے گرجے کہ منیرہ اور زینب کی رنگت فق ہوگئی۔"میرا تجھ جیسے گھٹیا اور ذلیل انسان کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں۔تجھ سے کلام کرنا بھی میں اپنی توہین سمجھتا ہوں کجا کہ تصفیہ؟ تو نے میرا خون ہو کر میری پیٹھ میں خنجر گھونپا ہے نصر! اور میں یہ دھوکا، یہ غداری کبھی معاف نہیں کرنے والا۔سمجھے!۔" تنفر سے اپنی بات مکمل کرتے انہوں نے ہاتھ میں پکڑا فون دور پھینک دیا تو وہ دونوں بری طرح سہم گئیں۔اگلے ہی پل شاہ صاحب ایک جھٹکے سے اٹھے اور تیز قدموں سے اندر کی جانب بڑھ گئے۔

ان کے منظر سے غائب ہوتے ہی منیرہ کا حوصلہ جیسے جواب دے گیا۔وہ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔جبکہ زینب نچلا لب دانتوں تلے دبائے اپنا چکراتا سر تھام گئیں۔جو کچھ بھی ہوا تھا بہت برا ہوا تھا۔آقا جان کو اتنے شدید غصے میں انہوں نے بہت کم دیکھا تھا۔ان پر نہ صرف بیٹوں کا جھوٹ کھل گیا تھا

بلکہ انہوں نے نصر عباس گردیزی کو فون کر کے یہ حقیقت بھی اچھی طرح باور کروادی تھی کہ وہ اس سے کسی قسم کی بات چیت کے لیے تیار نہیں۔ پھر چاہے ان کی اپنی اولاد ہی کیوں نا مصالحت پر اتر طرح آتی۔ وہ نصر کو بخشنے والے نہ تھے۔ اور یہ ان کا آخری فیصلہ تھا۔

☆☆☆

رات دھیرے دھیرے اپنے سفر پر گامزن تھی۔ مگر نیند، آنسو بہاتی طیبہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ زندگی یوں اچانک اتنا بھیانک موڑ لے گی انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ خلیل غوری ان کے صرف بھائی ہی نہیں بلکہ ان کے باپ، ماں اور دوست بھی تھے۔ وہ ان کی پناہ گاہ تھے۔ اور آج سے نہیں بلکہ ہمیشہ سے تھے۔ زندگی کا کوئی بھی دور رہا ہو طیبہ ہر موقعے اور ہر لمحے پر اپنے بھائی کی طرف ہی پلٹی تھیں۔ حتیٰ کہ جب انہوں نے اپنی کل کائنات، اپنے شوہر، کو کھودیا تھا تب بھی ان کی بکھرتی زندگی کو سنبھالا دینے والا، ان کے اور ان کی بچی کے سر پر سائبان بننے والا ان کا یہی پیارا بھائی تھا۔ اور آج جب ان کے اسی بھائی کی ذات پر موت کے سائے منڈلانے لگے تھے تو طیبہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے انہیں موت کی سزا سنادی ہو۔

وہ اوپر والے سے بے حد نالاں اور شکوہ کناں تھیں جس نے ان سے ایک ایک کر کے ان کے سبھی پیارے چھین لیے تھے۔ مگر اب کی بار وہ اپنا بھائی اسے لوٹانے کو تیار نہ تھیں۔ پھر چاہے وہ ان سے کتنا ہی ناراض کیوں نہ ہو جاتا وہ اپنے بھائی سے دست بردار ہونے کے لیے کسی طور راضی نہ تھیں۔ وہ اپنے رب سے رو کر، لڑ کر، ضد کر کے ساری رات اپنے بھائی کی زندگی مانگتی رہی تھیں یہاں تک کہ صبح کی سفیدی چاروں اور نمودار ہو گئی تھی۔

''بیا۔'' وہ چپ چاپ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھیں جب ان کے دروازے پر دستک کے ساتھ ہی خلیل غوری کی نرم آواز آئی تھی۔

آج زندگی میں پہلی بار انہوں نے فجر کی نماز جان بوجھ کر قضا کی تھی۔ مؤذن کی پکار پہ وہ ڈھیٹ بنی اپنی جگہ پر پڑی رہی تھیں یہاں تک کہ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے نماز کا وقت نکل گیا تھا۔ اب بھی ان کا دروازہ کھولنے کا کوئی ارادہ نہ تھا مگر جب دوبارہ دستک کے ساتھ ایک بار پھر خلیل صاحب کی آواز سنائی دی تو ناچار طیبہ کو اٹھ کر دروازہ کھولنا پڑا۔

''کیا بات ہے، کیوں تنگ کر رہے ہیں آپ؟'' وہ نروٹھے سے لہجے میں بولیں۔

خلیل صاحب بے اختیار مسکرا دیے۔ وہ انہیں اس پل بالکل وہ چھوٹی سی طیبہ لگی تھیں جو اکثر روٹھ کر خود سے بھی ناراض ہو جاتی تھیں۔

''میں تنگ کر رہا ہوں یا تم؟ کہاں ہے میری چائے؟''

''میں نے نہیں بنائی۔'' خفگی سے جواب دیتے ہوئے وہ پلٹنے کو تھیں جب خلیل صاحب نے تیزی سے ان کی کلائی پکڑ لی۔

''مگر میں نے بنائی ہے۔ اس لیے فوراً کچن میں آؤ اور آ کر میرے ساتھ چائے پیو۔''

''بھائی میرا دل نہیں......''

''بیا۔'' ان کی بات کاٹتے ہوئے اب کے انہوں نے سنجیدگی سے ٹوکا تو وہ جیسے ہار سی گئیں۔

''اچھا آپ چلیں میں آتی ہوں۔''

ان کی بات پر خلیل صاحب مسکراتے ہوئے واپس پلٹ گئے۔ وہ اک گہری سانس لیتی باتھ روم کی طرف بڑھ گئیں۔

منہ ہاتھ دھو کر وہ کچھ دیر بعد کچن میں آئیں تو ان کے قدم بے اختیار ہی دہلیز پر رک گئے۔ میمونہ بھابھی تنہا

کرسی پر بیٹھی تھیں۔ ان کی نگاہیں اپنے سامنے رکھے بھاپ اڑاتے چائے کے مگ پر جمی تھیں۔ انہیں دیکھ کر طیبہ کو ایک لمحے کے لیے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیسے ان کے سامنے خود کو کمپوز اور نارمل رکھ پائیں گی۔ لیکن تبھی میمونہ بھابھی نے نظریں اٹھاتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تھا۔ دونوں کی نگاہیں ٹکرائی تھیں اور طیبہ ان کی سرخ متورم آنکھیں دیکھ کر سارا بھید پا گئی تھیں۔ وہ جیسے اڑ کر ان تک آئی تھیں اور اگلے ہی لمحے دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے اپنے مشترکہ غم پر آنسو بہا رہی تھیں۔

☆☆☆

دن بھر کا تھکا ہارا سورج اپنے سفر کے اختتامی مراحل میں تھا جب لمبی مسافت کی گرد سے اٹی لینڈ کروزر ''گردیزی ہاؤس'' کے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی اور ماربل کی روش پر دوڑتی بالآخر باقی گاڑیوں کے ساتھ جا کر پورچ میں رک گئی تھی۔ سبحان صاحب نے گاڑی بند کرتے ہوئے بے اختیار اک گہری سانس لی تھی۔

''اچھا ہوا جو آقا جان اس ملاقات کے لیے راضی نہیں ہوئے ورنہ سوائے ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔''

''صحیح کہہ رہے ہو۔ طبیعت عجیب بوجھل سی ہو گئی ہے۔'' اپنی طرف کا دروازہ کھولتے حاتم گردیزی نیچے اترے۔ سبحان صاحب بھی گاڑی لاک کر کے اندر کی جانب بڑھ گئے۔ آگے پیچھے چلتے وہ دونوں اپنے دھیان میں داخلی دروازہ کھول کر لاؤنج میں داخل ہوئے تھے جب شاہ مخدوم گردیزی کی سرد آواز نے ان کے بڑھتے قدم اپنی جگہ پر ساکت کر دیے تھے۔

''وہیں رک جاؤ۔''

دونوں بھائیوں نے چونک کر نگاہیں اٹھائی تھیں اور لاؤنج کے وسط میں کھڑے شاہ صاحب کا چہرہ دیکھتے ہی کچھ غلط ہو جانے کا احساس بہت شدت سے ان کے اندر جاگا تھا۔

''آقا جان۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' پریشان سے حاتم گردیزی تیزی سے آگے بڑھے تھے لیکن باپ کے اشارے پہ انہیں ایک بار پھر اپنی جگہ پر رکنا پڑا تھا۔

''تم نے سنا نہیں میں نے کیا کہا؟'' پیشانی پر بل ڈالے وہ سخت لہجے میں بولے۔

حاتم صاحب نے الجھ کر پہلے انہیں اور پھر لاؤنج میں داخل ہوتی زینب اور منیرہ کو دیکھا جن کے چہروں پر پھیلی پریشانی اور سراسیمگی دیکھ کر ان کی الجھن اور فکر میں مزید اضافہ ہو گیا۔

''کوئی مجھے بتائے گا کہ کیا ہوا ہے اس گھر میں؟'' اگلے ہی لمحے وہ جھنجلا کر غصے سے بولے تو شاہ مخدوم کے لبوں پر اک استہزائیہ مسکراہٹ آ کر غائب ہو گئی۔

''اس گھر میں بغاوت ہوئی ہے برخوردار۔ وہ بھی میرے خلاف۔ شاہ مخدوم گردیزی کے حکم کے خلاف۔'' کاٹ دار لہجے میں کہتے وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ان کے مقابل آ کھڑے ہوئے۔

حاتم صاحب کے ساتھ ساتھ سبحان گردیزی نے بھی چونک کر باپ کی طرف دیکھا۔

''کیا سمجھا تھا تم دونوں نے۔ میرے علاقے میں جاؤ گے اور مجھے خبر نہیں ہو گی؟'' ان کے چہروں پر نگاہیں جمائے انہوں نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا تو دونوں نظریں چرا گئے۔ ''ابھی شاہ مخدوم گردیزی کے اتنے برے دن نہیں آئے کہ وہ اپنی ہی پیدا کردہ اولاد کے ہاتھوں مات کھا جائے۔ بتاؤ! کیوں تم دونوں نے میری حکم عدولی کی...... کیوں؟'' وہ اس زور سے گرجے کہ گھر کے در و دیوار لرز اٹھے۔ منیرہ نے دہل کر اپنا دل تھام لیا جبکہ زینب کا ہاتھ بے ساختہ ان کے نیم والبوں پر آ ٹھہرا۔

''ہمارا مقصد قطعاً آپ کی حکم عدولی نہیں تھا آقا جان۔'' پشیمان کھڑے حاتم گردیزی نے دھیرے سے

لب کشائی کی۔

شاہ صاحب نے استہزائیہ انداز میں ہنکارا بھرا۔

"بہت خوب! میری بات کو رد کر کے اپنی مرضی چلانا، میری حکم عدولی نہیں بلکہ میری عزت و توقیر میں اضافہ ہے۔ واہ! کیا کہنے ہیں تمہارے۔ بہت بلند اور نیا معیار طے کیا ہے تم دونوں نے تابعداری کا۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولے تو سبحان صاحب انہیں بے بسی سے دیکھتے ایک قدم آگے آئے۔

"بھائی جان ٹھیک کہہ رہے ہیں آقا جان۔ ہم آپ کے خلاف جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنے دشمن کے خلاف محاذ آرائی سے پہلے صلح صفائی کے ہر ممکنہ راستے کو ٹٹول کر دیکھ لینے میں کوئی ہرج، کوئی برائی نہیں۔ الٹا یہ قدم آپ کو مستقبل میں نہ صرف بے جا پریشانیوں بلکہ پچھتاوؤں سے بھی بچاتا ہے۔ نصر نے جب عدالت سے باہر تصفیے کی پیشکش کی تو ہمیں لگا کہ اس موقعے کو آزما کر دیکھ لینے میں کوئی قباحت نہیں، کیونکہ ہمارا مقصد ہماری زمینوں کا حصول ہے جو کہ اگر عدالتوں کے چکر لگائے بنا پورا ہو جاتا ہے تو ہمیں اور کیا چاہیے۔"

"یہی تو فرق ہے، تمہاری اور میری سوچ میں......" بیٹے کی بات سن کر شاہ مخدوم تلخی سے مسکرائے۔ "تمہارا مقصد زمین کی واپسی ہے۔ جبکہ میرا مقصد اپنے دشمنوں کو دھول چٹانا ہے۔ میں تم لوگوں کو بتا چکا ہوں کہ زمین، جائیداد میرے لیے اہمیت نہیں رکھتی۔ میرے لیے اگر کوئی چیز اہم ہے تو وہ ہے میرا وقار، میرا پندار۔ اور جو کوئی انہیں ٹھیس پہنچائے گا اسے میں سزا دیے بنا کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ اور تم لوگوں نے وہاں جا کر میرے اسی مقصد کو چوٹ پہنچائی ہے۔ جس پر میں تم دونوں کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔" انہوں نے شعلے برساتی نظروں سے انہیں گھورا۔

"ہم نے آپ کے کسی مقصد کو چوٹ نہیں پہنچائی آقا جان۔" حاتم صاحب تڑپ کر بولے۔ "آپ کا وقار ہمارا وقار ہے۔ آپ کی اولاد اتنی گری پڑی نہیں کہ غاصبوں اور لٹیروں کے آگے اپنے اور اپنے باپ کے پندار کو نیچا کر آئے۔ ہم وہاں ان کی درخواست پر گئے ضرور تھے مگر دبے اور ان کی ماننے کے لیے نہیں۔ بلکہ ان کو ان کی اوقات یاد دلانے کے لیے۔ لیکن وہ کہتے ہیں ناں کہ رسی جل گئی مگر بل نہیں گیا۔ لالچ اور طاقت کے نشے نے ان کا دماغ اتنا خراب کر رکھا ہے کہ انھیں اپنا سر پہ کھڑا انجام نظر نہیں آ رہا۔ مگر میں بھی آج انہیں یہ باور کروا آیا ہوں کہ اگر ان کو ان کی اس اکڑ سمیت منہ کے بل نہ گرایا تو حاتم گردیزی نام نہیں۔ آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں یہ لوگ واقعی کسی نرمی کے مستحق نہیں۔ اب ہمیں نہ صرف انہیں کورٹ میں گھسیٹنا ہے بلکہ انہیں قرار واقعی سزا بھی دلوانی ہے۔" انہوں نے بنا کسی پس و پیش کے اپنی غلطی اور ان کے فیصلے کی درستگی کا اعتراف کیا تو شاہ صاحب لب بھینچے رخ موڑ گئے۔

"ہم جانتے ہیں آقا جان کہ ہم نے آپ سے غلط بیانی کر کے آپ کے اعتبار کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ مگر یقین جانیں کہ ہم نے یہ قدم صرف اس لیے اٹھایا کہ کل کو جب ہم آگے بڑھیں تو نہ ہمارے ضمیر پر کوئی بوجھ ہو اور نہ ہی ہمارا کوئی اپنا ہمیں زیادتی کا مرتکب ٹھہرا سکے......" رسان سے کہتے ہوئے سبحان صاحب نے آگے بڑھ کر ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تو زندگی میں پہلی بار شاہ مخدوم گردیزی لاجواب سے ہو گئے۔ "مگر ہم پھر بھی اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں اور آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں معاف کر دیں۔"

"سبحان ٹھیک کہہ رہا ہے آقا جان۔ ہم واقعی شرمندہ ہیں۔" حاتم صاحب بھی باپ کے قریب چلے آئے تو شاہ مخدوم کی ناراضی اور غصہ دونوں دم توڑنے لگے۔

"ٹھیک ہے، آج تو تم دونوں مجھے اپنی اس حرکت کی وضاحت دینے میں کامیاب ہو گئے ہو۔ لیکن یاد

رکھنا، اعتبار کا بحال ہونا ہر بار آسان نہیں ہوتا۔ دوبارہ اگر کبھی میرے بھروسے کو توڑا تو میں تمہیں کسی صورت معاف نہیں کروں گا۔" شاہ صاحب قطعی لہجے میں بولے۔ وہ دونوں تابعداری سے اثبات میں سر ہلا گئے۔
یہ رنگ بدلتا منظر زینب اور منیرہ کو اپنی جگہ پر حیران کر گیا۔ وہ منہ کھولے ایک ساتھ کھڑے ان باپ بیٹوں کو دیکھے چلی گئیں۔ یہ طوفان بنا کسی نقصان کے ٹل گیا تھا انھیں یقین نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

کسی نے سچ کہا ہے لاعلمی بھی کبھی کبھی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ آپ کو پتا بھی نہیں ہوتا اور آپ اپنے اردگرد موجود کتنی ہی قیامت خیز حقیقتوں سے بے خبر، بڑی ہی پرسکون اور مطمئن زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ یوں جیسے آپ سے بڑا خوش نصیب اس دنیا میں اور کوئی نہ ہو۔ لیکن پھر ان حقیقتوں کو بے نقاب کرتا اوراک کا ایک ظالم لمحہ آتا ہے اور آپ کا سکون اور چین آن کی آن میں جیسے شعلوں کی نظر ہو جاتا ہے۔ آپ کے علم میں یہ تلخ حقیقتیں کیا آتی ہیں زندگی کے معمولات، ترجیحات، ضروریات سب ایک ہی جھٹکے میں بدل کر رہ جاتے ہیں اور آپ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر پاتے۔ بے بسی کی یہ کیفیت سچ میں بڑی اذیت ناک ہوتی ہے اور بدقسمتی سے یہ اذیت میمونہ اور طیبہ کے دامن سے آلپٹی تھی۔ جن کی آنکھیں ایک دوسرے کے ساتھ ڈھیروں آنسو بہا لینے کے باوجود تھوڑی تھوڑی دیر بعد بھر آرہی تھیں مگر وہ خود کو سنبھالے بچوں کا ناشتا اور لنچ بنانے میں مصروف تھیں جو اپنی زندگیوں میں در آنے والی اس بھیانک آزمائش سے بے خبر سکول کے لیے تیار اپنی معمول کی فرمائشوں میں مگن تھے۔
"مما! میں نے پراٹھا مانگا تھا۔" حیا نے جونہی اپنی پلیٹ کی طرف دیکھا اس کا منہ بن گیا۔ طیبہ نے چونک کر میز پر رکھی پلیٹ کو دیکھا اور اس میں پڑے سلائس دیکھ کر وہ بے اختیار اک گہری سانس لے کر رہ گئیں۔
"حیا ابھی یہ کھالو بیٹا ورنہ اسکول سے دیر ہو جائے گی۔"
"نہیں۔ مجھے پراٹھا چاہیے۔" اس نے ضد سے نفی میں گردن ہلائی۔
"حیا! مجھے تنگ مت کرو۔" انہوں نے غصے سے بیٹی کو گھورا تو کچن میں داخل ہوتے خلیل صاحب اپنے دھیان میں بولے۔
"کیا ہوا؟ کیوں ڈانٹ رہی ہو میری بیٹی کو بھئی؟"
"ماموں! مما مجھے پراٹھا نہیں دے رہیں۔" حیا نے انہیں دیکھتے ہوئے جھٹ سے ماں کی شکایت لگائی۔ خلیل صاحب مسکرا دیے۔
"کیوں بیا...... ! میری بیٹی کو پراٹھا کیوں نہیں دے رہیں تم؟" اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے انہوں نے بہن کو دیکھا۔
"میں بھول گئی تھی کہ اس نے پراٹھا کھانا ہے۔ مگر اب سکول سے دیر ہو رہی ہے اس لیے کہہ رہی ہوں کہ ابھی سلائس کھالے۔" وہ چڑ کر بولیں تو خلیل صاحب نے گھڑی کی طرف دیکھا۔
"دیر تو واقعی ہو رہی ہے پارٹنر......" وہ حیا کی جانب پلٹے۔ "پھر آپ نے ابھی تیار بھی ہونا ہے۔ اس لیے بریڈ کھالو، مما دوپہر میں پراٹھا بنا دیں گی۔"
"بس میں کچھ نہیں کھا رہی۔" حیا روٹھ کر کرسی سے نیچے اترنے لگی تو طیبہ کا حوصلہ جواب دے گیا۔
"ادھر بیٹھو سیدھی طرح۔" انھوں نے بازو سے کھینچ کر اسے واپس بٹھایا تو اس کی چیخ نکل گئی۔
"مما!"

"بیا! کیا کر رہی ہو؟" خلیل صاحب نے فہمائشی نظروں سے انہیں دیکھا۔ بسیط اور ایلیا بھی ناشتا چھوڑ کر اپنی نرم خو پھپھو کو دیکھنے لگے جو بہت کم اس طرح غصے میں آتی تھیں۔

"آپ چھوڑ دیں بھائی۔ دن بہ دن بدتمیز ہوتی جا رہی ہے۔" سختی سے کہتے ہوئے انہوں نے جیم اٹھا کر سلائس پر لگایا اور آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو لیے بیٹھی حیا کی طرف بڑھایا۔ "کھاؤ اسے۔"

اس کے نفی میں سر ہلاتے ہی ان کا پارہ مزید چڑھ گیا۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور ایک تھپڑ رکھ کر اس کے سر پر لگا دیا۔

"بیا!" حیا کو روتا دیکھ کر خلیل غوری ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھے اور بلکتی ہوئی بچی کو خود سے لگا لیا۔ "کیا کر رہی ہو؟ پاگل تو نہیں ہو گئی؟"

"ہاں ہو گئی ہوں میں پاگل۔ دماغ خراب ہو گیا ہے میرا۔" ہاتھ میں پکڑا سلائس پلیٹ میں پٹختے ہوئے وہ اگلے ہی لمحے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے خود بھی رو پڑیں تو ماحول پہ جیسے سناٹا چھا گیا۔ میمونہ نے تاسف سے اپنی سسکتی ہوئی نند کو دیکھا۔ جبکہ بسیط اور ایلیا سہمی ہوئی نظروں سے اس سارے منظر کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے گھر میں ایسا بھلا پہلے کب ہوا تھا؟

بہن کو روتا دیکھ کر خلیل غوری کی آنکھوں میں بے چارگی اتر آئی۔ وہ لب بھینچے آگے بڑھے اور انہیں خود سے لگا لیا۔ بھائی کے سینے سے لگتے ہی طیبہ ایسے ٹوٹ کر روئیں کہ میمونہ کی بھی ہچکی بندھ گئی۔ جبکہ خلیل صاحب سرخ آنکھیں لیے اپنے ضبط کی انتہا پر کھڑے فقط ایک بات سوچ رہے تھے۔'

"وہ ان سب کو کیسے مضبوط بنائیں گے؟"

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

کردار

ارم اقصیٰ

عاشر وسیم سے شادی کا فیصلہ اس نے صرف سطوت آنٹی کو دیکھ کر کیا تھا یہ پانچواں پرپوزل تھا جو اس کے لیے آیا تھا اور صحیفہ کے من کو بھی بھایا تھا۔

سطوت آنٹی انتہائی باوقار خاتون دکھائی پڑتی تھیں سادہ و بے ریا چہرہ حجاب کے ہالے میں مقید...... اپنی فیملی کے برعکس صحیفہ شروع سے مذہبی رجحانات رکھتی آئی تھی۔ کالج میں اسپورٹس ڈے کے علاوہ وہ ہر فنکشن سے خار کھاتی تھی۔ اپنے ماسٹرز کے لیے بھی اس نے ایل سی کا انتخاب کیا تھا۔ مہندی، بارات کے فنکشنز اسے بے حد بورنگ لگتے صرف ولیمہ اٹینڈ کرتی تھی۔ کلین شیو کے بجائے کالی گھنی داڑھی اسے مردوں کے چہرے پر بھلی لگتی۔

دوسری ملاقات میں وسیم انکل کو دیکھ کر تو وہ اور اس فیملی کی معترف ہوگئی تھی۔ سرخ وسفید رنگت پر پڑی سفید داڑھی۔

شادی سے پہلے اماں اور بہنوں نے کوشش کی کہ ایک بار وہ عاشر سے مل لے۔ لانگ ڈرائیو...... آؤٹنگ یا چلو ڈنر ہی اس کے ساتھ کہیں باہر کرلے مگر اس نے ہاں کر کے نہ دی...... یہ سب کچھ اس کے لیے کم از کم دل پسند نہیں تھا۔

شادی کی رات پہلا جھٹکا اسے عاشر کے حلیے کو دیکھ کر لگا تھا۔ کلین شیو انتہائی کھلنڈرا اور باتونی تو بے حد...... فیمیل کزنز سے چھیڑ چھاڑ، مذاق اور قہقہے...... صحیفہ ضبط کے کناروں تک ڈولتی آئی۔

لیٹ سونے کے باوجود صبح عادت کے مطابق اس کی جلدی آنکھ کھل گئی نماز اور قرآن کی ادائی کے دوران صحیفہ بار بار بیڈ کی جانب دیکھتی عاشر بے سدھ سویا ہوا تھا۔ ایک دو بار جی میں آئی اور ایک بار تو قدم بھی بیڈ تک اٹھے عاشر کو اٹھانے کو مگر پھر کچھ جھجک کر رہ گئی اور باہر لان میں نکل آئی۔ مدھم اندھیرے کی چادر ہولے ہولے سرک رہی تھی۔ جوتے ایک طرف اتار کر وہ نم گھاس پر چلتی تسبیح پڑھتی رہی۔

کچھ ہی دیر بعد وسیم انکل گیٹ سے آئے اسے دیکھ کر حیران ہوئے اس کے سلام کے جواب میں دعا دی اور اندر بڑھ گئے۔ صحیفہ بے اختیار انہیں دیکھے گئی۔

"کتنے نیک ہیں اور ایک ان کے صاحبزادے ہیں۔" کھڑکی کی جانب دیکھتی وہ بھی اندر چلی آئی۔ عاشر ابھی تک سو رہے تھے۔ نماز کا وقت تو گزر گیا اب اٹھانے کا فائدہ وہ یونہی بے مقصد ٹہلتی رہی۔

نیچے لاؤنج سے آوازیں آنا شروع ہوگئی تھیں۔ وہ بھی نیچے چلی آئی۔ وسیم انکل اور سطوت آنٹی کے سب رشتہ دار اسی شہر میں مقیم تھے سو بارات سے واپسی پر سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ آج رات ولیمہ تھا گھر میں اکا دکا ہی مہمان تھے سطوت آنٹی نے

خوش دلی سے ماتھا چوم کے صبح بخیر کہا۔
"انکل کہاں ہیں۔" چائے کا کپ پکڑتے اس نے یونہی برائے بات پوچھا۔
"چاشت کے نوافل ادا کرنے گئے ہیں۔"
صحیفہ کے منہ سے بے اختیار "ماشاءاللہ" نکلا۔
عاطفہ اس کی اکلوتی نند سوئی ہوئی تھی۔ کافی دیر وہیں بیٹھی وہ سطوت آنٹی سے باتیں کرتی رہی جب ایک نوعمر سی لڑکی پراندہ جھلاتی ہوئی آئی۔
"یہ مہکی ہے۔" ان کی نظروں کے مفہوم سے وہ سمجھ گئی کہ کام والی ہے۔
"سلام بھابھی......" وہ دیکھنے میں جتنی بھلی محسوس ہو رہی تھی آواز اتنی ہی پاٹ دار تھی۔
"مہکی مہکی ہے فضا......" بلند آواز میں گنگناتا ہوا عاشر نیچے آیا۔ سطوت آنٹی نے اسی طرح کھڑے ہو کے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔
"مہکی۔ ایک کپ چائے تو پلاؤ۔" لاؤنج میں پھیلاوا سمیٹتی مہکی سے عاشر نے کہا۔
"آپ کی بیگم آگئی ہیں انہی سے کہو۔" پاٹ دار آواز لاؤنج میں گونجی۔
"ارے ہاں۔ وقت پر یاد دلایا میری ایک عدد بیگم آگئی ہیں۔ سو بیگم......" شرارتی نظروں سے صحیفہ کو تکتے ہوئے وہ بولا۔
وہ اٹھنے ہی والی تھی جب سطوت آنٹی نے ہاتھ پکڑ کے روکا اور عاشر کو بھی تنبیہہ نگاہوں سے گھورا۔
"کیا ماما......! شروعات تو اچھی ہونے دیں۔ ورنہ یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہا کریں گی اور آپ آٹھ آٹھ آنسو رویا کریں گی کہ کیسی نکھٹو بہو ملی۔"
اس کی شریر نگاہوں کے جواب میں سطوت بیگم مسکرائیں۔
"ایسی نوبت کبھی نہیں آئے گی ان شاءاللہ۔" سطوت بیگم یقین سے بولیں۔
"یا الٰہی ......" مسکراتے لبوں پر دونوں ہاتھ عاشر نے شرارتاً رکھے۔

☆☆☆

برتن سمیٹ کر کچن کی جانب جاتی صحیفہ پل کی پل رکی۔
"چائے بناؤں ماما......" کل سے اس نے باقاعدہ کچن میں قدم رکھا تھا۔
"تمہارے پاپا عشاء پڑھ آئیں پھر بنانا۔" سطوت بیگم خود بھی نماز کے لیے اٹھیں۔
"عاشر آپ بھی نماز پڑھ آئیں......ٹی وی آن کرتے عاشر سے صحیفہ نے کہا۔
"کل سے پڑھوں گا پکا......آج تو بہت تھکا ہوا ہوں۔" صوفے پر نیم دراز ہوتے وہ لاپروائی سے بولا۔
صحیفہ بجھے دل سے اوپر چلی آئی۔ اسے اکثر سطوت آنٹی کی قسمت پر رشک آتا کس قدر نیک شوہر ان کے نصیب میں لکھا تھا......نمازی پرہیز گار...... بیٹا بالکل ہی الٹ تھا۔
یہ اگلی دوپہر کی بات ہے۔ صحیفہ کی ایک دم سے آنکھ کھلی۔ چائے کی طلب محسوس ہونے پر وہ نیچے چلی آئی۔ لاؤنج سے گزرتے اسے جھٹکا لگا تھا لاؤنج کے جالی دار دروازے کے باہر اسے عاشر کی جھلک نظر آئی تھی۔ کچن کی طرف جاتے وہ رکی اور دروازے کے قریب آئی وہاں سیڑھیوں پر عاشر بیٹھا تھا نیچے فرش پر مہکی بیٹھی رو رہی تھی۔ عاشر کا ہاتھ اس کے سر پر تھا۔
"میں نے کہا ناں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اس معاملے کو خود دیکھوں گا۔ پریشان نہ ہو۔" صحیفہ ناسمجھی سے دونوں کو دیکھے گئی۔ مہکی نے روتے روتے سر اوپر اٹھایا صحیفہ پر نظر پڑتے ہی گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ عاشر نے پیچھے مڑ کر کے دیکھا۔
"آپ اس ٹائم ......"
"ہاں ایک فائل رہ گئی تھی گھر پر، وہ لینے آیا ہوں اور پلیز ایک کپ چائے بھی پلوا دو۔" مہکی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔
"چلو مہکی۔ تم بھی پانی پیو اور فریش ہو جاؤ۔"
صحیفہ ساری صورت حال پر غور کرتی کچن کی جانب آئی۔ وہ ابھی چائے بنا رہی تھی کہ مہکی بھی آگئی

اور سبزی وغیرہ کاٹنے لگی۔
"کوئی مسئلہ وغیرہ ہے تمہارے ساتھ۔" صحیفہ کا لہجہ نا چاہتے سخت تھا۔
"نا...... نہیں تو......" وہ ایک گھبرا کے بولی۔
اگلی بہت سے دونوں تک یہ بات صحیفہ کے ذہن میں اٹکی رہی۔

☆☆☆

وسیم انکل نے ناسازی طبع کے باعث آفس سے چھٹی کی تھی۔ قریب نو بجے صحیفہ نے اپنا، سطوت آنٹی اور انکل کا ناشتا بنایا۔
"انکل نہیں آئے۔" میز پر سطوت آنٹی اکیلے کو آتے دیکھ کر صحیفہ نے پوچھا۔
"وہ نوافل ادا کر رہے ہیں۔ ہم کرتے ہیں ناشتا، وہ لیٹ کریں گے۔"
"ماما...... آپ بہت لکی ہیں۔"
"وہ کیسے بھئی۔" سطوت آنٹی بے ساختہ مسکرائیں۔
"آپ کو اتنے اچھے اتنے نیک میاں ملے ہیں۔"
"انسانوں کو ان کی عبادات سے نہیں معاملات سے پہچانتے ہیں۔" کوئی اداسی سطوت آنٹی کی آنکھوں میں پل کی پل ابھری تھی۔
"عبادات سے خالص بھلا کیا ہوتا ہے ماما......"
"بعض لوگوں کی عبادت درحقیقت ان کی عادات ہوتی ہیں صحیفہ بیٹے۔ خیر چھوڑو میں تو یونہی ایک بات کر رہی تھی۔
"ناشتا کر لیں پھر ذرا بازار تک چلتے ہیں...... چلوگی ساتھ؟"
"خیریت ہے بازار سے کیا لینا......"
"مہکی کے لیے کچھ چیزیں لینا ہیں۔ اگلے مہینے نکاح ہے اس کا۔"
"اچھا...... واؤ......"
"اس کے ماں باپ کے درمیان بچپن میں ہی علیحدگی ہوگئی تھی۔ مہکی اپنی ماں کے پاس ہی رہتی تھی اس کی ماں پہلے ہمارے یہاں آئی تھی۔ اس کا باپ اس کی شادی نہیں کرنا چاہتا بلکہ اپنے پاس لے جانا چاہتا ہے۔ اس لیے اس کی ماں اسے یہیں چھوڑ گئی ہے دو تین ماہ سے۔ یہیں سے نکاح کر کے رخصتی کر دیں گے۔
عاطفہ عاشر کے ساتھ بچپن میں کھیلی ہے سو ان کے ساتھ بہت بے تکلفی ہے۔" سطوط آنٹی نے تفصیل سے بتاتے ہوئے پوچھا چلوگی ساتھ۔"
"ابھی تو بہت تھکن سی ہو رہی ہے ماما۔ شام میں نہ چلیں؟" وہ جانا نہیں چاہ رہی تھی مگر انکار کرنا بھی عجیب سا لگ رہا تھا۔
"اوکے۔ آپ ریسٹ کرو۔ عاطفہ کو لے جاؤں گی۔ شام اصل میں فاروقی صاحب کے ہاں جانا ہے پوتے کی مبارک باد دینے۔"
سطوت آنٹی کے جانے کے بعد نجانے کتنی ہی دیر وہ کسل مندی سے لیٹی رہی تھی۔ پھر اس خیال سے کہ دوپہر کے کھانے میں مہکی کی کچھ مدد ہی کروا دے وہ اٹھ کے نیچے چلی آئی۔ سیڑھیاں اترتے ہی اسے چکر سا آیا وہ وہیں درمیانی سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ ایک ہاتھ سے سر کو تھامے وہ بے بسی سے بیٹھی تھی جھکی نظریں رینگتی ہوئیں سیڑھیوں سے اتریں اور صوفوں پر سے ہوتی ہوئیں کچن میں کھلتی ونڈو پر جا کے بجھ گئیں۔ حیرت سے خوف سے۔
وسیم انکل مہکی کے قریب کھڑے تھے اور ان کے ہاتھ حرکت میں تھے۔ صحیفہ کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ دل اس قدر زور سے دھڑکا تھا کہ سماعتیں جان سے جاتی رہ گئیں۔
"یہ تھے وہ انکل جنہیں وہ آئیڈیل کہتی تھی۔"
اسے بے اختیار عاشر پر فخر ہوا۔ وہ نمازی نہیں تھا مگر نفس کا غلام بھی تو نہیں تھا۔ کیسا پاکیزہ تعلق تھا۔ مہکی کو بہن کہتا تھا سب کے سامنے بھی اور تنہائی میں بھی۔
واقعی انسان کی اصل پہچان عبادات نہیں بلکہ معاملات ہیں۔ رہیں عبادات تو کچھ لوگوں کی درحقیقت یہ عادات ہوتی ہیں۔ لرزتے قدموں سے وہ بے اختیار اوپر چلی آئی۔ عاشر کی تصویر پر نگاہ پڑتے اسے ماما کی قسمت پر افسوس ہوا تھا۔

☆

میمونہ صدف

چار مخنثوں میں وہ پہلا مخنث، جس نے بچہ اٹھا رکھا تھا، اس کے قریب آیا۔ دھیرے سے ایک ہاتھ اس کے سر پہ رکھا...... کیا کچھ نہ تھا اس لمس میں......؟ وہ، جو اسے اس چھت تلے کبھی نہیں ملا تھا۔ وہ، جو اسے اس چھت تلے اس لمحے مل رہا تھا...... محبت، اپنائیت اور سب سے بڑھ کر ایک مان...... وہ مان جس کی چاہ لے کر وہ اس آنگن میں اتری تھی اور پھر وہ چاہ اس میں اتر گئی۔

مخنث نے بچے کو اس کی گود میں دینا چاہا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھائے، نہ اس کی جانب دیکھا۔ وہ ہنوز اسی طرح بیٹھی رہی۔ سر جھکائے، منہ پھلائے۔ گویا وہ تہیہ کر چکی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے وہ سر نہیں اٹھائے گی...... نہ سر اٹھائے گی، نہ ہی بچے کو۔

سر پہ دھرے ہاتھ کا دباؤ بڑھنے لگا، اتنا اور اس حد تک کہ اس نے سر اٹھانے اور اس کی جانب دیکھنے پہ خود کو مجبور پایا۔ مسی کا لاکھا جے ہونٹ سختی سے بھینچے تھے۔ ناک کا بلاق خوب دمک رہا تھا۔ اسے دیکھتی سکڑتی آنکھوں میں ایک تنبیہہ تھی۔ وہ تنبیہہ جو مائیں ہی بیٹیوں کو کیا کرتی ہیں۔ وہ ان سب کا گرو تھا اور گرو واقعی ماں جیسے ہی ہوتے ہیں۔

"تیرا کوکھ جما ہے۔ اسے نہیں اٹھائے گی تو پھر کسے اٹھائے گی؟ مجھ سے پوچھ، کوکھ کا نہ ہونا کیسا ہوتا ہے؟"

"کیسا ہوتا ہے؟" وہ بھی بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

"کوکھ نہ ہو تو لکھ نہ ہو۔"

"میں کوکھ سنگ لکھ کیسے ہو گئی پھر......؟ کوکھ جما، جم کر بھی جم نہ سکی؟"

اس کے سر پہ رکھے ہاتھ کا دباؤ کم ہوتا اس کے چہرے تک آیا، رخسار تھپکے اور اسے دیکھتا وہ افسردہ سا مسکرایا۔

"تیری بات جمی نہیں، میرے کو......"

جواباً وہ بھی مسکرا دی، ایسی مسکراہٹ جو مخنث کی مسکراہٹ لے اڑی۔

"ساری بات ہی یہی ہے کہ میری بات نہیں جمی۔"

مخنث نے سامنے صحن میں ناچتے دیگر مخنثوں کو دیکھا پھر ان کے گرد کھڑے اس کے گھر والوں کو۔ ایک مخصوص کی جانب اشارہ کرتے وہ اس سے پوچھنے لگا۔ آج اس بچے کا عقیقہ تھا اسی لیے گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔

"تیرا گھر والا وہ ہے؟"

اس نے وہاں نہیں دیکھا، وہاں دیکھ کر بھی کیا دیکھ پاتی بھلا؟

"پہلے گھر تو ڈھونڈ لوں۔ گھر والا بھی کھوج لوں گی۔" مخنث نے اس کے سر پہ پھر سے ہاتھ دھرا۔

"عورت ماں بنے تو بھانویں گھر ہو نہ گھر والا، بچہ اسی کا ہوتا ہے۔ بچے کو ماں نہ اٹھائے تو سمجھو ڈائن کہلائے۔ دکھ تو عورت کی جھولی بھرتا ہے، ماں کی جھولی تو بچہ بھرتا ہے، جو سکھ کا دوجا نام ہے۔"

ایک آنسو اس کی آنکھ سے ٹوٹ کر گرا اور ایک مخنث کی آنکھ سے...... پہلی بار اس نے بچہ گود میں لیا اور اسے گلے سے لگا لیا۔

سارا گھر بچے کے رونے کی آواز سے گونج اٹھا۔

☆☆☆

مہروش سے پہلی ملاقات اس کی بچپن میں ہوئی تھی......اپنے لڑکپن اور اس کے بچپن میں......اور وہ تبھی سے اس سے محبت کر بیٹھا تھا۔ اسے مہروش میں زیادہ کیا اچھا لگا، یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ اس کی آواز سریلی، صورت بھولی، ادا نرالی اور حسن خیالی تھا۔ وہ "مہروش" تھی یا نہیں، اسے وہ "مہر" ہی لگی تھی جو اس کی زندگی پہ "محبت کی مُہر" ثابت ہوئی تھی۔

وہ خالہ امی کی بھتیجی تھی۔ خالہ امی...... جو نہ کسی کی خالہ تھیں نہ ہی امی۔ پھر بھی سب انھیں، خالہ امی ہی کہتے تھے۔ سو اس نے خالہ امی کے ہاں اسے میلاد پہ سفید پریوں سی آن بان لیے، عالم جذب میں نعت پڑھتے دیکھا تھا۔ کچھ الفاظ کا اثر تھا اور کچھ الفاظ والی کا، وہ جھومنے لگا تھا۔ اور تب سے لے کر

اگلے سبھی سالوں کے سبھی لمحوں میں وہ اسی سرمستی میں جھومتا رہا تھا۔ ایک حصار تھا جو اس کی آواز نے اس کے گرد باندھ دیا تھا۔ کوئی تعویذ جو مخملی ڈبیا میں لپیٹ کر، اس پہ کر دیا گیا تھا..... یا پھر اک طلسم، جو پڑھ کر پھونک دیا گیا تھا۔

''کیا مدح سرائی اس قدر خوب صورت بھی کی جاسکتی ہے......؟'' وہ زنان خانے سے نکل کر باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے اس سے ٹکرائی تھی۔ سفید پریوں سی آن بان والی کے سر سے آنچل ڈھلکا اور سامنے کھڑے اس مسحور کی نظریں تعظیماً جھک گئیں۔ پلکوں نے بچھ جانے کو محبوب جانا۔ وہ پردہ دار تھی تو وہ اس کا پردہ قائم رکھنا چاہتا تھا۔ کسی ایسے موقع کا فائدہ اٹھانا مرد کے لیے جائز نہیں۔

''کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ مدح کس کی کی گئی؟'' آنچل اوڑھ کر پلو سر کا لیا گیا اور جواب دے کر لاجواب کر دیا گیا۔

''کیا ایسی مدح میں بھی کر سکتا ہوں؟ ہستی وہی رہے گی مگر مجھے کیوں لگتا ہے کہ بات وہ نہیں رہے گی۔''

پلو سر کا رہا۔ نظریں جھکی رہیں...... نہ وہ بے حجاب تھی، نہ وہ بے اختیار۔

''بات تو بنانے سے بنتی ہے۔ بات بنانے کی سعی تو کریں...... قوی وہ کرے گا۔'' جھکی نظروں کا سر اٹھا اور لب مسکرا دیے۔ بات پسند آئی تھی جیسے کہ بات والی۔ سفید آنچل والی پری اب باورچی خانے کے ساتھ اس کے دل کے پار ہو چکی تھی۔

پھر سالوں بعد جب گھر میں اس کی شادی کی بات ہونے لگی تو عالم قلب میں چھپی مہر نے عالم رب میں بسی مہر کے حق میں سر جھکایا۔ تو اپنا اٹھا سر اسے پھر سے جھکانا پڑا...... اب نہ کہتا تو کب کہتا۔ سو ابھی ہی کہنا تھا۔

اماں اس کی شکل دیکھ دیکھ کر تھکنے لگیں مگر بات انھیں ہضم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔

مہروش...... عدیل ضیا کی لے پالک اولاد جو انہوں نے اپنی سالی سے بے اولادی کے سبب لی تھی۔ وہ عدیل ضیا جنھوں نے عطیہ کے ساتھ اپنے بچپن کی منگنی ختم کرتے ہوئے، مدیحہ سے شادی کی تھی۔ ان کی جگہ مدیحہ کو دی تھی...... آج وہ انہی کی بیٹی کو لا کر بہو کی جگہ کیسے دے سکتی تھیں؟ عدیل ضیا بھلے نہ رہے ہوں، مدیحہ تو زندہ تھیں اور وہ تذلیل بھی جو برسوں پہلے انہوں نے عدیل کے ہاتھوں منگنی ٹوٹنے کے سبب سہی تھی۔

''ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی موجود ہے۔''

''وہ ان سب سے بڑھ کر ہے۔''

انہیں لگا عدیل سامنے کھڑا مدیحہ کی دلیل دے رہا ہے...... ان کا دماغ الٹ گیا تھا۔

''ایسا کیا ہے اس میں......؟'' سوال بھی پھر عطیہ نے مدیحہ پہ ہی اٹھایا ہو جیسے۔ اور جواب نہ برسوں پہلے سامنے کھڑے اس شخص نے دیا تھا، نہ برسوں بعد سامنے کھڑا وہ شخص دے سکا۔

''دنیا اس پہ ختم نہیں ہو گئی۔'' وہ دنیا کو اپنی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ اسے دکھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''دنیا اس کے بغیر ختم ہو جائے گی۔''

''یہ تو نہیں، وہ بول رہی ہے۔'' طعنہ بیٹے کو دیا گیا یا عدیل کو، طعنہ دینے والی آج بھی وہی تھیں۔

''بات محبت کی ہو یا محبوب کی، بات تو حب کی ہوئی نا۔''

عطیہ نے اب بھی خود کو ویسے ہی بے بس پایا جیسے ستائیس سال پہلے پایا تھا۔ اس وقت منگیتر پہ بس نہیں چلا تھا، آج بیٹا انہیں بے بس کیے دے رہا تھا۔ عطیہ اس کی پسند سے زیادہ اس مسند پہ خائف تھیں جو وہ مہروش کو دے بیٹھا تھا۔ بہت بار سمجھایا، بہت سوں نے سمجھایا۔ مگر وہ یہ کیسے سمجھتا کہ وہ سمجھ کے مدار کو چھوڑ کر کہیں بہت آگے نکل چکا تھا۔

وہ ان کی چھ اولادوں میں سب سے زیادہ کماتا اور سب کو کھلاتا تھا۔ وہ خاندان کا سرپرست نہ ہو

کر بھی سرپرست بنا بیٹھا تھا۔ ایسی اولاد، وہ بھی بیٹے، وہ بھی کماؤ بیٹے سے کون بگاڑ سکتا تھا؟ عطیہ کو ماننا ہی پڑا تھا ورنہ کھلی کمائی اور جوان اولاد مٹھی سے نکل جاتی۔ اور دوسرے معنوں میں وہ مان کر بھی نہ مانیں۔ ساری عمر جو بغض دل میں پلتا، دل جلاتا رہا۔ وہ اسے اپنے بیٹے کے گھر میں پلنے اور جلنے کے لیے تیار کرنے لگیں۔

جس گھر میں ستائیس سال قبل وہ خالہ امی کے سنگ خود بیاہ کر آنا چاہتی تھیں، اسی گھر میں خالہ امی کے سنگ بہو بیاہنے آئی تھیں۔ بھلا ایسا بھی کہیں ہوتا ہے...... نصیب نے رقیب کو ہی حبیب بنانے بھیج دیا۔ ماتھے پہ سو بل ڈالے وہ صاف جتا رہی تھیں کہ اس رشتے میں ان کی سرے سے کوئی پسند نہیں ہے۔ رشتے کی بات بھی ساری خالہ امی نے کی تھی کہ انھوں نے تو بات تک کرنا گوارا نہ کی۔

مدیحہ کو اس رشتے کو لے کر جتنے اعتراض تھے، اس سے کہیں زیادہ تو مہروش کو تھے۔

"آپ سے اپنا بدلہ لینے کے لیے، میرا رشتہ مانگنے آئی ہیں۔" بادام کے چھلکے اتار کر ایک طرف رکھے تاکہ کتر کر کھیر میں ڈال سکے۔ مدیحہ اس کی بات پہ بہت سارا ہنسیں۔

"اس بات کو ستائیس سال بیت گئے ہیں۔ اتنے برس تو کوئی مرگ کو نہیں روتا۔ وہ منگ کو روئے گی۔"

"مرگ جدائی کا دوسرا نام ہے اور منگ ملاپ کا...... طے شدہ جدائی یوں نہیں رلاتی، جیسے طے شدہ ملاپ جدائی میں ڈھلنے سے رلاتا ہے۔ پھر بھلے سات سال گزرے یا ستائیس سال، رونا کہیں مکتا۔" کھیر میں ڈوئی چلاتے اس نے ایسی بات کی کہ مدیحہ اسے دیکھتی ہی رہ گئیں۔

مدیحہ ماننے کو تیار نہیں تھیں، اس بات کو...... اور ماننے کو تو مہروش بھی تیار نہ تھی، اس ساتھ کو۔ مدیحہ کا اقرار مہروش کے انکار سے ٹل گیا۔ وہ اس کے خدشات کو ختم تو کیا، کم کرنے میں بھی ناکام رہی تھیں۔ سو خالہ امی کے طفیل انکار عطیہ تک پہنچا دیا گیا۔ مدیحہ کی بیٹی کے بہو نہ بننے کی خوشی بیٹے کو رد کرنے کے غصہ سے کہیں زیادہ تھی جو چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ پھر انہیں اس بات کی بھی پروا نہ رہی کہ مہروز پہ کیا گزری۔ وہ اس لمحے ماں نہیں، محض ایک عورت تھیں۔ وہ عورت جو وچھوڑے کا دکھ بھول کر نہیں بھولتی۔ وہ بھی سالوں سے سینے سے لگائے بیٹھی تھیں۔

☆☆☆

جے کوئی آتش عشق دے وچ پووے اوجھد امول نہ جاوے
بے پرواہی دلبر دی کر گھونگھٹ مونہہ لکاوے

مہروش اپنے گیلے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے اتنے سر میں پڑھ رہی تھی کہ خواجہ فرید ہوتے تو ایک پل ٹھہر کر اس جذب کے عالم میں پڑھتی لڑکی کو ٹھہر کر سنتا اور سراہنا ضرور پسند کرتے۔ اور ہاتھ بلند کر کے دعا دیتے کہ جیسا پیارا لکھا گیا۔ ویسا پیارا پڑھا گیا۔ وہ ہر کام کی ادائیگی میں فرض شناس لڑکی کلام کا حق ادا کرنے میں بھی کامیاب ہوئی۔

مدیحہ دروازے پہ لگی ہوا دوز گھنٹیوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے اندر داخل ہوئیں تو سارا کمرہ گھنٹیوں کی ٹن ٹن سے گونج اٹھا۔ وہ کم کم ہی اس کے کمرے میں داخل ہوتی تھیں جو گھر کے سب سے آخری کونے میں تھا۔ کسی خاص کام سے ہی، تو گویا اب بھی کوئی کام انہیں وہاں لایا تھا۔ دیوقامت کھڑکی کے پٹ کو وا کرتے مہروش نے گردن موڑ کر ماں کو دیکھا۔

"مہروز آیا ہے۔ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

"کون مہروز......" اس کی یادداشت ایسے کسی بھی نام سے خالی تھی۔

"عطیہ بانو کا بیٹا...... جس کے بھیجے پیغام سے تم نے انکار کیا تھا۔"

وہ جتنا بھی حیران ہوتی کم تھا۔ بھلا جواب دے دیا گیا تھا تو اب کون سے سوال لے کر آیا تھا؟ وہ مدیحہ کی معیت میں سر جھکائے، پلو گرائے مہمان

خانے تک آئی تھی۔ لیکن وہ آئی نہیں، اک سحر پھونک کرلائی گئی تھی جس کا اسے ادراک نہ ہو سکا۔ مہمان، کلام میں گم کہیں اور خواجہ جی کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھا دعا کی گزارش کر رہا تھا کہ وہ جن کا مہمان بنا بیٹھا ہے، انہی کے گمان میں سے ہو جائے۔

وہ خالی نظروں سے زمین کو دیکھتی بہت کچھ سوچ رہی تھی اور وہ اس خاموشی میں بھی بہت کچھ سن رہا تھا۔

"میں بس یہ جاننے آیا ہوں کہ کسی کو بنا جانے، پرکھے، بنا کسی وجہ کے کیسے ٹھکرایا جا سکتا ہے......؟"

وہ آج بھی سر جھکائے بیٹھا رہا تھا۔ اس لڑکی کے سامنے آتے ہی نجانے نگاہیں اٹھنے سے انکاری کیوں ہو جاتی تھیں۔

"انکار میرا حق ہے جس سے مجھے کوئی روک نہیں سکتا۔"

"اور اصرار میرا...... میں آپ سے آپ کا حق نہیں چھینتا...... آپ مجھ سے میرا حق نہ مانگیں...... تو پھر یہ طے ہوا کہ دونوں اپنے حق کے پابند رہتے ہیں۔"

وہ سٹپٹائی تو مدیحہ مسکرائیں۔ انہیں مہمان کی ادا بہت بھائی تھی۔ وہ کہیں سے بھی عطیہ کا خون نہیں لگتا تھا۔

"بھلے آپ کے پاس انکار کی سو وجوہات ہوں، میرے پاس اقرار کی واحد وجہ محبت ہے...... جو بچپن میں ایک بچے کا سا روپ دھارے، جوانی کے ساتھ جوان ہوتی، بڑھاپے میں جا کر ضعف ہوتے، اندر سے قوی ہو جاتی ہے...... اور ایسی قوت کو لوٹایا نہیں کرتے۔ کیا یہ ایک وجہ اقرار کے لیے ناکافی ہے؟"

مہروش نے اک جھروکے سے اسے تکا اور مدیحہ نے مہروش کو۔ وہ دنیا کا پہلا مرد تھا جو اس سے یہ کہہ رہا تھا، اس کے دل نے گواہی دی کہ اسے ہی دنیا کا آخری مرد ہونا چاہیے۔

جے کوئی آتش عشق دے وچ پووے اوجھدا
مول نہ جاوے

آتش عشق...... مول...... سب ہی آشکار کر دیا گیا تو پھر انکار کیسا؟ ایک پھونک کلام کی اس پہ ماردی گئی اور مہروش کا سر جھکانا مان جانے کے برابر ٹھہرا۔

نوجوان جو باہمت دکھتا تھا، باادب بیٹھا تھا، باکمال ظاہر تھا، وہ بامراد لوٹا تھا۔

☆☆☆

"تم تو اس رشتے سے انکار کر رہی تھیں، اچانک مان کیسے گئیں؟" اس کے کھلے لمبے بال نیچے بیٹھنے کی وجہ سے زمین کو چھو رہے تھے۔ بال اس کے تھے اور سمیٹ انہیں قندیل رہی تھی۔ اس کے بال اس سے زیادہ قندیل کی کمزوری تھے۔

"وہ پہلے کی بات ہے...... تب میں اور اب میں بہت فرق ہے۔" اس نے سر اٹھائے بنا ہی جواب دیا۔ بس مسکرانے پہ اکتفا کیا۔

قندیل اس کے بالوں کو سمیٹ کر جوڑے کی شکل میں لپیٹ رہی تھی۔

"کیسا فرق؟"

"وہی فرق جو جاننے اور نہ جاننے میں ہوتا ہے۔ جو پالینے اور کھو دینے کا ہوتا ہے۔"

قندیل اٹھ کر اس کے سامنے آ بیٹھی۔ بے یقینی سے اسے تکنے لگی تو وہ کھل کر مسکرا دی۔ اسے قندیل کی نگاہوں کی حیرت مزا دے رہی تھی۔

"تو یہ فرق کہاں سے آ گیا، یکدم، بن بلائے، کسی بھوت پریت کی مانند......؟"

"وہ لایا ہے۔ اور سچ مانو جیسے بھوت پریت ہی ہے۔"

"وہ......؟" قندیل نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ وہ اس 'وہ' کو نہیں جانتی تھی۔

"جس کے لیے میں نے ہاں کی ہے۔"

"یعنی کہ میم سے مہروز جس سے میم سے مہروش کو میم سے محبت ہو گئی۔" وہ مسکرا دی اور میم کے سارے اسم اور فعل پوروں پہ گن لیے۔ قندیل سے

اس کے چہرے سے پھوٹتی روشنی سے نظر ہٹانا مشکل ہوگیا تھا۔

"دو مہر یکجا ہو جائیں تو یہی 'میم'، مارگزیدہ میں ڈھل کر اکثر مرگ بن جاتا ہے۔"

قندیل اس کی بچپن کی گوڑھی سہیلی تھی جس کی حال ہی میں طلاق ہوئی تھی۔ سرخ و سفید رنگ کسی مارگزیدہ کی مانند ہی کالا پڑ گیا اور منہ سے یوں لگتا جیسے ابھی بھی سفید جھاگ بہتی ہو۔ مہروش اسے دیکھتی تو دل تھام لیتی۔ محبت کی شادی سال بھر بھی نہ چل سکی۔ ماں سے ضد کر کے اسے دنیا کے سامنے دو بول پڑھوا کر لے گیا تھا۔ ماں کی ضد پہ بند کمرے میں تین بول اس کے منہ پہ دے مارے تھے۔ ایک مضبوط رشتہ جو دو اجنبیوں کو تین بول بولنے سے ایک کر دیتا ہے، وہی رشتہ تین بول بولنے سے پھر سے اجنبی بھی بنا دیتا ہے۔ قندیل کی آنکھوں کی ساری قندیلیں اس کی ازدواجی زندگی نے پھونکوں سے بجھا دی تھیں۔

☆☆☆

عطیہ بانو بے یقینی سے سب سن رہی تھیں۔ وہ جس معاملے کے بگڑ جانے پہ مٹھائی بانٹنے کا سوچ بیٹھی تھیں، اسی معاملے کے سنور جانے کی مٹھائی ان کا بیٹا ان کے منہ میں نوالوں کی طرح ڈالے چلا جا رہا تھا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں بیٹے کی خوشی کو یوں دیکھ رہی تھیں کہ کاش انہی کی نظر لگ جائے اور اس کی یہ خوشی جل کر کوئلہ بن جائے۔ دنیا کی کوئی بھی لڑکی ہو بس وہ عدیل اور مدیحہ کی اولاد نہ ہو۔

اور عطیہ کو ایک بار پھر سے خالہ امی کی معیت میں وہاں جانا پڑا جس در پہ وہ تھوکنا بھی کبھی پسند نہ کرتی تھیں۔ اپنی ہونے والی بہو کو بیٹے کی نام کی انگوٹھی پہنائی اور مہروز کے واپس دبئی جانے سے قبل مبارک سلامت ہوگئی۔

وہ نکاح کے بعد خاص مدیحہ سے اجازت لے کر اس سے ملنے ہوا دوز گھنٹیوں سے گزرتا، ان کے بجتے ساز میں اس کی خواب گاہ میں ملنے آیا تھا۔ اس حق کے ساتھ جو وہ چند گھنٹے پہلے کہیں اوپر سے حاصل کر چکا تھا۔ جسے نیچے والے چاہ کر بھی نہیں جھٹلا سکتے تھے۔ اس کے آتے ہی سب لڑکیاں مہروش کے پاس سے تخلیہ کے سے انداز میں چھٹ گئیں اور وہ کمرہ ایک ایسی کائنات کا روپ دھار ے موجودات میں سے ہوگیا جہاں دو انسانوں کے سوا سب سمیٹ دیا گیا ہو۔ سب لپیٹ دیا گیا ہو، سوائے محبت کے۔

"کیا میں کچھ کہنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟"

اس نے جھکی نظروں کو اٹھانا گوارا نہ کیا۔ اب تو اس کا پورا حق تھا لیکن وہ بنا اجازت حق نہیں جتانا چاہتا تھا۔

"یہاں آنے کی جسارت کرنے والا کہنے سے کیوں ڈر رہا ہے۔"

سونے کے رنگ کا لباس اسے چاندی بنائے دے رہا تھا اور اس شخص کا ساتھ ہیرا۔ اس نے پلو اٹھا ڈالا، اور برسوں کی جھکی نگاہ اٹھ گئی۔ یہ دونوں طرف کی پہلی نظر تھی جو پھر بڑی دیر تک رہی۔ حلال رشتے کی حق دار نظر۔

"جانے سے پہلے بس یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ تم خوش ہو؟" بہت جلدی "آپ" سے "تم" کا سفر طے ہوا تھا۔ گلابی ہونٹ اس بات پہ مسکا اٹھے۔

"خوش نہ ہوتی، تو نکاح کی سنت نہ ہوئی ہوتی۔"

"تو گویا تمہیں میرا یقین ہے۔" وہ جواب سن کر محظوظ ہوا۔

"آپ کا نہیں۔ محبت کا......"

"یہ بھی کافی ہے۔ محبت بھی تو میری ہی ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر محظوظ ہوتے مسکرایا تھا۔

"یہ کافی نہیں، کافی سے زیادہ ہے۔" وہ مسکرائی نہیں تھی پھر بھی اسے مسکراتی دکھائی دی۔

"میں جانتا ہوں اماں تمہیں پسند نہیں کرتیں، مگر میں جانتا ہوں کہ وہ تمہیں پسند کرنے لگ جائیں گی۔ ٹھیک ویسے جیسے میں نے کیا۔"

وہ اس بات پہ مسکرائی تھی اور وہ اس مسکراہٹ

پہ حیران ہوا تھا...... وہ اسے یہ کہہ رہا تھا کہ وہ اس کی ماں کی ستائیس سالہ رقابت کو قلب سے سلب کر ڈالے۔ کچھ زیادہ ہی کہہ گیا تھا۔

"میں ایسا کوئی جھوٹ نہیں کہنا چاہتی جو امید بھرا ہو۔ نہ میں خوش فہم ہوں نہ کسی کو خوش فہمی میں رکھنا چاہتی ہوں۔" اس نے سر جھکائے دوٹوک واضح کیا تھا۔

"تم راست گو ہو، مجھے اچھا لگا۔" سراہا گیا۔

"اور آپ وسیع قلب ہیں، یہ جان کر خوشی ہوئی۔"

"اس قلب میں تم اپنے لیے وسعت ہی وسعت پاؤ گی۔" اور اس اعزاز نے کیا کیا نہ دے ڈالا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

محبت وجود میں مٹھاس بن کر اتری تھی۔

☆☆☆

یہ مہروز کے جانے سے تین ہفتے بعد کی بات تھی جب عطیہ کا فون آیا تھا اور انھوں نے بیٹے کی آڑ میں کیا کیا نہ سنا ڈالا۔ مدیحہ کے لیے سمدھیانے کا معاملہ تھا اور عطیہ کے لیے رقابت کا...... ایک کو سننا اور دوسرے کو لازماً سنانا تھا۔

"تمہاری بیٹی کیوں میرے بیٹے سے فون پہ رابطے میں ہے؟"

"میری بیٹی اپنے شوہر سے رابطے میں ہے۔" بہت دیر وہ سنتی رہی تھیں پھر نرمی سے جواب دیا تو عطیہ سلگ اٹھیں۔

"آئندہ میں نہ سنوں کہ وہ میرے بیٹے کو فون کر رہی ہے۔"

"پھر تو آپ کو اپنے بیٹے کو ہی منع کرنا ہوگا کیونکہ فون تو وہی کرتا ہے۔" مدیحہ نرمی سے زیادہ برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھیں مگر عطیہ کی برہمی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ انھیں اپنی باتوں کے جواب میں کسی کی بات سننا سخت کھلتا تھا۔

"مردوں کو مٹھی میں کرنے کے گر خوب آتے ہیں۔ جیسی ماں ویسی بیٹی۔"

"مردوں کو نہیں شوہروں کو۔" انھوں نے فوراً تصحیح کی۔

"میرا بیٹا دن رات وہاں محنت اس لیے نہیں کرتا کہ سارا پیسہ فون پہ لٹا تا رہے۔" وہ کسی صورت خاموش ہو کے نہ دے رہی تھیں۔

"جو کماتا ہے، وہ جانتا ہے کہ کہاں لگانا ہے۔ پیسہ اس کا تو فیصلہ بھی اس کا۔"

"میں نہیں چاہتی کہ تمہاری بیٹی میرے بیٹے سے رابطے میں رہے۔" عطیہ نے دل کی بات صاف کہہ ڈالی۔

"یہ آپ کو میری بیٹی کو بہو بنانے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا کہ بیویاں اپنے شوہروں سے رابطے میں رہتی ہیں تاکہ شوہر کہیں اور رابطے نہ بڑھا لیں۔ اور یہ ہر بیوی کا حق بھی ہے اور فرض بھی۔" غصہ انہیں بھی آ گیا تھا مگر وہ دبا گئی تھیں۔

فون تو کٹ گیا مگر ساتھ دل بھی کاٹ گیا تھا۔ انھوں نے نرمی سے مہروش کا ہاتھ تھاما اور اسی نرمی سے اسے سمجھایا۔

"مہروز سے بات کرنا ترک کر دو۔"

مہروش نے تعجب سے ماں کو دیکھا۔ اور اسی حیرت کے زیر تسلط ہی تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ترک کر دوں گی۔"

"وہ فون کرے تو مت اٹھانا۔" یہ کہتے ہوئے ان کا سر جھک گیا تھا۔ غلط بات وہ نظریں ملا کر کہنے کی ہمت نہیں پاتی تھیں۔

"نہیں اٹھاؤں گی۔" عجب میکانکی انداز تھا جس نے مدیحہ کو سر اٹھانے پہ مجبور کیا۔

"جب تک رخصتی نہیں ہو جاتی تب تک اجتناب رہے تو اچھا ہے۔"

"اجتناب رہے گا۔"

وہ اس قدر فرماں برداری پہ پہلو بدل کر رہ گئیں۔ ماں باپ کو اولاد سے ناجائز مطالبات کا حق نہیں ہے، یہ اولاد کے ساتھ زیادتی ہے اور وہ یہ زیادتی کرنے پہ مجبور کر دی گئی تھیں۔

''کیا تمہیں کچھ پوچھنا ہے؟''
''کیا آپ کو کچھ بتانا ہے؟'' اس نے پوچھ لیا جو اسے پوچھنا تھا۔ کچھ کہتے کہتے مدیحہ نے سرنفی میں ہلایا تو مہروش نے ہاتھ چھڑا کر اٹھنا چاہا۔ مدیحہ نے اس جاتی ہوئی کی کلائی تھام لی۔
''شادی کے بعد سب آسان ہو جائے گا۔''
ایسی طفل تسلی جس نے مہروش کو بے طرح ہنسایا تھا۔
''شادی کی اصل نکاح ہے۔ جو کام نکاح کے بعد آسان نہیں ہوا، وہ پھر کب آسان ہوگا؟'' اس سوال در سوال، جواب در جواب میں مدیحہ نے خود کو مقید پایا۔ وہ بس اس پیاری صورت والی بیٹی کو دیکھ کر رہ گئیں جس کا رنگ اس ایک بات سے ہی کملا گیا تھا۔

اور پھر عطیہ بیگم کے اطمینان کی خاطر وہ مہروز سے اعراض برتنے لگی تھی۔ محض اپنا رشتہ بچانے کو یہ سب کرنے پہ مجبور تھی۔ مگر سب ٹھیک تو پھر بھی نہیں رہا تھا۔ عطیہ بیگم مطمئن ہو گئیں تو مہروز روٹھ گیا۔
''تمہیں مجھ سے زیادہ میرے گھر والوں کی پروا ہے۔''
''ان کی پروا اس لیے ہے کہ وہ آپ کے گھر والے ہیں۔ پروا ان کی ہو تو بھی پروا تو آپ کی ہی ہوئی نا۔''
''تمہارا رشتہ مجھ سے جڑا ہے، میری وجہ سے ان سے جڑا ہے۔ پہلا حق میرا ہے کہ تم میری خوشی دیکھو۔'' وہ ہنوز خفا رہا۔
''بطور لڑکی رشتہ تو پوری سسرال سے جڑا ہے..... میں انہیں دیکھوں یا آپ کو یہ آپ ہی بتادیں مجھے۔''
''تم دونوں طرف توازن رکھو۔''
''میں ترازو نہیں ہوں۔''
''کوشش تو کر سکتی ہو نا۔''
''یہ کوشش کروں کہ وہ راضی ہوں تو آپ ناراض ہوتے ہیں، یہ کوشش کروں کہ آپ کو راضی رکھوں تو وہ ناراض..... آخر کوشش کروں تو کیسے کروں؟'' وہ اسے سمجھاتے سمجھاتے خود نا سمجھی کے دائرے میں گول گول گھومنے لگی تھی۔
''تم کوشش کرنا ہی نہیں چاہتیں۔ لڑکیاں سب کر لیتی ہیں اور تم سے اتنا نہیں ہو سکتا۔''
اور بات اس بات پہ آکر ختم ہوگئی تو مہروش کو لگا وہ ختم ہو چلی ہے۔ اور وہ جو ایک محبت کو اقرار بنا کر، گواہ بنا کر لایا تھا، قبولیت کے بعد اس کا کوئی اقرار انکار سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اسے نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ حالات نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ یہ کیسی محبت تھی جو ہوا برد ہوگئی تھی۔

☆☆☆

پھر چند ماہ بعد ہی مہروز کے اصرار پہ رخصتی ہوگئی۔ جب تک مہروز پاکستان رہا، وہ محبت میں ماتی بنی جھومتی رہی۔ پر کب تک مہروز وہیں رہتا۔ اسے واپس جانا ہی تھا اور عطیہ چاہتی تھیں کہ وہ اس بار جلدی لوٹ جائے اور اگلی بار دیر سے لوٹ کر آئے۔
''دوبارہ چھٹی کب ملے گی؟'' وہ اداس تھی۔ اداس تو وہ بھی تھا۔ پردیس اور اس سے دوری کا دہرا غم، لیکن خاموش رہا۔
''مجھے کب بلائیں گے؟'' اگلا سوال۔
''جلد ہی.....'' یہ دونوں سوالوں میں سے کس کا جواب تھا، وہ نہ سمجھ سکی۔ بس دونوں کا جواب جان کر خود کو تسلی دیتی، آس کا جہان خود کے گرد آباد کرتی رہتی۔ اس کے جانے کے بعد، سارے دن کے کام کاج نبٹا کر، سسرال کی تمام باتیں سن کر جب وہ تھک ہار کر لیٹتی تو ایک یہی جواب اس کے گرد طواف کرتا۔ جلد، جلد، جلد۔ اور وہ اسی 'جلد' کو سوچتی، جلد سو جاتی، اگلے روز جلد اٹھنے کے لیے۔
پہلے پہل اکثر فون پہ بات ہوتی تو گھنٹوں ہوتی۔ پھر فون کا دورانیہ کم ہونے لگا۔ دو ہفتوں کے بعد ایک بار کا فون، وہ بھی شکوؤں سے لبریز فون۔
''اماں کہہ رہی تھیں کہ تم ان کے پاس نہیں

بیٹھتیں۔"

"میں بیٹھا کروں گی۔" وہ سادہ سا جواب دیتی کہ بات ہی ختم کردے۔

"وہ کہتی ہیں تم ان سے بات تک نہیں کرتیں۔"

"اب سے کیا کروں گی۔ لیکن سمجھ میں بھی تو آئے کہ کیا بات کروں......؟" اپنی مشکل وہ اپنے دوست، محبوب اور شوہر کے سامنے رکھتی۔

"جو وہ کہتی ہیں، اس کا جواب دے دیا کرو۔"

"وہ تو طعنے دیتی ہیں، ان کا جواب نہیں دے سکتی میں۔" مہروز کو ایسے جواب سے چپ لگ گئی۔

"تم انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرو وشی...... کیا تم یہ کر سکتی ہو......؟"

اس کی خوشی کے لیے وہ سر ہلا دیتی۔ "میں آپ کے لیے کوشش کر سکتی ہوں۔ خوش رکھ پاؤں گی، یہ نہیں کہہ سکتی۔"

وہ اس کی ساری باتیں مان لینے پہ خوش ہو جاتا مگر پھر اگلی بار اسی طرح شاکی لہجے میں وہی سارے شکوے شکایات، بلکہ پہلے سے بھی کہیں گنا بڑھ کر۔

"نہ تم سمجھتی ہو نہ کوشش کرنا چاہتی ہو۔ تمہیں بس حامی بھرنا آتا ہے۔"

اور وہ سوچتی رہ جاتی کہ وہ کیسے اور کیا سمجھے......؟ کیسے اور کتنی کوشش کرے......؟ اس نے عطیہ کے پاس بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ ان سے بات چیت شروع کر دی تھی مگر نتیجتاً انہیں اس سے مزید شکایات ہو چلی تھیں۔ وہ اس کی ہر بات کو الٹا رنگ دینے لگ گئی تھیں کیونکہ وہ الٹا رنگ ہی دینا چاہتی تھیں۔ اور یہ سب اسے مہروز سے ہی پتا چلتا تھا کہ وہ کتنی خامیوں کا مرقع ہے۔ وہ کھردرے لہجے میں بولتی ہے، اس کے نخرے بہت ہیں، وہ اپنی باتوں سے خوش نہیں لگتی، اس گھر کے مکینوں سے نالاں دکھتی ہے، اسے اس گھر کے مکینوں سے چڑ ہے، وہ کسی کے ساتھ بیٹھنا اور بات کرنا پسند نہیں کرتی، وہ گھر کے کام کاج میں دلچسپی نہیں لیتی، وہ میکے بیٹھی رہتی ہے۔ سب شکایات جھوٹ اور بس جھوٹ تھیں۔

وہ بھلے لاکھ وضاحتیں بھی دے دیتی تو بھی کوئی کسی کام نہیں آنا تھیں۔ اس خود ساختہ قیاس آرائیوں کا وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی کیونکہ ماں کے آگے اس کے شوہر کو بیوی کی باتیں من گھڑت کہانیاں لگتی ہیں۔

یہ مرد بھی عجیب مخلوق ہے...... عورت کو حاصل کرنے کی طلب ہو تو مرا جاتا ہے...... حاصل کر لے تو پھر اسے کسی کونے میں ڈال کر بھول جاتا ہے۔ اس کی عزت کروانا تو دور کی بات خود بھی عزت دینا بھول جاتا ہے۔

☆☆☆

اس گھر میں قدم رکھنے کے بعد اس پہ حقیقت کھلی تھی کہ گھر کا سارا خرچا مہروز کی کمائی سے چلتا تھا۔ باہر کی وہ کمائی جو یہاں ہوا میں اڑائی جاتی تھی۔ مہروز سے بڑا شہروز اب تک تین بار کاروبار کی مد میں سارا پیسہ اجاڑ چکا تھا اور ان دنوں کسی نئے کاروبار کے بارے میں ماں سے سر جوڑے بیٹھا رہتا تھا۔ متلون مزاج تھا کہ کاروبار تو کاروبار شادی بھی دو بار کر چکا تھا اور دونوں ہی اسے چھوڑ گئی تھیں کہ وہ ایسے مرد کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتیں جس کی جیب خالی ہو، خالی جیب مرد کی سب سے بڑی بدصورتی۔ مہروز سے چھوٹا فیروز تھا جسے عطیہ یہ کہہ کر گھر بٹھائے رکھتیں کہ باپ کی پینشن ہے نا، آرام سے بیٹھ کر کھا رہا ہے تو کیوں باہر کی خواری کاٹے۔ سو لے دے کر ایک مہروز ہی تھا اس گھر کے لیے کمانے والا اور خواری کاٹنے والا۔

"شہروز بھائی پھر سے کاروبار کرنے کے لیے پیسے مانگ رہے ہیں۔ مجھے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کتنی بار انہیں کاروبار سیٹ کروا کر دوں۔" وہ خود بھی اس روز اکتایا ہوا تھا۔ اپنی پریشانی اس سے کہے بنا رہ نہ سکا۔ وہ بھی میاں کی ہمدرد بن کر مشورہ دے بیٹھی۔

"آپ ان سے صاف کہہ دیں کہ آپ نہیں دے سکتے مزید رقم۔ آپ بھی تو دن رات محنت کرتے ہیں، کماتے ہیں۔ کوئی درختوں سے توڑ کر نہیں لاتے...... یہی محنت وہ کیوں نہیں کر سکتے۔ ایسے بھکاریوں کی طرح کب تک مانگتے رہیں گے۔"

"تم میرے بھائی کو بھکاری کہہ رہی ہو؟" وہ یک دم چلایا تھا۔

"میں نے ایسا کب کہا......؟ میں تو بس مثال دے رہی تھی۔" بوکھلاہٹ میں وہ عرق عرق ہوگئی۔

"ایسی مثالیں تم اپنے گھر والوں کے لیے کیوں نہیں لاتیں؟ اماں ٹھیک کہتی ہیں تم مجھے ان سب سے الگ کرنا چاہتی ہو، توڑنا چاہتی ہو تا کہ میں بس تم سے جڑا رہوں۔ تم سے کہیں زیادہ حق ہے ان کا۔ زندگی کے چھبیس سال بھاڑ میں جھونک کر چھ ماہ کے ساتھ کے لیے تمہارے پیچھے اندھا نہیں ہو جاؤں گا۔ محبت ہوئی ہے، کوئی بینائی نہیں چلی گئی کہ کچھ اور دکھائی نہ دے۔" فون کٹ چکا تھا۔

اس سے غلط ہوا تھا۔ اسے چپ رہنا چاہیے تھا اور بس سننا چاہیے تھا۔ شوہر اپنے گھر والوں کے لیے کچھ بھی سوچے، کچھ بھی بولے، وہ اس کے گھر والے ہیں، وہ کہہ سکتا ہے۔ بیوی کو بولنے کا حق وہ کبھی نہیں دیتا۔

میاں کے سامنے اس کے خاندان کو برا کہا جائے تو اسے برا لگ جاتا ہے، غصہ بھی آجاتا ہے اور وہ بے بھاؤ کی سنا بھی ڈالتا ہے۔ یہ کلیہ اس نے پلو سے پکا پکا باندھ لیا تھا کہ آئندہ زبان بند ہی رکھنا ہے۔

☆☆☆

"تم مہروز سے کہو کہ تمہارے اکاؤنٹ میں الگ سے پیسے بھیجا کرے۔ یہ تمہارا حق ہے۔" امی اس کے خشک ہوتے اور جھڑتے بالوں کو دیکھ کر جھٹ سے تیل لگانے بیٹھ گئیں۔ گر قندیل دیکھ لیتی تو کیا ہوتا جو اس کے بالوں کی عاشق تھی۔ شادی کے بعد سے اب تک چھ ماہ میں وہ ایک بار بھی قندیل سے نہیں مل سکی تھی۔

"ایسی بات اس گھر میں بھائیوں، بہنوں اور ماں کے منہ سے اچھی لگتی ہے، بیوی کے منہ سے نکلے تو گالی بن جائے گی اور آپ نے ہمیں گالی دینا نہیں سکھائی امی۔" اپنی سادہ فطرت بیٹی کے لیے ان کا دل دکھی ہوگیا۔ وہ اس ایک جملے سے اندر کی ساری کہانی سمجھ گئی تھیں۔

"وہ تمہیں اپنے پاس کیوں نہیں بلا لیتا؟" اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

"وزٹنگ ویزا پہ بلوا رہے ہیں ایک ماہ کے لیے۔" یہ بات کل ہی مہروز نے اسے بتائی تھی۔ ابھی وہ اسی بات پہ خوش تھی کہ وہ ایک ماہ اس کے پاس جا کر رہے گی۔ کیا خبر یہ ایک ماہ اگلی ساری زندگی کے رستے وا کر دے۔ وہ اس کی قربت میں رہنے کا عادی ہو جائے اور پھر اسے واپس نہ آنے دے۔

"ایک ماہ کیوں، ہمیشہ کے لیے کیوں نہیں؟" اس نے ماں کو سرد آہ بھر کر دیکھا تھا۔ یہی سوال اس نے شوہر سے کیا تھا۔

"دبئی بہت مہنگا شہر ہے۔ اتنی محدود آمدن میں یہاں فیملی رکھنا ممکن نہیں ہے۔"

"دبئی تو ہمیشہ سے مہنگا تھا۔ اس بات کا ادراک ابھی جا کر ہی کیوں ہوا ہے؟" یہ بات تو حال ہی میں اماں نے اسے سکھائی تھی اور ننھے منے بچے کی طرح وہ ماں کے پیچھے دہرا دہرا کر ازبر کر چکا تھا۔

"ضرورت کی ہر شے بھیج دوں گا وشی۔" وہ اسے اب ایک بچہ سمجھ کر لالی پاپ دکھا کر بہلا رہا تھا۔

"مجھے آپ کی ضرورت ہے۔"

"کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔ کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

"پریشانی چیزوں کی کمی سے زیادہ انسانوں کی

کمی سے ہوتی ہے۔ آپ کی کمی سے ہو رہی ہے۔ کیسے دور ہو گی؟" وہ خاموش ہو گیا تھا۔ کچھ سوالوں کے نصیب میں جواب نہیں ہوتے۔ وہ سوال ہی رہتے ہیں۔

پھر اس نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا، ضرورت کی ہر شے بھیجی تھی جسے عطیہ نے بند ڈبوں سمیت اسٹور میں بھر دیا تھا۔ اس کی رسائی سے دور جیسے انھوں نے بیٹے کو کیا، ویسے اشیاء کو بھی کر دیا۔ یہ سامان تو ان کی نواسی کا جہیز بننے جا رہا تھا۔ بہو کو بھلا ان چیزوں کی کیا ضرورت تھی؟

کپڑوں کے نام پہ وہ گرمی سردی، بری جہیز کے ریشمی کپڑوں میں گھومتی رہتی۔ ماہانہ خرچا اسے شوہر سے کبھی موصول ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ خود کے لیے کچھ خرید پاتی۔ کھانے پینے کو تو ویسے ہی اسے وہ ملتا جو بچا کھچا ہوتا۔ جو کوئی نہیں کھاتا تھا، وہ کھا لیتی تھی۔

میکے سے رخصت ہوتے چند نوٹ اس کی مٹھی میں پکڑا دیے جاتے جسے وہ نہ نہ کرتے ہوئے بھی اپنی غیرت کا گلا گھونٹ کر رکھ لیتی۔ ایک آدھ شاپر تھما دیا جاتا جس میں کھانے پینے کی چند اشیاء اور کچھ موسمی کپڑے ہوتے۔ اس کی بیوہ ماں اس کی شادی کے بعد اس کے حالات سمجھ کر، اس کا خرچا اٹھا رہی تھیں جو اس کا سر شرم سے جھکا دیتا تھا۔ شادی کے بعد اکثر بیٹیوں کی غیرت اسی طرح کہیں مر مرا جاتی ہے اور تب ادراک ہوتا ہے کہ ضرورت غیرت پہ بھاری ہوتی ہے۔

"جب ہم جیسی بیٹیوں کا نان نفقہ بھی ماں نے اٹھانا ہوتا ہے تو شادی نام کا ٹھپہ ہم پہ کیوں لگایا جاتا ہے۔ شوہر تو یوں بھی ہمارا بس نام کا ہی ہوتا ہے۔ لیکن جو بیڑی شادی کے نام پہ پاؤں میں پڑتی ہے اور کسی کو دکھائی بھی نہیں دیتی وہ اتنے کرب سے گزارتی ہے کہ جینے کا حق چھین لیتی ہے۔ ہم جیسی بیٹیوں کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے۔" میکے سے سسرال کے سارے رستے وہ یہی سوچتی جاتی تھی۔

☆☆☆

شادی کے سات مہینے بعد وہ وزٹنگ ویزا پہ ایک مہینے کے لیے دبئی مہروز کے پاس گئی تھی اور اس ایک ماہ میں اسے لگا تھا کہ یہ ایک بھرپور زندگی تھی جو اس نے اپنے شوہر کے ساتھ گزاری تھی۔ سسرال میں ایک دن ایک ماہ کی طرح گزرتا تھا اور یہاں ایک ماہ ایک دن کی طرح گزر بھی گیا تھا۔ چٹکی بجی اور مہینہ ختم۔ کاش کہ وہ اسے روک لیتا مگر وہ تو ڈگڈگی کا بندر تھا جو ماں کے کہنے پہ چلتا تھا، بچہ جمورا ہاتھ جوڑو اور سلام کرو، بچی کو خوش کرو اور اب ناراض ہو جاؤ۔ ٹک ٹک ناچتا ہوا، بچہ جمورا۔

"اماں وہاں اکیلی ہیں اور سارے گھر کی دیکھ ریکھ ان پہ ہے۔ انھیں تمہاری ضرورت ہے وشی۔" وہ زخم خوردہ سی شوہر کو دیکھنے لگی۔

"اور مجھے آپ کی ضرورت ہے یہ آپ کیوں نہیں سمجھتے۔" وہ نظریں چرا گیا۔

"اماں اکیلی نہ ہوتیں تو میں تمہیں مزید روک لیتا۔" کھوکھلا لہجہ، بودا بہانہ۔

"آپ نے بلا لیا اور اماں نے ایک ماہ کے لیے آنے دیا یہی بہت ہے۔ جنت جوگی نہیں تھی اسی لیے نکالی جا رہی ہوں۔" وہ فوراً سامان باندھنے لگی۔

"میں چھ ماہ بعد پھر بلا لوں گا۔" اس بار امید کے جہاں میں قدم رکھنے سے وہ منکر ہو گئی اور اسے اب منکر ہی رہنا تھا۔

پاکستان لوٹ کر بھی وہ گم صم ہی رہتی تھی اور ایسے میں اماں کے طعنے اس کی زندگی مشکل بنا دیتے۔

"جب دیکھو دبئی کی سیر کو نکل جاتی ہے اور وہیں گھومتی پھرتی رہتی ہے۔"

انہی دنوں اس کے وجود میں ایک اور وجود پنپنے لگا۔ وہ آسودہ بھی تھی اور ناصبور بھی۔ کبھی دائم المریض کی سی سدھ بدھ کھو کر گھنٹوں پڑی رہتی اور کسی کو تب

ہی خبر ہوتی جب اس سے کام پڑتا۔
مہروز کو خبر ہوئی تو وہ تو قہقہے لگاتا چلا گیا۔

”مجھے لگتا ہے وشی میرے حواس کھو گئے ہیں۔“
وہ خاموش رہی کہ وہ تو یوں بھی مختل حواس رہتی تھی۔

”میں آسمان پہ جا پہنچا ہوں۔“ وہ پھر سے دل کھول کر ہنس رہا تھا۔

”اور میں پاتال میں۔“ وہ بڑبڑائی تو اب کی بار وہ چونکا۔

”تم خوش نہیں ہو کیا......؟“ نجانے وہ زیادہ خوش تھی یا زیادہ اداس۔

”مجھے اپنے پاس بلا لیں مہروز۔“ وہ منت کرتے ہوئے رونے لگ گئی۔

”یہاں آ کر کیا کرو گی، میں آفس چلا جاؤں گا تو تم اکیلی ہو گی۔ سو مسئلے ہو سکتے ہیں۔ کون خیال رکھے گا۔ وہاں سب کے درمیان ہو۔ کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو سب بھاگ دوڑ کرنے کو ہیں۔“

وہ روتی رہی تھی۔ عورت کے آنسو مرد کا دل پگھلا دیتے ہیں لیکن یہاں تو ایسا کچھ نہ تھا۔ یا تو اس کے آنسو خالی پانی تھے یا اس کا دل پتھر۔

”میں نہیں بلا سکتا تمہیں۔ اماں نہیں مانیں گی۔“

”اماں شادی کے لیے بھی تو نہیں مان رہی تھیں۔“

”تب اور حالات تھے، اب اور حالات ہیں۔“

”حالات تب بھی یہی تھے۔ فرق حالات کا نہیں نیت کا آیا ہے۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

اور اسے جو بہت مان تھا کہ وہ سب کے درمیان ہے اور سب اس کا خیال رکھیں گے تو وہ خیال یہ تھا کہ دن بھر میں ایک دودھ کا گلاس اس کو نصیب نہیں ہوتا تھا، فروٹ کے نام پہ انگور کا دانہ تک کھانے کو نہ ملتا۔ وہ اس کا اتنا خیال کرتے تھے کہ دن بھر کا سارا کام اس کے سر ڈال دیتے تھے اور دو دو ماہ ڈاکٹر کے پاس نہیں لے کر جاتے تھے۔ وہ اس کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ اس کی دوائیاں ختم ہونے پہ پوچھتے تک نہ تھے، لانا تو دور کی بات تھی۔ مگر بات تو ماننے والی تھی کہ 'وہ سب کے درمیان تھی'۔ سب کے درمیان تھی...... تبھی تو تین وقت کی روٹی مل جایا کرتی تھی۔ احساس دلایا جاتا تھا کہ اپنے آپ کو ڈھانپ کر رکھے کیونکہ وہ سب کے درمیان ہے۔ وہ سب کے درمیان تھی تبھی درجنوں کام اور منوں کپڑے دھونے کے لیے منتظر ہوتے۔ سب کے درمیان تھی تبھی صبح فجر کے وقت اٹھتی اور رات گئے جا کر کمر سیدھی کرتی تھی۔

مہروز کہتا تھا کہ وہ ناشکری ہے، اسے شکر کرنا نہیں آتا محض شکوہ کرنا آتا ہے۔ مگر وہ اسے یہ نہیں بتاتا تھا کہ وہ کس کس بات پہ شکر کرے، شکوہ نہ کرے۔ اس نے شکوہ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا کیونکہ شکوہ اسے گراں گزرتا تھا، وہ اسے رفع نہیں کرتا تھا۔

☆☆☆

”تم کچھ کھاتی نہیں ہو؟“ دو گلیاں چھوڑ کر مائکے جانے میں بھی اس کے دو ہفتے لگ جایا کرتے تھے۔ گھر سے فرار کا دل کرتا تو چند گھنٹے مدیحہ کے پاس جاتی۔

”کھاتی ہوں امی۔“ کھانے کے نام پہ وہ کیا کھاتی ہے بس یہ چھپا گئی تھی۔

”کھانے والوں کی ایسی حالت نہیں ہوا کرتی۔“ انھوں نے اسے سر تا پیر دیکھا تھا جو پہلے سے کہیں زیادہ لاغر دکھائی دیتی تھی۔

”کھاتی ہوں بس لگتا نہیں ہے۔“ طفل تسلیاں۔

”فروٹ، دودھ، دیسی گھی زیادہ کھاؤ گی تو طاقت آئے گی۔“ وہ ماں کی محض شکل دیکھ کر رہ گئی کہ وہ سب جانتے ہوئے بھی کن چیزوں کے نام لے رہی ہیں۔

”مجھے ڈاکٹر کے لے جائیں امی۔“ اس نے سر جھکاتے آنسو چھپا لیے تھے۔

شام کو ڈاکٹر کے جانے پہ اسے ڈاکٹر سے سخت

سننے کو ملا تھا کہ وہ تین ماہ بعد آ رہی ہے۔ امی اس کی شکل دیکھتی رہ گئی تھیں۔ تین ماہ پہلے بھی وہ امی کے ساتھ ہی آئی تھی تو گویا اس دوران کوئی اسے یہاں نہیں لایا تھا۔ اس کا فشار خون کم تھا، فولاد کی کمی تھی، کیلشیم کی اشد ضرورت تھی۔ واپسی پہ وہ خاموش تھی اور امی اس سے بھی زیادہ خاموش تھیں۔ جاتے ہوئے انہوں نے اس کی مٹھی میں ڈھیر نوٹ تھمائے تھے جنہیں اس نے چپ چاپ تھام لیا تھا۔

"جو دل کرے کھانے کو مجھے بتا دیا کرو، میں دے جایا کروں گی۔ تم اپنا خیال نہیں رکھو گی تو کوئی دوسرا بھی نہیں رکھے گا۔" وہ چپ چاپ سب سنتی رہی۔ اس بار ہلکا سا بھی انکار نہیں کیا تھا پیسے تھامتے ہوئے۔ اب سوال اس کا نہیں اس کی اولاد کا تھا۔

مہروز کا فون آیا تو اس نے پوچھا تھا کہ وہ ڈاکٹر کے گئی تھی۔ اس نے سچ سچ بتا دیا کہ وہ امی کے ساتھ گئی تھی۔ وہ لحظہ بھر کو خاموش ہوا تھا۔

"خوراک ٹھیک سے لیتی ہو؟"

"تین وقت کی روٹی بمعہ سالن۔"

"بس؟" وہ حیران ہوا تھا۔ اس حالت میں تو اسے بہت عمدہ غذا درکار تھی اور وہ معمولی غذا گنوا رہی تھی۔

"زندہ رہنے کے لیے جتنا چاہیے ہوتا ہے مجھے مل رہا ہے۔" وہ بالکل چپ ہو گیا تھا کہ مہروش کو لگا رابطہ منقطع ہو چکا ہے۔ اس نے فون رکھ دیا تھا۔ اگر وہ شرمسار تھا تو اس کے لیے بے فائدہ تھا، بے یقین تھا تو بھی اسے کیا حاصل تھا۔

مہروز نے شاید اپنے تئیں عطیہ بیگم سے اس کا خیال رکھنے کا کہا تھا تبھی وہ اس کے خلاف نیا محاذ کھولے بیٹھی تھیں۔ اس نے کان بند کرنے کے ساتھ کمرہ بھی بند کر لیا تھا۔ اگلی بار مہروز کا فون آیا تو اس نے صاف کہہ دیا۔

"آپ اماں سے کچھ مت کہا کریں۔ میرے لیے آسانیاں پیدا نہیں کر سکتے تو مشکلات بھی مت کھڑی کریں۔"

"تمہاری آسانی کی ہی کوشش کی تھی۔"

"میری آسانی چاہتے ہیں تو مجھے ساتھ رکھیں ورنہ کچھ مت کریں۔"

"اس گھر کا خرچا میں چلاتا ہوں اور اس خرچے پہ میری بیوی اور بچے کا مکمل حق ہے۔"

"حق کی بات وہ کرتا ہے، جس نے خود حق دیا ہو۔" وہ تلخ ہو رہی تھی کیونکہ حالات نے اسے ایسا کر دیا تھا۔

"تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں نے تمہیں تمہارا حق نہیں دیا۔"

"میں بالکل یہی کہنا چاہتی ہوں۔" اس نے بنا کسی لگی لپٹی کے کہا تو مہروز نے فون بند کر دیا۔ اس دن کے بعد سے پھر اس کا فون نہیں آیا۔ مہروش نے بھی خود پہ جبر کر لیا تھا۔

"ٹھیک ہی ہے، کم از کم اس سے ہمارے درمیان مزید تلخی نہیں بڑھے گی۔"

☆☆☆

اس کا ساتواں مہینہ شروع ہوتے ہی پیچیدگیاں اتنی بڑھ گئیں کہ اس کی ڈاکٹر نے جلد آپریشن کی تجویز دے دی۔

"میں اپنے شوہر سے مشورہ کر لوں؟" وہ اتنا بڑا فیصلہ اکیلے نہیں لے سکتی تھی۔

"میں نے آپ سے مشورہ مانگا نہیں ہے، حل بتایا ہے کہ آپ کو ہر حال میں آپریشن کروانا ہے اور جلد کروانا ہے۔ آج یا پھر کل۔" گھر پہنچ کر اس نے اتنے ہفتوں بعد دبئی کال ملائی تھی۔ کسی خبرنامے کی طرح، بنا تاثر کے ساری بات بتائی تھی۔

"ضروری ہے تو کروانا تو پڑے گا نا۔ میں رقم بھجوا دیتا ہوں۔"

"آپ کب آ رہے ہیں؟" رقم کی بات اس نے ان سنی کر دی۔ وہ جیسے چپ ہو گیا۔

"میں نے اگلے ماہ کی چھٹی کے لیے اپلائی کیا تھا۔"

"ایمرجنسی بھی کسی چیز کا نام ہے۔" وہ یہاں

اس حال میں تھی کہ کوئی بھی اس کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھا اور شوہر یہ بتا رہا تھا کہ وہ اگلے ماہ آ رہا ہے۔

"یہاں بہت سے پاکستانی اپنی چھٹی پہ گھر گئے ہوئے ہیں۔ میں اپنی باری پہ ہی آ سکتا ہوں۔" اس کی مجبوری سننے میں وہ دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔

"جو شخص میری مشکل میں میرے پاس نہیں ہے، وہ بھلے پھر بھی آئے یا نہیں مجھے پروا نہیں ہے۔" اس نے فون بند کرتے دیوار پہ دے مارا تھا۔ روتے ہوئے فشار خون بلند ہوا تو وہ کمرے میں گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔

☆☆☆

خوراک کی کمی اور اتنی پیچیدگیوں کے باوجود اس نے ایک صحت مند بچے کو جنم دیا تھا۔ گھر کا پہلا پوتا جسے دادی نے سینے سے بھینچ لیا تھا۔ یک دم اس کی اہمیت بڑھ گئی تھی کیونکہ وہ بیٹے کی ماں بنی تھی۔ مہروز بہت خوش تھا یہ اسے دوسروں کی زبانی پتا چلا تھا کیونکہ اس نے اس سے فون پہ بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ہسپتال سے گھر آ گئی تھی لیکن وہ بالکل خاموش تھی۔ نہ وہ کسی سے بات کرتی تھی، نہ اس نے بیٹے کو گود میں لیا تھا۔ نہ اسے چوما نہ ہی دودھ پلایا۔ نہ اسے بچے کا نام رکھنے میں کوئی دلچسپی تھی۔

اس کی ڈاکٹر کہتی تھیں کہ اکثر عورتیں بچے کی پیدائش کے بعد وقتی کیفیت سے دوچار ہوتے ایسی ہو جاتی ہیں اور پھر ٹھیک بھی ہو جاتی ہیں، وہ بھی ٹھیک ہو جائے گی لیکن دو ہفتے بعد بھی اس کی حالت جوں کی توں رہی تھی۔

ذرا جو عطیہ بیگم کمر سیدھی کرنے کو لیٹیں تو پورے گھر میں بچے کے رونے کی آواز گونجنے لگی تھی۔ بڑی مشکلوں سے وہ اٹھ کر آئیں تو عیشان اکیلا کمرے میں پڑا رو رہا تھا اور مہروش کمرے سے غائب تھی۔

"کسی کو ہوش نہیں ہے کہ معصوم جان کیسے بھوک سے بلک رہی ہے۔ بس مفت کی روٹیاں توڑنا آتی ہیں سب کو۔" فیڈر اس کے منہ کو لگایا تو اسے قرار آ گیا۔

"ڈائن کہیں کی نجانے کہاں مر مرا گئی ہے۔ نجانے کون سے غم ہیں جو غلط ہونے میں نہیں آ رہے۔ کہاں سے پلے پڑ گئی ہے ہمارے جو اپنی اولاد کو ہی نہیں دیکھتی۔" بچے کو تھپکتے ہوئے مسلسل بولتے وہ ٹیرس پہ نکل آئی تھیں جہاں وہ بال بکھرائے ریلنگ کے ساتھ جڑی بیٹھی تھی۔

"کیسی ماں ہے تو؟ مائیں کیا ایسی ہوتی ہیں جو اپنی اولاد کو دو گھڑی دیکھ نہ سکیں۔"

"ماں نہیں ہوں، ڈائن ہوں میں اور اسے کھا جاؤں گی۔ لے جائیں اس سنپولیے کو اپنے ساتھ ورنہ اس کی جان لے ڈالوں گی۔" اس نے رخ موڑ کر عطیہ بیگم کو یوں دیکھا جیسے اس پہ سایہ ہو گیا ہو۔ عطیہ بیگم گھبرا کر وہاں سے الٹے قدموں ہی بھاگ آئیں۔ مہروز کو دس آگے پیچھے کی لگا کر نجانے کیا سنائیں کہ رات وہ مسلسل اسے فون کرتا رہا تھا۔ اس کا نام جلتے بجھتے وہ دیکھتی رہی لیکن فون نہیں اٹھایا۔ اگلے کئی دن وہ اسی طرح اسے فون کرتا رہا تھا لیکن وہ خالی نظروں سے فون کو دیکھتی تھی، اٹھاتی نہیں تھی۔

عیشان تب سے عطیہ بیگم کے پاس تھا۔ امی اس سے ملنے آتیں، باتیں کرتیں، کپڑے بدلواتیں اور چلی جاتیں۔ کھانا اس کے کمرے میں یوں بھیجا جاتا جیسے وہ قیدی ہو اور اسے یہ گھر قید ہی لگتا تھا۔

"مہر۔ جب عورت ماں بنتی ہے تو مکمل ہو جاتی ہے۔ دنیا کا عظیم کام اس کے سپرد کیا جاتا ہے۔ ایک عظیم ہستی کی ایسی حالت نہیں ہو سکتی۔"

"اسفل کبھی افضل نہیں ہوا کرتا۔ ماں بن کر بھی میں ادھوری ہوں۔" کتنے دنوں کے بعد اس نے اپنی ماں کی بات کا جواب دیا تو انہیں کچھ حوصلہ ہوا کہ وہ ان کی بات سننے کو تیار ہے تو سمجھے گی بھی۔

"دنیا کی کوئی طاقت ماں کی عظمت سے انکار نہیں کر سکتی کیونکہ یہ عظمت سب سے بڑی طاقت نے اسے عطا کی ہے۔ اب تم ایک بیٹے کی ماں ہو تو تمہاری اہمیت بھی مختلف ہو گی۔" دیسی گھی کی پنجیری وہ اسے دودھ کے ساتھ زبردستی کھلا رہی تھیں۔ ایسی

خوراک اس کے لیے بے حد ضروری تھی جو اسے قوت دے۔

''اہمیت اس بچے کی ہو گی، میری نہیں۔ میں تو اب بھی وہی ہوں جسے بڑی چاہ سے بیاہ کر لایا گیا تھا لیکن اسی چاہ سے بسایا نہیں گیا۔ جس محبت کی وکالت پہ وہ رشتہ جوڑنے آیا تھا، اسے تو میں نے نکاح کے ساتھ رخصت ہوتے پایا ہے۔ وہ کون سے بول ہوتے ہیں جو محبت کو باندھ دیتے ہیں، مجھے وہ بول بے مول لگے امی۔'' اسے شکوہ تھا، بجا تھا۔

''وہ تمہارا بیٹا ہے مہر، باقی دنیا کا بدلہ اپنی اولاد سے کون لیتا ہے۔'' مدیحہ نے اسے احساس دلانے کی کوشش کی۔

''وہ اس گھر کا پوتا ہے اور بس۔'' اس نے امی کا ہاتھ پرے کر دیا تھا۔ وہ مہروز کی درخواست پہ اسے سمجھانے آئی تھیں لیکن ان کا سمجھانا بھی جیسے بے سود تھا۔ واپس جا کر انھوں نے داماد کو صاف بتا دیا تھا۔

''اس وقت تم ہی ہو جو اسے سنبھال سکتے ہو۔ تمہیں یہاں ہونا چاہیے اس کے پاس۔ اگر اب بھی تم نہ آئے تو مہر کی طرح میں بھی یہی سمجھتی ہوں کہ پھر تم بھلے آؤ نہ آؤ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' جواباً وہ خاموش رہا تھا۔

☆☆☆

وہ رات گئے پاکستان پہنچا تھا اور گھر پہنچتے پہنچتے ایک بج گیا تھا۔ عیشان عطیہ بیگم کے پاس ہی ان کے کمرے میں کھیل رہا تھا۔ مہروش وہاں نہیں تھی۔ مہروز نے عیشان کو دیکھتے ہی اسے خود سے بھینچ لیا تھا۔ اولاد کے وجود کی ٹھنڈک کیا ہوتی ہے یہ اولاد کو چھونے سے ہی پتا چلتا ہے، دنیا کا کوئی بول اس تجربے کا مول نہیں ہے۔ وہ اس کے ساتھ کھیلتے کھیلتے وہیں سو گیا تھا۔ صبح فجر کے وقت اس کی آنکھ کھلی تھی جب عیشان رو رہا تھا۔ اس نے عطیہ بیگم کو آواز دی تو وہ بڑبڑاتے ہوئے سو گئیں۔

''آج خود دیکھ لے۔ اتنے دن سے میں ہی دیکھ رہی ہوں۔ اولاد تیری ہے، بھگت میں رہی ہوں۔'' وہ عیشان کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ وہ جاگ رہی تھی لیکن اسے دیکھ کر بھی ان دیکھا کر گئی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے، شاید وہ خود کلامی کر رہی تھی۔

نو ماہ بعد وہ اسے اپنے سامنے دیکھ رہا تھا اور وہ پہلے سے آدھی بھی نہیں رہی تھی۔۔ کملائی ہوئی رنگت، اندر کو دھنسی بے نور آنکھیں، پپڑی جمے لب، بکھرے الجھے بال۔ وہ کہیں سے بھی مہروش نہیں لگ رہی تھی۔ اس کا دل کانپ کر رہ گیا۔

''وشی یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ عیشان اس کی گود میں ہی دوبارہ کسمسا کر سو چکا تھا۔ اسے اماں کی زبانی سب پتا چلتا تھا لیکن وہ اس قدر دگرگوں حالت میں تھی یہ نہیں پتا چل سکا۔ شاید وہ خود ہی کوتاہ اندیش تھا۔

''میں آ گیا ہوں، مجھ سے بات تو کرو۔'' وہ ہنوز ایسے ہی لیٹی رہی کہ اب نہ کسی کے آنے سے فرق پڑتا تھا نہ جانے سے۔ اسے بلانے کی وہ بہت کوشش کرتا رہا لیکن اس نے جواب میں ایک بار بھی ہوں ہاں نہیں کی تھی۔

اگلی صبح وہ اسے زبردستی ڈاکٹر کے لے گیا تھا۔ اس کا تفصیلی معائنہ ہوا تھا۔ وہ پوسٹ پریگنینسی ڈپریشن کا شکار رہی تھی۔

''انسان کے اندر ایک عرصے تک بہت کچھ جمع ہوتا رہے تو ڈپریشن کی صورت میں ایسے ہی باہر نکلتا ہے۔ ہمارے ہاں اکثر خواتین پریگنینسی میں ڈپریشن کا شکار ہوتی ہیں اور کچھ اس کے بعد۔ ایسے میں ان کو الزام دینے یا باتیں سنانے کے بجائے ان کا ساتھ دینا چاہیے۔ خواتین ایسے میں بچے کو بوجھ سمجھتی ہیں، اسے دیکھنا، اٹھانا، بہلانا، کھلانا پلانا نہیں چاہتیں۔ اپنا بچہ ہی انھیں برا لگتا ہے۔ وہ اس سے چھٹکارا پانا چاہتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ اس کی ماں نہیں ہیں یا کسی بھی دوسری ماں کی نسبت ان کے جذبات کم ہیں۔ یہ ایک وقتی فیز ہوتا ہے جو ختم ہو جاتا ہے۔ یہ سب وہ جان بوجھ کر نہیں کرتیں، ایک بیماری

ہے جس پہ ان کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔
مہروش کے اندر بھی بہت غصہ ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ بہت تنگ حالات کا شکار رہی اور ایسے میں اسے کہیں سے بھی ہمدردی سننے کی بجائے باتیں سننے کو ملتی رہیں حتیٰ کہ آپ سے بھی۔ اس کی حالت نازک تھی اور ایسے میں اسے اپنا شوہر اپنے پاس چاہیے تھا، جب آپ اس وقت اس کے ساتھ نہیں آئے تو اندر کا سارا غصہ باہر ابل آیا جو اب دیکھنے میں آرہا ہے۔ وہ خود کو اکیلا سمجھتی ہے۔ اسے اس بچے میں بھی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ اس بچے نے حالات کو اس کے لیے مزید مشکل بنایا ہے۔ وہ اپنی ساری تکالیف میں اکیلے سفر کرتی رہی ہے۔ آپ نے اس دوران اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اسے محبت، توجہ اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔ بچے سے زیادہ اسے اہمیت دیں تاکہ وہ یقین کر سکے کہ وہ جو اس بچے کو اس دنیا میں لائی ہے، وہ اس سے زیادہ آپ کے لیے اہم ہے۔ اسے بولنے پہ اکسائیں اور اپنے اندر کی ساری کرواہٹ نکالنے دیں۔ اس کا دماغ ایک پریشر ککر بنا ہوا ہے اور آپ کو اس پریشر کو ہٹانا ہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اسے اپنے ساتھ رکھیں۔" وہ سر جھکائے سب سن رہا تھا۔ مزید کچھ ہدایات اور ادویات لے کر وہ مہروش کو گھر لے آیا تھا۔

☆☆☆

"میری کیا پروا ہے تمہیں، اپنے بیٹے کے لیے آیا چاہیے، اسی لیے یہ سب کر رہے ہو۔" وہ اسے زبردستی ادویات دیتا تھا جسے اکثر وہ تھوک دیا کرتی تھی۔ کبھی اس کے منہ پہ اگل دیا کرتی تھی۔ وہ خاموشی سے جا کر چہرہ اور جگہ دھو دیا کرتا تھا۔ اسے اس سب پہ صبر کرنا تھا کیونکہ وہ اسی کی وجہ سے اس حال کو پہنچی تھی۔
"تم تو بڑی محبتوں کے دعوے لے کر آئے تھے، سب جھوٹ اور بکواس تھا۔" بنا کوئی جواب دیے وہ اپنا کام کرتا رہتا۔ اسے سنبھالنے کے ساتھ وہ عیشان کو بھی دیکھتا تھا۔
"مجھے آزاد کر دو۔ میں نے غلط کیا تم سے شادی کر کے۔ مجھے ماننا ہی نہیں چاہیے تھا۔" وہ جونکا ضرور تھا، کہا کچھ نہیں تھا۔ وہ جس حالت میں تھی اس کی بات پہ غور کرنا بھی حماقت کے مترادف تھا اور اب مزید حماقت وہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔
"کیوں باندھ رکھا ہے مجھے۔ میرا دم گھٹتا ہے یہاں۔ اگر تم مجھے نہیں چھوڑو گے تو میں خود بھاگ جاؤں گی ایک دن۔"
نوالے بنا بنا کر وہ اس کے منہ میں ڈالتا تھا۔ کبھی وہ ہذیانی انداز میں اس کے ہاتھ پہ کاٹ لیا کرتی۔ اب تک ساری اذیت اس نے اکیلے سہی تھی، اب اس کے ساتھ وہ بھی سہہ رہا تھا۔
جیون ساتھی ہونا محض ایک رشتہ بنانا نہیں ہوتا، اس رشتے کو تمام آزمائشوں میں جیون بھر نبھانا ہوتا ہے۔
"تم جو کہنا چاہتی ہو، جتنا بھی برا بھلا سنانا چاہتی ہو سنالو۔ میں آج سب سنوں گا۔ تمہاری ایک ایک بات سننے آیا ہوں۔ آج تمہیں بولنے کا پورا حق ہے۔" اسے بس حق تفویض کرنے کی ہی دیر تھی کہ وہ زور زور سے رونے لگ گئی تھی۔ وہ خاموشی سے اسے روتے دیکھ رہا تھا۔ اچھا تھا کہ وہ روتی، چیخ کر اندر باہر سب ایک کر لیتی۔
"مجھے اس گھر میں تم ساری برادری کے سامنے لائے تھے، میں بھاگ کر یا قیدی بن کر نہیں آئی تھی۔ پھر مجھے کس لیے سزا دی گئی۔ کیوں اٹھتے بیٹھتے مجھے طعنے سنائے گئے کہ جیسے میں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہوں۔ بیوی کا فرض شوہر کی خدمت ہے، اس کا حکم ماننا ہے جو میں نے پورا کیا۔ جواباً مجھے میرے کون سے حقوق دیے گئے؟ سسرال کی خدمت بیوی کا فرض نہیں ہے، شوہر کے حکم پہ اگر وہ کرتی ہے تو اس کی احسان مندی ہے۔ میں نے یہ احسان پھر بھی ذمہ داری سمجھ کر کیا لیکن بدلے میں مجھے کیا ملا؟ کوئی بھلے مجھے اپنی ذمہ داری نہ سمجھتا، احسان بھی نہ کرتا لیکن

انسان سمجھ کر تھوڑی انسانیت تو دکھا دیتا۔ میں اس گھر میں تمہارے ساتھ بیاہ کر آئی تھی، تمہارے گھر والوں کے ساتھ نہیں۔ تمہارے ساتھ رہنا میرا حق تھا جو تم نے مجھے نہیں دیا لیکن مجھ سے میرے فرائض سے زیادہ مانگتے رہے۔ شادی کے بعد بھی اگر تم نے مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھنا تھا، میرے خرچے پورے نہیں کرنا تھے، میری کوئی ذمہ داری نہیں اٹھانا تھی تو مجھ سے شادی کیوں کی تھی؟"

وہ اس کا گریبان تھامے جھنجوڑ رہی تھی۔ مہروز اذیت سے اس کی خون رنگ ہوتی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔

"تم نے کبھی ماہانہ خرچا نہیں بھیجا، مجھ سے میری ضروریات کا نہیں پوچھا، تم مجھے فون صرف ان شکایات کے بارے میں بتانے کے لیے کرتے تھے جو تمہاری ماں کو مجھ سے تھیں، تم نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ مجھے کوئی تنگی تو نہیں ہے۔ تم نے ہمیشہ مجھے جتایا کہ میں اچھی بہو نہیں ہوں، لیکن کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ کیا تمہاری ماں اچھی ساس ہیں۔ تم نے ہمیشہ اپنی ماں کی ہر بات کا یقین کیا لیکن کبھی مجھے یہ موقع نہیں دیا کہ میری کوئی بات سنی جائے اور اس کا یقین کیا جائے۔"

مہروز نے سر جھکا لیا تھا۔ وہ مانتا تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک طرف جھک گیا تھا۔ اس کا پلڑا ماں کی طرف ہی جھکا رہا اور پھر دوبارہ نہیں اٹھا۔ یہ اس کی غلطی تھی اور اس کا خمیازہ وہ آج بھگت رہا تھا۔

"ہاں میں مانتی ہوں کہ میں اچھی بہو نہیں بن سکی کیونکہ میں یہاں اچھی بیوی بننے آئی تھی بہو نہیں۔ لیکن میں نے پھر بھی اچھی بہو بننے کی کوشش کی تھی، یہ اور بات ہے کہ کوئی تسلیم کرنے والا نہیں تھا کہ میں ایک اچھی بہو ہوں۔"

مہروز نے نرمی سے اس کے ہاتھ تھامے۔

"میں مانتا ہوں کہ تم اچھی بہو ہو، تم اچھی بیوی بھی ہو اور اب اچھی ماں بھی بنو گی۔" زندگی میں پہلی بار اس نے اعتراف کیا تھا جس پہ وہ تلخی سے ہنسی تھی۔

"لیکن تم اچھے شوہر نہیں ہو۔ ہاں بیٹے تم بہت اچھے ہو۔" وہ ٹھیک کہہ رہی تھی، وہ اچھا شوہر ہوتا تو وہ اس حال میں تھوڑا ہی ہوتی۔

"بلکہ تم نے تو اچھا شوہر بننے کی سرے سے کوشش ہی نہیں کی۔ ساتھ لے جانا الگ بات لیکن تم نے کبھی میری تکالیف کا احساس کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ تم نے تو یہ تک جاننے کی کوشش نہیں کی تمہاری بیوی جس حال میں ہے اس کی غذائی ضروریات پوری بھی ہوتی ہیں یا نہیں۔"

"میں تم سے پوچھا کرتا تھا۔"

"پوچھنے سے اگر سارے فرائض پورے ہو جاتے ہیں تو میں تو ایک بہترین بہو ہوں جو محض پوچھتی نہیں تھی بلکہ دن رات خدمت بھی کرتی تھی۔ پھر بھی مجھے سزا سنائی گئی تو تم کیسے بری الذمہ ہو گئے؟ میں نے بیوی اور ماں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کا تمہیں نہیں کہا تھا کہ مجھے تمہیں تمہاری جنت سے محروم کرنے کا کوئی حق نہیں تھا تو تمہیں کیا حق تھا کہ مجھے میری جنت سے محروم کرو۔ آدم اور حوا ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں، کسی تیسرے کے لیے نہیں کہ انہیں کسی تیسرے کے لیے دور کر دیا جائے۔" وہ سر جھکائے اس کے حرف حرف سے متفق تھا۔

"عورت کے سارے رشتے مرد سے ہوتے ہیں۔ مرد ہی اگر اسے بے وقعت سمجھے تو اور کون اس کی قدر کرے گا؟ وہ جس بچے کو جنم دیتی ہے وہ صرف اس کا نہیں ہوتا مرد کا بھی ہوتا ہے۔ بچے کی ہر تکلیف ماں اٹھاتی ہے لیکن باپ کو اس کی تکلیف کا احساس کرنے کے لیے اس کے ساتھ تو ہونا چاہیے، ایک ایک پل کا گواہ تو بننا چاہیے۔ اگر وہ اتنا بھی نہیں کر سکتا تو بعد میں حق جتانے بھی مت آئے۔ تم تو آخری پل میں بھی میرے ساتھ نہیں تھے مہروز۔ اگر کسی پل میرے اور بچے میں سے کسی ایک کو بچانا ہوتا تو یہ فیصلہ کون لیتا۔ وہاں سات سمندر پار بیٹھ کر تم لے پاتے؟" وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیے بری طرح رو دی تھی۔

"میری غیر ذمہ داری، لاپروائی کے لیے مجھے معاف کردو وشی۔" وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہہ رہا تھا۔

"مجھے کیا ملا اس شادی سے؟ نہ مان، نہ امان۔ میں بس رل گئی ہوں۔"

مہروز نے اسے اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا تھا اور وہ کسی نازک سی گڑیا کی طرح اس کے سینے سے لگی روتی رہی تھی۔

☆☆☆

جتنے دن وہ وہاں رہا اس نے پہلے سے بھی بدتر حالات دیکھے تھے۔ بھائی اسی طرح اپنی لاابالی طبیعت کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔ نہ کوئی کام کرتے تھے نہ کرنا چاہتے تھے۔ اوپر سے عطیہ بیگم انہیں مزید شہ دیتیں۔ مہروش بھی اب پہلے سے بہتر ہو گئی تھی۔ عیشان کو اس نے خود سنبھالنا شروع کر دیا تھا۔ اس فیز سے وہ باہر آ چکی تھی۔

پچھتاووں کا ایک جہاں مہروز کے اندر آباد ہو گیا تھا۔ وہ جن گھر والوں پہ بہت مان کر کے اپنی بیوی کو وہاں چھوڑ کر گیا تھا، جن کے لیے وہ پردیس میں اکیلا رہتا اور کماتا تھا، انہوں نے یہ صلہ دیا تھا کہ اس کا گھر تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

ایک مضبوط پل تھا فیصلے کا جو آیا اور گزر گیا پھر سب آسان ہو گیا۔ وہ رات کو اماں کے کمرے میں آیا تھا۔

"اماں میں دو ہفتے بعد واپس جا رہا ہوں اور وشی عیشان میرے ساتھ جا رہے ہیں۔" عطیہ بیگم کو کرنٹ لگا تھا۔

"میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں امی اور لباس بنا انسان برہنہ ہو جاتا ہے۔ انھیں ایک ساتھ ہی رہنا چاہیے ورنہ وہ کہیں کے نہیں رہتے۔ فاصلے دوریاں اور مشکلات پیدا کرتے ہیں اسی لیے میرے بیوی بچے بھی وہیں رہیں گے جہاں میں رہوں گا۔" ماں کے کچھ بھی کہنے سے پہلے اس نے مضبوط لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر انہیں کہا تھا۔

"ایک دم سے کیا ہوا ہے؟" اب بھی وہ یہ پوچھ رہی تھیں۔ کیا یہ سب ایک دم ہوا تھا؟

"میں اکیلا رہ رہ کر تھک گیا ہوں۔ میرا بیٹا کل کو بڑا ہوگا اور میں نہیں چاہتا کہ جیسے میں نے بچپن میں باپ کی کمی محسوس کی ہے وہ بھی کرے۔ میں زندہ ہوں تو مجھے میری اولاد کے سر پہ گھنے سائے کی طرح موجود ہونا چاہیے۔ جہاں تک گھر کے خرچے کی بات ہے، وہ میں بھیجتا رہوں گا۔ ہم سال میں ایک چکر لگایا کریں گے۔ آپ اگر خوشی خوشی اجازت دیں گی تو بہترین ورنہ میں نوکری چھوڑ کر یہاں آ جاؤں گا لیکن اب وہیں رہوں گا جہاں میری بیوی بچے ہیں۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ نکل گیا تھا اور عطیہ بیگم سکتے کی سی کیفیت میں کچھ کہہ ہی نہیں پائی تھیں۔

☆☆☆

وہ خوشی خوشی سارا سامان پیک کر رہی تھی اور وہ باہر ٹیرس سے اندر کا منظر دیکھ رہا تھا جہاں مہروش کے چہرے کی آسودگی اور طمانیت

اس کے دل کو مزید مطمئن کر رہی تھی۔ عطیہ بیگم نے بھلے برے دل سے ہی لیکن اسے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی۔

"عورت کانچ سی نازک ہوتی ہے جس کی قوت اس سے جڑا مرد ہوتا ہے۔ مان دے دے تو معتبر ہو جائے، امان دے دے تو طاقت ور۔ رشتوں کو متوازن مرد رکھتا ہے کیونکہ یہ کام اسے سونپا گیا ہے۔ سب رشتے میزان میں رکھ کر برابر تولے جائیں تو کوئی شاکی نہ ہو۔ ترازو ایک طرف جھکنے لگے تو مرد عادل نہیں رہتا۔ میں اچھا بھائی، بیٹا بن گیا تو اچھا شوہر اور باپ بننا بھول گیا۔ اب مجھے نئے سرے سے شروع کرنا ہے اور سب رشتوں کو برابر تولنا ہے۔"

اس نے ایک آسودہ سی گہری سانس لی اور مہروش کی مدد کے لیے اندر چلا گیا۔ اگلی صبح ان تینوں کی فلائٹ تھی دبئی کے لیے، ایک نئی زندگی کے لیے۔

☆

حوریہ بتول

تم میرے لیے کافی نہیں ہو

محبت کے ہنڈولے پر سوار ہولے ہولے ہواؤں میں آسمانوں کو چھونا عجب دلفریب احساس ہوتا ہے۔ لیکن جب وہی دلفریب احساس تکلیف کا باعث بننے لگے تو محبت بھی اہمیت کھو دیتی ہے۔

شادی کے کچھ عرصے بعد عانیہ شوہر سے ناراض ہو کر میکے آ بیٹھی۔ یہ تو چلو کوئی اتنی اچنبھے والی بات نہیں ایسی چھوٹی موٹی ناراضیاں تو ازدواجی زندگی کا حسن ہوتی ہیں۔ لیکن عانیہ نے خلع لینے کا فیصلہ سنا کر ہر سننے والے کو حیرت کی اتھاہ گہرائیوں میں اتار دیا۔ جو بھی سنتا اس کی حیرت سے آنکھیں پھیلنے لگتیں۔

گھر والوں نے لاکھ سمجھایا لیکن عانیہ اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی ہلنے کو راضی نہ تھی۔

سحر پھوپھو (ساس) اپنے چند سسرالی رشتے داروں کو ساتھ لیے عانیہ کا فیصلہ بدلوانے آئی بیٹھی تھیں۔

"برا نہ ماننا صفیہ۔ بہت ناشکری ہے تمہاری عانیہ۔ اس قدر چاہنے والے شوہر کو دنیا کے سامنے رسوا کر رہی ہے۔ ساری زندگی تم ناشکری کرتی رہیں۔ بیٹی کو بھی یہی سیکھ دے کر بھیجا۔" پھوپھو نے لگے ہاتھوں امی کو بھی لتاڑ دیا۔

"ارے بھئی۔ ہم گواہ ہیں۔ زورین پاگلوں کی طرح عانیہ کو چاہتا ہے۔" سحر پھوپھو کی چھوٹی نند نے آنکھیں گھماتے ہوئے لقمہ دیا۔

وہ سب اس کی امی کے پاس بیٹھے زور و شور سے زورین کے حق میں دلائل دے رہی تھیں۔ اور امی بے چاری چپ بیٹھے ہوئے سنتی جا رہی تھیں۔ نند کے سامنے ویسے بھی ان کی ایک نہ چلتی تھی۔ کہتیں بھی تو کیا۔ وہ خود عانیہ کی ضد پر شرمندہ تھیں۔ لیکن اس شرمندگی پر ایک سوچ غالب آنے لگتی۔

"آخر کوئی تو بات ہے۔ جو ہر بڑی سے بڑی بات چٹکیوں میں اڑا دینے والی عانیہ اتنا بڑا فیصلہ کیے بیٹھی ہے۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے فیصلے کی بھی کوئی تو وجہ ضرور ہوتی ہے۔ یہ تو پھر اتنا بڑا فیصلہ ہے۔"

آصف صاحب بہن کے رویے اور بیٹی کی حالت پر حد سے زیادہ دل برداشتہ تھے۔ بہن کی اپنے سسرالیوں کے ساتھ آمد کا سن کر دوست کے ہاں چلے گئے۔ ابھی وہ کسی کا سامنا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

کمرے میں بے حس و حرکت لیٹی عانیہ سوچ رہی تھی۔ زورین پاگلوں کی طرح چاہنے کے بجائے صرف چاہتا تو یہ نوبت کبھی نہ آتی۔

اللہ تعالیٰ نے ہر تعلق کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھال رکھا ہے۔ ہر رشتہ ہمارے دل میں اپنے مقام پر ایستادہ ہوتا ہے۔ کسی ایک رشتے کے لیے دوسرے رشتوں کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔" یہ بات زورین سمجھنے کو تیار نہ تھا۔

☆☆☆

عانیہ اور زورین کی تو میرج ہوئی تھی۔ اس کی پھوپھو کا اکلوتا بیٹا لندن سے تعلیم مکمل کر کے واپس آیا تھا۔ اسی خوشی میں سب رشتے داروں کے لیے ایک شاندار سی دعوت رکھی گئی۔

زورین نے دعوت میں اپنے گھر عانیہ کو دیکھا

اور پہلی نظر کی محبت کا شکار ہو گیا۔ چار سال پہلے جب وہ لندن سدھارا تھا۔ تب تو کبھی ایسا کچھ سوچا نہیں۔ لیکن اب باہر رہ کر وہ مشرقی حُسن اور روایات کا دل دادہ ہو گیا تھا۔ اس لیے اپنے ماموں کی خوب صورت اور معصوم بیٹی اس کے دل کی خواہش بن گئی۔ عانیہ کو بھی اپنا ہینڈسم سا کزن بہت اچھا لگا۔

ان دونوں کے درمیان ظالم سماج والا کوئی چکر نہیں تھا اسی لیے دونوں طرف سے پسندیدگی کی سند ملتے ہی چند دنوں میں ہی منگنی کے خوبصورت بندھن میں بندھ گئے۔ عانیہ محبت کے اس دور میں تھی۔ جب محبوب کی پابندی بھی محبت لگتی ہے۔

”عانی! مجھے تمہاری دوست عائشہ بالکل اچھی نہیں لگتی۔ تم اس سے نہ ملا کرو۔“

زورین کے کہنے پر عانیہ نے بنا وجہ پوچھے عائشہ سے دوری اختیار کر لی۔

"عانی تم ہلکے ڈیسنٹ رنگ پہنا کرو۔"
گہرے رنگوں پر جان دینے والی عانیہ خوشی خوشی ہلکے رنگ پہننے لگی۔
"عانیہ! تمہیں میرے ہوتے ہوئے بھی کیا کسی اور کی ضرورت ہے؟ اپنی دوستوں جیسی کزن کی شادی میں جانے کے ذکر پر زورین کے لگاوٹ سے پوچھنے پر عانیہ نے بنا سوچے نفی میں گردن ہلا دی۔
منگنی کے بعد عانیہ اپنے بہن بھائیوں تک سے دور ہو گئی۔ زندگی کا ایک ہی محور تھا۔ زورین اور بس زورین۔ منگنی کو بمشکل چھ ماہ ہوئے تھے۔ زورین نے شادی کا شور ڈال دیا۔ عانیہ کے فائنل ایگزامز سر پر تھے۔
سب نے بہت سمجھایا۔ دو ماہ کی بات ہے بچی کو اطمینان سے امتحان دے لینے دو۔ لیکن وہ زورین ہی کیا جو کسی کی مان لے۔ عانیہ تو اس بے تابی پر پھولے نہ سمارہی تھی۔ اتنی محبت کرنے والا ہمسفر ہو تو اور بھلا کیا چاہیے۔
"امی آپ پھوپھو کو شادی کی تاریخ دے دیں میں شادی کے بعد ایگزامز دے لوں گی۔"
بیٹی کے کہنے پر صفیہ بیگم چپ سی ہو گئیں۔ صفیہ بیگم کو یہ بات بالکل اچھی نہیں لگی کہ بچی اپنی شادی کا فیصلہ خود کرے۔
انہوں نے آصف صاحب سے ڈھکے چھپے لفظوں میں بات کی۔
"آپ سحر آپا سے کہہ دیں۔ ہم بس بچی کے امتحانوں کے بعد کی تاریخ دیں گے۔"
"جب سب راضی ہیں تو تمہیں کیوں اعتراض ہے صفیہ بیگم؟" تیکھی نظریں بیوی کے چہرے پر ٹکا کر آصف صاحب نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔
"میں بس عانیہ کے امتحانوں کی وجہ سے کہہ رہی ہوں۔" صفیہ بیگم منمنائیں۔
"تم تو پہلے دن سے ہی اس رشتے کے خلاف ہو۔ ساری عمر تم نے کٹھور بھاوج کا کردار نبھایا ہے۔ اب اپنی انا چھوڑو۔ اور اولاد کا سوچو۔" آصف صاحب نے طنز کے تند و تیز تیر چلائے۔
شوہر کے سامنے صفیہ بیگم کی ایک نہ چلی اور ٹھیک عانیہ کے ایگزامز سے ایک ماہ پہلے وہ عانیہ آصف سے عانیہ زورین بن گئی۔ خاندان کی پہلی شادی تھی۔ اس لیے سب جوش و خروش سے اپنے گھر آنے کے دعوت نامے شادی میں ہی دینے لگے۔
ولیمہ سے اگلے دن زورین نے تمام رشتہ داروں سے دعوتوں میں نہ آنے کی پیشگی معذرت کی اور عانیہ کو ایک ماہ کے لیے ورلڈ ٹور پر لے گیا۔ عانیہ بہت بہت خوش تھی۔ اسے احساس ہی نہیں تھا ایسے سب کا دل توڑ کر ان دونوں نے اچھا نہیں کیا۔
"بس ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے کافی ہیں۔" زورین نے سو بار کا کہا فقرہ دہرایا۔
عانیہ نے غرور سے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔
ایک ماہ کے ٹور کا دورانیہ بڑھتے بڑھتے دو ماہ ہو گیا۔ اسی بیچ عانیہ کے امتحان بھی گزر گئے۔
"عانیہ۔ تمہیں ان جھمیلوں میں پڑنے کی کہاں ضرورت ہے۔ تم نے کون سا جاب کرنی ہے۔ جتنا وقت کتابوں میں لگاؤ گی۔ اتنا وقت ہم یہاں آبشاروں، درختوں اور پہاڑوں میں گزاریں گے ایک دوسرے کی سنگت میں۔"
ایک ماہ بعد پیرس، فرانس اور پھر دبئی گھومنے کے بعد زورین نے پاکستان گھومنے پر اصرار کیا۔ لندن سے واپسی پر وہ لوگ کشمیر، مری اور ناران کے پہاڑوں پر اپنی محبت کی داستان رقم کرنے چلے آئے۔
دو ماہ بعد اسلام آباد کی سرزمین پر قدم رکھا تو عانیہ کو اپنے گھر والے شدت سے یاد آنے لگے۔ ہنی مون کی خوشی میں اس نے کسی سے ایک لمحے کے لیے بھی رابطہ نہیں کیا تھا۔ پھوپھو اور پھوپھا سے مل کر یہ یاد اور شدت اختیار کر گئی۔ گھر والوں کا کوئی نعم البدل نہیں۔ دل میں سب سے ملنے کی ہلچل ہوئی۔
☆☆☆

''زورین مجھے کل امی کے گھر جانا ہے۔'' عانیہ نے کلینزنگ کرتے ہوئے التجائیہ انداز میں کہا۔ مبادا زورین وہی راگ الاپنے لگے ''میں کافی نہیں'' اتنے دن کے ساتھ میں وہ شوہر کی عادتوں سے کچھ تو واقف ہو ہی گئی تھی۔

''جو حکم مائی ڈیر وائف! کل مجھے آفس میں دو گھنٹے کا کام ہے۔ میں جاتے ہوئے تمہیں ماموں کی طرف چھوڑ دوں گا۔''

عانیہ ابھی پوری طرح خوش بھی نہ ہوئی تھی۔ زورین کی اگلی بات پر ساری خوشی اڑنچھو ہو گئی۔

''اور آفس سے واپسی پر تمہیں واپس لیتا آؤں گا۔ کیونکہ گھر آکر میرا تمہارے بغیر ایک پل نہیں گزرے گا۔''

اتنے عرصے میں پہلی بار عانیہ اس کی محبت سے بیزار ہوئی۔

''پلیز زورین! میں کچھ دن گھر والوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ سب کے لیے بہت اداس ہو گئی ہوں۔'' عانیہ کے اصرار پر زورین تیوری چڑھا کر خفگی سے بولا۔

''جب میرے لیے بس تم کافی ہو عانیہ! تو تمہارے لیے میں کیوں نہیں؟''

''زورین۔ ہر رشتے کی اپنی چاہت اور ضرورت ہوتی ہے۔ دو لوگ ہمیشہ تو تنہا نہیں رہتے۔ وہ دو لوگ ہی ایک گھر کی بنیاد رکھتے ہیں۔ پھر ہم کیسے اپنی بنیاد کو بھلا کر خوش رہ سکتے ہیں؟''

''عانیہ۔ تم آج ہی گھر واپس آؤ گی۔ اب بحث نہ کرو۔'' زورین دوٹوک انداز میں کہہ کر رخ موڑ گیا۔

عانیہ ہونق بنی اس کی پشت کو گھور رہی تھی۔

''میں زورین کو سمجھا لوں گی۔ اکیلا رہا ہے نا ہمیشہ۔ اسی لیے لوگوں سے بیزار رہتا ہے۔ پھوپھو نے بھی تو مل بیٹھنا نہیں سکھایا۔'' عانیہ خود کو تسلیاں دینے لگی۔

لیکن جو خود سمجھنا نہ چاہیں انہیں سمجھانا ناممکن ہوتا ہے۔ اسی لیے نہ زورین نے سمجھنا تھا اور نہ ہی عانیہ اسے سمجھا سکی۔

اس نے کچھ عرصہ خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ لڑنے جھگڑنے کے بجائے وہ زورین کو محبت اور نرمی سے بدلنا چاہتی تھی۔

زورین اس سے بے انتہا محبت کرتا۔ وہ اس کا ایسے خیال رکھتا، جیسے وہ کوئی نازک سی کانچ کی گڑیا ہو۔ شادی کو آٹھ ماہ گزر چکے تھے۔ اب تک زورین نے اسے ایک کپ چائے نہیں بنانے دی تھی۔

گھومنا پھرنا، شاپنگ کرنا، اس کے ساتھ گیمز کھیلنا بس عانیہ کی ذات زورین کی زندگی کا محور تھی۔ آفس کے علاوہ نہ تو زورین خود کہیں جاتا اور نہ ہی اسے کسی سے ملنے جلنے دیتا۔

عانیہ اب اس سب سے اکتانے لگی تھی۔ زورین کی دیوانگی نے اسے زندگی کی ہر رشتے سے دور کر دیا تھا۔ اس کا دل زورین کی محبت سے بغاوت پر اتر آیا۔ کیونکہ زورین کو بدلنا ناممکن تھا۔ شادی کے اتنے عرصے بعد بھی وہ اس میں ذرا سی بھی تبدیلی نہ لا سکی تھی۔

آہستہ آہستہ ہم دوسروں کو قائل کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ شاید ہمیں سمجھ میں آجاتا ہے۔ کس سے کتنی امید رکھنی ہے۔ زندگی سب سکھا دیتی ہے۔ عانیہ زورین کو بدلنے کی ناکام کوشش کے بعد خود کو بدلنے کے مشن پر ڈٹ گئی۔

پھوپھو، پھوپھا اپنی یورپین اسٹائل زندگی میں مگن تھے۔ وہ زورین کو کسی بات پر نہ ٹوکتے۔ پھوپھا اور زورین آفس چلے جاتے۔ اور پھوپھو بوتیک پر۔ وہ اپنا بوتیک چلاتی تھیں۔

ایک وہ ہی تھی جو ان تینوں کے جانے کے بعد پاگلوں کی طرح یہاں وہاں چکراتی پھرتی۔

بہار اپنے جوبن پر تھی۔ رنگ رنگ کے پھول زندگی خوب صورت ہے کے فلسفے پڑھتے نظر آتے۔ لیکن باہر کے موسموں کی ڈور تو دل کے موسموں سے بندھی ہوتی ہے۔

عانیہ خوب صورت موسم کو انجوائے کرنے کے بجائے بس وقت گزارا کرتی۔ .. کبھی پودوں پر کھلے، پھول گننے لگتی اور کبھی آزاد اڑتے پرندوں کو دیکھ کر وقت گزارتی۔ اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ اس لان کے ہر پھول، ہر پتے کو انگلیوں پر گن لیتی۔

گھر والوں کے سوالوں سے بچنے کے لیے وہ انہیں فون کرنے سے بھی کترانے لگی۔ ہر کسی کے لبوں پر ایک ہی سوال رقصاں ہوتا۔ تم ہمیں بھول گئیں۔ ملنے نہیں آتیں۔

''آپی جب سے آپ کی شادی ہوئی ہے۔ آپ ایک بار بھی گھر رہنے نہیں آئیں۔'' چھوٹی بہنوں کے شکوے پر اس کے پاس خاموشی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

وہ زورین کا نام لے کر سب کو اس سے بدگمان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میاں، بیوی تو سب اختلافات بھلا کر پھر ایک ہو جاتے ہیں۔ باقی سب رشتوں میں ایسا خلا پیدا ہو جاتا ہے جو کبھی نہیں بھرتا۔

☆☆☆

اس کی خزاں رسیدہ زندگی میں فاریہ (چھوٹی بہن) کے نکاح کی خبر بہار بن کر آئی۔ سب کچھ میرے بغیر ہی طے کر لیا۔ یعنی میرے اپنوں نے میرے بغیر رہنا سیکھ لیا ہے۔ وہ مایوسی سے مسکرائی۔ سب سمجھنے لگے ہیں میرے لیے زورین ہی کافی ہے۔

''آپی۔ مانا کے زورین بھائی آپ کی زندگی میں سب سے بلند مقام رکھتے ہیں۔ لیکن ہم بھی آپ کے کچھ لگتے ہیں یا نہیں۔'' فاریہ نے خفگی سے کہا۔

''میری جان فاری! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں بھی تم سب کو بہت یاد کرتی ہوں۔ زورین ہوٹل کے کام میں بزی ہوتے ہیں۔ ایک پاؤں مری اور ایک اسلام آباد۔ اس لیے آ نہیں پاتی۔'' عانیہ نے ہر بار کہی جانے والی گھسی پٹی دلیل پیش کر کے بہن کو مطمئن کرنا چاہا۔

''اچھا آپ سب باتیں چھوڑیں اور آج کا پلان بتائیں۔ شام کو گھر پہ میری ڈھولکی ہے۔ آپ جلدی آ جایئے گا۔ پارلر میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ عائلہ نے تو صاف انکار کر دیا ہے۔''

فاریہ نے لگے ہاتھوں چھوٹی بہن کی شکایت بھی لگا دی۔

''اچھا بابا آ جاؤں گی تم پریشان نہ ہو۔''

''زورین کی کال آ رہی ہے۔ میں تم سے بعد میں بات کرتی ہوں۔'' عانیہ نے عجلت میں اس کی مزید کوئی بات سنے بغیر کال کاٹ دی۔

''عانی۔ کب سے کال کر رہا ہوں۔''

دنیا جہان سے بے خبر کس کے ساتھ اتنی لگاوٹ سے باتیں کرنے میں مگن تھیں؟ حسب توقع زورین کی ناراضی بھری آواز ائیر پیس سے ابھری۔ عانیہ کا دل چاہا اسی وقت فون رکھ دے۔

لیکن شام کو جانے کے خیال نے ایسی کسی بھی حرکت سے روک کے رکھا۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جس سے زورین کا موڈ خراب ہو۔

''فاریہ سے بات کر رہی تھی۔ کل اس کا نکاح ہے۔ اور آج ڈھولکی۔''

''پلیز زورین! مجھے ایک دو دن کے لیے جانے دیں۔'' عانیہ نے بات مکمل کرتے ہی التجا کی۔

''اوکے! تم تیار رہنا میں چھوڑ آؤں گا۔'' زورین نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔

عانیہ اتنی آسانی سے مان جانے پر پہلے تو جی بھر کے حیران ہوئی۔ پھر مزید کچھ سوچنے کا ارادہ ملتوی کر کے خوشی خوشی جانے کی تیاری کرنے لگی۔

اس نے زورین کا فیورٹ کلر پہننے کے لیے منتخب کیا۔ لائٹ پیچ رنگ پہ ہلکا پھلکا سلور نگوں کے کام والا۔ وہ شیشے کے سامنے ایستادہ دل لگا کر سج سنور رہی تھی۔ زورین کمرے میں داخل ہوا۔

''آپ جلدی سے فریش ہو جائیں۔ وہاں سب لوگ میرا بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں۔''

''ماما، پاپا نہیں جا رہے؟'' زورین نے اس کی بات کو نظر انداز کیا۔

''انکل آؤٹ آف سٹی گئے ہوئے ہیں۔ اور

پھوپھو جان کے سر میں درد ہے۔ وہ لوگ کل نکاح کی تقریب میں شامل ہوں گے۔" عانیہ نے جلدی جلدی ساری تفصیل زورین کے کانوں میں انڈیلی۔

اس بات سے بے خبر زورین کو کسی اور کے لیے اس کی یہ بے تابی زہر لگ رہی تھی۔ وہ مزید کوئی سوال کیے فریش ہونے چلا گیا۔ عانیہ نے ایک طائرانہ نظر اپنی سج دھج پر ڈالی۔ اور مطمئن ہو کر زورین کا انتظار کرنے لگی۔ وہ لوگ آٹھ بجے گھر سے نکلے۔

زورین نے گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے سامنے روک دی۔

"ہم پہلے تمہارے فیورٹ ریسٹورنٹ میں کافی پئیں گے۔ اس کے بعد میں تمہیں ماموں کی طرف چھوڑ دوں گا۔"

"زورین۔ سب وہاں ویٹ کر رہے ہوں گے۔" عانیہ رو دینے کو تھی۔

"میں نے کہا تھا تم آج کے دن اس قدر حسین لگو کہ میرا دل تمہیں گھنٹوں دیکھنے کی خواہش کر بیٹھے۔" زورین نے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے وجہ بتائی۔

زورین نے تھوڑی دیر کہتے کہتے رات کے ساڑھے بارہ بجا دیے۔ پھر گھڑی میں ٹائم دیکھتے ہوئے معصومیت سے بولا۔

"عانی میری جان! اب تو وہاں سب ختم ہو گیا ہو گا۔ گھر چلتے ہیں۔ میں صبح آفس سے پہلے تمہیں چھوڑ آؤں گا۔"

عانیہ ایک لفظ نہیں بولی۔ خاموشی سے گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔

جب انسان کوئی فیصلہ کر لے نا، تو پھر لفظوں کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ بھی فیصلہ کر چکی تھی۔ اٹل فیصلہ، زورین کو چھوڑنے کا فیصلہ۔

نکاح کے فنکشن کے بعد زورین اس کے ساتھ لے جانے پر بضد تھا۔ عانیہ نے بہانے سے منع کر دیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی زورین اس کو چھوڑ گیا۔ کل آ جانے کے وعدے پر گھر جاتے ہی زورین کو فون کیا۔

عانیہ نے فون اٹھایا اور بہت آرام سے اس کے سر پر بم پھوڑا۔

"مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا زورین، مجھے تم سے خلع چاہیے۔"

"عانیہ۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ یہ کیا بے ہودہ مذاق ہے؟" زورین غصے سے چیخا۔

"بہت جلد تمہیں نوٹس مل جائے گا۔" عانیہ نے سخت لہجے میں کہا۔

"عانی! آخر ایسا کیا کر دیا میں نے۔ جو تم اتنی کٹھور بن رہی ہو۔"

"تم اچھی طرح جانتے ہو تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا۔"

"میں...... میں آئندہ کچھ ایسا نہیں کروں گا۔ جس سے تم خفا ہو۔ بس تمہاری سنوں گا اور بس تمہاری مانوں گا۔ میں تمہیں ابھی لینے آ رہا ہوں۔"

"تم آ بھی گئے تو ناکام لوٹو گے زورین! میں تمہاری نام نہاد محبت کی قید میں تنہا بھٹک کر مرنا نہیں چاہتی۔"

"عانیہ۔ کیا میں تمہارے لیے کافی نہیں ہوں؟" زورین نے ایک بار پھر اس یقین سے پوچھا کہ ابھی عانیہ سب بھلا کر کہے گی۔ تم کافی ہو۔

"زورین۔ میرے لیے تم کافی نہیں ہو۔" عانیہ نے آہستگی سے کہہ کر فون بند کر دیا۔

☆☆

فرح بخاری

کنارِ خوابِ جو

گزشتہ اقساط کا خلاصہ:

سوار حسن کو کچھ عجیب سے حالات میں ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑنا پڑا اور وہ خالی جیب منتشر دماغ لیے بنا سوچے مری کی کوسٹر میں بیٹھ گیا۔ مری میں ایک معمولی ڈھابے کے مالک میاں نذر اسے پہلے مہربان دوست کی صورت میں ملے، میاں جی کے توسط سے سوار کو ایک ہوٹل میں مہینے بھر کے لیے ریسپشنسٹ کی جاب مل گئی۔ ہوٹل کے مینیجر رفیق احمد کی بیٹی کنعان کالج میں پڑھتی ہے۔ ماضی کے کسی واقعے نے اسے محبت سے سخت بدگمان کر رکھا ہے۔ لیکن سوار سے پہلی ملاقات ہی اس کے دل کی دنیا کو پریشان کن حد تک تبدیل کر دیتی ہے۔

ثمامہ ایک طرح دار جوان بیوہ ہے، جس نے مرحوم شوہر کی جائیداد سے مری میں نیا فائیو اسٹار ہوٹل کھولا ہے۔ وہ بھی مری میں نووارد ہے۔

شازمہ جس نئے محلے میں اپنے شوہر کے ساتھ شفٹ ہوئی ہے وہاں تنہائی اور اکیلا پن اس کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا کیونکہ شوہر اپنی مجبوریوں کی وجہ سے اس کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں۔

ثمامہ کو ہوٹل کے افتتاح میں کچھ مسائل کا سامنا ہے۔

رفیق احمد کے پیر میں سیڑھیاں اترتے شدید فریکچر آ گیا۔ سوار نے ان کی بہت مدد کی۔ شازمہ کی محلے میں آمنہ بھابی سے دوستی ہوئی جو کہ مولوی فیض الحسن کی بہو ہیں۔

ثمامہ نے مری کے راستوں پر سوار کو دیکھا، یہ اس کا سوار سے دوسرا سامنا تھا اور معلوم نہیں کیوں لیکن وہ اسے، بہت خاص لگا۔

کنعان کی رابعہ پھوپھو ان کے گھر آئیں تو کنعان کے پکائے بدمزا کھانوں کی وجہ سے دیا اور کنعان دونوں کا داخلہ کوکنگ اسکول میں کروا آئیں کنعان نے وہاں پر سوار کو دیکھ کر خوشی محسوس کی۔

مکمل ناول

سوار کی جاب ازمیر ہوٹل سے ختم ہوئی تو ثمامہ نے اسے ''پیٹران'' میں منیجر کی پوسٹ پر اپوائنٹ کرلیا۔ سوار علی پہلی ملاقات میں ہی اسے پسند آ گیا تھا۔

رفیق سر کی طبیعت خراب ہوئی تو سوار ہاسپٹل آیا۔ واپسی میں جس ٹیکسی میں وہ کنعان کو گھر چھوڑنے آیا اس کے ڈرائیور نے کنعان کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کیں۔ کنعان نے اپنی صفائی میں اپنی بہن کی کہانی سنائی کہ کس طرح اس کی بہن نے گھر سے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور کنعان اس کا پیچھا کرکے جس ٹیکسی میں واپس اسے گھر لائی، وہ یہی ٹیکسی والا تھا۔ بہن کی شادی تو کردی گئی لیکن امی نے مرتے وقت اس سے وعدہ لیا کہ وہ کبھی کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہوگی لیکن وہ اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکی۔

وقاص کی ملاقات شازمہ سے کاغان میں ہوئی جہاں اس نے شازمہ کو اپنی گاڑی میں لفٹ دی تھی۔ یہیں سے ان کی دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ وقاص نے اس کو اپنے شادی شدہ ہونے کا نہیں بتایا تھا۔ شازمہ کے باپ نے اس کا رشتہ اپنے جیسے سفید پوش گھرانے میں کر رکھا تھا جو اس کو پسند نہیں تھا۔ اسے وقاص اپنے خوابوں کا شہزادہ نظر آیا۔ کاغان سے واپس آنے کے بعد وقاص کی بات چیت شازمہ سے ہوتی رہی بالآخر ایک دن شازمہ اپنے گھر سے بھاگ کر وقاص کے شہر آ گئی۔ وقاص کے پاس سوائے اسے اپنانے کے کوئی چارہ نہ رہا۔

شازمہ کو وقاص کی پہلی شادی کے بارے میں علم ہو گیا اور اس کی لڑائی وقاص سے ہو جاتی ہے۔

شازمہ نے آمنہ بھابھی کے دیور عبدالعلی سے جسے سب پیار سے آدی کہتے تھے، ٹیوشن پڑھانے کی درخواست کی۔ آدی رضامند تو ہو گیا لیکن شازمہ کی نگاہوں کے مبہم اور خطرناک پیغام کی وجہ سے وہ اس سے کترانے لگا تھا۔ لیکن شازمہ اسے گھر بلانے کا کوئی نہ کوئی بہانہ نکال ہی لیتی تھی۔

ثمامہ سوار علی کی سالگرہ پر اسے زبردستی ڈنر پر لے آئی اور وہاں پر اس سے شادی کی خواہش ظاہر کردی۔

ثمامہ کو سوار کی کنعان سے محبت کا علم ہوا تو اس نے کنعان کو اغوا کروالیا کہ اغوا شدہ کنعان اس کے دل سے اتر جائے گی۔ سوار کو کنعان کے اغوا کا علم ہوا تو اس نے کوشش کر کے کنعان کو اغوا کاروں کے چنگل سے نکال لیا۔

نویں قسط

''گزرے چند ماہ میں محبت کے جس دائرے میں قید ہوا ہوں، اس کا ٹوٹنا میری بھی برداشت کا امتحان ہوگا۔ یہ نیا حلقہ صرف اور صرف دوستی اور محبت کی بنیاد پر قائم ہوا ہے۔ سچ کے نوکیلے خار اس میں چھید کر گئے تو دونوں طرف تکلیف کی شدت ناقابل برداشت ہوگی۔''

''ایسا کیا ہوا ہے سوار۔ جسے آپ زبان پر لانا بھی نہیں چاہتے اور ہر لمحہ اس کی تکلیف بھی خود پر سہتے ہیں؟'' حیرت سے اس کی پشت تکتی کنعان پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

سوار نے دھیان سے اس کا جملہ سنتے رخ پھیر کر اس کی طرف دیکھا اور دو قدم آگے آتے ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔ کنعان نے اس کی بڑھی ہتھیلی پر اپنا ہاتھ رکھا اور اُٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ سوار دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اسے عجیب خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا کنعان بھی سوالیہ اسی جانب دیکھ رہی تھی، سوار نے ایک گہرا سانس لے کر خود کو کسی اثر سے نکالا۔

''بتاؤں گا کنعان۔ لیکن ابھی مجھے خود سے لڑنے دو، ابھی ابھی اپنے آپ کو پہچاننے کی راہ پر نکلا ہوں، ابھی تو ہر مرحلے پر خود میرے لیے ایک نیا انکشاف ہے۔ لیکن تسلی رکھو......'' سوار کے لب ہلکا سا مسکرائے۔ الجھے لفظوں میں پہلی بار سلجھاؤ کی کیفیت نظر آئی۔ ''کچھ امتحانوں میں پاس بھی ہوا ہوں۔ شاید ابھی ابھی۔ اس لیے اُمید تو بہار کی ہے۔ محبت کی مہک، اس کے نت نئے رنگوں سے آشنائی ایک حسین تجربہ ثابت ہو رہی ہے۔''

''لیکن یہاں بہار سے پہلے برف پڑتی ہے

جناب۔'' کنعان کی کھنکتی ہنسی میں عجیب بے فکرا پن تھا۔

سوار کی ہنسی یک لخت سمٹ گئی۔ کنعان نے تو یونہی برجستہ ایک بات کہی تھی لیکن برف کا ذکر سوار کے وجود میں کچھ جمانے لگا۔ یہ آنے والا موسم کہیں رشتوں اور تعلقات کی گرمی پر بھی سرد مزاجی کی تہیں نہ چڑھا دے۔ چہرے کا رنگ واضح اڑا۔ کنعان گھبرا گئی۔

''میں نے تو یونہی کہہ دیا۔ بس مری کے موسم کی مناسبت سے۔ پھر برف پگھلتی بھی تو ہے۔ یہ سب تو موسم کی بدلتی کیفیات ہیں۔''

''اور تم کنعان؟'' وہ بے چین نگاہوں سے اس کے چہرے کا طواف کرتے عجیب جلد باز سا ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ یونہی بچوں جیسا جذباتی لگا کرتا۔

''کنعان موسم نہیں ہے سوار۔ آپ کے لیے میں کبھی نہیں بدلوں گی۔ اور بدل بھی کیسے سکتی ہوں، ہر گزرتے دن کے ساتھ جس محبت پر میرا اعتماد مضبوط ہوا ہے اس سے آنکھیں پھیرنے کا مطلب سراسر محبت کی توہین ہے۔ مجھے آپ ہمیشہ ہر قدم پر اپنے ساتھ پائیں گے۔''

''تھینک یو کنعان۔ تھینک یو سوچ۔'' سوار نے اس کے ہاتھ پر اپنی محبت کی نرمی کا ہاتھ رکھا۔ دل نے کہا شاید اب آگے کا سفر قدرے آسان ہو۔

☆☆☆

صبح کی ہلکی ہلکی روشنی ہر سو پھیلنے لگی تھی۔ سوار نے کنعان کو جگا دیا تھا۔ دونوں نے قریب دو ڈھائی گھنٹے کی نیند لی تھی۔ اور اب انہیں گھر کے لیے نکلنا تھا۔ سوار نے میاں جی کو کال کر دی تھی، وہ اسی ٹیکسی والے کو یہاں بھیج رہے تھے جو رات کو اسے آبادی میں چھوڑ گیا تھا۔ کمرے میں گھوم پھر کر سوار نے دو شاپر ڈھونڈے اور اب کنعان اور وہ اپنا اپنا سامان ان میں ڈال رہے تھے۔ سوار نے کچن میں جا کر اپنا لباس تبدیل کیا اور باورچی عزیز کے کپڑے واپس لٹکا دیے۔ کنعان نے اپنی شال دوبارہ پہن لی جو اب گیلی تو نہیں البتہ ٹھنڈی ضرور تھی۔ سوار نے کیل سے لٹکا کنعان کا بیگ اتارا، پلٹ کر دیکھا تو وہ سوار کی گیلی شال کو تہ لگا رہی تھی۔ سوار نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا جس میں کنعان کا بیگ تھا، کچھ خیال آنے پر اس کے ہونٹ مسکرانے لگے۔

''ویسے تصور کرو کنعان۔ تھوڑا سا فیوچر میں جا کے......'' وہ اس کا بیگ سینے سے لگائے اب رک کر تسلی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کنعان بھی ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگی

''ہمارا بھی ایک روم...... آں مطلب ایک گھر ہوگا۔'' شرارت کو قابو میں کرتے اس نے خود ہی اپنا جملہ بدلا، کنعان بھی مسکرانے لگی۔

''اس سے تو اچھا ہی ہوگا۔'' اس نے نظریں آس پاس پہ گھمائیں لیکن پھر رک کر توجہ سے ان دو دیوار کو دوبارہ دیکھا پھر سوار کو۔

''جگہیں اہمیت نہیں رکھتیں نا سوار۔ جگہ سے زیادہ مناسبت اہم ہوتی ہے، برسوں بعد شاید میں ہی آپ سے کہوں، اشرف بھائی کی سرائے چلتے ہیں۔''

''ہاں، اور تب وہ ہمیں ایک کمرا ایک کر دے گا اور......'' سوار نے چمکتی آنکھوں سے کنعان کی تائید چاہی جس کا اپنا چہرا صبح کی ٹھنڈی روشنی جیسا منور تھا۔

''اور ہم کہیں گے ہمیں اسی اسٹور روم میں جانا ہے۔'' دونوں نے کھلکھلا کر ہنستے بیک زبان کہا۔

''ہاں۔'' کنعان مسکراتے لبوں اور حسرت بھری نظروں سے ایک ایک چیز کو دیکھتے چارپائی کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ ''محبت کا ہر لمحہ قیمتی، ہر ٹھکانا تاج محل ہوتا ہے۔ اس رات نے مجھے بہت سے انمول تحفے دیے ہیں۔ کنعان نے کہتے کہتے نجانے ایسا کیا سوچا پلکوں پہ موتی سا چمکا، اور اس نے اپنی کلائی کو اونچا کرتے اپنے چہرے سے چھوا۔ سوار نے حیرت سے اس کی حرکت کو دیکھا، بھیگی پلکیں لیے اس نے کلائی میں بندھے اس بریسلٹ کو اپنے رخسار سے لگا رکھا تھا جو تین روز قبل ہی سوار نے گفٹ کیا تھا۔

"میں نے کل یہ بریسلٹ پہلی مرتبہ پہنا تھا سوار۔ اور گھر سے نکلتے ہی اغوا ہو جانا، جمشید کے گھر اس کمرے کے اندھیرے میں اس چمکتے بریسلٹ کو دیکھ کر مجھے عجیب عجیب وہم لاحق ہونے لگے تھے۔ محبت کی پہلی نشانی کا راس نہ آنا بہت درد دے رہا تھا۔ جبکہ میں اس تحفے میں چھپے خلوص کا یقین چاہتی تھی۔"

"تو...... کیا ہوا وہ یقین؟" سوار اس کا بیگ لیے مسکراتے ہوئے قریب آیا تو کنعان بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مزید پختہ ہوا ہے۔ میں سمجھ رہی تھی شاید میں آپ سے، اپنوں سے ہمیشہ کے لیے دور جا رہی ہوں لیکن وہ میرا وہم ہی تھا۔"

"میرے لیے یہ یقین قدرت کا انعام اور تمہاری طرف سے جوابی تحفہ ہے۔" اس نے پیار سے کنعان کا گال تھپکا اور سامان اٹھالیا

"آؤ۔ سر شدت سے تمہارے منتظر ہوں گے۔"

"ہوں۔" کنعان نے مسکرا کر بیگ کندھے سے لٹکایا اور اس پرانے کمرے پر آخری محبت بھری نگاہ ڈالتے اس کے پیچھے چل پڑی۔

☆☆☆

"کہیے سوار۔ اب کیسی طبیعت ہے آپ کے سر کی؟" ثمامہ نے بدقت مسکراتے اپنی اندرونی کیفیت کو سوار سے چھپایا

"اب تو بہت بہتر ہیں میم۔ گھر پہنچ گئے ہیں۔" وہ بھی مسکرا کر ایک ہی جملے میں بات کو سمیٹتے کمپیوٹر لگا کر بیٹھ گیا۔

"پچھلا پورا دن تو آپ کافی ڈسٹرب رہے۔"

ثمامہ جانتی تھی وہ کبھی اس سے اپنے پرسنل شیئر نہیں کیا کرتا، پھر بھی اپنے اندر کی بے چینیوں سے نبرد آزما وہ سوال پوچھنے سے باز نہیں آ رہی تھی۔ نہ ہی اسے موضوع سے ہٹانا چاہتی تھی۔ کچھ خوف اندر سے اٹھتے وہموں کے بھی تھے کہ کہیں جمشید نے اس کا نام نہ سوار کے سامنے اُگل دیا ہو۔ وہ اس کے ساتھ بات چیت جاری رکھ کر اس کا اپنے ساتھ رویہ جانچنا چاہتی تھی۔

"جی میم۔ دن ہی نہیں پچھلی پوری رات بھی کافی ڈسٹرب گزری ہے، لیکن الحمدللہ۔ آج کی صبح کے ساتھ ہر چیز معمول پر آ گئی ہے۔" وہ کمپیوٹر کی اسکرین سے نظر ہٹا کر اس مرتبہ بھرپور انداز میں مسکرایا تھا۔

صبح چھ بجے اس نے کنعان کو اس کے گھر پہنچایا تھا۔ رفیق سر سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر تک رات کے حوالے سے بات چیت کرتے وہ پیدل ہی مال روڈ کے راستے اپنے ہوٹل آ گیا تھا۔ کنعان اور اس نے آپس میں طے کیا تھا کہ جمشید کے حوالے سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ رفیق احمد سے اس نے یہی کہا کہ اغوا کار کون تھے اور ان کا کیا مقصد تھا وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے، بس دیا سے کل کوکنگ اکیڈمی کے سلسلے میں کال پر بات ہوئی تو اس نے کنعان کا بتایا، اور پھر سر سے دیر ہو جانے کا بہانہ کرتے عجلت میں وہاں سے نکل آیا کیونکہ آگے اگر رفیق سر اس سے یہ پوچھ لیتے کہ دیا نے تو صرف کنعان کے اغوا ہونے کا بتایا تو وہ اغوا کاروں کے ٹھکانے تک کیسے پہنچا تو اس کا وہ کیا جواب دیتا اس لیے اس وقت تو ان سوالوں سے پیچھا چھڑا کر نکلنے میں ہی عافیت جانی۔ اور یہاں جمشید کی حقیقت بتانے سے اسے کنعان کی مجبوری آڑے آ گئی تھی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اس کے ابو پر ان دونوں کی دوستی کا راز کھلے۔ یعنی ایسی گہری دوستی کہ کنعان نے سوار سے اپنے گھر کا سب سے بڑا راز بھی شیئر کر لیا تھا۔ وہ تکلیف دہ حقیقت جس پر تین چار برس ہونے کو آئے ان باپ بیٹی نے بھی کبھی بات نہیں کی تھی۔

سوار نے سر جھٹک کر خود کو کام میں مصروف کیا۔ کچھ حقیقتوں سے نظریں چرا کر جینا پڑتا ہے، یہ بات قدم قدم پر جتنا اسے پیش آ رہی تھی شاید ہی کوئی اور اس کا اتنا شکار ہوا ہو۔

"آپ نے تو شاید ناشتا بھی نہیں کیا؟" ثمامہ بڑی دیر تک اسے توجہ سے دیکھتے ایک بار پھر گویا ہوئی، وہ اس وقت نہا کر ڈیپ بلو جینز اور میرون جرسی میں پچھلے کئی دنوں کی نسبت کہیں زیادہ تروتازہ اور حسین لگ رہا تھا۔

"جی، ٹائم ہی نہیں ملا۔ مجھے بس سیٹ پر آنے کی جلدی تھی۔"

"ہوں۔" ثمامہ نے مسکراتے ہوئے فون پر ناشتے کا آرڈر دیا۔ وہ خود بھی آج ناشتا کیے بنا آ گئی تھی۔

یہاں کی صورت حال جاننے کی عجلت میں وہ صبح سویرے ہی بھاگی چلی آئی تھی۔ لیکن وہ سامنے بیٹھا بے مہر تو دام میں آنے کو تیار ہی نہیں لگ رہا تھا۔ البتہ چہرے کا اطمینان بتاتا تھا کہ کنعان بحفاظت اپنے گھر پہنچ چکی ہے۔ اور ثمامہ کے ہاتھ فی الحال تک کے وقت میں ایک یہی کامیابی لگی تھی کہ سوار کو اس کا نام معلوم نہیں ہو پایا تھا۔ حالت ورنہ اس وقت کھسیانی بلی سے کم نہ تھی۔

کنعان کو اغواکاروں کے چنگل میں رات بھر کے لیے چھوڑ کر وہ سوار کی نظروں میں اسے گرانا چاہتی تھی لیکن ہوا کیا تھا۔ کنعان تو گھر سے دوری کی اس رات کا ایک ایک پل اپنے محبوب کی سنگت میں گزار کر آئی تھی۔ نقصان کے سودے میں سرفہرست ایک اسی کا نام جگمگا رہا تھا۔ اور "شکست" نے ثمامہ کو ہمیشہ ہی سراسیمگی کا شکار کیا تھا۔ کبھی بہت اتاولی ہو کر وہ کوئی بہت بڑا رسک لے بیٹھتی تو کبھی دماغ کے کسی کونے سے نہایت عمدہ پلان نکال لاتی۔ البتہ اس وقت دماغ بالکل صاف سلیٹ تو دل ایکدم بجھا ہوا اداس سا تھا۔

ویٹر ناشتا لیے اندر داخل ہوا تو وہ کار کی چابی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی، سوار نے چونک کر سر اٹھایا۔

"مجھے کچھ ضروری کام یاد آ گیا ہے سوار۔ آپ پہلے اطمینان سے ناشتا کر لیں، کاموں کے لیے تو سارا دن پڑا ہے۔" وہ اسے ایک نرم مسکراہٹ سے نوازتی فوراً ہی باہر نکل آئی۔

پنڈی پوائنٹ تک بے مقصد گاڑی چلا کر آتے وہ مزید مایوس، سست اور ڈھیلی سی پڑ چکی تھی۔ کار سے نکل کر سڑک کنارے بنی سیمنٹ کی حد بندی پر بیٹھی وہ اس وقت رو دینے کو تھی۔ کچھ دور چند گھوڑے اور سیاح گھومتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بے سبب بیٹھی انہیں دیکھتی رہی، وہ بہت سارا رونا چاہتی تھی لیکن برسوں بعد آج پھر ایسا لگا کہ نہ تو رونے کے لیے اسے کوئی مقام میسر ہے اور نہ ہی کوئی آنسو پونچھنے والا۔ اور برسوں بعد آج دوسری مرتبہ اس کی ترکیب بھی الٹی پڑ گئی تھی۔ سوار کی بے اعتنائی نے آج پہلی بار اس شدت کا درد اندر پیدا کیا تھا جو بھی ولید کی دھوکا دہی سے محسوس ہوا تھا۔ اور تب تو قصوروار معلوم نہیں کون تھا پر آج اپنے ساتھ ہوئی زیادتی کی ذمہ دار وہ خود تھی۔ دماغ بار بار کنعان، سوار اور پچھلی رات کی جانب بھٹکنے لگتا۔

سوار کا آج کا اطمینان بتاتا تھا کہ ثمامہ کی دونوں کو ایک دوسرے سے دور کرنے کی پلاننگ کا نرا اسی کے اپنے ہاتھوں ستیاناس ہوا تھا۔ پچھلی رات جو کارنامہ سوار نے انجام دیا تھا اس کے بعد تو رفیق احمد کی نظروں میں اس کا قد اور بھی بلند ہو گیا تھا۔ اور اغوا جیسا واقعہ ہو جانے کے بعد ایک ڈرا سہما باپ پہلے اچھے رشتے پر ہی حامی بھر لیا کرتا ہے، اور سوار کا ان حالات میں ایک بار بات کرنا ہی کافی ہو جائے گا، نہ صرف رشتہ بلکہ رفیق احمد بیٹی کی شادی بھی جلد از جلد کر دینا چاہیں گے۔

"تو مطلب یہ ہوا ثمامہ ابراہیم۔ آپ نے ان دونوں کی راہ کی رہی سہی رکاوٹیں بھی دور کر دیں۔" ثمامہ نے پلکوں پہ در آتے آنسو اپنی ہتھیلیوں سے رگڑے، ماتھے پر تناؤ کی لکیریں بڑی دیر ہوئی جیسے ٹھہری گئی تھیں۔

"سوار علی کو ایک اچھی پرکشش جاب پر تو آپ پہلے ہی لگا چکیں، اب بھلا رفیق احمد کو کیوں کوئی اعتراض ہوگا۔ ایسے خوب صورت، برسر روزگار،

بھروسے مند داماد تو خوش قسمتی سے ملا کرتے ہیں۔ اس لیے آپ بس بیٹھ کر تماشا دیکھیں۔ بہت جلد ہوٹل میں سوار کی شادی کی مٹھائی بٹے گی۔ بالکل ویسے جب ایک بار ولید کی شادی کی مٹھائی زہر مار کرنے پر مجبور ہوئی تھیں...... ناکام...... سلی لیڈی۔" وہ بے بسی سے چہرا ہاتھوں میں دیے ہل ہل کر روئے گئی۔

فولش...... ابسلوٹلی فولش...... سرگوشی میں جھٹکتے اس نے سر اٹھایا، آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ چکی تھیں۔ سوار کو باقاعدہ کھودینے کی گھڑی عین اس کے سر پر آچکی تھی۔ اس نے کھلی آنکھوں سے دیکھنا شروع کیا کہ عنقریب سوار ہوٹل کا کمرا چھوڑ کر ایک گھر میں شفٹ ہوجائے گا، پھر وہ شادی شدہ مرد بیوی کے ہاتھ کا ناشتا کھا کر ہوٹل آیا کرے گا۔ اور تب وہ اسے اپنانے کی سوچ بھی دماغ میں نہیں لا پائے گی۔ تو کیسی ہوں گی وہ صبحیں جب تیار ہو کر ہوٹل آنا انتہا کا پھیکا اور بدمزا لگا کرے گا۔ کیا رہ جائے گا زندگی میں خوب صورتی کا پہلو۔ کون سی کشش آگے بڑھنے پر ابھارے گی۔ کچھ بھی نہیں ہوگا ایسی بے رنگ زندگی میں۔ کچھ بھی نہیں۔ سوار علی سامنے موجود ہو کر بھی خواب وخیال ہو کے رہ جائے گا۔ سب ہاتھ سے نکل جائے گا اگر ایک بار وہ کنعان کا ہوگیا۔ اور اگر یہ نہ ہو۔ اس نے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ پہلی مرتبہ سوچا۔

اگر یہ نہ ہو تو ہی بہتر ہے ثمامہ۔ لیکن کیسے۔ ثمامہ کا خود سے عہد تو بہت پکا تھا لیکن اس حوالے سے کوئی خاکہ قطعاً کہیں نہیں تھا۔ تھکے ہارے انداز میں موبائل نکال کر جمشید کا نمبر ملایا، اغوا کی رقم حاصل نہ ہوسکنے پر وہ سخت جھنجلایا ہوا تھا، اور اس کی یہ جھنجلاہٹ ثمامہ کو کوئی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ اس لیے اس نے طے کیا تھا کہ پانچ لاکھ کی رقم وہ خود ہی جمشید کو دے دے گی۔ ورنہ شکست کی صورت میں بہت ممکن تھا وہ رفیق احمد کو تنگ کرنا شروع کر دیتا، اور ثمامہ کے لیے باقی نقصان اپنی جگہ پر۔ اچھا پہلو یہ تھا کہ وہ پولیس کی نظر میں آنے سے بچ گئی تھی۔ اس لیے جمشید کو کال کر کے پانچ لاکھ کی رقم حوالے کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ دن کے لیے مری چھوڑ جانے کی ہدایت بھی کر دی۔ جمشید خود بھی کافی گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا کیونکہ سوار نے اس کا گھر دیکھ لیا تھا۔

ثمامہ نے اس سے دوپہر دو بجے رقم حوالے کرنے کی جگہ مقرر کی اور موبائل آف کر کے اگلا نمبر ہری پور کا ملایا، سویرا نے اس روز کے بعد پھر کوئی رابطہ ہی نہیں کیا تھا۔ ثمامہ نے شکوہ کیا تو خوب معذرت کرنے لگی کہ خاندان میں دو تین شادیاں اکٹھی ہوگئی تھیں اس لیے وہ مصروف ہوگئی تھی لیکن ثمامہ کا کام اس نے اپنی ایک دوست کے ذمے لگا دیا تھا اور اب اس سے صرف دو دن کا وقت مزید مانگا۔ ثمامہ نے ایک گہرا سانس لیتے موبائل ہینڈ بیگ میں رکھا۔ خود کو ضبط کی تلقین کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اندر ایک نام اور ایک عہد کی تکرار تھی۔

سوار...... اس کا حصول اور بس...... تیسری راہ اگر سوار کی طرف نہیں جاتی تھی تو اس کی نہ تھی۔ وہ تھکے تھکے انداز میں اٹھ کر گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

کالج میں سرما کی چھٹیاں اسٹارٹ ہوگئی تھیں، اور کنعان تو گزشتہ دو روز بھی کالج نہیں گئی تھی۔ اور ان دو دنوں نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا تھا۔ حالانکہ اغوا کا خوف اس پر تب تک طاری رہا تھا جب وہ جمشید کے گھر میں رہی۔ سوار کے ملنے کے بعد سارا منظر نامہ ہی تبدیل ہوگیا۔ گھر آتے وقت وہ صرف ابو کے سوالوں سے کچھ کچھ گھبراہٹ کا شکار ضرور تھی لیکن انہوں نے جتنا کچھ پوچھا بس وہی سوار کے سامنے۔ اس کے جانے کے بعد وہ اس کی دلجوئی کر رہے تھے، آرام کا مشورہ دیا، کھانے پینے۔ بظاہر تو سب کچھ ٹھیک تھا لیکن معلوم نہیں اسے کیوں ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ اور دو دن گزرنے پر تو اس کا شک یقین میں تبدیل ہونے لگا تھا کہ ابو معمول جیسا بی ہیو نہیں کر رہے تھے، وہ چپ بھی تھے اور مسلسل کسی

سوچ میں بھی تھے۔
''اوہ۔ آج کی یہ صبح۔ کتنی حسین، کتنی خوب صورت ہے نا۔'' دیا آج ناشتے کے بعد ہی نازل ہوگئی تھی، اور اس وقت کمرے میں گول گول گھوم کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ کیونکہ آج سرما کی پہلی چھٹی تھی۔
''اف۔ یہ ڈھائی تین مہینے کا آرام۔ سچی کتنا مزا آئے گا۔ میں سوچ رہی ہوں، پہلی برف باری کے بعد پٹریاٹہ چلیں گے۔ چیئر لفٹس کا لطف لیے مجھے تو برسوں ہی ہو گئے۔''
''میرے ابو سے پوچھ لینا۔'' کنعان نے عجیب یاسیت بھرے لہجے میں کچھ یوں کہا کہ دیا نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔
''کیوں۔ انکل کیا کہیں گے۔ پہلے کبھی کچھ کہا کیا جو......''
''پہلے کی بات اور تھی۔'' کنعان کی آنکھیں جھلملانے لگیں، دیا گھبرا کر اس کے پہلو میں آئی۔
''کیا بات ہے کنعان۔ ارے رونے کیوں لگیں۔ کسی نے کچھ کہا؟''
''پتا نہیں دیا۔ جب سے آئی ہوں، سب کی نظروں میں سوال، خدشے، وہم نجانے کیا کیا دکھائی دیتا ہے۔ کوئی کھل کر کچھ پوچھتا بھی نہیں۔ پلیز دیا۔ تم ہی مجھے بتاؤ۔ یہ سب کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ اور......اور اس کے کیا اثرات ہوں گے میری لائف پر؟''
''انکل تو بہت فرینڈلی ہیں کنعان۔ تم دونوں نے ہمیشہ ہر بات دوستوں کی طرح ڈسکس کی ہے، تو اب کیا ہوا؟''
''تو میں کیا سمجھوں دیا۔ اب انہیں کیا خدشے ستا رہے ہیں۔''
''شاید وہ آگے کے لیے پریشان ہوں، کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے ایسا کیا۔ کیا پتا دوبارہ ایسا کچھ...... انہیں تھوڑا وقت دو، اور خود کو خوش ظاہر کرو تاکہ ان کے وہم دور ہو جائیں، جلد ہی سب کچھ معمول پر آجائے گا۔''
''ہاں۔'' کنعان نے ممنونیت سے دیا کی طرف دیکھا۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ابو کو ضرور مستقبل کی فکریں ستا رہی ہوں گی کہ دوبارہ ایسا کوئی واقعہ نہ ہو جائے۔
''چلو۔ یہ سب چھوڑو......اور یہ بتاؤ سوار کی آمد کے بعد کیا ہوا؟'' دیا نے اس کی تھوڑی اونچی کی۔ ''کیسے اس نے تمہیں دشمنوں سے ریسکیو کیا، اور کیسا گزرا بعد کا وہ وقت جو تم دونوں نے ساتھ گزارا......ہوں؟'' دیا نے ہنس کر موضوع تبدیل کیا اور کنعان کے لبوں پر سوار کے نام سے پہلی دلکش مسکراہٹ چمکی۔
''واہ بھئی، بڑی مسکراہٹیں بکھر رہی ہیں۔ بتاؤ نا کیا باتیں ہوئیں۔ ہیرو صاحب تو سچ مچ ہیرو بن کر سامنے آئے۔''
''کچھ خاص نہیں۔'' وہ اپنی شرمگیں مسکراہٹ چھپانے میں لگاتار ناکام تھی۔۔ سوار کا انگاروں کی لپک میں نظر آتا چمکتا سنہری چہرا اس کے گال دہکانے لگا۔
''مسکرانے سے فرصت مل جائے تو بلا لینا۔ دو کپ چائے بنانے کچن میں جا رہی ہوں۔'' دیا اسے ٹہوکا مارتے اٹھ کھڑی ہوئی، اور وہ یونہی بیٹھی رہی کہ دیا کی بات سنائی کہاں دی تھی۔ تصور میں اشرف کی سرائے زندہ ہو چکی تھی۔۔ اور بس وہ دونوں۔

☆☆☆

مری کے ٹھنڈے ٹھار ماحول میں جبکہ دسمبر کا آخری ہفتہ چل رہا تھا ہر نئی بارش کے ساتھ برف باری کے امکان کچھ اور بڑھ جاتے تھے۔ ایسے میں چمکتی دھوپ کا نکلنا نعمت سے کم نہیں تھا۔ سوار پچھلے تین چار روز ہوٹل کی مصروفیت اور بارش کی تواتر سے برستی جھڑی کی وجہ سے کہیں نکل نہیں پایا تھا۔ آج دھوپ نکلنے پر باقی سارے کام ترک کرتے خوب ترنگ میں میاں جی کے پاس آیا تھا۔ سادہ بلیک جینز

کے ساتھ لائٹ پیچ شرٹ اور بلیک اپر میں وہ معمول
سے کہیں زیادہ حسین دکھائی دے رہا تھا۔ داڑھی بھی
آج بڑے دنوں بعد توجہ سے سیٹ کی تھی۔

دن کے کچھ ساڑھے دس گیارہ کے بیچ کا وقت
تھا۔ میاں جی ناشتے کی مصروفیت سے فراغت پا کر
دھوپ سینک رہے تھے۔ رب نواز ایک نئے لڑکے
کی مدد سے دور ڈھابے کی صفائی کر رہا تھا۔

"ابھی تمہیں ہی کال کرنے والا تھا۔" وہ ہنس
کر سوار سے بغلگیر ہوئے۔ "پھر سوچا خود تو فرصت
سے دھوپ میں بیٹھا ہوں، تم کہیں کاموں میں
مصروف نہ ہو۔"

"کام تو میاں جی کبھی ختم نہیں ہوتے، کھینچ
تان کر ہی اپنے لیے، اپنوں کے لیے وقت نکالنا پڑتا
ہے۔ پھر آپ کی طرف تو خصوصی شکریہ بنتا تھا۔ آج
بھی نہ آتا تو کہتے۔ بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا،
لوگ احسان تک کو یاد نہیں رکھتے۔" سوار کا اچھا موڈ
اس کے لہجے سے جھلک رہا تھا۔ پہلا جملہ ہی
چھیڑنے والا منتخب کیا تو میاں جی نے ہنس کر دھپ
لگائی۔

"پہلے کب تمہیں گلے دیے۔"

"منہ پہ گلہ کون دیتا ہے، پیٹھ پیچھے ہی عزت
خراب کی جاتی ہے۔" وہ باز نہیں آیا۔ میاں جی قہقہہ
مار کر ہنس پڑے۔ صبح کا آغاز ہی اچھا ہوا تھا۔ انہوں
نے دوسری کھاٹ بھی دھوپ میں گھسیٹی۔

"رب نواز، یار۔ دو کپ اچھی سی چائے بنانا۔
اور دیکھو وہ شکور والا سوہن حلوہ بھی گرم کر کے دینا۔"

"سوہن حلوہ۔" سوار بے اختیار مسکرایا۔ "میرا
ایک ملتان والا دوست منگواتا تھا اکثر۔"

"یہ بھی میانوالی سے آیا ہے، اسپیشل بادام
سوہن حلوہ۔"

"کھلا دیں میاں جی، آج تو ناشتا بھی بس
بھاگ دوڑ میں کر پایا ہوں۔"

"ناشتا خوب ڈٹ کر کیا کرو، تسلی سے۔"

"فخری نظر نہیں آ رہا؟" سوار نے ادھر ادھر
دیکھا۔

"اسکول کی چھٹیاں ہوئی ہیں نا، تو اس کا باپ
آ کر لے گیا۔ پہلی برف باری ہوتے ہی بھاگ
آئے گا۔ پاگل ہے برف کے لیے۔"

"میں بھی ایک ایک دن انتظار میں کاٹ رہا
ہوں۔ سرما میں مری آنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔
میرا یہ لائف کا پہلا تجربہ ہوگا۔ بہت ایکسائٹڈ
ہوں۔"

"بس ہو جائے گی ہفتے دس دنوں تک، دیکھتے
نہیں، بارشوں میں کیسی جما دینے والی ٹھنڈ ہے۔"

"اوہ۔" سوار جھرجھری لے کر ہنسا۔ "یاد مت
دلائیں میاں جی، میں تو جنگل کی بارش خود پہ گزار
بیٹھا ہوں۔ برف سے کیا ہی کم تھا وہ پانی۔ اس رات
تو یقین مانیں، بس اللہ نے بچایا، ایسی جان نکالنے
والی ٹھنڈ......"

"بڑی ہمت ہے تمہاری۔ میں تو قسم سے تمہیں
بھیج بیٹھنے کے بعد خوب پچھتایا، نہ چھتری، نہ کوئی
ہتھیار، نہ سردی سے بچاؤ کی کوئی ترکیب۔ کوئی ایسے
بھی کسی کو موت کے منہ میں بھیجتا ہے۔ اماں تمہاری
نے مصلی تو سنبھالا لیکن بیچ بیچ میں مجھے برا بھلا کہنے
کی فرصت بھی خوب نکالی، میں کیا کم نادم تھا اپنے
کیے پر، اس کے کچوکے الگ میرے سر میں درد
کر رہے تھے۔" میاں جی بے چارے چار دن سے
بھرے بیٹھے تھے۔ بے تکان بولتے چلے گئے اور سوار
بھی ہنس کر سنتا رہا۔

"سب کچھ اچانک پیش آیا میاں جی۔ سوچنے
سمجھنے کا وقت ہی کہاں تھا۔ اور اب سوچوں تو یقین
مانیں مجھے ان کمیوں بیشیوں کا ذرا بھی قلق نہیں ہوتا۔
اللہ کے کرم سے سب کچھ بخیر و عافیت رہا۔ کنعان
اپنے گھر پر ہے، نہ پولیس تک خبر گئی، نہ لوگوں میں
تشہیر ہوئی، حتیٰ کہ رفیق سر پانچ لاکھ کے نقصان سے
بھی بچ گئے۔ آپ بلاوجہ خود کو کوس رہے ہیں۔ یہ
سب کچھ آپ کی بدولت تو ممکن ہوا، اب بارش تو
ظاہر ہے اللہ پاک کی طرف سے تھی، اس میں بھی اپنا

قصور نکالیں گے۔" وہ ہنس پڑا۔
"ہاں لیکن مجھے تمہارے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔"
"آپ تو یہاں بیٹھ کر بھی ہر جگہ کا کنٹرول سنبھالنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ کیسے درست موقع پر سرائے جانے کا مشورہ دیا۔ ماننا پڑے گا آپ کے نیٹ ورک کو۔"
"اور...... کنعان کیسی ہے؟" میاں جی اس کا کھلا چہرا خوش ہو کر دیکھ رہے تھے۔
"ہوں۔" اس نے مسکرا کر سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے۔ بلکہ اب ٹھیک ہے، شروع کے دو دن ذرا ڈسٹرب تھی۔"
"اور اس کے والد صاحب؟"
"باپ ہیں میاں جی۔ سو طرح کی فکریں لاحق ہو جاتی ہیں۔ بظاہر خود کو مطمئن ظاہر کر رہے ہیں۔"
"تمہارا جانا ہوا دوبارہ؟"
"اونہوں۔" سوار نے چائے کا کپ اٹھا کر گرم سپ لیا۔ "جانے کے بارے میں اب سوچ رہا ہوں۔" وہ جیسے سنجیدہ ہوا کسی خیال سے۔ میاں جی نے بنا سوال کیے ایک خاموش نظر ڈالی۔ اور یہ بھی کسی سوال سے کم نہ تھی، سوار نے خود ہی وضاحت دینے کا سوچا۔
"مجھے لگتا ہے، رشتے کی بات کرنے کا اس سے بہتر موقع نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی کنعان کی وجہ سے پریشان ہیں اور میں بھی اپنی ذات کی مزید تفصیلات میں جانے سے گھبرا رہا ہوں۔ اگر انہیں "حال" کا سوار محض آج کی شناخت کے بل بوتے کسی قابل دکھائی دیتا ہے تو ہو سکتا ہے وہ مجھے رشتے کے لیے ہاں بول دیں۔" سوار نے نہایت صاف گوئی سے اپنا نکتہ نظر بیان کر دیا۔ بنا کسی لگی لپٹی کے۔ کم از کم میاں جی کے سامنے اس نے کبھی اپنے ظاہر کو باطن سے الگ نہیں ہونے دیا۔ میاں جی اس کی بات مکمل ہونے پر ہلکا سا مسکرائے۔
"بات تو تم نے ٹھیک کہی سوار۔ کمی، کوتاہی، خامیاں کہاں نہیں ہوتیں۔ کوئی بھی یہاں مکمل ہونے کا دعوا نہیں کر سکتا۔ پھر ہو سکتا ہے وہ پہلی مرتبہ میں تمہیں ہاں بول دیں۔ موجودہ صورت حال تو سراسر تمہارے حق میں ہے۔ اور اب تو تم ان کے محسن بھی ہو۔ زیادہ چھان پھٹک اور تفصیلات میں جانے کا حق بھی شاید وہ اپنے آپ کھو چکے ہیں۔ ادھر تم رشتہ مانگو گے، ادھر اس موقع کو غنیمت جانتے وہ فوراً سے پہلے تمہیں ہاں کہہ دیں گے۔"
"تو...... یعنی کہ میں چلا جاؤں میاں جی؟"
سوار کے لہجے میں دبا دبا جوش چھپا تھا۔ میاں جی نے ایک گہرا سانس لیتے خالی کپ سامنے میز پر رکھا اور بائیں جانب دیکھا۔ رب نواز وہاں سے اتنے فاصلے پر تھا کہ اگر دھیان لگاتا تو ان دونوں کی باتیں صاف سن سکتا تھا۔ میاں جی اٹھ کھڑے ہوئے
"میرے ساتھ آؤ سوار۔"
ان کا رخ ایک بار پھر سڑک پار کے جنگل کی طرف تھا۔ گھنے درختوں کی گزرگاہ سے نکل کر وہ پھر کھلے سورج کی روشنی والے قطعہ کی طرف آگئے تھے۔ سوار نے خاموشی سے ان کی پیش قدمی کی تھی۔ ان کی سنجیدگی ذرا ذرا دل کو ڈرانے لگی تھی۔ سوار کے اعصاب میں یک لخت نجانے کیوں تھکا تھکا سا احساس اترا تھا۔ جیسے سارا جوش ساری خوشی کسی نے کھینچ کر نکال دی ہو۔ میاں جی اب آلتی پالتی مارے عین اس کے سامنے بیٹھے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔
"بیٹیوں والے باپ کے لیے ہر بچی اس کی بیٹی جیسی ہونی چاہیے سوار۔ میں نے آج تک بھی کنعان کو دیکھا تک نہیں۔ لیکن میں دو بچیوں کا باپ ہوں۔ بیٹیوں کو بیاہنے کا مرحلہ ایک باپ کے لیے کیسا ہوتا ہے، خود پر گزار بیٹھا ہوں۔ اور یہی مرحلہ اب رفیق احمد کو درپیش ہے۔ اور میرے لیے اب وہ اس جگہ پر ہے جہاں کچھ سال پہلے میں تھا۔ دیکھا جائے تو کنعان میرے لیے بہو کا درجہ رکھتی ہے۔ میرے منہ بولے بیٹے نے اسے زندگی بھر کے

لیے اپنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے تو یقیناً اس کے لیے اچھا بھی سوچتا ہوگا۔ لیکن میں......" وہ کھلے کور کے۔ "جس سے تم ایک بزرگ، باپ یا شاید مشیر سمجھ کر مشورہ طلب کرنے آئے ہو۔ ایک شریف، عزت دار بچی کے تمہاری زندگی میں شامل ہونے کے موقع پر خود کو اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ آج مجھے اپنے متعلق سب کچھ بتاؤ سوار۔ اپنے ماضی کی ایک ایک بات۔ چاہو تو صرف ایک دوست سمجھ کر۔"

"میاں جی۔" سوار نے اپنے سفید پڑتے چہرے کو یک لخت اوپر اٹھایا، میاں جی کا مؤقف بہت حتمی بہت قطعی تھا۔ گریز ناممکن تھا۔ سوار نے کندھے ڈھیلے چھوڑ کر ایک سانس خارج کی۔

"مطلب...... بنا سچ بولے میں وہاں بھی رشتے کی بات نہیں کر سکتا۔"

"اس کا فیصلہ شاید ہم بعد میں کریں۔ فی الحال میں کنعان کے باپ کی جگہ آ کر تم سے سچ سننا چاہتا ہوں۔ تمہیں سننے کے بعد شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔"

"ابھی......؟" سوار شاید ذہنی طور پر خود کو تیار نہیں کر پا رہا تھا۔

"ہاں ابھی...... یہیں......" وہ اب مسکرا رہے تھے۔ سوار نے ان کی پشت پر کھڑے اونچے شاہ بلوط کے دھلے خوب صورت پتوں پر پڑتی دھوپ کی چمک کو دیکھا۔ لگا جیسے ہلکی ہلکی سرسراتی ہوا دور دیس سے آتی پراسرار کہانیوں کو دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ جسم کو حرارت پہنچاتی سورج کی یہ نرم سی تپش اسے بہار کی ٹھنڈی راتوں کی طرف چپکے سے ہاتھ تھام کر لے جاتی نظر آئی۔ سوار وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ پر آج اس کا چاہنا نہ چاہنا بے معنی تھا۔ اگرچہ ان ٹھنڈی راتوں میں اب اپنی جانب کھینچنے کی کشش مدت ہوئی سرد پڑ چکی تھی، لیکن وہ ایک نامعلوم سی بے بسی محسوس کرتا ان دنوں میں کھنچا چلا گیا۔

☆☆☆

"ٹھیک سے لکھو ثمر۔" ثمامہ نے ہاتھ سے پکڑ کر بیٹے کو گائیڈ کیا۔ "دیکھو ٹیچر نے صرف اوپر والی تین لائنوں میں لکھا ہے۔ آپ بھی ان ہی میں لکھو۔"

"تو ماما۔ یہ فورتھ لائن کیوں بنائی؟" ثمر نے ماتھے پر آئے بال ہٹاتے معصومیت سے سوال کیا اور ثمامہ نے مسکرا کر اس کا گال چوما۔

"جب آپ اسمال لیٹرز لکھنا سیکھو گے تب یہ فورتھ لائن بھی یوز ہوگی۔"

"اچھا ابھی تو میں تھک گیا ہوں ماما۔"

"نو بیٹا۔ ابھی کاؤنٹنگ باقی ہے۔"

"لیکن مجھے ماموں کے پاس جانا ہے، میری گیم کا لیول......"

"تمہارے ماموں کو بھی ٹھیک کرتی ہوں، اسی نے بگاڑ......" ثمامہ کی توجہ موبائل پہ آتی کال نے اپنی طرف کھینچی۔

"سویرا۔" اس نے دبے دبے جوش سے زیر لب دہرایا، پھر ثمر کی طرف دیکھا۔

"او کے۔ ماموں کے پاس جاؤ، باقی پڑھائی بعد میں۔" اس نے ثمر کو بھگا کر جلدی سے کال اٹینڈ کی۔

"ہیلو سویرا۔"

"ہائے ثمامہ، کیسی ہو؟"

"بالکل ٹھیک، تم سناؤ۔" ثمامہ کا چہرا قبل از وقت ہی تپنے لگا۔

"فری ہو تو، ذرا تفصیلی بات ہے۔" سویرا نے تمہید باندھی۔

"ہاں ہاں، بالکل فرصت ہے۔ تم بتاؤ، کچھ معلوم ہوا ہے کیا؟"

"ہاں معلومات تو ساری مل گئی ہیں۔" سویرا ڈھیلے سے لہجے میں قدرے تذبذب کا شکار نظر آتی تھی۔

"تمہیں یہ کہاں ملا ثمامہ، جس کے متعلق تم جاننا چاہتی ہو؟"

"کیوں؟" ثمامہ کا اپنا لہجہ اٹکنے سا لگا، بمشکل

خود کو سنبھالا۔ ''میرے پاس تو جاب کے لیے آیا ہے۔ اور کوئی خاص بات نہیں۔''

''یار جاب پہ تو بالکل بھی مت رکھنا۔'' سویرا کا لہجہ سرگوشیانہ ہوا۔ ''یہ تو بالکل بھی اچھا لڑکا نہیں ہے۔ اہل علاقہ میں اس کی ریپوٹیشن بہت خراب ہے۔ قریب دس ماہ پہلے گھر سے بھاگا تھا، ایک قتل کر کے......اور......''

''اور......'' ثمامہ کی آنکھیں غیر یقینی کیفیت میں پھیل کر ایک ہی جگہ پتھرا گئیں۔ اور سویرا نے ذرا سے توقف کے بعد آرام سے بتانا شروع کیا اور ثمامہ دم سادھے سنتی چلی گئی۔

☆☆☆

وہ ڈھیٹ تھی۔ ہٹ دھرم، ضدی اور اپنے مقصد کو پالینے تک کے وقت میں بے چین بے قرار، کسی بھٹکتی روح جیسی بے آرام۔۔ اس نے زندگی میں بھی اپنے دل کو سمجھایا نہیں تھا، صرف دل کی مانی تھی۔ وقاص سے محبت ہوئی تو بنا سوچے سمجھے اسے اپنانے کی دھن اس پر سوار ہو گئی تھی۔ حالانکہ وہ تو دس پندرہ دن کی دوستی کے بعد بنا اسے کوئی اونچے اونچے خواب دکھائے واپس لوٹ گیا تھا۔ لیکن شازمہ نے وقاص کو اپنے خوابوں کا شہزادہ سمجھ لیا تھا تو وقاص بھی اسے حقیقت کی دنیا میں واپس نہیں لا سکا تھا جب تک کہ اس کے خوابوں کا یہ محل نائلہ سے ملاقات کے بعد چکنا چور نہیں ہو گیا۔۔ اور پھر تو پے در پے کی چوٹوں نے اسے سنبھلنے ہی نہیں دیا۔

وقاص کے لیے نائلہ اور اس کا بچہ ہی اولین ترجیح تھے، ان کی دلجوئی کی خاطر وہ اسے اپنی زندگی سے نکال تک سکتا تھا۔ بعد کی چند ایک اور باتوں سے اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وقاص کو اس سے شادی پر محض اولاد کے لالچ نے اکسایا تھا اور اب یہ خوشی نائلہ کے توسط سے پوری ہو گئی تھی تو وقاص کی زندگی میں اس کی حیثیت ایک فالتو پرزے کی تھی۔ ۔اوپر سے وقاص کی طرف سے چھ راتوں اور ایک رات کی غیر منصفانہ تقسیم نے اسے مزید الجھنوں میں مبتلا کیا تھا، اور اس تقسیم میں بھی کسی قسم کے کمپرومائز پر وقاص ہرگز تیار نہیں تھا۔ کل ملا کر وقاص کی خطائیں اتنی زیادہ ہو گئی تھیں کہ شازمہ کا اس زندگی سے جی ہی اچاٹ ہو گیا، لیکن اسے یونہی تو وقاص کی زندگی سے الگ نہیں ہونا تھا۔۔ اور جو اس نے سوچا تھا اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے شکار میسر آ ہی گیا تھا۔ اور اسے حیرت تھی کہ عبدل جیسے معصوم پنچھی یوں تو بڑی ہی آسانی سے دام میں آ جایا کرتے ہیں۔ پتا نہیں کیا بلا تھا یہ لڑکا۔ اچھا خاصا گھما ڈالا تھا اس نے۔ پر اب...... وہ شرارت سے مسکراتے اسے میسج کرنے لگی۔

''ضمیر'' نام کے مخلص ساتھی سے وہ بالآخر اس کا ہاتھ چھڑوانے میں کامیاب ہو ہی گئی تھی۔ شیطان کی پٹاری میں بہکاوؤں کے لیے یوں بھی بڑا خزانہ تھا۔ عبدل کو اس کے گھر جا کر آمنہ بھابی کے سامنے بلیک میل کرنا تو بڑا ہی کارگر ثابت ہوا تھا۔ عبدل اسی شام ہی اس کے پاس بھاگا چلا آیا۔

''پلیز، میری آپ سے ہاتھ جوڑ کر گزارش ہے، بھابی کے علم میں کچھ نہ آنے دیں؟'' عبدل اس کے سامنے باقاعدہ دونوں ہاتھ جوڑے بس رو دینے کو تھا۔

''ارے۔ یہ نہ کرو آدی۔'' شازمہ نے اپنے ملائم ہاتھوں سے اس کے بڑھے ہاتھوں کو تھاما تو عبدل ہاتھ چھڑواتے ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا۔ دل بڑے بے ڈھنگے انداز میں زور زور سے دھڑکنے لگا، چہرا شاید غصے سے تپنے لگا تھا، آج کل اپنی محسوسات کچھ سمجھ سے باہر قسم کی تھیں۔

''آ...... آپ نے قسم کھانا تھی، میں بس اسی لیے آیا تھا۔ پلیز جلدی سے نمٹائیں، مجھے پھر کبھی یہاں نہیں آنا۔'' وہ نظریں نیچے فرش پہ گاڑے جلدی جلدی بول رہا تھا۔ شازمہ نچلا لب دانتوں میں دبائے اب کسی الگ سوچ میں ڈوبی تھی۔

''ہوں۔'' اسے بس چند سیکنڈز لگے ایک خیال سے باہر آنے میں۔ ''آجاؤ۔'' وہ آگے بڑھنے لگی

جب آدی نے گھبرا کر پیچھے کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔

"تم اندر جاؤ، میں بند کر کے آتی ہوں۔" شازمہ دروازے کی طرف بڑھی۔

"نہیں نہیں۔" آدی اس حرکت پر مزید بوکھلایا۔

"بھئی کوئی آس پڑوس کی عورت نہ اچانک آنکلے، گھبراؤ نہیں۔" شازمہ کے لہجہ سپاٹ اور سنجیدہ تھا۔ آدی کو مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی، خاموشی سے اندر بڑھ گیا۔ شازمہ دروازہ بند کر کے پلٹی تو ایک نظر کمرے کی طرف دیکھا، عبدل اندر جا چکا تھا۔ اس نے اپنے قدم تیزی سے برآمدے کی طرف بڑھاتے رخ کچن کی جانب کیا اور کچن کے باہر لگے بجلی کے مین سوئچ بورڈ کو بے آواز طریقے سے نیچے گرایا اور فوراً کمرے کی طرف بڑھی۔

"ارے۔ لائٹ پھر بے وقت چلی گئی۔" وہ ٹھنک کر دروازے میں رکی، بیزاری کی ایکٹنگ کرتے تاسف سے سر ہلایا اور اندر چلی آئی، جہاں اب نیم تاریک سا ماحول لگنے لگا تھا۔ آدی کمرے کے بیچوں بیچ ڈسٹرب سا کھڑا تھا۔

"بیٹھ جاؤ آدی۔" شازمہ نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا تو وہ بدک کر پلنگ سے دور ہوا۔

"نہیں، اس کی کیا ضرورت۔ آپ پلیز جلدی کریں۔" وہ اب گھبراہٹ پر قابو پاتے کوفت زدہ سا لگنے لگا

"اصل میں آدی۔ وہ......" شازمہ ایک گہری سانس کھینچتے انگلیاں چٹخاتے تھوڑا اس کے نزدیک آئی۔

"میں بھی سوچ میں پڑ گئی ہوں کہ ایسا کرنا چاہیے یا نہیں۔"

"آپ ہی چاہ رہی تھیں، مجھے تو خود بھی ٹھیک نہیں لگ رہا یہ قسم وغیرہ کھانا۔" وہ عجلت میں فوراً ہی بول اٹھا۔

"ہاں آدی۔" اس مرتبہ شازمہ نے سر اٹھا کر نرم لہجے میں کہتے عبدل کی آنکھوں میں دیکھا۔ "مجھے لگتا ہے تم ہی صحیح کہتے ہو کہ اپنے آپ کو روکنا پڑتا ہے، لیکن پتا ہے کیا۔" اس نے پھر ایک آہ بھرتے دوست دار لہجے میں مسکرا کر عبدل کو دیکھا۔

"میں کنفیوژ ہونے لگتی ہوں، خود سے سوال جواب ہی ختم ہونے میں نہیں آتے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کمزور لمحوں میں غرض قریب آنے پر مجبور کرتی ہے یا محبت؟"

"یہ سب سوچنے کی ضرورت کیا ہے؟" عبدل نے خشک گلے سے تھوک نیچے اتارا، قابو میں آیا دل پھر کسی انجان سمت میں سرپٹ دوڑنے لگا۔ یہ شازمہ کیوں اتنا بلاضرورت بول رہی تھی، اسے اب نکلنا تھا یہاں سے۔

"تنہائی بڑی بری چیز ہے۔" شازمہ کا جملہ آخر میں پھر ایک گہری آہ لیے ہوئے تھا۔ کمرے کی خاموشی اور نیم تاریکی میں اس کی آہیں پورے ماحول پر حاوی ہو رہی تھیں۔

"میں چلتا ہوں۔" عبدل نے کانپتے قدم باہر کی جانب اٹھائے۔

"اچھا، چلے بھی جانا۔" شازمہ نے دھیمے لہجے میں کہتے جرأت سے فوراً ہی اس کی کلائی پکڑی تھی۔

"چلو وعدہ کرتے ہیں آدی۔ قسم بھی نہیں کھائیں گے، غلطی بھی نہیں کریں گے، لیکن مجھے بس دوستوں کے انداز میں تھوڑی دیر کچھ درد بانٹنے دو۔ پلیز آدی۔ منع مت کرنا۔" شازمہ کا بھیگا مجبور لہجہ دھیما سا ہونے لگا، انداز میں ایسی امید بھری منت چھپی تھی جو کسی دشمن کو بھی انکار کرنے کی ہمت نہ دے، وہ تو عبدالعلی تھا، سدا سے مروت کا مارا، زندگی میں کب کسی سے سختی سے پیش آیا تھا۔

"آپ نے کیا پوچھنا ہے؟" وہ بار مروت میں کہہ ہی گیا۔

"یہاں دیکھو آدی۔" اس نے شہادت کی انگلی کا ہلکا سا ٹچ اس کی ٹھوڑی پہ رکھتے اس کا چہرا اپنی جانب کیا۔ "کیا میری آنکھوں میں محبت نہیں؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" ایک تو اپنا تنفس قابو میں نہیں آرہا تھا اور پر سے یہ جملے، جھنجھلاہٹ میں اس کی آواز اونچی ہوگئی۔

"کیا فرق پڑتا ہے غرض یا محبت سے۔ گناہ پھر گناہ ہے۔" اس نے اپنی آواز میں زور پیدا کیا۔

"تو پھر جنگ اور محبت میں سب "جائز" کیوں ہے۔" وہ اس کے بہت قریب آچکی تھی، بالکل غیر محسوس طریقے سے، شازمہ کا چہرا عبدل کے عین مقابل سانسوں جتنا نزدیک آچکا تھا اور وہ اس کی آنکھوں میں ایک ٹک دیکھتے ایسے کہیں اِدھر اُدھر دیکھنے کی مہلت تک نہیں دے رہی تھی

"یہ...... جھوووٹ...... ہے......" عبدل کو اپنی آواز کسی کھائی سے ابھرتی لگی۔ گلا خشک تھا، سانسوں کی دھمک سی ضرب سی سینے پر پڑ رہی تھی۔

شازمہ نے اپنا سر اس کے سینے پر رکھتے پتا نہیں کیا کچھ بولنا شروع کردیا تھا، آوازیں گھنٹیوں جیسی گڈمڈ ہورہی تھیں۔ دماغ جامد، ٹانگیں بے جان، سوچیں مفلوج...... ہوش میں صرف وہ تھی جس کے پیشِ نظر نہ یہ وقت تھا، نہ ماحول نہ اس کا جادو۔ بس ایک بھڑبھڑاتی آگ یہ پکتا اس کا منصوبہ، جس کے آڑے اب وہ خود بھی نہیں آنے والی تھی۔

"اور وہ دوسری ملاقات......" شازمہ نے ہنستے ہوئے سامنے کھلے آدمی کے نمبر کو دیکھ کر میسج سینڈ کیا۔

اس ملاقات نے عبدل کا دماغ جیسے بالکل ہی ہپناٹائز کردیا تھا۔ وہ اسے بس ایک کال یا میسج کرتی اور کوئی دھن تھی جو عبدل کو اس گلی میں بے اختیار کھینچ لے آتی۔ وہ کسی بھکاری سا اس دروازے پہ کھڑا اس در کے کھلنے اور شازمہ کو دیکھ لینے کا مشتاق دکھائی دیتا۔ قدم کسی عادی نشئی جیسے ہر دم جیسے پڑیا کی تلاش میں گزرنے لگے، نہ اسے دن کی پروا تھی نہ رات کا ہوش۔

ہاں البتہ کچھ دنوں سے شازمہ اب اس روٹین سے اوبنے لگی تھی۔ دو ہفتوں سے عبدل کے مزاج پہ چڑھا یہ محبت کا نشہ کہیں ضمیر کی ایک آدھ آواز سے ٹوٹ گیا تو وہ اپنے مشن کو پھر کبھی پورا نہیں کرسکے گی۔ عبدل نے ہی بتایا تھا کہ اب کبھی اسے آمنہ بھابھی تو کبھی عمار بھائی اور پچھلے روز کاشی نے بیچ راہ میں روک کر ٹوکا تھا کہ وہ ایک اکیلی عورت کے گھر زیادہ نہ جایا کرے، محلے والے باتیں بنانے لگے ہیں۔ اور عبدل یہ سب باتیں ابھی تو بے فکری سے آکر بتا دیا کرتا لیکن اگر جو کہیں کسی دن اسے بھی احساس ستانے لگا کہ وہ جو کررہا ہے وہ غلط ہے تو شازمہ کو پھر پہلے جیسے پاپڑ بیلنے پڑسکتے تھے کہ یہ شکار تو اس کے ہاتھ میں آیا ہی بڑی جوکھم کے بعد تھا۔

عبدل کی ترنگ اور مستی کا وہ چودھواں دن تھا جب شازمہ نے بالآخر اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا۔

عبدل نے بیپ کی آواز سنتے ہی فوراً موبائل اپنی جیب سے نکالا، میسج شازمہ کی طرف سے ہی تھا۔ وقاص آج بھی نہیں آرہا تھا، اس لیے اس نے عبدل کو بلا بھیجا تھا۔ اور میسج پڑھ کر عبدل کی ساری بے چینی ساری بے تابی ایک نشہ آور ترنگ میں بدل گئی۔ پچھلی صبح کے بعد سے اب رات کے آٹھ بجے تک نہ ہی وہ اسے دیکھ پایا تھا نہ ہی ملا تھا۔ اور یہ پورا ڈیڑھ دن اس نے عجیب سی بے کلی میں گزارا تھا...... اور اب...... اب وہ بلا رہی تھی۔

یہ فروری کا آخری ہفتہ چل رہا تھا۔ اباجی کھانا کھانے کے بعد عمار بھیا کے ساتھ برآمدے میں ہیٹر لگا کر بیٹھے تھے۔ اگلے روز محلے میں ہونے والی شادی کی تقریب دونوں کے زیرِ بحث تھی۔ مولوی فیض الحسن کو نکاح خوان کے طور پر تو آئے روز ہی بلایا جاتا تھا، پر وہ ڈھول شہنائیاں پیٹنے والوں کی تقریبات میں جانے سے آج کل بالکل ہی معذرت کردیا کرتے۔

"لیکن اباجی۔ ہر شخص کی اپنی مرضی ہے، ہم کس کس کو سمجھا سکتے ہیں۔" عمار بھیا نے نرم الفاظ میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"منع کہاں کررہا ہوں۔ نکاح پڑھنے سے

معذرت کررہا ہوں، وہ چاہیں تو کسی اور کو بلالیں۔"

"تو بھی کیا فائدہ۔ وہ کسی اور کو بلوالیں گے، نکاح بھی ہوجائے گا، گانے بھی بجتے رہیں گے۔"

"سوبار بجائیں۔" فیض الحسن صاحب کی آنکھوں میں غیض اترا۔ "میری طرف سے تو یہ پیغام جائے گا نا کہ یہ گانا بجانا نہ صرف حرام فعل ہے بلکہ ایسے عقل کے اندھوں کے مولوی فیض نکاح بھی نہیں پڑھواتا، کسی نہ کسی کو تو اچھی سیکھ ملے گی۔"

"کیوں نہیں ابا جی۔" آمنہ نے قہوہ سامنے رکھتے ایک نظر شوہر کی طرف دیکھا۔ "یاد نہیں آپ کو، سلطانہ چاچی نے کہا تھا، ان کی بچی کے نکاح کی رسم تو مولوی صاحب کے بابرکت ہاتھوں ہی انجام پائے گی۔ اور اگر مولوی صاحب کی یہی شرط ہے تو نہ گانا بجانا ہوگا نہ ڈھول وغیرہ۔ آخر اچھے کام کا آغاز کسی نہ کسی کو تو کرنا ہی چاہیے۔" وہ سلیقے سے دوپٹا درست کرکے وہیں شوہر کی پائنتی کی طرف بیٹھ گئیں۔ آدی کمرے سے نکلا تو ہاتھ میں موبائل فون اور کانوں میں ہینڈز فری لگا رکھے تھے۔

"اور ایک یہ بھی ہیں۔" مولوی صاحب نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔ "باپ دنیا کو سمجھانے نکلا ہے اور یہ اولاد شیطانی ڈبا ہاتھ میں اٹھائے پورے جہان میں رسوا کررہے ہیں۔ کدھر چل دیئے اس وقت؟" انہوں نے پیچھے سے ہانک لگائی۔

"میں ذرا کاشی کی طرف جارہا ہوں۔" عبدل خجالت سے سر کھجاتے ذرا دیر کو رک گیا۔

"سب کا گھروں میں آرام کرنے کا وقت ہے، تم بھی گھر بیٹھو۔" انہوں نے گھر کا، لیکن عبدل بجائے رکنے کے کچھ اور سوچنے لگا۔ پھر واپس پلٹ کر موبائل اور ہینڈز فری میز پر رکھے۔

"وہ باہر میری راہ دیکھ رہا ہوگا۔ اسے بتا کر تو آنے دیں۔" اس بار وہ عجلت میں کہہ کر باہر نکل گیا۔ کاشی تو کہیں تھا ہی نہیں، وہ تیز قدموں سے سیدھا شازمہ کے دروازے پر آیا۔ ہلکی دستک پر دروازہ تو فوراً کھل گیا لیکن شازمہ اسے سامنے پا کر بری طرح ٹھٹکی۔

"عبدل...... تم یہاں سے......" اس نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا پھر کلائی تھام کر اندر کھینچ لیا۔

"تم تو چھت سے آنے والے تھے، یہاں سے کیسے؟"

"گھر والے سب ابھی جاگ رہے تھے۔ چھت سے آنا ممکن نہیں تھا۔"

"تو کیا ہوا، سب کے سوجانے پر آجاتے۔ اچھا، خیر بیٹھو۔" وہ انگلیاں آپس میں مسلتے کچھ الجھی الجھی سی کھڑی تھی۔ عبدل بجائے بیٹھنے کے اس کی طرف بڑھا، ہاتھ پکڑ کر قریب کرنے کی کوشش کی تو وہ سٹپٹا کر دور ہوئی۔

"بیٹھو ناں آدی۔ باتیں کرتے ہیں۔" وہ غائب دماغی سے اسے مخاطب کرتے دوپٹے کے پلو سے کبھی گردن تو کبھی پیشانی تھپتھپا رہی تھی۔

"کیا بات ہے شازمہ۔ تم ٹھیک تو ہو۔ کوئی مسئلہ ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔"

"ارے نہیں۔" وہ مسکرا کر اس کے پہلو میں آئی۔ "میں نے ہی تو بلایا ہے تمہیں۔ اچھا سنو آدی۔" وہ بھاگ کر الماری سے ریوالور نکال لائی۔

اور یہ وہ ریوالور تھا جو اس نے عبدل سے ہی مانگا تھا۔ یہ کہہ کر کہ رات کو اکیلے میں وہ ڈرتی رہتی ہے اور وقاص کو جب تک اپنا لائسنس شدہ ریوالور نہیں مل جاتا وہ اپنے گھر سے اٹھا لائے۔ اور آدی اس کی ضد دیکھتے اسٹور روم میں سے عمار بھائی کا پستول چوری چھپے اسے دے گیا تھا۔ بقول شازمہ کہ ہفتے بھر میں ہی وقاص اس کے لیے اپنا لے آئے گا تو وہ واپس کردے گی۔

"آج مجھے یہ چلانا تو سکھادو۔"

"اس وقت...... رات کو ریوالور چلانا سیکھو گی؟" عبدل تعجب سے ہنسا۔ "بھئی مجھے تو چلانا نہیں آتا۔"

"پلیز آدی۔ سکھاؤ نا، گولیاں بھی ہیں اس میں۔"

"گولیاں تو ہیں لیکن سائیلنسر کہاں لگا ہوا ہے، خاموشی میں فائر کی آواز تو خوب گونجے گی۔"

"سائیلنسر......" شازمہ کے لیے شاید یہ نئی بات تھی۔ کچھ دیر رک کر سوچا، پھر سر جھٹک کر مڑی۔ "چلو کوئی بات نہیں، بنا گولی ڈالے کم از کم چلانا تو سیکھ لیں۔"

"اچھا، سیکھ لیں گے۔ بات تو سنو۔" وہ مسکراتے ہوئے پھر شازمہ کے قریب آیا۔ "آج تو بات ہی نہیں سن رہیں۔"

"تم بھی ناں آدی۔" وہ لجا کر دھکا دیتے تھوڑی دور ہوئی اور تبھی کال بیل کی آواز نے بیک وقت دونوں کو بوکھلا دیا۔

"اس وقت کون......؟" عبدل کا چہرا پریشانی سے پھیکا پڑا۔

"میں دیکھتی ہوں۔ تم آدی......" وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگی، دونوں اس وقت بیڈروم میں کھڑے تھے۔

"ہاں...... تت...... تم اس اسٹور روم میں چھپ جاؤ۔"

"یہاں، کیوں؟" عبدل حیران ہوا۔ "میں چھت......"

"نہیں چھت پر نہ جاؤ۔" وہ بوکھلا کر مڑی۔ "ابھی شاید چھت پر تالا لگا ہو، پھر اس طرف تمہارے گھر والے...... عبدل۔ اندر جاؤ۔ میں آنے والے کو دروازے سے ہی ٹالتی ہوں۔"

وہ دوسری دستک سن کر بری طرح بوکھلائی اور خود ہی عبدل کو چھوٹے کمرے میں گھسا دیا۔ اور وہ بری طرح گھبرایا ہوا سا اس اندھیرے کمرے میں دبکا کھڑا رہا۔ دل میں خود کو یہ سوچ کر تسلی دی کہ جو کوئی بھی ہوا، شازمہ ضرور اسے دروازے سے ٹال دے گی۔ لیکن یہ سوچ عبدل کی خام خیالی ثابت ہوئی کیونکہ باہر کسی مرد کی آواز سنائی دینے لگی تھی اور اب وہ آواز خطرناک حد تک قریب آ رہی تھی۔ عبدل کو اپنی ٹانگوں میں واضح کپکپی محسوس ہونے لگی تھی۔ سردی کی ایک لہر سنسناتی ہوئی سی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ مارے خوف کے اس نے اپنی سانس تک روک لی تھی۔ آواز شازمہ کے شوہر وقاص کی تھی جواب بیڈروم کے اندر تک آ گیا تھا۔

"کھانا وقاص؟" شازمہ کا نارمل انداز میں پوچھا گیا سوال عبدل کو بری طرح چونکا گیا۔ کچھ دیر پہلے کی ہڑبڑاہٹ کا شائبہ تک شازمہ کی آواز میں نہ تھا۔

"ابھی فون پر بتایا تو ہے کہ کھا کر آ رہا ہوں۔" وقاص نے جواب دیا تو عبدل کو حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا۔ شازمہ اگر شوہر کی آمد سے آگاہ تھی تو اسے کیوں بلایا۔

"آں...... ہاں......" وہ کھسیا کر ہنسی۔ "بھول گئی۔"

"اچھا میں ذرا فریش ہو کر آتا ہوں۔" وقاص شاید اٹھ کھڑا ہوا تھا اور عبدل نے پہلا سکون کا سانس لیا کہ ایک بار وقاص باتھ روم میں داخل ہو جائے تو وہ گھر سے باآسانی نکل جائے گا۔

"ابھی نہیں وقاص۔ بیٹھو۔ مجھے تم سے ضروری کام ہے۔" شازمہ کی آواز سنائی دی۔

اور یہ وہ جملہ تھا جس نے پہلی بار عبدل کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجائی، وہ یہاں کسی بےبس پرندے کی طرح پر پھڑپھڑا رہا تھا اور شازمہ یہ کیا کرتی جا رہی تھی۔ گھبراہٹ سے آدی کی پیشانی اس ٹھنڈ میں بھی عرق آلود ہو گئی۔ وہاں اندھیرے میں چھپ کر کھڑا وہ خود کو دنیا کا سب سے بڑا گھامڑ محسوس ہوا۔ چھپ کر ٹھہرنا ہی اس بات کی دلیل تھی کہ نہ وہ حق پر تھا نہ اپنے عمل میں سچا، یہ جگہ، یہ حیثیت سوائے ایک چور، مجرم، غاصب یا گناہ گار کے کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ آج بڑے دنوں بعد وہ احساس وہ ضمیر پوری شدت سے ایک بار پھر بیدار ہوا، شازمہ کی قربت کا نشہ جسے پوری طرح سلا چکا تھا۔ آج دو ہفتوں بعد اس بے ضمیر من کو کسی روزن سے جھانکنے کا موقع ملا تھا۔ اور اندھیرے من پہ پڑتی وہ

روشنی کی لکیر بڑی زور آور بڑی جاندار تھی، مانو پورا سورج ہی گھس آیا تھا اندر۔۔ شوہر کے سامنے اعتماد سے کھڑی اس کی آنکھوں میں مسکرا کر جھانکتی شازمہ اس لمحے عبدل کو انتہا کی بدصورت اور مکروہ دکھائی دی۔

"ضروری کام؟" وقاص کو اچنبھا ہوا "خیریت؟"

"ہمارے رشتے ہماری زندگی کے متعلق، میں کچھ فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔" وہ سر جھکائے پتا نہیں کیا بک بک کیے جا رہی تھی۔ عبدل کو تعجب تھا کہ وہ اس کی موجودگی سے یکسر لاتعلق کیسے ہوگئی تھی، وہ ہکا بکا اس کی بے سروپا باتیں سن رہا تھا۔

"کیسا فیصلہ؟" وقاص کے لہجے سے بھی حیرت مترشح تھی۔

"مجھے طلاق چاہیے وقاص۔ میں اب اور یہ اذیت نہیں سہہ سکتی۔"

"اوہ اچھا۔" وقاص کی ہلکی ہنسی میں ذرا استہزا تھا۔" اور طلاق لے کر کہاں جاؤ گی شازمہ بیگم؟ پیچھے کی کشتیاں جلاتے تو تم نے میری بھی ایک نہیں سنی تھی۔ ماں باپ، بھائی بہنوں کی عزت خاک میں ملاتے تو تمہیں یہ خیال نہیں آیا کہ واپسی بھی کرنا پڑ سکتی ہے۔"

"ہاں۔ کیونکہ مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ میرا واسطہ ایک جھوٹے اور دھوکے باز شخص سے پڑا ہے۔" وہ اب کینہ توز نظروں سے وقاص کو دیکھتی ناگن جیسی پھنکارنے لگی تھی۔ وقاص نے قہقہہ بلند کیا۔

"تمہارے منہ سے یہ الفاظ اچھے نہیں لگتے شازمہ۔ چار دن کی محبت کے لیے تم بھی اپنے خون کے رشتوں کے ساتھ یہی سب کر کے آئی تھیں۔ میں نے تب بھی وارن کیا تھا کہ آنے والی زندگی پھولوں کی سیج نہیں ہوگی۔"

"آگ لگے ایسی ڈھکی چھپی نصیحت کو، ایسے ہی سچے تھے تو کھل کر اپنی پہلی بیوی کے بارے میں بتاتے۔"

"بہتر ہوگا کہ جو ہو چکا اس سے چپ چاپ مصالحت کر لو۔ ورنہ یاد رکھو شازمہ، اگلی مرتبہ تمہیں طلاق مانگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی، میں ہی تمہیں اپنی زندگی سے نکال باہر کروں گا، میرے ساتھ یہ بلیک میلنگ ٹرک مت کھیلا کرو۔" وقاص کچھ غصے میں آ گیا تھا تبھی لہجہ ایکدم کھردرا سا ہو گیا تھا۔

"اور تمہیں لگتا ہے میرے پاس تمہارے دیے اس قید خانے کے سوا کچھ نہیں ہے۔" شازمہ کے لہجے میں بھی کھلا طنز تھا۔" اور طلاق مانگنا تو جیسے میرا حق ہی نہیں۔ ہاں؟" دفعتاً شازمہ کے لہجے اور انداز میں ایک نہ سمجھ میں آنے والی سختی در آئی۔

"ویسے تم بالکل ٹھیک سمجھے وقاص۔ مجھے تم سے طلاق چاہیے ہی نہیں، بھلا ایک بیوہ عورت کو طلاق کی کیا ضرورت۔"

"عبدل...... باہر آؤ۔" اس نے اسٹور روم کا دروازہ کھول دیا اور اتنی سی جگہ میں سامنے کھڑا عبدل صاف دکھائی دینے لگا، باہر آنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ ادھر وقاص کے لیے بھی حیرت کا جھٹکا تھا۔

"یہ کیا تماشا ہے۔ کون ہے یہ؟"

"تماشا تو تم نے بنا رکھا تھا وقاص۔" شازمہ اب حلق کے بل چلا رہی تھی۔" ایسی بے وقوف دکھائی دیتی ہوں نہیں، طلاق لے کر تمہاری زندگی آسان بنا جاؤں گی۔ نائلہ اور بچوں کے ساتھ ہنستی بستی زندگی دے کر چپکے سے ایک دن نکل جاؤں گی، پاگل سمجھ رکھا ہے۔" وہ ایکدم ہی جنونی اور دیوانی سی دکھائی دینے لگی تھی۔ آگے بڑھ کر عبدل کا بازو ہلایا۔

"گولی چلاؤ، مار ڈالو اسے...... عبدل......" وہ اسے ہذیانی انداز میں جھنجوڑ رہی تھی۔۔۔ وقاص کو بھی اب سنگینی کا احساس ہوا۔ شازمہ کے عزائم کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگے تھے۔ اس نے عبدل کی جیب سے دوپٹے کی مدد سے پستول نکال کر اس کے ہاتھ میں دیا۔

"کام تمام کر دو اس کا، بھاگ چلتے ہیں

آدمی...... سوچومت، ہری اپ......"

لیکن پتھر بنا آدمی تو کیا ہلتا وقاص ہی کمرے سے بھاگنے لگا اور اس کی نیت بھانپتے شازمہ نے کونے میں پڑا اسٹول اٹھا کر پوری طاقت سے وقاص کے سر پردے مارا۔ لکڑی کا کونا لگتے ہی وہ لڑکھڑا کر بیڈ پر گرا۔ شازمہ نے اسٹول اٹھا کر دوسری ضرب پھر اس کے سر پر لگائی، اس مرتبہ وہ بالکل بے سدھ ہو گیا۔ اور اس کے بے حس وحرکت ہوتے ہی وہ آگ بگولہ سی آدمی کی طرف مڑی۔

"پاگل ہو آدمی۔ اتنا اچھا موقع ملا تھا اور تم......" وہ تاسف سے سر ہلاتے موقع مس ہو جانے کا افسوس کر رہی تھی۔

"چلو اب جلدی کرو، اس کو مار کر نکل چلتے ہیں۔" وہ بھاگ بھاگ کر چیزیں اٹھانے لگی۔

"کہاں؟" وہ دیوار سے ٹکا اس خبطی عورت کو دکھ اور صدمے سے دیکھ رہا تھا۔

"ہماری نئی زندگی شروع کرنے، سوچو مت ٹائم بالکل نہیں ہے۔ زیور، نقدی میں نے پرس میں رکھ لی تھی، اور کچھ خاص نہیں ہے۔"

"تم اس کو مارنا......" وہ آنکھیں پھاڑے بیڈ کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں وقاص کی کنپٹی سے خون نکل کر گلابی بیڈ شیٹ کو تر کر چکا تھا۔ وہ بھاگ کر وقاص کے قریب گیا، اس کی نبض چیک کی جو ابھی چل رہی تھی۔

"اس کو بچاؤ شازمہ۔ یہ...... یہ زندہ ہے ابھی۔" وہ عجلت میں مڑا۔

"بے وقوف۔ اب تو بالکل اس کو زندہ نہیں چھوڑ سکتے، پستول اٹھاؤ اور خاتمہ کر دو اس کا۔"

"تو...... تمہارا یہ پلان تھا؟ تم میرے ہاتھوں اپنے شوہر کو مروانا چاہتی تھیں۔ تم گھر سے بھاگی ہوئی آوارہ...... تم نے مجھے پھنسایا، اور اب تم اپنے شوہر سے انتقام......" وہ قدم قدم پیچھے ہٹتے خود اپنی ہی نظروں میں گرتا جا رہا تھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے، ابھی یہاں سے نکلنے کی سوچو۔"

"اگر میں نے زندگی میں کبھی ان ہاتھوں سے کسی شخص کی جان لی تو وہ تم ہو گی شازمہ۔ جھوٹی...... فریبی...... مکار عورت...... چالباز۔" وہ جنونی انداز میں آگے بڑھا اور شازمہ نے پلک جھپکتے میں نیچے سے ریوالور اٹھا کر وقاص کے سر پر فائر کر دیا۔ فائر کی آواز سناٹے اور خاموشی کو چیرتی ہوئی پورے ماحول کو بیدار کر گئی۔

"یہ...... یہ...... تم نے کیا کیا...... مم...... مار ڈالا......" عبدل نے دیکھا۔

وقاص کا جسم ہلکا سا تڑپ کر بے جان ہو چکا تھا۔ عبدل کی ساکت آنکھیں وقاص پر جمی تھیں، شازمہ نے نظر بچا کر دوپٹے سے ریوالور کو صاف کیا اور زبردستی اسے عبدل کے دائیں ہاتھ میں پھنسا دیا۔ اور پھر بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔ عبدل ایکدم ہوش میں آیا، ریوالور ہاتھ سے چھوٹ گرا تھا۔ شازمہ باہر کیوں بھاگی تھی، وہ دیکھنے کے لیے برآمدے میں آیا تو شازمہ گلی کا دروازہ کھول کر اونچا اونچا چلا رہی تھی۔

"ہائے میں لٹ گئی، میری مدد کو آؤ۔ میں برباد ہو گئی۔"

"مائی گاڈ۔" عبدل نے دکھ اور صدمے سے منہ پہ ہاتھ رکھا۔ شازمہ محض اسے استعمال ہی نہیں کر رہی تھی، پھنسا رہی تھی قتل کے الزام میں...... اور...... اگر وہ اپنی مرضی سے اپنے ہاتھوں وقاص کا خون کر دیتا، وہ تب بھی یہی کرنے والی تھی۔ وہ اس کے ساتھ بھاگنے کے لیے نہیں، دنیا کے سامنے خود کو معصوم ثابت کر کے یہاں سے نکلنے کی نیت پر تھی۔ اور بس یہی تھا اس کا اصل پلان، وقاص کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکلنا لیکن اسے اس کے دھوکے کی سزا دے کر، وہ بھی اپنا دامن بچاتے ہوئے...... اور اس جنونی عورت نے ہر قیمت اپنا مقصد حاصل کیا تھا۔ عبدل نے دماغ استعمال کرتے سیڑھیوں کا رخ کیا۔ نیچے صحن میں اب شازمہ کے ساتھ اور لوگوں کی

آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔

سیڑھیوں پر تالا لگا ہوا نہیں تھا۔ وہ فوراً اوپر آیا لیکن اپنے گھر کی چھت پر کودنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ویسے بھی اِدھر شازمہ اس کا نام لیتی، اُدھر پلک جھپکتے میں لوگ اس کے دروازے پر پہنچ جاتے۔ اس نے باقی سمتوں میں جھانک کر دیکھا، سبھی چھتیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں وہ کہیں بھی کود سکتا تھا لیکن...... سیڑھیوں سے بہت سے قدم اوپر آنے لگے۔ اور عبدل نے سیکنڈز میں فیصلہ کرتے لپک کر چھوٹی دیوار پر پاؤں رکھا اور چھت کے واحد کمرے کی چھت پر چڑھ کر الٹا لیٹ گیا۔ فی الوقت یہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں کسی کا دھیان نہیں جاسکتا تھا۔ سب اسے چھت پر آکر آس پاس کی چھتوں پر ڈھونڈنے کی کوشش کرتے۔ اسی چھت کے کمرے کے اوپر اس کا ہونا کسی کے ذہن میں نہ آتا۔

چھت پر اب مردوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

"نکل گیا...... ہم سب نے آنے میں دیر کردی۔"

"ضرور اپنے گھر میں کودا ہوگا، جلدی نہ کی تو وہاں سے بھی نکل جائے گا۔" ایک دوسری آواز سنائی دی۔

"چلو یہیں سے کود کر نیچے جاتے ہیں۔ مولوی صاحب لونڈے کو بھگا نہ دیں۔" وہ آدمی وہیں سے چھلانگ لگا کر اس کی چھت پر کود گئے۔ عبدل دم سادھے وہیں پڑا رہا۔ اس کے گھر جانے والوں کے ہاتھ تو کچھ نہیں آنا تھا پر گھر والوں کو اس سانحے کی نہ صرف خبر ہونے والی تھی بلکہ مصیبت کا ایک پہاڑ تھا جو اباجی، بھیا اور بھابھی کے سر پر ٹوٹنے والا تھا۔ عبدل تصور کر کے ہی آدھی موت مرگیا کہ ان سب کو کیسی کہانی سنائی جائے گی۔ کاش......

وہ اس وقت پکڑے جانے کے خوف سے کہیں زیادہ ان پچھتاوؤں اور شرمندگی کے سمندر میں غرق تھا جس سے نکلنے کی دور دور تک راہ دکھائی نہ دیتی تھی۔ ایک جی میں آئی، خود کو سامنے کے لیے حاضر کردے کہ وقاص کا قتل اس نے نہیں شازمہ نے کیا تھا اور وہی اس کا چشم دید گواہ تھا۔ لیکن نہیں......
اس نے شدید تاسف سے سر نفی میں ہلایا۔

کون اسے سنتا، کون اس کی مانتا، آخر آدھی رات کے وقت وہ ان کے بیڈروم میں کیا کرنے گیا تھا۔ اس کا چشم دید ہونا فی الحال تو اسے آدھا بھی نہیں پورا مجرم اور قاتل بنا چکا تھا۔

عبدل کو انہی لایعنی سوچوں میں ڈوبے قریب پندرہ بیس منٹ اسی طرح اوپر والی چھت پر لیٹے ہوچکے تھے۔ نیچے سے شازمہ کے رونے چلانے اور عورتوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ پولیس بھی کسی وقت یہاں پہنچ سکتی تھی۔ اور کیا پتا ان کی نظروں سے وہ نہ بچ پائے، یہ سوچ کر عبدل نے اس جگہ سے نکلنے کا سوچا اور اوپر والی چھت سے دوسری چھت پر آتے، اپنے گھر کی چھت پھلانگ گیا۔ جو کچھ ہوچکا اسے فیس تو کرنا ہی تھا۔ اس کے گھر سے محلے والے تو تلاشی لے کر جاچکے ہوں گے یقیناً...... لیکن یہاں اسے جس نئے امتحان کا سامنا تھا وہ ہر اترتے قدم کے ساتھ عبدل کے وجود کو لرزا رہا تھا۔ قدم آخری سیڑھی پر تھے اور نظر سامنے صحن میں کھڑے اباجی، بھابھی اور عمار بھائی پر......

"مم...... میں نے کچھ نہیں کیا اباجی۔" ان سب کے تیور دیکھ کر عبدل نے جلدی سے وضاحت دینے کی کوشش کی، حالانکہ اعصابی طور پر وہ ڈوب مرنے والا ہو رہا تھا۔

"وہ تو چھت سے تمہارا آنا ہی بتا رہا ہے۔ نیچ...... ذلیل اولاد......" مولوی صاحب کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ جو کچھ وہ سن کر کھڑے تھے، اب تک کے وقت میں اللہ سے ایک ہی دعا تھی کہ یہ سب جھوٹ اور لوگوں کی غلط فہمی کے سوا کچھ نہ ہو، انہیں اپنے بیٹے سے ایسا کوئی شکوہ تو کبھی نہیں رہا تھا۔ لیکن عبدل کا چھت کے راستے گھر واپس آنا۔ ساری کہانی خود اپنی زبانی کہہ رہا تھا۔

"پولیس کو بلاؤ عمار۔ حوالے کرو اس نامراد کو

ان کے۔ میں اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔"
"ابا۔ میرا یقین کریں۔" وہ تڑپ کر ان کے قریب آیا۔
"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے...... نہ تم میری اولاد...... نہ آج کے بعد ہمارا تم سے کوئی رشتہ۔"
"ابا۔ ایک بار میری بات......" وہ رو دینے کو ہو گیا لیکن عمار بھائی نے کھینچ کر اسے ایک سائیڈ پر کیا۔

"کیا صفائی دو گے آدی۔ یہی کہ تم کاشی کے پاس گئے تھے۔ کاشی ابھی صاف صاف بتا گیا ہے کہ دوپہر کے بعد اس نے تمہاری شکل بھی نہیں دیکھی۔ یہی ہیں سلیم اور ارشد نے تمہیں اپنی آنکھوں سے اس عورت کے گھر داخل ہوتے دیکھا ہے۔ اور اب ایسے چوروں کی طرح چھت سے آیا...... اور اگر یہ واپسی دس پندرہ منٹ پہلے ہوئی ہوتی تو محلے والے تمہیں پولیس کے حوالے کر چکے ہوتے۔ اب عافیت اسی میں ہے کہ اپنا جرم خود قبول کر لو، ورنہ پولیس تو اگلوا ہی لے گی۔"
"لیکن بھیا میں نے کچھ نہیں۔" وہ دہائی دیتا رہ گیا اور ابا جی کے بعد بھیا بھی کمرے میں چلے گئے۔

"جاؤ آدی۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ پولیس کسی بھی وقت ہمارا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہے۔ خدا کے لیے نکل بھاگو۔" آمنہ بھابھی سرگوشیانہ لہجے میں کہتے اس کے نزدیک آئیں۔
"ان لوگوں کی معافی تلافی کا انتظار کرتے رہے تو زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزر جائے گی۔"

"بھابھی۔ میں نے قتل نہیں کیا۔" اس نے اپنا سر تھاما، صحیح معنوں میں اب احساس ہو رہا تھا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔
"قتل" جیسا خوف ناک لفظ اور اتنی سیدھی گرفت۔ ضمیر کی آواز کو پیچھے دھکیلنے کی سزا ملی تھی اور اتنے جلد۔ اللہ کتنا خفا تھا اس پر۔ رب تعالیٰ کا ایسا جلال۔ عبدل کو لگا سوائے اپنے آپ کو مار ڈالنے کے اس گناہ کی تلافی ممکن نہیں۔ زندہ رہ کر بھلا وہ کیسے بھر پائے گا اس نقصان کو۔ کبھی نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔
"مجھے پولیس کا سامنا کرنا ہوگا۔" اس نے جیسے حتمی فیصلہ کیا۔ دفاع تو جیتے جی شاید ممکن ہی نہیں۔ سزا بھگت کر ہی اللہ کو خوش کر سکتا ہوں۔
"میں نے تمہارا کچھ ضروری سامان اس بیگ میں ڈال دیا ہے آدی۔ جلدی سے نکل بھاگو۔" آمنہ بھابھی پورے کمرے میں بھاگ دوڑ کر کے نہ جانے کیا سوچ بچار کر چکی تھیں۔
"میں نہیں بھاگوں گا بھابھی، مجھے سامنا کرنا ہے۔" اس نے گہرے گہرے سانس لیتے اپنا حتمی فیصلہ بھابھی کو سنایا تو وہ بیگ پھینک کر ہاتھ جوڑتے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ آنکھوں میں نمی تھی اور بندھے ہاتھوں میں التجا۔
"تمہیں کچھ ہو گیا آدی۔ تو میں قسم کھاتی ہوں اپنی جان دے دوں گی۔ اس فریبی مکار عورت سے دوستی کرنے، اسے اپنے گھر بلانے، کسی نہ کسی کام سے تمہیں ان کے ہاں بھیجنے کے سب گناہوں کی ذمہ دار میں ہوں۔ تم نے کچھ کیا ہے یا نہیں، مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں، لیکن خدارا تمہیں میرے بندھے ہاتھوں کا واسطہ، مجھے زندگی بھر کے لیے اس اذیت میں مبتلا کر کے مت جاؤ کہ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔ تمہیں بھاگنا ہوگا آدی۔ مجھے آج بھابھی سمجھ کر نہیں، اپنی ماں سمجھ کر میری بات ماننا ہوگی۔ تم یہاں سے کہیں بہت دور چلے جاؤ، بس میرا دل تمہاری زندگی تمہاری سلامتی کے خیال سے مطمئن رہے گا۔ جاؤ آدی۔ وقت بالکل نہیں ہے۔" وہ منت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

اس بار عبدل نے سر اثبات میں ہلاتے ان کے ساتھ ساتھ خود اپنے آپ کو بھی تسلی دی کہ شاید وہ سچ دنیا پر ظاہر کرنے کے قابل ہو جائے، شاید اپنا

داغ دھونے کا اسے کوئی موقع مل جائے۔ اس نے بیگ اُٹھا کر اپنی الماری کھولتے جلدی سے اپنے ڈاکومنٹس کی فائل، اور کچھ دوسرا ضروری سامان بھی بیگ میں ڈالا اور بھاگنے کے لیے باہر نکلا۔

"سامنے کے راستے سے محلے والے اب بھی تاک میں کھڑے ہوں گے آدی۔ میں پچھلی دیوار سے گراؤنڈ میں جھانک کر دیکھتی ہوں۔ اس وقت صرف وہی راستہ ہے جہاں سے شاید تمہیں بچ نکلنے کا موقع مل جائے۔" انہوں نے کمرے سے نکل کر ایک کرسی اٹھائی اور پیچھے کے صحن کی آخری دیوار کے ساتھ لگا کر پیچھے جھانکا۔ یہاں دور تک پھیلے گراؤنڈ میں صرف اندھیرا تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ درختوں کی قطار بھی جن کے پیچھے چھپ چھپا کر جاتے وہ سڑک تک پہنچ سکتا تھا۔ وہ نیچے اتر کر واپس سامنے کے حصے میں آئیں۔

"جلدی نکل چلو، پیچھے کوئی نہیں ہے۔" وہ آہستگی سے کہتے اس کے قریب آئیں اور تبھی اباجی دروازے میں آئے۔ خاموش افسوس بھری نظروں سے ان دونوں کو دیکھتے وہ اس وقت دکھ سے نڈھال تھے۔ عبدل میں آنکھیں ملانے کی تاب نہ تھی۔ آمنہ بھابھی بھی نظریں چرا گئیں۔ عبدل نے قدم پچھلے حصے کی طرف بڑھائے اور آمنہ کی نظر برآمدے کی میز پر پڑے اس کے موبائل پر گئیں۔ آگے بڑھ کر جلدی سے موبائل اٹھایا۔

"آدی۔ تمہارا موبائل۔" انہوں نے موبائل والا ہاتھ آگے بڑھایا اور عبدل بھی واپس پلٹا، لیکن اس سے پہلے ہی اباجی آگے بڑھے اور موبائل آمنہ کے ہاتھ سے لے کر سامنے دیوار پر دے مارا۔

"خبردار۔ جو رابطے کی یہ آخری کڑی بھی اپنے ساتھ رکھی۔ تم جیسے نیچ انسان کی یہاں آواز بھی کوئی سننا نہیں چاہتا۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے ہمیشہ کے لیے....." اباجی کے نفرت بھرے الفاظ میں بھی اسے زندگی کی طرف جانے کی اجازت نظر آئی اور وہ چپ چاپ وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔

دیوار پھلانگ کر درختوں کے اندھیرے سایوں تلے بھاگتا وہ سڑک پر آیا تو ایک ٹیکسی مل گئی۔ اور اس کے اندر بیٹھنے تک بھی اس کا دماغ آگے کے متعلق بالکل خالی تھا۔

"کہاں جانا ہے باؤ۔" ٹیکسی والے نے مڑ کر سیدھا کیا۔

"ہوں۔" عبدل نے خالی خالی نظروں سے اوپر دیکھا، ٹیکسی والا بنا جواب کا انتظار کیے روانہ ہو چکا تھا۔

"پنیاں۔"

بالآخر چند منٹ کے وقفے سے منزل کا نشان بتاتے عبدل نے پہلی اطمینان کی سانس خارج کرتے سر پشت سے ٹکایا۔

پنیاں یہاں کا ایک مضافاتی گاؤں تھا۔ جہاں اس کا یونیورسٹی فیلو سمیع اللہ رہتا تھا۔ اور یہ اس کا واحد دوست تھا جس کے متعلق گھر میں بھی شاید کسی کو کبھی بتانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی سمیع اللہ سے یونیورسٹی ختم ہونے کے بعد کبھی ملاقات ہی ہو پائی تھی۔ اور آج شاید سمیع اللہ ہی تھا جو مشکل گھڑی میں اس کے کسی کام آ سکتا تھا۔ پبلک ٹرانسپورٹ میں کہیں نکلنے کا رسک وہ فی الحال نہیں اٹھا سکتا تھا۔ پولیس ایک بار مستعد ہو جاتی تو اس کے کہیں بھی نکلنے کی راہیں مسدود ہو جاتیں۔ اس لیے ایک طویل سفر ٹیکسی میں طے کر کے وہ آدھی رات کو سمیع اللہ کے گھر پہنچا تو وہ بے چارہ ٹھیک سے حیران بھی نہیں ہو پایا لیکن فطرتاً ایک شرمیلا اور وضع دار لڑکا تھا اس لیے بنا کچھ پوچھے عبدل کو اپنے ہاں ٹھہرا لیا۔

سوچوں اور تناؤ سے بھری رات کا اختتام ہوا تو اگلی صبح بھی ناشتے اور سمیع اللہ کی خاموشی سے ہوئی۔ عبدل نے البتہ خود ہی شرمندگی بھری وضاحت دی کہ اباجی سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا ہے اور وہ ناراض ہو کر گھر سے نکلا ہے۔ سمیع اللہ اسے بیٹھک میں ہی ٹھہرا کر اپنے کام پر نکل رہا تھا۔ وہ ہری پور میں کہیں ڈرافٹ مین کے طور پر کام کرنے لگا تھا۔

چند ماہ پہلے ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔ گھر میں اس کی والدہ اور بیوی کے علاوہ تین بہنیں بھی تھیں۔ گھر میں کسی اور مرد کی موجودگی کو نہ پاتے سمیع اللہ کے ساتھ وہ بھی گھر سے نکل آیا اور اس کی واپسی کا ٹائم پوچھ کر پنیاں کے ویرانوں کی طرف نکل گیا۔

اکیلے تنہائی میں سوچتے اور بس سوچتے چلے جانا۔ اپنے کیے پر ندامت، آنے والے وقت کے لیے پلاننگ، خود سے کچھ وعدے اور نئی ان دیکھی زندگی کی طرف قدم بڑھانے کے لیے خود کو ڈھیر ساری ہمت، حوصلے اور خوش امیدی کی تسلی دیتے وہ پورے آٹھ دن یہیں گزار بیٹھا۔ وہ بہت دھیرے دھیرے پرانے عبدالعلی کو واپس اپنے اندر لا پایا تھا۔ جو کچھ ہو چکا تھا، عبدل اس کے نتیجے میں اپنے اوپر سے اعتماد مکمل کھو چکا تھا۔ اسے لگتا بہت جلد سب بھول بھال وہ ایسا اس سے بھی بھیانک کوئی اور فعل انجام دے بیٹھے گا۔

آنکھوں پر غفلت اور نادانی کی پٹی بندھ جائے تو ساری عقل ہوش پل میں رخصت ہو جاتی ہے۔ اور ایسے عقل کے اندھے کو برا بھی اچھا دکھائی دیتا ہے۔ پھر کوئی سنگین حادثہ ہی اس کی کھوئی یادداشت لوٹانے کا باعث بنتا ہے۔ ہاں، لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے، چوٹ کھا کر وہ عارضی طور پر سنبھل بھی جاتا ہے، ایسی غلطی دوبارہ نہ دہرانے کے خود سے بڑے پکے وعدے بھی کرتا ہے لیکن پھر کہیں کوئی اور اندھا کنواں اس کے قدموں کا منتظر ہوتا ہے، جس میں گرتے ہی وہ ایک بار پھر ویسا بن جاتا ہے۔

عبدل بھی ہر صبح کے ساتھ کچھ ایسے عہد کچھ ایسی ترکیبیں سوچنے بیٹھ جاتا جو زندگی بھر کے لیے اسے سدھار دیں، کوئی ایسا نسخہ کوئی، ایسا علاج کہ دوبارہ وہ بیماری پھر کبھی اس پر حملہ آور نہ ہو، دن دن بھر پہاڑوں سے سر ٹکراتے وہ خود کو ایک نفسیاتی مریض تصور کرنے لگا تھا جسے ایک معالج کی اشد ضرورت تھی۔ کوئی سامع، کوئی مسیحا جو اسے یقین دلا سکے کہ ہاں وہ دوبارہ کبھی ایسا کچھ نہیں کرے گا۔ سات روز بعد اسے اپنی حالت میں پہلے دنوں کی نسبت کچھ بہتری محسوس ہوئی۔ رفتہ رفتہ وہ خود سے لڑنے کے بجائے اب آگے کے متعلق پلاننگ کرتے وقت گزارنے لگا تھا۔ اور یہ ایک اچھا سائن تھا۔ دو روز ہوئے اس نے اب پیچھے کے متعلق سوچنے سے خود کو دانستہ باز رکھا تھا۔ ۔اور یہ پہلی تدبیر تھی جو بڑی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ اب اس نے اپنے آپ سے تہیہ کیا کہ وہ گزری تلخ یادوں کو کبھی اپنے ذہن میں نہیں دہرائے گا۔ اور اس عہد کے باندھتے ہی اسے پہلی مرتبہ اپنے خاموش میزبان کی بے بسی پہ ترس آیا۔ آٹھ دنوں سے وہ ایک بوجھ کی طرح اس پہ مسلط تھا۔ سمیع اللہ نے اشارتاً بھی ایک بار یہ سوال نہیں کیا کہ وہ کب یہاں سے جائے گا۔ عبدل نے اسی رات ہی کھانے کے دوران اسے آگاہ کیا کہ اگلی صبح وہ یہاں سے چلا جائے گا۔

اور پھر اگلی صبح عبدل نے ایک معمولی رقم اپنی جیب میں بچا کر رکھتے باقی کی ساری رقم سمیع اللہ کو اس کی شادی کے تحفے کے طور پر دے دی۔ اور دس ہزار کی خطیر رقم ہتھیلی پہ دھری دیکھ سمیع اللہ کا منہ کھل گیا۔

”یہ کیا کر رہے ہو بھائی۔ تو تو خود......“

’اللہ مسبب الاسباب ہے سمیع۔“ عبدل اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر سادگی سے مسکرا دیا۔ ”تمہاری شادی پر آ نہیں پایا تھا۔ بھابھی کے لیے ان کی پسند کا کچھ خرید لینا۔“

اور جیب میں راولپنڈی تک کا کرایہ اور ماما جی کے پانچ سو لیے وہ ایک نئے سفر پر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

دھوپ درختوں سے ابھر کر کافی اوپر آ گئی تھی۔ سایے کچھ اور سمٹ گئے تھے۔ چمکتے پتوں کی نمی کو دھوپ نے مکمل نگل لیا تھا۔ ہوا کا زور بھی شاید بادلوں کو اڑا لے جانے کے لیے تھا۔ مطلع مکمل صاف ہوا تو ہوا بھی ٹھہری سی گئی صبح کی چمکتی سفید دھوپ نے

خون کے اندر تک حرارت بھر دی تھی۔ دل کا بوجھ پہلی بار کسی کے سامنے نکال پھینک کر سوار نے دل کو روئی کے گالے سے بھی ہلکا پایا۔ انجام چاہے کچھ بھی ہو۔ میاں جی بھلے کتنے بھی خفا ہوں۔ وہ تو دس ماہ سے سینے پہ دھری سل اتار کر اطمینان بھری سانس آج ہی لے پایا تھا۔

''مجھے بس ایک بات سمجھ میں نہیں آئی سوار۔ تم نے اپنا نام کیوں تبدیل کیا۔'' میاں جی کی پیشانی کے لاتعداد بل کچھ اور جان لینے کے مشتاق نظر آئے۔ سوار مسکرا دیا۔

''نام کبھی نہیں بدلا میاں جی۔ اور نہ ہی کبھی نوبت آسکتی ہے۔ میرا پورا نام سوار عبدالعلی ہے جسے یہاں آنے کے بعد ہر پوچھنے والے کو سوار علی بتایا۔ دراصل بات یہ ہوئی میاں جی۔'' سوار نے ایک گہری سانس باہر نکالی۔

''میری پیدائش سے پہلے ہی اماں اور ابا جی نے میرا نام اپنی اپنی جگہ پہ سوچ رکھا تھا۔ ابا نے کہیں سوار سنا تو انہیں اتنا پسند آیا کہ دل میں رکھ لیا۔ اور اماں فرماتی تھیں کہ عبدالعلی کا انہوں نے خواب دیکھا۔ میں پیدا ہوا تو دونوں بضد تھے اپنی اپنی جگہ۔ سنا ہے تایا ابا نے سوار عبدالعلی رکھوا کہ جان چھڑوائی۔ ابا جی تو سن کر فوراً خوش ہو گئے لیکن اماں کو تجویز پسند نہیں آئی اس لیے انہوں نے مجھے عبدل کہہ کر بلانا شروع کر دیا اور گلی محلے میں بھی یہی نام مشہور کروا دیا۔ مجھے سوائے اسکول کے کوئی سوار کے نام سے نہیں جانتا تھا۔ یا پھر ابا جی سوار کہہ کر بلاتے تھے، اور جب یہاں آیا تو عبدل اور آدی کی پکار سے اتنا خوف آنے لگا کہ اسے اپنے نام سے ہی نکال دیا۔ پھر مجھے بھی ہمیشہ سے اپنا سوار نام ہی پسند تھا اور میں یہی کہلوانا چاہتا تھا لیکن جنہیں عادت پڑ چکی تھی انہیں ٹوکنے کا فائدہ نہیں تھا۔''

''ہوں۔'' میاں جی نے ہنکارا بھرا اور سوار انہیں بغور دیکھے گیا۔

''تو......؟''

''تو...... کیا؟'' وہ انجان بننے لگے، سوار نے خفگی سے دیکھا تو ہنس دیے۔

''تم نے قتل نہیں کیا، میری طرف سے باقی سب گناہ معاف ہیں۔''

''تھینک یو میاں جی۔''

''اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو......'' انہوں نے شاید اسے چھیڑا تھا۔ سوار نے صدمے سے دیکھا۔

''خوفِ خدا کریں میاں جی۔ مجھ سے آج تک چڑی نہیں ماری گئی، اس روز جمشید کے دوست کی ٹانگ میں گولی مارنا پڑ گئی تو مجھے ابکائی آرہی تھی قسم سے۔''

''ہاہاہا۔'' وہ زور سے ہنستے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''یونہی تنگ کر رہا تھا۔''

''میاں جی۔ سچ بتائیں۔ میرے باقی قصور کیا واقعی اتنی آسانی سے معاف ہو سکتے ہیں؟'' وہ ابھی تک بے یقین تھا۔ میاں جی چلتے چلتے رک گئے۔

''تکلیف تب ہوتی سوار۔ اگر میں ابھی تک تمہیں اسی گمراہی میں گرے دیکھتا۔ تم نے کڑی محنت کر کے خود میں تبدیلی لائی ہے، ماضی کے حوالے سے طعنہ اب مجھے زیب نہیں دیتا۔''

''آئی لو یو میاں جی۔'' سوار دل سے خوش ہو کر ان کے گلے لگ گیا اور میاں جی نے ہنس کر اس کی پیٹھ تھپکی، دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔ انیٹوں کا راستہ اتر کر دونوں کا رخ سڑک کی طرف تھا۔

''تو میرا رشتہ میاں جی؟''

''دونوں مل کر چلتے ہیں کسی دن۔ دیکھتے ہیں وہ تمہاری ذاتی زندگی کے متعلق کیا کیا جاننے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ پھر اگر کوئی بات ایسی سامنے آئی ہے تو کسی اچھے ڈھنگ سے میں خود ہی بتانے کی کوشش کروں گا۔ اچھا ویسے کنعان کو کبھی کچھ بتایا۔'' میاں جی کو خیال آیا۔

"ابھی تک تو نہیں۔ اور پتا نہیں کیوں ہر بار ایسا لگتا ہے کہ کسی طرح رفیق سر مان جائیں، کنعان کو سمجھایا جاسکتا ہے۔"

"چلو پھر، دن اور وقت وغیرہ فون پر بتا دینا۔"

وہ دونوں اب سڑک پر آچکے تھے۔ سوار ان سے اجازت لے کر ہوٹل روانہ ہوگیا اور میاں جی اپنے ڈھابے کی طرف چل دیئے۔

☆☆☆

سویرا کا ایک ایک لفظ دھیان سے سنتے ہر نئے انکشاف پر ثمامہ اپنی سوچوں میں اس سے کہیں آگے کا سفر کرآئی، اس کی تیز دماغی کا یہی بڑا مسئلہ تھا۔ معاملے کے مختلف پہلوؤں، اس کے حل اور نتیجے تک وہ نہایت سرعت سے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کردیتی۔ سوار کے سوالات سن کر اختتام پر شکریے کے ساتھ اجازت لینے تک وہ کئی مرحلے خیالوں میں ہی طے کرآئی تھی۔

"ہوں۔" موبائل فون ایک ہاتھ میں پکڑے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر دھیرے دھیرے بجاتے وہ کمرے میں گھومنے لگی تھی۔

سویرا نے جو کہانی اسے بتائی تھی اس کے مطابق وہ ایک شادی شدہ عورت کے ساتھ ناجائز تعلقات میں ملوث رہنے کے بعد اسی کے شوہر کو قتل کرکے موقع واردات سے بھاگ نکلا تھا۔ لوگوں کے مطابق وہ عورت بھی کسی حد تک مشکوک تھی کیونکہ شوہر کی تدفین وغیرہ کے بعد وہ بھی اگلے ہی روز اس محلے کو چھوڑ گئی تھی۔ علاقے میں یہ بات مشہور ہوچکی تھی کہ وہ دونوں ایک پلاننگ کے تحت آگے پیچھے بھاگے اور اب یقیناً کسی تیسری جگہ ایک ساتھ رہائش پذیر تھے۔

ثمامہ نے ذہن میں تصور کیا کہ کیسے اگلے روز کے اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی ہوگی کہ عورت نے آشنا کے ساتھ مل کر شوہر کا قتل کیا اور آشنا سمیت فرار ہوگئی۔ پولیس اُن دونوں کی تلاش میں ہے وغیرہ۔

لیکن...... ثمامہ نے حال میں واپس آتے کچھ حقائق کو سامنے رکھا۔ حقیقت یہ تھی کہ سوار یہاں مری میں بالکل اکیلا تھا۔ لگتا نہیں تھا کہ شوہر کی تدفین کے بعد وہ عورت بھی یہاں مری آئی تھی۔ سوار نے اپنے مری آنے کا جو وقت بتایا وہ عین وہی بن رہا تھا جب ثمامہ خود یہاں آئی تھی۔ اور جب سے وہ سوار کو جاننے لگی تھی اسے اکیلا ہی پایا تھا۔

تو مطلب قتل کی واردات کے بعد کچھ اختلافات نے دونوں کو دور کردیا تھا۔ اور پھر مری آکر سوار نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا جس میں بدقسمتی سے اس کی ملاقات ثمامہ سے پہلے کنعان سے ہوگئی۔

"لیکن نہیں سوار۔" وہ ایک حتمی نتیجے تک پہنچتے نفی میں سر ہلانے لگی۔

ثمامہ کی بدقسمتی کا دور بھی بس یہیں تک تھا۔ اسے سوار کی پوری کہانی میں بہت سے جھول نظر آتے تھے، جو بتایا اور سمجھ آگیا اس میں یقیناً بہت کچھ غلط ثابت ہونے والا تھا کیونکہ جس سوار کو وہ جانتی تھی، وہ کبھی ایسا کوئی فعل انجام نہیں دے سکتا تھا ہاں لیکن وہ بزدل ضرور ہوسکتا تھا، تبھی گھر سے دور اکیلا یہاں آن بسا تھا۔ اور اب... وہ دعوے سے کہہ سکتی تھی کہ رفیق احمد اپنی بیٹی ایسے بزدل اور بدکردار شخص کو کبھی نہیں دے رہے... بھلے اب وہ قاتل ان کا محسن ہی کیوں نہ ہو۔ وہ محسن جس کے چہرے پر صاف لکھا ہے کہ اگر ماضی میں وہ کچھ غلطیاں کر بھی چکا ہے تو اب اس کے ازالے کی ٹھان چکا ہے۔ ہاں لیکن رفیق احمد کا ابھی اس دھوکے میں رہنا ہی ٹھیک ہے کہ شکلیں بھی دھوکا دے جایا کرتی ہیں۔ سوار کی معصوم صورت سے انہوں نے بھی بڑا دھوکا کھایا اور شکر پڑھیں گے کہ اس سے بھی بڑا دھوکا کھانے سے وہ بچ گئے۔

"ہاں لیکن کیسے؟" ثمامہ خیالوں کے رنگین آنچل کا کونا چھوڑتے حال میں واپس آئی۔ اس وقت سب سے اہم مرحلہ جو اسے درپیش تھا وہ رفیق

احمد تک یہ ساری سچائی پہنچانے کا تھا۔ اور وہ بھی کچھ ایسے کہ کسی کو اس پر شک نہ ہو سکے۔ ثمامہ نے طے کر لیا تھا کہ سب سے پہلے سوار اور کنعان کا رشتہ ہونے سے روکنا ہے۔ ایک بار وہاں سے انکار ہو جائے تو دوسرے مرحلے پر سوار کی حقیقت کو کچھ اور جاننے کی ضرورت ہے، پھر اگر وہ بے قصور نکلتا ہے تب تو کیا ہی کہنے لیکن اگر اس سے یہ غلطیاں سرزد ہوئی ہیں تب اس کی کمزوریوں کو ہاتھ میں لے کر اسے اپنا بنانا کتنا آسان ہو جائے گا، اب کمیاں کوتاہیاں بھلا کس میں نہیں ہوتیں۔ سوار تو پھر اسے اپنے گزرے کل سے کہیں بدلا ہوا میسر آیا تھا۔ دل کشادہ کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ ہاں لیکن اب اگر وہ سوار کے متعلق مزید کسی چھان بین میں لگ گئی تو ضرور اسے ہاتھ سے کھو بیٹھے گی۔ اور جہاں تک اس کا خیال تھا یوں تو سوار کو بھی آج کل یہی الجھن گھیرے ہوگی کہ وہ رفیق احمد سے بنا اپنا ماضی بیان کیے کیسے کنعان کا ہاتھ مانگ لے، لیکن واہ رے ثمامہ بیگم۔ یہاں بھی آپ کی عجلت نے سوار کی راہیں آسان کر دیں۔ اس نے ایک بار پھر خود کو کوسا۔ رفیق احمد کی بیٹی کو اغواکاروں کے شکنجے سے چھڑوا کر احسان تو وہ ان پہ کر ہی چکا تھا۔ اب وہ کوئی بھی جھوٹی سچی کہانی گھڑ کر رفیق احمد کو رشتے کے لیے بھی قائل کر سکتا تھا۔

چوبیسوں گھنٹے اب ثمامہ کے دماغ پر کوئی جامع حل، کوئی ترکیب نکالنا جیسے سوار ہی ہو گیا تھا۔ پہلے خیال آیا کال کر کے رفیق احمد سے سوار کے متعلق پوچھا جائے کہ میں نے سنا ہے وہ یہاں کام کرتا ہے، وہ کہیں گے کہ پہلے کرتا تھا اب یہاں نہیں ہے، اس پر وہ پوچھے گی اب کہاں ہے تو رفیق احمد ضرور اس کے متعلق پوچھیں گے۔ وہ کہے گی سوار کی بھابھی بات کر رہی ہوں ہری پور سے۔ یوں بات ذرا لمبی ہو جائے گی اور...... ثمامہ نے مایوسی سے پین سامنے ٹیبل پر پٹخا۔

وہ یہ ریکارڈنگ سوار کو سنا دیں گے اور سوار اس کی آواز دو منٹ میں پہچان جائے گا۔ یا اگر وہ یہ کام کسی اور سے کروائے تو بھی سوار اپنی بھابھی کی آواز تو پہچانتا ہوگا۔ اور ویسے بھی اپنے علاوہ وہ کس پہ بھروسا کر سکتی تھی۔ امی کی آواز سوار سن چکا تھا اور آصفہ باجی سے کہے تو ان کی آواز پہلے ہی ثمامہ سے بہت مشابہ تھی۔ فون پر تو اکثر لوگ دھوکا کھا جاتے تھے۔ تو پھر...... اس نے اپنا سر ہاتھوں پہ گرایا، سوار کی حقیقت جانے اسے چوبیس گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اور اسے ٹھیک ٹھیک اندازہ تھا کہ اس کے پاس وقت اب زیادہ نہیں ہے، سوار کبھی بھی اچانک کنعان کا رشتہ مانگنے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

''میم۔ وہ گھنٹے بھر کی چھٹی چاہیے۔'' وہ آفس سے باہر نکلی تو ریسٹورنٹ کے کچن سے کامران نکل کر سامنے آیا۔

''میم۔ میری والدہ کی طبیعت خراب ہے، ہاسپٹل لے کر جانا ہے۔''

''ہوں۔ تو سوار صاحب کہاں ہیں؟'' ثمامہ ماتھے پر شکن ڈالے ارد گرد دیکھ رہی تھی، ورکرز کے ایسے معاملات دیکھنا اس کا کام تھا۔

''جی میم۔ وہ اوپر کینٹے ٹیریا میں گئے ہیں۔ اصل میں مجھے کچھ رقم کی اشد ضرورت ہے۔'' کامران نے سر جھکایا۔ ''اگر آدھی سیلری ایڈوانس میں مل جائے تو علاج کے لیے......'' وہ سر جھکائے جھجک کر بتانے لگا۔

''ہوں، میں سوار صاحب سے کہہ دیتی ہوں۔ آپ چھٹی کا انہیں بتا کر رقم بھی لے لیں۔'' وہ چشمہ آنکھوں پر سیٹ کرتے شیشے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

بلاوجہ بھروسے مند بندہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی۔ اسے کسی بھروسے مند کی نہیں، ایک عدد ضرورت مند کی تلاش تھی۔

☆☆☆

''صبح بخیر شہزادی صاحبہ!''

"السلام علیکم۔" وہ جواباً مسکرائی۔ "آپ ساڑھے گیارہ بجے صبح بخیر کہا کرتے ہیں؟"

"وعلیکم السلام۔ بھئی میری صبح تو چھ بجے ہوجاتی ہے، میں نے سوچا چھٹیوں کے مزے لینے والوں کی صبح شاید اب ہورہی ہو۔" سوار نے ریوالونگ چیئر پر جھولتے خوش گواری سے آغاز لیا۔

ہوٹل کے روٹین معاملات دیکھ کر وہ بڑے سبک سر جذبات لیے آفس میں آیا، ثمامہ میڈم صبح تھوڑی دیر کے لیے آکر واپس چلی گئی تھیں۔ ادھر ٹائم دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ رفیق سر بھی ہوٹل میں ہوں گے، تبھی خود ہی کال ملالی۔

"دیر تک سونے کی بات کرتے ہیں، مجھے تو رات رات بھر نیند ہی نہیں آتی۔" کنعان کا لہجہ کچھ بجھا بجھا سا تھا۔

"ارے۔ کیوں؟" وہ ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔ "کیا ہوا؟" ذہن میں جمشید کے حوالے سے پریشان کن خیالات آنے لگے۔

"کچھ نہیں ہوا۔" اس نے ایک آہ بھری۔ "میں ابو کی وجہ سے پریشان ہوں، وہ مجھے اندر ہی اندر بہت اپ سیٹ لگتے ہیں۔ لیکن مجھے سمجھ میں نہیں آتا، میں انہیں کیسے تسلی دوں۔"

"ان کی پریشانی بھی بجا ہے کنعان۔ لیکن بہرحال وقتی اثر ہے، آہستہ آہستہ ہی ہر چیز معمول پر آتی ہے۔ باقی اگر آپ کی اجازت ہو تو مزید بہتری کے اقدامات بھی کیے جاسکتے ہیں۔" آخر میں لہجہ بھی شوخ اور معنی خیز ہوگیا، لیکن کنعان کا دھیان شاید کہیں اور تھا، وہ سمجھ نہیں سکی۔

"یعنی؟"

"میں نے میاں جی سے مشورہ کیا تھا کنعان۔ وہ میرے ساتھ آنے کے لیے تیار ہیں۔ رفیق سر سے ملنے کے لیے۔" سوار نے سبھاؤ سے آغاز لیا۔

"ابو سے ملنے، کس لیے؟" وہ ہنوز غائب دماغ سی تھی۔ اغوا نے شاید یادداشت پہ اثر ڈالا ہے۔ سوار نے تشویش سے داڑھی کھجائی۔

"رفیق سر کی شادی کروانے کے لیے۔ تمہاری نئی امی گھر آئیں گی تو ان کی پریشانیاں بھی ختم ہوجائیں گی، تم بھی ذرا مصروف ہوجاؤ گی۔"

"ابو کی شادی؟" کنعان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "لیکن وہ کبھی نہیں مانیں گے، پھوپھو نے بھی ایک بار کہا تھا......"

"کنعان......" سوار نے اس بار تنبیہاً ٹوکا۔ "میاں جی کیا رشتہ کروانے والی ماسی ہیں، ڈفر لڑکی۔ میں ہمارے رشتے کے لیے ان کو لا رہا ہوں۔"

"اوہ۔" وہ کھسیا کر اب پوری طرح سوار کی جانب متوجہ ہوئی، دماغ واقعی آج کل ایک ساتھ کئی اطراف میں گھومتا رہتا تھا۔ سن کچھ رہی ہوتی اور دماغ میں کچھ اور چل رہا ہوتا۔

"کیا لگتا ہے کنعان۔ وہ مان تو جائیں گے نا؟"

"کیا کہہ سکتی ہوں۔" کنعان کا لہجہ مدھم پڑ گیا۔ سوار سے ایسے موضوع پر ڈائریکٹ بات کرنا بھی ایک مشکل مرحلہ ہوتا۔

"تمہاری رائے لیں گے؟"

"جی، مجھ سے ضرور بات کریں گے۔" کنعان پراعتماد تھی اس بارے میں۔

"پھر تو مجھے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ خوش ہوا۔

"ہاں لیکن مجھے بھی تو وقت چاہیے سوچنے کے لیے۔" اب وہ تنگ کر رہی تھی۔

"چل جھوٹی۔" سوار نے اس کا مذاق پل میں پکڑ لیا تو وہ بھی ہنس پڑی۔

"کب آنا ہے؟"

"کل سیکنڈ ٹائم کا سوچ رہا ہوں۔ آج میڈم کہیں نکلی ہوئی ہیں۔ کل پہلے ان سے بات کرلوں گا، ایک دو گھنٹے کی چھٹی کی۔"

"ابو کو بتائیں گے؟"

"ہاں۔ بات کرلوں گا۔ آنے سے پہلے۔ آں، کہوں گا ایک ضروری کام سے آرہا ہوں، ہاں ایسا کچھ......"

"ٹینشن میں لگ رہے ہیں۔" کنعان اس کے بے ربط جملوں سے خوب اخذ کررہی تھی، بلاتکلف جتا بھی دیا۔ سوار نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

"ہاں بدتمیز۔ تم ٹینشن سے کچھ اوپر کا لفظ لے آؤ، میری حالت کا پھر بھی اندازہ نہیں لگا سکتیں۔"

"ہیں......" کنعان ٹھٹکی۔ "لیکن کیوں؟"

"کیوں کی الجھن میں مت ڈالو، خود بھی الجھ جاؤ گی۔"

"جانتی ہوں۔" کنعان نے بے اختیاری آہ بھری "ایک روز خوب الجھائیں گے۔"

"یعنی؟" اب کے وہ حیران ہوا۔

"مجھے اپنی خوش قسمتی کا کبھی یقین نہیں رہا۔" وہ سنجیدہ ہوگئی تھی۔ لہجہ بتاتا تھا، یاسیت میں ڈوبنے لگی ہے۔

"میری یہ جو بچی کھچی ہمت ہے نا۔ اس کے دشمن تم اور میاں جی ہو۔" وہ اب شکوہ کناں دکھائی دیا، کنعان ہنس پڑی۔

"سوری بابا۔ یونہی بس آپ کو ٹینشن میں دیکھ کر میں بھی وہمی ہونے لگی۔"

"اوکے۔ دعا کرتی رہنا، کل شام ان شاء اللہ۔"

"ان شاء اللہ۔"

کنعان کے گلابی لب آنے والے کل کے حسین تصور سے مسکرانے لگے۔ شرمگیں سی لپک گالوں کے ڈمپل میں گدگدانے لگی، موبائل آف کرکے فوراً دیا کا نمبر ملا دیا۔ آخر کل شام کے لیے اتنی ساری تیاری جو کرنی تھی۔

☆☆☆

امین اللہ نرس کو بلا کر وارڈ کی طرف واپس آتے برآمدے کے بنچ پر اس کالے عبایہ والی پردہ دار عورت کو ایک مرتبہ پھر چور نظروں سے دیکھتے قریب سے گزر گیا۔ وہ بھی شاید مجبور تھی کہ باوجود اس کے انکار کرنے کے ابھی تک وہیں جمی بیٹھی تھی۔ حتیٰ کہ امین اللہ بھی قطعی انکار کردینے کے بعد اس کی ثابت قدمی دیکھتے کچھ کچھ متزلزل ہونے لگا تھا۔ سر جھٹک کر بار بار اپنے کہے پر پختہ رہنے کا عزم کرتا لیکن اندر وارڈ میں لیٹے بیمار بیٹے کو دیکھ کر پھر ایمان ڈانواں ڈول ہونے لگتا۔ عورت اپنے حلیے سے بے حد امیر دکھائی دیتی تھی۔ اوپر سے اس کی آفر۔

امین کو یاں کی صورت میں اپنی قسمت بدلتی محسوس ہورہی تھی۔ اس عورت کی طرف سے کی جانے والی پیشکش سے نہ صرف اس کے بیٹے کا آپریشن ہوسکتا تھا بلکہ گھر کے کئی ایک دوسرے مسائل سے بھی باآسانی نمٹا جاسکتا تھا۔ قریب دو گھنٹے پہلے عورت نے امین کو سائیڈ پہ لے جا کر جو بات کی وہ اس کے لیے ناقابل یقین حد تک حیران کن تھی۔ وہ ایک ایسے کام میں امین اللہ کی معاونت طلب کررہی تھی جو یقیناً بہت مشکوک تھا۔ لیکن بقول اس عورت کے نیک نیتی اور کسی کی بھلائی کی خاطر انجام دینا تھا۔ امین اللہ کے لیے پیسے کی کشش اپنی جگہ لیکن منہ اٹھا کر کسی خطرے میں کود پڑنا بھی ہرگز دانش مندی نہ تھی۔ وہ پردہ پوش کوئی جعل ساز، بلیک میلر یا ٹھگ بھی ہوسکتی تھی، اس کا ساتھ دینے کے نتیجے میں وہ سیدھا جیل کی سلاخوں کے پیچھے جاسکتا تھا۔ غلط لوگوں کے دام میں پھنس کر جان سے ہاتھ بھی دھو سکتا تھا، لیکن بہرحال یہ ایک سوال باقی ہر معاملے پر حاوی اور اہم تھا کہ ایک اجنبی عورت نے اسی کا انتخاب ہی کیوں کیا۔ ایسے میں عورت کا سادہ ترین جواز کہ امین کا حلیہ، عمر اور زبان اس کام کے لیے اس قدر مناسب ہیں کہ وہ اس کی ہاں سننے کے لیے اب تک وہیں بیٹھی ہے۔

بالآخر بہت دیر بعد ایک حتمی فیصلے تک پہنچ

امین نے اسے حامی بھر لی۔ پہلے کال کر کے ایک آدمی کو اندر بلایا اسے مریض کا خیال رکھنے کو کہا اور خود اس عورت کے پیچھے پیچھے چلتے پارکنگ ایریا میں آ گیا۔ عورت نے اعتماد سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور امین اللہ کو ساتھ بٹھائے ہاسپٹل کے ایریا سے باہر نکل آئی۔

"میرا بھائی بہت سیدھا سادا اور معصوم ہے۔ میں ہی بھری دنیا میں اس کا واحد سہارا ہوں۔ میں اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔"

"آپ اپنی جگہ درست ہیں بی بی۔" امین نے تھکے تھکے انداز میں پشت سیٹ سے ٹکائی۔ "لیکن جو آپ مجھ سے کروانا چاہ رہی ہیں وہ سراسر گناہ کے مترادف ہے۔ جس لڑکے کا والد بنا کر آپ مجھے کسی کے ہاں بھیج رہی ہیں۔ میں اس کا باپ نہیں ہوں۔ اور جو آپ مجھ سے کہلوانا چاہ رہی ہیں وہ بھی کسی صورت جائز نہیں لگتا۔"

"لیکن وہ سب سچ ہے۔" ثمامہ نے دبے دبے جوش سے کہا۔ "آپ یقین مانیں وہ لڑکا اتنا ہی برا ہے جتنا میں نے آپ کو بتایا اور وہ لڑکی مقابلے میں کہیں زیادہ معصوم اور سیدھی سادی۔"

"تو پھر آپ خود کیوں نہیں لڑکی کے باپ کو حقیقت بتا دیتیں۔" امین ایک بار پھر بحث کر کے معاملے میں پڑنے سے پہلو تہی کرنے لگا۔

"بتا دیتی بزرگوار۔ ضرور بتاتی، لیکن میں پہلے ہی اپنے بھائی کا رشتہ لے کر اس لڑکی کے گھر جا چکی ہوں۔ اب اگر میں نے اس دوسرے رشتے کی راہ میں روڑے اٹکائے تو وہ سمجھیں گے میں اپنے بھائی کی وجہ سے غلط بیانی کر رہی ہوں۔ آپ یقین کریں کہ آپ کے ذرا سے ساتھ کی وجہ سے کئی لوگوں کا بھلا ہو جائے گا۔ آپ خود سوچیں ایک ایسا لڑکا جو شادی شدہ خواتین کے ساتھ ناجائز مراسم رکھتا ہو اور اس چکر میں ایک قتل بھی کر چکا ہو، وہ اس معصوم لڑکی کو زیادہ خوش رکھے گا یا پھر میرا بھائی، جو بے چارہ اُس لڑکی کی محبت میں بستر سے جا لگا ہے۔ وہ اس کا اصل مخلص ہے۔ آپ ویسے مجھے ایک دین دار آدمی لگتے ہیں۔ میں اپنے سچ کا یقین دلانے کے لیے یہ سامنے مسجد میں جا کر قسم اٹھانے کو تیار......"

"نہیں نہیں خاتون۔" مسجد دیکھتے ہی امین کا چہرا سفید پڑنے لگا۔ "کسی قسم وغیرہ کی ضرورت نہیں، میں آپ کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن...... مجھے فکر ہے کہ لڑکی کے باپ سے دوبارہ کبھی سامنا ہوا تو مجھے پہچان جائیں گے۔"

"اس کے لیے ہمیں حلیہ تھوڑا تبدیل کرنا پڑے گا۔ میں آپ کو بازار سے ایک ہیئر کلر لے کر دیتی ہوں، آپ داڑھی اور سر کے یہ سرخ مہندی والے بال کالے کر لیں، اور مولویوں والی ٹوپی پہن لیں گے تو اصل سے کافی تبدیل ہو جائیں گے۔"

"جی۔" امین نے اس بار قدرے تسلی سے سر ہلایا۔

"ابھی ہم ہوٹل کے آگے سے گزرنے والے ہیں، آپ اپنا چہرے پر مفلر لپیٹ لیں، اگر رفیق احمد سامنے بیٹھے ہیں تو دکھا دیتی ہوں، نہیں ہوں گے تو کوئی مسئلہ نہیں، میں آپ کو حلیہ سمجھا دوں گی۔" ثمامہ اُس وقت ازمیر ہوٹل کے راستے کو مڑ چکی تھی۔

"بس یاد رکھیے گا کل آپ نے نام لے کر خصوصی طور پر ان سے نہیں ملنا۔ ملاقات اتفاقی ہونی چاہیے، اور سوار علی کے متعلق ہر بات صرف انہی کو بتانی ہے۔"

"اور اگر وہ ہوٹل میں ہوئے ہی نا؟"

"تب تو ظاہر ہے کچھ نہیں ہو سکتا۔ پھر کچھ اور سوچنا پڑے گا۔"

ثمامہ ہوٹل کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔ اسپیڈ آہستہ کرتے ہوٹل کے دروازے کے سامنے سے کار گزاری تو ریسپشن پر ایک لڑکے کے ساتھ وہی بیٹھے تھے۔ اس نے اشارہ کر کے امین اللہ کو رفیق احمد دکھایا

اور کاربڑھالے گئی۔

اب اسے اگلی صبح قدرے تبدیل حلیے کے ساتھ امین اللہ کو یہاں چھوڑنا تھا۔ بدلے میں اس کے بیمار بیٹے کے جگر ٹرانسپلانٹ کا پورا خرچہ خود اٹھانا تھا۔ اور اسے یقین تھا دونوں کا کام ہو جائے گا۔

☆☆☆

''ایک تو مجھے اتنی صبح صبح بلالیا، اوپر سے کام دیکھو۔''

''کام دیکھو۔'' کنعان نے آنکھیں نکالیں۔ ''تمہیں یہ معمولی بات لگ رہی ہے؟''

''ارے بابا۔ وہ لوگ کہیں چار پانچ بجے آئیں گے، اتنا سارا دن پڑا ہے۔ کچھ بھی پکا لو۔ کچھ بھی پہن لو۔'' دیا ابھی تک نیند کے اثر میں تھی۔ اماں چائے کی ٹرے لیے کمرے میں آئیں تو دیا کی چندھیائی آنکھیں تھوڑی سی پھیلیں۔

''یہ ہوئی نا بات۔ کیا کہنے بھئی اماں آپ کے۔ حق میزبانی تو واللہ کوئی آپ سے سیکھے۔ ایک یہ......'' اس نے ساتھ بیٹھی کنعان کی طرف دیکھا ہی تھا کہ اس نے اچک کر ٹرے لے لی۔

''اتنے سے کپ سے کیا بنے گا مہارانی کی نیند کا، اماں۔ آپ ایک بالٹی پانی لے آئیں، تب شاید آپ کی مہمان کو ہوش آئے۔''

''ارے نہیں نہیں۔ میں کپ سے ہی کام چلا لوں گی۔'' دیا مکمل ہوش میں آتے ایکدم سیدھی ہو بیٹھی۔

''آج کے دن مجھے ایک بھی مذاق نہیں چاہیے۔ سمجھی۔'' کنعان نے وارن کرتے چائے اس کی طرف بڑھا دی۔

''اور اب سنو۔'' کنعان سرگوشی میں آغاز لیتے اس کے نزدیک ہو بیٹھی۔ ''کچن میں کچھ یوں گھسنا ہے کہ اماں کو بھی شک نہ ہو۔''

''تو کیا سوار بھائی کے آنے کا کسی کو نہیں پتا؟''

''ابو کو اس نے بتایا تو ہے لیکن ابو نے مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ اور میں نے خود کو انجان ظاہر کرنا ہے نا، تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔''

''ہوں...... اور پہن کیا رہی ہو۔''

''پتا نہیں، سامنے بھی جانا ہے کہ نہیں۔'' کنعان نے لب سکوڑے۔

''کون آرہا ہے ان کے ساتھ؟'' دیا چائے پینے کے بعد اب خاصی رواں لگ رہی تھی۔

''کوئی دوست کہہ رہے تھے۔''

''دوست؟'' دیا نے اچنبھے سے دیکھا۔ ''تو ان کے گھر والے...... کوئی بڑا بزرگ؟''

''پلیز یار، اب تم نہ نروس کرو۔ مجھے کچھ نہیں پتا۔'' کنعان کا اعصابی تناؤ کچھ اور ظاہر ہونے لگا، دیا نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''تمہیں کاموں میں ہیلپ کے لیے نہیں۔ مورل سپورٹ کے لیے میری ضرورت تھی۔ ہوں؟''

''یہی سمجھ لو۔ مجھے سچ مچ بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔'' کنعان نے ہار مانی، حیرا بھی پورے بارہ بجا رہا تھا۔

''پھر تو کچن میں مصروف ہو جانا ہی بیسٹ آپشن ہے۔ اماں پر یوں ظاہر کریں گے جیسے وقت گزاری کے لیے کوکنگ کے تجربے کرنے گھسے ہیں۔''

''اور بنائیں کیا؟'' اب کنعان کا دماغ بند ہونے لگا تھا۔

''پہلے تمہارے لیے کوئی اچھی سی ڈریس منتخب کرتے ہیں، پھر کھانے پکانے کے لیے بھی کچھ سوچتے ہیں۔ چلو اٹھو شاباش۔'' دیا نے مستعد ہوتے کنعان کو بھی ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

☆☆☆

جس وقت امین اللہ ہوٹل کے ریسپشن پر آیا۔ وہاں صدیق اور قاسم کھڑے تھے۔ دو مسافر بھی ریسپشن کے اس جانب بیگ کندھوں پر لٹکائے کھڑے تھے۔ معلوم نہیں آرہے تھے یا جا

"جی فرمائیے؟" صدیق نے قدرے تعجب سے مولانا ٹائپ کے اس بندے کو دیکھا جو بنا کسی سامان کے اندر آیا تھا۔

"السلام علیکم۔" ماتھے تک ہاتھ لے جا کر امین نے اہتمام سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" صدیق کی الجھن اس کے سوالیہ انداز کے جواب سے ظاہر تھی۔

"کسی کو ڈھونڈتا ہوا آیا ہوں۔ کوئی بڑا بزرگ ملے گا بیٹے؟" ثمامہ کی اسے خصوصی ہدایت تھی کہ ریسپشن کے لڑکوں کے سامنے سوار کا نام بالکل نہیں لینا۔ اسے ڈر تھا رفیق احمد اور امین کی گفتگو کے دوران یہ لڑکے کال کر کے سوار کو نہ بلا لیں۔ اس طرح تو جعلی باپ کا پول موقع پر ہی کھل سکتا تھا۔

"جی۔ایک منٹ۔"

صدیق نے قاسم کے ساتھ رفیق سر کے پاس پہنچا دیا۔ قاسم نے ایک چھوٹے کمرے کے پاس پہنچ کر رفیق سر کو آواز لگائی۔

"سر، یہ انہیں کچھ معلومات چاہئیں۔" اس نے امین کو اندر آنے کا اشارہ کیا، رفیق احمد نے کچھ نہ سمجھتے سر اٹھا کر دیکھا۔ قاسم ایک مولانا ٹائپ بندے کو کمرے میں چھوڑ کر واپس پلٹ گیا تھا۔ امین نے ہاتھوں کی واضح لرزش پر بمشکل قابو پاتے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے کیا۔

"جی، تشریف رکھیے۔" رفیق احمد حیرانی سے اس آدمی کو دیکھ رہے تھے۔

"جی، وہ میرا بیٹا...... سنا ہے یہاں کام کرتا تھا۔ کافی مہینے پہلے کی بات ہے۔" کرسی پر ٹک کر بیٹھتے امین نے پہلا سکون کا سانس لیا۔ ٹانگوں کی کپکپاہٹ اب اس کے لیے بھی ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔

"آپ کا بیٹا؟"

"جی ہاں۔سوار نام ہے میرے بیٹے کا۔"

"ارے...... آپ سوار کے والد ہیں۔ ماشا اللہ۔" رفیق احمد نے جوش سے اٹھ کر دوبارہ ہاتھ آگے بڑھایا، چہرے پر خوشی اور آشنائی کی اپنائیت بھری مسکراہٹ آگئی۔

"جی، اسی کا باپ ہوں۔" امین کو یاد آیا کہ سوار کے نام پہ اس نے خود کو خوش ظاہر نہیں کرنا اس لیے شکل پر غمگینی طاری کی۔

"جی بالکل، یہیں کام کرتا تھا۔لیکن پچھلے کافی ماہ سے زیادہ اچھی جگہ پر کام کر رہا ہے۔ لیکن...... آپ سے رابطے میں نہیں ہے کیا؟" رفیق احمد ان کی بے خبری پر پہلی مرتبہ متعجب ہوئے۔

"رابطے میں...... ہونہہ......" امین اللہ نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔ "کس منہ سے رابطہ کرے گا، میں نے ہی گھر سے نکال باہر کیا تھا۔ ایسی ناہنجار اولاد تو پیدا ہوتے ہی مر جائے۔" وہ اب جیسے اپنے آپ میں بول رہے تھے۔ رفیق احمد حیرت سے کچھ دیر دیکھے ہی گئے۔

"جی، اپنا سوار تو بڑا سعادت مند بچہ ہے، کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔"

"سب بھولی صورت کا فریب ہے۔" امین نے ایک لمبی آہ بھری۔ "بس صاحب قدرت کے قانون کے آگے بے بس ہیں، جانے ماں باپ کی محبت بھی اللہ نے کس مٹی سے گوندھی ہے، کبھی سخت ہی نہیں ہوتی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ڈھونڈنے نکلا ہوں، اس سے پہلے کہ پولیس اس تک پہنچ کر اسے عمر قید یا پھانسی کی سزا دلوا دے۔ ہوشیار کرنے آیا ہوں کہ اب مری چھوڑ کر کہیں اور نکل جائے۔ بھلے میرا اب اس سے کوئی واسطہ تعلق نہیں لیکن ہے تو میری اولاد۔"

"لیکن پولیس کیوں سوار کے پیچھے ہے؟" رفیق احمد کا چہرا تپنے لگا، سوار کے متعلق یہ وہ کیا کچھ سن رہے تھے۔

"آپ سے اب کیا چھپانا صاحب۔ بھلے آدمی لگتے ہیں۔ میرا کام بھی آپ ہی کر دیجیے، میں تو اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔" امین آہ پہ آہ

بھرتے اب اصل مدعے کی طرف آیا۔ آدھا سفر خوب ہی کامیابی سے کٹ گیا تھا، اب تو بس جلد از جلد رفیق احمد کو سوار کی اصلیت بتا کر فوراً یہاں سے چمپت ہونا تھا۔

''میرا سینہ کھول کر دیکھیں، گرم سلاخوں سے داغ لگائے ہیں اس بدبخت اولاد نے۔ کس طمطراق سے مولوی فیض الحسن ہری پور کے راستوں سے گزرا کرتا تھا۔ لوگ ادب سے جھک کر سلام کرتے تھے۔ پر اب...... اب تو اپنے ہی ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ کہیں کا نہیں رکھا اس لڑکے نے مجھے۔ ساری حکمت، ساری دین داری دھری رہ گئی، ایسا عزت کا جنازہ نکالا ہے، مولوی فیض الحسن تو اب ایک چلتی پھرتی لاش ہے۔'' صورت پر زمانے بھر کا درد لاتے امین نام اور شہر کے ساتھ ساتھ علاقے اور لوگوں کے حوالے دے دے کر اپنی سچائی ان پر ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ایسا کیا کیا سوار نے؟'' رفیق احمد کی آواز بھی اس مرتبہ دھیمی اور مایوس کن سی تھی۔

''بس صاحب۔ میرے ہی گناہ ہوں گے جن کی سزا اللہ پاک نے ایسی ناخلف اولاد کی صورت نازل فرمائی۔'' امین نے ایک آہ بھرتے اب اصل مدعے کی طرف آیا، اس سے پہلے کہ خود اسی پر کوئی مصیبت نازل ہو جاتی۔

''محلے میں ایک شریف شادی شدہ عورت آ کر رہنے لگی تھی۔ میاں بے چارہ کام دھندے کی وجہ سے دور رہتا تھا۔ اس نامراد نے معلوم نہیں کہاں اس کی ایک جھلک دیکھ لی اور عشق وشق میں گرفتار ہو بیٹھا۔ اور بس لاکھ مرتبہ توبہ استغفار......'' امین نے باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''کم بخت اس کے پیچھے ہی پڑ گیا۔ اور ایسا کہ رفتہ رفتہ اسے بھی بہکا دیا۔ جانے کب سے چل رہا تھا یہ کھیل، اب ظاہر ہے جوان اولاد پر چوبیسوں گھنٹے پہرا بھی نہیں لگا سکتے، اور میں تو صبح سے شام تک اپنے دواخانے میں مصروف رہتا ہوں۔ ہمارا تو عرق، معجون، شربت اور ڈھیروں ڈھیر دواؤں کا لمبا چوڑا کاروبار ہے۔ مجھے تو کام کی مصروفیت میں بس اتنی تسلی تھی کہ بچہ پڑھ رہا ہے۔ اور ان دنوں تو پڑھائی مکمل کر کے فارغ تھا، کیا پتا تھا فراغت یہ گل کھلائے گی، ورنہ اپنے ساتھ دوکان پر ہی بٹھا لیتا۔

خیر تو ہوا پھر یہ کہ ان دونوں نے شاید گھر سے بھاگنے کا منصوبہ بنایا۔ عورت کو اس کا میاں شاید طلاق نہیں دے رہا تھا۔ بس قضا کا مارا اس رات تھکا ہارا گھر واپس آیا تو دونوں نے مل کر اس کا کام تمام کر دیا، اور پولیس کے خوف سے یہ تو موقع پر ہی بھاگ نکلا۔ لڑکی دو دن واویلا مچاتی رہی اور جب تک پولیس کو اس پر کچھ شبہ ہوتا وہ بھی بھاگ نکلی۔''

''لیکن سوار تو یہاں اکیلا رہتا تھا، کوئی عورت تو یہاں کبھی نہیں دیکھی۔'' اس کے ساتھ رفیق احمد جھٹکے سے نکل کر بے اختیار پوچھ بیٹھے، اس ساری روئیداد کو سنتے انہیں یقین کرنا ویسے بھی مشکل تھا کہ یہ سب سوار کے متعلق کہا جا رہا ہے۔

''ہاں صاحب۔ وہ یہاں سے دو دو روز بعد نکل تھی۔ اب معلوم نہیں پولیس کے ہی ہتھے چڑھ گئی یا کسی اپنے نے غیرت میں مروا ڈالا۔ بس کیا باقی رہ گیا۔ ہماری زندگی تو موت سے بدتر ہو گئی نا۔'' وہ تاسف سے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتا اٹھ کھڑا ہوا۔

''ارے، آپ تشریف رکھیں، معافی چاہتا ہوں آپ کی باتوں میں کچھ چائے پانی بھی منگوانا بھول گیا۔'' رفیق احمد چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''نہیں نہیں صاحب۔'' امین کو اب جانے کی جلدی تھی۔ ''مجھے بس اس کا نیا پتا بتا دیں، اگر آپ کے لیے بتانا ممکن نہ ہو تو......''

''جی میں کوشش کروں گا بتانے کی، اور آپ بھی رکھ لیں۔'' رفیق احمد نے ایک پیپر پہ پتا ان کا

ایڈریس لکھ کران کے ہاتھ میں دیا۔ اور امین اللہ ہاتھ ماتھے تک لے جاتے شکریہ ادا کر کے باہر نکل گیا۔ اور رفیق احمد کسی ہارے ہوئے انسان کی مانند کرسی پر ڈھے سے گئے۔ انسان کی صورت اس کا ظاہر کیا اس طرح بھی دھوکا دیا کرتا ہے۔

"اُف۔" انہوں نے نہایت افسردگی سے پیشانی مسلی۔ صورت ہی کیا انہیں تو سوار کی شخصیت، ذہانت، گفتگو، عادات سب نے مل کر فریب دیا تھا۔ کیا واقعی کوئی شخص اپنے ظاہر اور باطن میں اتنا مختلف بھی ہوسکتا ہے۔ اور وہ پچھلے دنوں کا اس کا احسان۔ اغوا کاروں کے چنگل سے کنعان کو چھڑوا لانا۔ کیا رات بھر ان کی معصوم بچی ایسے غلیظ، اتنے مکروہ اور بدکردار شخص کے ساتھ رہی تھی، کہیں سوار نے کنعان کو کوئی نقصان نہ پہنچایا ہو...... اور کہیں...... وہ سوچتے سوچتے رُکے۔ ہاتھ بے ساختہ دل پہ پڑا۔ کتنے سادہ لوح تھے وہ، اتنی سامنے کی بات بھی سمجھ میں نہ آئی۔ وہ جو آج ان کے گھر شاید اپنے رشتے کی بات کرنے آرہا تھا، تو یہ پلاننگ کی تھی اس نے اپنے گناہوں کو چھپانے کی، مجھے ہر طرح سے بے بس ولاچار کر کے مجھ سے ہاں کہلوا کر جانا چاہتا تھا۔ رفیق احمد کا تنفس اچانک ہی کچھ تیز ہوا، دل پہ ہاتھ رکھ کر گھونٹ گھونٹ پانی اندر اتارتے وہ اپنے آپ کو نارمل حالت میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ قریبی دراز سے ایک گولی نکال کر زبان پہ رکھی اور پانی کے ساتھ نگل کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیے۔ اب وہ گہرے گہرے سانس لے رہے تھے۔

جانے کیا کچھ نہ سوچ رکھا تھا انہوں نے کنعان اور سوار کے فیوچر کے متعلق۔ اور قدرت نے یہ کیسے موڑ پر ایسا بھیانک مذاق کھیلا تھا۔

☆☆☆

جس وقت سوار میاں جی کو ساتھ لیے رفیق سر کے گھر کے لیے نکلا شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ پہلے مشتاق خان کی شاپ سے مٹھائی پیک کروائی، پھر مزید آگے روانہ ہوئے، کنعان نے میسج کر کے بتایا تھا کہ ابو کچھ دیر پہلے گھر آئے ہیں۔ میاں جی تو ساڑھے چار بجے ہی اس کے پاس پیٹرا ان آگئے تھے، وہ بھی تیار تھا۔ رفیق احمد انہیں لیے بیٹھک والے کمرے میں آگئے۔ یہاں کا ایک دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ وہ اسی راستے سیدھے بیٹھک کے اندر آئے تھے۔ چہرے پر چھائی گمبھیر سنجیدگی، بلا کی خاموشی اور کسی حد تک روکھے سے رویے پر وہ چاہ کر بھی قابو نہیں پا سکے۔ سوار نے پہلے پانچ منٹ کے دوران ہی جان لیا کہ سر کچھ الجھے، بلکہ پریشان اور اکھڑے اکھڑے سے ہیں۔ اس کا زوروں سے دھڑکتا دل کچھ اور بھی مضطرب ہوگیا۔ جانے کیا ہوا تھا سر کے ساتھ۔ اور کیا ہونے والا تھا اس کے ساتھ۔ سر انہیں بٹھا کر کچھ دیر کے لیے اندر گئے، واپس آکر بھی زبردستی کی ایک مسکراہٹ لبوں پر لاتے میاں جی کی طرف دیکھا۔ سوار نے تعارف کروانے سے گفتگو کا آغاز کیا۔

"سر۔ یہ میاں نذر حسین ہیں۔ مری آنے پر پہلے پہل انہوں نے ہی میری بہت مدد کی۔"

"ہوں۔" اثبات میں سر ہلاتے وہ خاصے غائب دماغ لگے۔ سوار نے اس بار الجھ کر میاں جی کی طرف دیکھا، خاموشی کا وقفہ طبیعت پر کچھ گراں سا گزرنے لگا تو انہوں نے ہی بات شروع کرنے کا ارادہ کیا۔

"رشتے تو خلوص اور محبت سے بنتے ہیں صاحب، اور اس ناتے تو میں سوار کو اپنے بیٹوں سے بھی بڑھ کر سمجھتا ہوں۔ اس نے بھی تو اپنوں سے بڑھ کر میری ذات پہ بھروسا کیا۔" میاں جی نے محبت سے ایک نظر سوار کو دیکھا پھر رفیق احمد کی طرف دیکھ کر گویا ہوئے۔

"اور آج، مجھے کسی قابل سمجھتے ہوئے ہی اپنے ساتھ بڑا اپنا کر لایا ہے۔ اور اس کے بارے

میں تو آپ کو کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بھی سوار کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اب تو روزگار بھی پہلے کی نسبت زیادہ اچھا ہے۔ اور اب قدم جما لیے ہیں تو میں نے ہی گھر بسانے کا مشورہ دیا ہے۔"

"اور...... آپ کے والد صاحب سوار۔ وہ بھی تو آج یہیں ہیں، انہیں ساتھ نہیں لائے؟"

"میرے والد؟" سوار پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹا۔

"سر وہ تو ہری پور میں ہوتے ہیں۔ اور......"

"لیکن آج صبح وہ تمہیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں آئے تھے۔ تم سے ملاقات نہیں ہوئی؟"

"نہیں سر۔ مجھے نہیں معلوم۔" سوار انہیں جواب تو دے رہا تھا لیکن ذہنی طور پر خود بہت ڈسٹرب ہو چکا تھا۔ وہ تو نجانے کیا خدشات لیے یہاں آیا تھا اور سامنا یہ کیسی صورت حال سے ہو گیا، اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اباجی کے متعلق ان سے کیا سوال پوچھے، دل تو پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

"تمہارے والد صاحب کو کسی سے معلوم ہوا کہ تم یہاں کام کرتے تھے، اس لیے پوچھتے ہوئے آئے تھے۔" رفیق احمد اسے بغور دیکھ رہے تھے۔

"تمہاری ان سے کوئی ناراضی چل رہی تھی سوار۔ ان کے پاس تمہارا ایڈریس یا نمبر وغیرہ کیوں نہیں تھا؟"

"جی سر۔" سوار نے نظریں جھکا لیں۔ "آج سے قریب دس ماہ پہلے انہوں نے ہی ناراض ہو کر مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔"

"ہوں۔ وہ بھی یہی کہہ رہے تھے۔ بقول ان کے نہ تو انہیں تم سے ملنے کی خواہش ہے نہ تمہیں دیکھنے کی۔ تو ایسا کیوں سوار؟" رفیق احمد کا لہجہ تیکھا ہوا۔ سوار نے ایک گہرا سانس باہر نکالا۔

"انہوں نے اور کیا کچھ بتایا؟" صاف لگا کہ جہاز پورا غرق ہو چکا، خود کو ابھارنے کی کوشش بے سود ہے۔

"وہ محض تمہیں انفارم کرنے آئے تھے کہ پولیس جلد ہی تمہارے پیچھے مری پہنچنے والی ہے، بہتر ہے اپنا جگہ ٹھکانا تبدیل کر لو۔" انہوں نے صاف سپاٹ لہجے میں مطلع کیا اور سوار سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا، میاں جی نے پریشان ہو کر سوار کو دیکھا۔

"انہیں میں نے سن لیا ہے سوار۔ اب میں تمہارے بارے میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔"

"میں نے کوئی خون نہیں کیا۔" سوار کی آواز رفیق احمد سے زیادہ سرد و سپاٹ تھی۔ میاں جی نے سانس روکا۔ لحظے کو رفیق احمد بھی ٹھٹک گئے، اتنے صاف واضح جواب کی شاید وہ خود بھی توقع نہیں کر رہے تھے۔

"میں وہاں سے اس لیے نہیں بھاگا تھا کہ میں نے کسی کا قتل کیا تھا یا میں اپنی جان بچانا چاہتا تھا۔ بس حالات میرے حق میں نہیں تھے۔ جن کا انجام صاف صاف ارتکاب قتل کے جرم میں موت تھا اور جب میری بھابھی نے مجھے واسطہ دے کر وہاں سے نکالا تو مجھے بھی یہی لگا کہ شاید وقت کا ملنا قدرت کی طرف سے کوئی مدد ہو اور ایک دن میں خود کو بے قصور ثابت کر سکوں۔ یہی سوچ کر میں وہاں سے نکلا اور آج میں سمجھتا ہوں، مجرم یا بے قصور ثابت ہونا اپنی جگہ لیکن اس ماحول سے دوری واقعی اللہ پاک کی طرف سے ایک مدد ہی تھی۔ اس جگہ اس ماحول میں شرمندگی بھری زندگی جیتے، ہر لمحہ دوسروں کے طعنے سنتے شاید میں سدھر تو نہ پاتا، ڈھیٹ ضرور ہو جاتا۔ دوری نے مجھے آپ اپنا محاسبہ کرنے اور اپنے لیے اچھی راہ کا تعین کرنے میں مدد دی۔ لوگوں کے رویے ہمیں مزید منفی سمت میں لے جاتے ہیں، تبھی یہ اجنبی ماحول میرے لیے معاون ثابت ہوا۔"

"تم بلاشک وشبہ بہت ذہین ہو سوار۔ لیکن دنیا

تو ہم نے بھی دیکھ رکھی ہے۔" وہ طنزیہ ہنسے تو سوار نے کرب سے بے اختیار آنکھیں بند کر لیں۔ اپنا آپ ہری پور میں اپنے محلے والوں کے بیچ کھڑا محسوس ہوا۔ بالآخر آج وہ یہاں بھی اجنبی نہیں رہا تھا۔

"ایک بات بتاؤ۔" گلا کھنکار انہوں نے دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنساتے آگے ہو کر سوار کی آنکھوں میں دیکھا۔ "آج صبح اگر تمہارے والد صاحب یہاں نہ آتے اور تمہاری حقیقت مجھے معلوم نہ ہوتی تو یہاں کا ماحول کیسا ہوتا۔ ہوں؟"

"شاید ہم آپ کے پچھلے دنوں کے کارنامے کر ڈسکس کرتے آپ کی تعریفوں کے پل باندھ رہے ہوتے، میرے پاس نہ تو موقع ہوتا نہ اتنی اوقات کہ تمہارے ماضی سے متعلق کوئی سوال کر سکوں۔ تمہارا ایک احسان ہی کافی تھا مجھے اس فیصلے میں سہولت دینے کے لیے، تمہارے تمام گناہوں پر اپنے آپ پردہ پڑ جاتا اور تم یہاں سے رشتے کے لیے حامی بھروا کے اٹھتے۔"

"سر، میں آپ سے کچھ نہ چھپاتا، آپ میری فیملی سے متعلق مجھ سے سوال کرتے اور میں نے طے کیا تھا کہ آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔"

"اب تو تم یہی کہو گے سوار۔ کیونکہ اب چھپانے کو کچھ رہا ہی نہیں۔ اور میں تمہارا ہر قصور معاف کر دیتا، ہر خطا درگزر ہو سکتی تھی اگر جو تم نے کنعان کے اغوا کی بھیانک غلطی نہ کی ہوتی۔" رفیق احمد کا لہجہ تلخ اور الفاظ نشتر تھے۔ سوار نے ایک جھٹکے سے سر اوپر اٹھایا۔

"یہ صحیح نہیں ہے۔ واللہ...... آ...... آپ......"

"بس سوار۔" وہ غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "مجھے کوئی صفائی نہیں چاہیے۔ میرے لیے اللہ کی یہی مدد ہی بہت کافی ہے، جو فیض الحسن صاحب کو عین وقت پر بھیج کر اس اوپر والے نے مجھ پر اور میری بیٹی پر کی۔"

"سوار نے کنعان بٹیا کا اغوا نہیں کروایا، میں خود گواہ ہوں صاحب۔"

"چلیں میاں جی۔" سوار نے سپاٹ نظروں سے میاں جی کو دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"صاحب۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں، اغوا جمشید نے کیا ہے، میں اس واقعے کے لمحے لمحے کا خود گواہ ہوں۔" میاں جی کو قرار نہیں تھا۔ تبھی گھر کے اندرونی دروازے پر ہلکی ناک ہوئی اور پھر پردہ ہٹا کر کنعان اندر داخل ہوئی۔ ہاتھوں میں ٹی ٹرالی تھام رکھی تھی۔ کھلے کاسنی رنگ کی ڈریس پہنے، بہت لائٹ میک اپ، اور اطراف میں دکھائی دیتے کھلے بالوں کے ساتھ سر پر ڈھیلے انداز میں دوپٹا اوڑھے، اس نے مسکراہٹ روک کر چور نظر سوار پہ ڈالتے ٹرالی کمرے کے سینٹر میں روکی۔ سب کے کھڑے ہونے پر پہلی بار کچھ تعجب بھی محسوس کیا لیکن نظریں دوسری بار بھی اسی جانب بھٹکیں۔ سوار کا معصوم جذباتی بچوں سے بھی زیادہ حساس دل دو ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔ آنکھ کے کونے میں آنسو کی نمی چمکی اور وہ بنا کچھ کہے باہر نکل گیا۔ میاں جی بھی اس بار خاموشی سے باہر نکل گئے۔ رفیق احمد نے آگے بڑھ کر بیٹھک کا بیرونی دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

"کیا ہوا ابو۔ وہ لوگ چلے کیوں گئے۔ اور چائے......" کنعان کی آنکھوں میں تحیر سمٹ آیا۔ پہلی مرتبہ کسی گڑبڑ کے احساس سے دل ڈوب سا گیا۔

"تمہیں معلوم تھا...... پہلے سے؟" رفیق احمد نے حیرت سے ٹرالی میں سجے لوازمات کی طرف دیکھا۔ انہوں نے تو کچھ بھی کنعان کو لا کر نہیں دیا تھا۔

"ج...... جی...... نہیں......" کنعان کے گھبرائے ہوئے انکار میں ہی جواب چھپا تھا۔

"کیا تمہاری کوئی کمٹ منٹ ہے یہاں؟" وہ اب دوٹوک انداز میں کنعان سے سوال پوچھ رہے تھے۔ کنعان کا جھکا سر باپ کے ڈر اور رعب سے نفی

میں ہل رہا تھا لیکن وہ باپ ہی کیا جو اولاد کے لب ولہجے سے آشنا نہ ہو۔ انہوں نے بمشکل خود پر ضبط کیا۔ ابھی تو ایک امتحان سے نمٹے تھے، دوسرا تو درپیش تھا۔ انہوں نے کچھ دیر رک کر سوچ کر آغاز لیا۔

"سوار یہاں رشتے کے لیے ہی آیا تھا، لیکن میں نے انکار کر دیا ہے کنعان۔ اور تم بھی صاف صاف سمجھ لو کہ اس میں تبدیلی کی قطعی کوئی گنجائش نہیں۔" انہوں نے دوٹوک انداز اپنایا اور کنعان نے حیرت بھری ایک سوالیہ نظر بے ساختہ اٹھائی۔ تو سوار کی آنکھ کا وہ چمکتا تارا اس کی نظر کا دھوکا نہیں تھا۔

"مجھے حیرت نہیں، افسوس ہے کنعان کہ تم جیسی لڑکی بھی بہک سکتی ہے۔ "تم" جسے میں اپنا فخر اپنا مان سمجھتا تھا، ماہین کے بعد جس سے میں نے اچھی امیدیں استوار کی تھیں۔ اور یہ کمال بھی اگر سوار کی دہری فریب دیتی شخصیت کا ہے تو اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اس جیسا برا لڑکا کوئی ہو نہیں سکتا۔"

"کیا ہوا ہے ابو؟" کنعان کا کپکپاتا لہجہ رو دینے والا ہو گیا۔

"کسی کو جان لینے کا دعوا سراسر ہماری بھول ہوتی ہے کنعان۔ تمہیں رعایت دینے کو اس لیے تیار ہوں کیونکہ یہی دھوکا خود بھی کھا چکا ہوں۔ بیٹھو۔" انہوں نے سامنے صوفے کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتے خود بھی تھک کر پشت صوفے کی بیک سے ٹکائی۔

"آج صبح ہوٹل میں سوار کے والد اسے ڈھونڈتے ہوئے آئے۔ سوار کی اصلیت آج اس کے سگے باپ سے سن کر بیٹھا ہوں۔ میں بھی صدمے میں ہوں اور کچھ سمجھ نہیں پا رہا، تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا کنعان۔"

"جی ابو۔" کنعان نے ان کی مجبوری سمجھتے سر اثبات میں ہلایا، اپنے دل پر اس لمحے جو بیت رہی تھی اسے خود پر جھیلنا تھا۔

رفیق احمد نے دھیرے دھیرے اسے وہ سب کہہ سنایا جو آج مولوی فیض الحسن اپنے بیٹے کے متعلق بتا گئے تھے اور جس کے ہونے سے سوار نے بھی انکار نہیں کیا تھا، خود کو بچانا البتہ اپنے دفاع کی ایک کوشش لگا اس لیے رفیق احمد نے اسے اہمیت نہیں دی۔

"مجھے یقین ہے کنعان۔ تمہارا اغوا بھی اسی نے کروایا ہو گا۔ تم پر اپنی محبت، مجھ پر اپنی شرافت کی دھاک بٹھانے کے لیے۔ یہ کچھ بھی کر سکتا ہے، اس سے دور رہنا کنعان۔ خود کو کسی بڑی مصیبت سے بچانا چاہتی ہو تو میری یہ بات کبھی بھولنا مت۔ کل کو میں نہ رہوں تو اسے میری وصیت سمجھنا کنعان۔ اس پہ بھروسا مت کرنا۔"

"ابو...... ابو......" وہ صوفے سے اٹھ کر جلدی سے ان کی طرف بڑھی، کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو ان کا سینہ ملنے لگی۔

"اماں جلدی آئیں۔" وہ زور سے آواز دے کر پھر ابو کی طرف متوجہ ہوئی، پیشانی پسینے سے تر ہو گئی تھی۔ سانس بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ اماں بھی بھاگتی ہوئی دروازے میں آئی تھیں۔

"اماں...... دیا کے گھر سے کسی کو جلدی بلائیں۔ موبائل......" اس نے جلدی سے نظریں دوڑائیں۔ ابو کا موبائل سامنے میز پر ہی رکھا تھا۔ اس نے خود ہی اشفاق انکل کو کال ملانا شروع کر دی۔ ابو نڈھال سے صوفے کی بیک پر سر ٹکا چکے تھے۔ آنکھیں بند تھیں اور حالت...... معلوم نہیں کیا۔ وہ بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی۔

☆☆☆

"تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہیے سوار۔ کہیں پولیس......"

"میں نے غلط نہیں کہا تھا میاں جی۔ میں پولیس کے خوف سے نہیں بھاگا تھا۔ وہ آمنہ بھابھی

کی ہاتھ جوڑ کر کی گئی منت تھی جس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے ان کی بات ماننے پر مجبور کیا تھا۔ ہاں لیکن بعد میں اس رعایت کو میں نے اپنے لیے مہلت تصور کیا۔ جانتے ہیں کب؟" جنگلے کے پار نیچے چیڑ کے درختوں اور سبزے سے بھری گہری وادی اور جنگل کو دیکھتے وہ افسردگی سے مسکرایا۔ رفیق سر کے گھر سے نکل کر وہ پیچھے کے راستے سے پیدل بس اسٹینڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ قدموں میں سستی تھی اور اعصاب پر تناؤ کی کیفیت۔

"سمیع اللہ کے گاؤں میں جو ایک ہفتہ میں نے پہاڑوں پر اکیلے چکراتے اور خود سے لڑتے گزارا، اس میں اپنا محاسبہ کرتے، اپنی غلطیوں کا کھلے دل سے اقرار کرتے بالآخر آٹھویں دن خود کو معافی دیتے میں نے اس قابل پایا کہ ہاں اب میں کسی عزم کے تحت دنیا کی بھیڑ میں نئے سرے سے قدم رکھ سکتا ہوں۔ اپنی غلطیوں کو کبھی نہ دہرانے کی ایک بس قسم نہیں کھائی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ برائی سے خود کو روکنے کی تحریک اندر سے پیدا ہونی چاہیے۔ نہ کہ قسم کھا کر جبراً۔ لیکن ہمارے برے کام کبھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے میاں جی۔ دنیا میرے سارے عہد و پیمان مٹی میں ملا دے گی، اب یہاں مجھے کبھی اچھا نہیں سمجھا جائے گا۔" سوار کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔ دل اس کا شاید زاروقطار رونے کو کر رہا تھا لیکن روتا ہوا مرد بھی اسی دنیا سے برداشت نہیں ہوتا۔

"رفیق احمد بیٹی کے باپ ہیں سوار۔ باپ اپنی اولاد کی محبت میں ایسے ہی جذباتی ہوتا ہے۔ تھوڑا وقت دو انہیں۔ اور تم بھی اتنے جلدی مایوس مت ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ۔ میں خود بہت جلد دوبارہ ان کے پاس جاؤں گا۔ چلو شاباش آؤ۔" انہوں نے کندھا تھپک کر سوار کا حوصلہ بڑھایا۔

"مجھے یہاں سے جانے کو دوبارہ مت کہنا میاں جی۔" وہ اپنی روئی روئی آنکھوں کے ساتھ انہیں خفگی سے دیکھ رہا تھا۔

"پاگل۔ میں تو تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہا تھا۔ تمہارے والد صاحب اگر کہہ گئے ہیں کہ پولیس یہاں آسکتی ہے تو......"

"تو آجائے میاں جی۔" وہ اب سائیڈ جیب سے رومال نکال کر اپنی آنکھیں اور چہرا صاف کرتے ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"ہری پور سے اس لیے نکلا تھا کہ اب اس ماحول اور ان لوگوں میں میرا جینا دشوار تھا۔ لیکن یہاں...... یہاں سے جا کر اب کوئی نئی زندگی نہیں جی سکتا۔ ان یادوں میں کوئی ندامت، کوئی پچھتاوا نہیں۔ اب نہ خود سے کوئی گلہ ہے اور نہ یہاں والوں سے کوئی شکایت۔ جہاں آپ ملے میاں جی۔ کنعان ملی۔ اس جگہ سے فرار...... محض جان بچانے کے لیے۔ قطعی نامنظور۔" اس نے شدت سے سر نفی میں ہلایا۔

"اچھا بابا۔ میری توبہ۔" وہ ہنس پڑے۔ "کبھی نہیں کہوں گا یہاں سے جانے کے لیے۔ اللہ پولیس کی آنکھوں پہ پردہ ڈالے، تم سامنے کھڑے ہو کر بھی انہیں نظر نہ آؤ، اور وہ ناکام و نامراد یہاں سے چلے جائیں۔" وہ باقاعدہ ماؤں کی طرح دعائیں دینے لگے۔

سوار کے ہونٹوں پر بھی ہنسی کھیل گئی۔ اب تو شاید وہی رہ گئے تھے یہاں، اس کے اپنے۔ اس کے غمگسار۔ سوار نے ایک ٹھنڈی آہ ہواؤں کے حوالے کرتے آسمان کی طرف دیکھا۔ دور تک جاتے اونچے پیڑوں سے پرے شام کے رنگ میں ڈھلتے آسمان پہ اس کا نیا نیا غم سیاہی بن کر پھیل رہا تھا۔

☆☆☆

رفیق احمد کی طبیعت تو ہسپتال سے لوٹنے پر اب کافی سنبھل چکی تھی لیکن جانے وہ مطمئن کیوں نہیں تھے۔ بہن کو اسی روز ہی بلوا بھیجا، ماہین سے رابطہ کیا تو اس کا میاں بھی بیوی بچوں کو بھیجنے پر راضی

ہوگیا۔ وہ بھی پھوپھو کے ساتھ آگئی۔ رابعہ کے لیے بھی بھائی کی طبیعت کا آئے روز بگڑنا اب تشویش کا باعث تھا۔ پھر جب سے وہ آئی تھیں رفیق احمد کی ایک ہی رٹ تھی کہ کنعان کے لیے لڑکا دیکھو وہ بھی سمجھ سکتی تھیں کہ ایک بیمار باپ کو جوان بیٹی کی کتنی فکر ہوتی ہے۔ اپنی دن بہ دن بگڑتی حالت کو دیکھتے اب وہ بیٹی کے فرض سے جلد از جلد سبک دوش ہونا چاہتے تھے۔

رابعہ نے بھائی کے سامنے تو کچھ نہیں کہا لیکن دل ہی دل میں افسوس ضرور ہوا کہ کچھ ماہ پہلے وہ اپنے جیٹھ کے بیٹے کا رشتہ لائی تھیں تو کاش بھائی جان انکار نہ کرتے، اب تو اس لڑکے کا کہیں اور رشتہ طے ہو چکا تھا۔

"فکر مند نہ ہو رفیق۔ ان شاء اللہ جلد بہت اچھی جگہ پر بندوبست ہو جائے گا۔"

"آپ کے ہوتے مجھے بھی زیادہ فکر نہیں ہے، اپنے بعد ایک آپ ہی ہیں جس کے سہارے کنعان کو چھوڑا جا سکتا ہے۔"

"اللہ تادیر تمہارا سایہ سلامت رکھے، اپنی بچیوں کی ذمہ داری اپنے ہاتھوں پوری کرو گے ان شاءاللہ۔" انہوں نے بھائی کا ہاتھ تسلی سے تھپکا۔

کچن میں ماہین باجی دوپہر کے لیے خود ہی کھانا بنانے گھس گئیں۔ کنعان لاکھ اس کی مدد کے لیے اپنی خدمات پیش کرتی وہ اسے ایک کام بھی نہ کرنے دیتیں۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ یہاں کام کر کے اسے خوشی ملتی ہے۔ کنعان بھی چپ ہو جاتی۔ ابو کی خدمت کرتی ماہین کے انداز میں جو ایک کفارے کی جھلک سی دکھائی دیتی، کنعان بنا اس کے بتائے ہی جان لیتی، وہ آج بھی امی کی موت کا ذمہ دار اپنی ذات کو ٹھہراتے پچھتاووں میں گھر جاتی تھی۔

کنعان باجی کو مصروف چھوڑ کر خاموشی سے کمرے میں چلی آئی، آج کل تو بنا بات ہی آنکھیں برسنے کو تیار ہو جاتیں۔ وہ زیادہ دیر تک کسی کو بھی ٹائم نہ دے پاتی، اپنے تازہ تازہ دکھوں کی چبھن کرچیوں سی اس کی آنکھوں میں چبھنے لگتی اور وہ بیٹھے بیٹھے اٹھ کر کہیں چھپ جاتی۔

جاگتی آنکھوں کے خواب بھی فریب کے سوا کچھ نہ نکلے۔ تو یہی ہوتی ہے محبت کی رنگین عینک کہ جس کے اندر سے دنیا قوس قزح کے رنگوں میں نہائی دکھائی دیتی ہے۔ اور جو اتار دو تو کچھ بھی نہیں۔ سب خواب سب سراب۔

کتنا باز رکھنے کی کوشش کی خود کو ایسے معاملات سے، کیسے سخت اصول بنائے تھے اپنی ذات کے لیے۔ کتنا یقین تھا خود پر۔ ہمیشہ یہ سوچا کہ ایک دن ابو کسی اچھی فیملی کے شریف لڑکے کو اس کے لیے پسند کریں گے اور فوراً سے پہلے سر جھکا دے گی، اپنے اندر کی کسی بھی باغی آواز پر کان دھرے بغیر۔۔۔ تو پھر کیوں...... کیوں سوار ہی...... اور بس یہیں آ کر کنعان کی تانیں گزشتہ دوروز سے آ کر اٹک جاتیں۔ یہ "کیوں" بڑی تیکھی، الجھی ہوئی سی، نہ سمجھ میں آنے والی عجیب گورکھ دھندے سی تھی۔ آخر اس نے سوار سے محبت کیوں کی، اور اگر کر لی تو سوار ویسا کیوں نہیں نکلا۔ تو ایسے ہوتے ہیں محبت کے دھوکے۔ بظاہر ریشم کے تار سے ملائم۔۔۔ اور اثر میں پتنگ کی ڈور سے کاٹنے والے۔

وہ بھی تو اپنے آپ کو ان دنوں کٹی پتنگ سی ڈولتی، الجھتی، ڈوبتی ابھرتی محسوس ہونے لگی تھی۔ جو اس پہ گزر چکی تھی اگر وہ کوئی بھیانک خواب تھا تو آخر وہ کب اس کے اثر سے باہر نکلے گی۔ کیا ان بھول بھلیوں میں کھو جانا بھی اسی فریب کا کوئی حصہ ہے۔ جو کہ "محبت...... بلکہ اندھی محبت" سے مشروط ہے۔ پیار کے شہر سے ناکام لوٹ آنے کے بعد بھی ادھر پلٹنے کی ہوک۔ کیا یہ خوش گمانیاں بھی اسی بے درد محبت کی دین ہوتی ہیں۔ سب کچھ لٹ جانے پر بھی آس امید کا دامن نہ چھوڑنے کی سوچ۔۔۔ پر یہ سوچ۔ وہ روتی آنکھوں سے پہلی بار ٹھٹکی تھی، سر بے

اختیار نفی میں ہلا۔

نہیں۔ یہ سوچ کچھ اور طرح کی تھی۔ یہ امید یہ خوش گمانی، کسی خواب و خیال کی نتیجہ نہ تھی، یہ تو مجسم حقیقت تھی۔ ایک سچ جو ایں کے اور سوار کے بیچ آیا تھا اور جس کی گواہ وہ خود تھی۔۔۔ دنیا کے قائم کردہ محبت کے عمومی معیارات سے بالکل ہٹ کر۔

☆☆☆

وہ بڑی دیر سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی تھی لب بظاہر ایک دوسرے سے جڑے تھے، سپاٹ اور سنجیدہ لیکن دل بڑی شدت سے مسکرانے کو کر رہا تھا۔ سوار کا نروٹھا پن آج تو سیدھا دل میں اترا جا رہا تھا۔ سامنے بیٹھی ثمامہ ہی کیا۔ وہ تو گزشتہ تین روز سے پوری دنیا سے خفا دکھائی دیتا تھا۔ اور یہ تین روز بھی ثمامہ نے دانستہ خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا تھا۔ وہ گرم حلوے سے منہ جلانے والوں میں سے نہ تھی۔ جانتی تھی معاملات سے کب، کہاں اور کیسے نمٹنا ہے۔

''کیا بات ہے سوار۔ پریشان ہیں کسی بات سے؟'' بالآخر بہت سوچ کر آج آغاز لینے کی ٹھانی۔

''جی؟'' وہ بری طرح کسی خیال سے باہر آیا تھا اور ثمامہ کو ایسے لمحے اندر تک گھائل کر دیا کرتے جب سامنے بیٹھ کر بھی وہ اس کی موجودگی سے یکسر غافل ہوا کرتا تھا۔ اچھا۔ آخر کب تک۔ اس نے ایک ٹھنڈا سانس بھرتے خود کو نارمل کیا۔

''میں نے کہا، پریشان لگتے ہیں۔'' اس نے ہلکا سا مسکرا کر اپنی بات پہ زور دیا۔ ''کچھ دنوں سے بہت اپ سیٹ ہیں۔''

''جی نہیں۔'' وہ زبردستی مسکرایا۔ ''سب ٹھیک ہے۔''

''جس طرح ہماری دوستی یک طرفہ ہے سوار۔ احساس اور خلوص کے جذبے بھی اسی حساب سے یک طرفہ ہیں، اس لیے آپ نہیں سمجھ سکتے کہ میں آپ کی کیفیت کو کس شدت سے محسوس کر سکتی ہوں۔ اور جانتی تو ویسے یہ بھی ہوں کہ آپ کبھی مجھ سے کچھ شیئر نہیں کرتے، پھر بھی پوچھنے سے باز نہیں آتی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کو پریشان نہیں دیکھ سکتی۔''

''میں یہ جاب چھوڑ رہا ہوں میم۔'' جواباً سوار نے اسی سادگی سے بس اتنا ہی کہا اور ثمامہ کی بولتی حقیقتاً بند ہوئی تھی۔ یہ کیا کر دیا تھا اس نے۔ کیا ایک بار پھر وہ اپنی نادانی میں کچھ اپنے خلاف کر بیٹھی تھی۔

''آنے والے دنوں میں شاید آپ کو میری وجہ سے کسی بڑی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے، آپ کے بہت احسانات ہیں میری ذات پر۔ مجھے یہ زیب نہیں دیتا کہ اندھیرے میں رکھ کر آپ کو کسی مصیبت میں مبتلا کر دوں۔''

''ایسا...... کیا ہوا ہے سوار۔ آپ کی وجہ سے خدانا خواستہ کوئی مصیبت کیوں۔'' ثمامہ کا دل چاہا بنا سوار کی موجودگی کی کچھ پروا کیے اپنے منہ پر ایک لعنت بھیج دے۔

''پولیس میری تلاش میں ہے۔ اِن فیکٹ میں نے پولیس سے بھاگ کر ہی مری میں پناہ لی تھی اور اب سننے میں آیا ہے کہ پولیس کو میری یہاں موجودگی کا علم ہو چکا ہے، اس لیے میں یہ نوکری چھوڑ رہا ہوں۔''

''آپ مری سے جا رہے ہیں؟'' ثمامہ کی گھٹی گھٹی آواز میں بلا کی مایوسی تھی، اس کی پھیلائی افواہ نے خود اسی کے بھس میں آگ لگا دی تھی۔

''جی نہیں۔'' سوار کا لہجہ ابھی بھی اتنا ہی سنجیدہ اور قطعی تھا۔ ''صرف یہ جاب۔''

''آ...... آپ پلیز مجھے شروع سے بتائیں۔ پلیز کھل کر بات کریں سوار۔'' وہ تو خود ہی ہڑبڑا چکی تھی۔ سوار نے ہلکا سا سر ہلا کر ہاتھ میں پکڑا پین سامنے میز پر رکھا اور پیچھے کرسی سے ٹیک لگائی۔

''میرے ایک بہت ہی مخلص اور پیارے

دوست نے یہاں میری آمد پر مجھے مشورہ دیا تھا کہ ماضی سے اگر پیچھا چھڑوانا ہے تو نئے ملنے جلنے والوں کو ایک فرضی کہانی سنا کر مطمئن کر دیا کرو، کسی جھوٹ سچ میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں بھی پہلے پہل یہ سن کر بڑی حیرت آمیز خوشی سے دوچار ہوا تھا کہ اچھا نئی زندگی اپنے انداز میں جینا تو بڑا ہی آسان کام ہے۔ سو میں واقعی ایک فرضی کہانی اور جھوٹی تسلی کے ساتھ اس نئی دنیا میں مگن ہو گیا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ گول گول گھومتی اس دنیا میں گھوم پھر کر ہر چیز واپس وہیں پر آتی ہے۔ میرے جھوٹ کا بھی مجھ سے یہیں تک کا ساتھ تھا۔

پچھلے چند روز میں خود پر گزرے سچ سنانے کا یہ تیرا موقع ہے۔ میں آپ سے بھی کچھ نہیں چھپاؤں گا، کوئی بھی ایسا شخص جس پر میرے کیے کا برا اثر پڑ سکتا ہے، اسے میں اپنی وجہ سے متاثر نہیں ہونے دوں گا۔ میری غلطیاں، میرے گناہ اللہ پاک کی نظر میں تو نہیں معلوم، پر دنیا والوں کے لیے بالکل قابل معافی نہیں۔"

سوار نے ایک گہرا سانس لیا، گزرے چند دنوں میں اتنا تو دیکھ ہی لیا تھا کہ اب اسے حقیقتوں کو فیس کرنا ہے، مہینوں کی لکا چھپی آخر کار اختتام کو پہنچی، اب جو بیتے گی صرف سچ کے بل بوتے پر۔ ثمامہ بھی منتظر نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ سوار نے نظریں سامنے رکھی ڈائری پر مرکوز کیے اسے بھی سب کہہ سنایا۔

"آ...... آپ نے مرڈر نہیں کیا تھا؟"

حیرت......خوشی......ایکسائٹمنٹ اس کے بے ساختہ جملے کی صورت ظاہر ہوئی اور سوار اس غیر متوقع ردعمل پر چونکا۔

"جی؟"

"میرا مطلب ہے، وہ ابھی آپ نے پولیس سے بھاگنے کی بات کی نا۔" وہ خود کو سنبھال کر بات بنانے میں کامیاب ہو گئی۔ سویرا کی کہانی کے مطابق سوار قتل کر کے بھاگا تھا، لیکن سوار کی کہانی سے صاف ہو گیا کہ بہر حال وہ قاتل نہیں تھا۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو سیلیوٹ کیا۔ کیا صحیح وقت پر سوار اور کنعان کے رشتے میں رخنہ ڈالا تھا، اور واہ کیا بات ہے رفیق سر کی۔ اتنے مہینوں سے سوار کو جاننے اور سمجھنے کے باوجود سنی سنائی پر ایسا پختہ یقین۔ کم از کم اس کے دل کو تو بڑا بھایا تھا۔ وہ اپنی اندرونی خوشی کو چھپائے بظاہر اپنا چہرا سنجیدہ رکھے ہوئے تھی۔ تیر تو خوب نشانے پر لگا تھا۔ اب تو بس آگے کی پلاننگ خوب سوچ سمجھ کر کرنی تھی۔

"موقع پر موجود شہادتیں میرے خلاف تھیں، اس لیے بھاگنا ناگزیر ہو گیا۔" وہ اب بہت خاموش اور تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اپنے متعلق ایسے کڑوے سچ بتانا ایک کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ اپنے منہ سے اپنی غلطیوں کا اعتراف، مخاطب کے سامنے اپنی کمزوریوں کا اقرار۔ خود اپنی نظر میں انسان کو نیچا دکھا دیتے ہیں، اور اب تو اس نے اپنے دفاع میں زور پیدا کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

"رابندر ناتھ ٹیگور لکھتے ہیں" دراصل جس وقت چڑیوں کو پنجرے سے نکال کر آزاد کر دیتے ہیں۔ اس وقت سمجھ میں آتا ہے کہ چڑیوں نے ہی ہمیں آزاد کر دیا ہے۔ جب میں دوسروں کو پنجرے میں بند کروں گا تو میرے لیے میری خواہش ہی قید بن جائے گی، اور یہ خواہشات کی قید تو ان زنجیروں کی قید سے بھی زیادہ سخت ہے۔"

سوار کے من میں اندر ہی کہیں ایک خواہش تھی کہ مری کے ایام یونہی اول روز جیسے گزرتے چلے جائیں۔ پیچھے مڑ کر اگر وہ خود نہیں دیکھنا چاہتا تھا تو خواہش تھی دوسرے بھی اس کے ماضی میں نہ جھانکیں۔ ہر کوئی بس اسے دیکھے، اسے سمجھے اور بس اس کی ذات پر بھروسا کرے۔ وہ جس آگ میں دوبارہ کودنا نہیں چاہتا تھا، بالآخر لوگوں کی مہربانی سے دھکیل دیا گیا تھا۔ ہاں لیکن اب محسوس ہوا، یہ کڑا امتحان تو اگنی پرکھشا جیسا ثابت ہوا تھا۔

نکل آنے کے بعد وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ پنجرہ کھل گیا تھا۔ پرندے آزاد ہو گئے تھے۔ اور پنچھیوں کی آزادی نے اس کے من پر پڑے بوجھ بھی سرکا دیئے تھے۔ اب کوئی جو چاہے، سوچا کرے۔

"اب آپ کہیں نہیں بھاگیں گے سوار۔" ثمامہ نے اپنی گہری کالی ساحر آنکھیں اس پر مرکوز کر رکھی تھیں۔ لہجہ اور انداز سوار سے بھی زیادہ قطعی تھے۔ وہ بہت کم بھی ثمامہ کی آنکھوں میں دیکھتا تھا۔ زیادہ گفتگو دائیں بائیں دیکھتے مکمل ہو جایا کرتی، پر عرصے بعد وہ چونک کر ڈائریکٹ اس کی آنکھوں میں دیکھنے پر مجبور ہوا تھا، جس کے نرم لبوں پر مسکان تو آنکھوں میں کسی فیصلے کی حتمی سی چمک تھی۔

"مجھے یقین ہے سوار آپ نے جو کہا وہی سچ ہے۔ اور پولیس کو اس سچ کی یقین دہانی کرانے میں، میں آپ کی مدد کروں گی۔ آج سے خود کو ہر فکر سے آزاد سمجھیں۔ آپ یہیں رہتے اپنے کام انجام دیں گے۔ میرے ہوتے کسی قسم کی ٹینشن نہ لیں۔ باقی جوانی کے جھول، چھوٹی موٹی غلطیاں کس سے سرزد نہیں ہوتیں۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ آپ کسی قتل میں ملوث نہیں۔"

"تھینک یو میم۔" وہ بس حیرت اور بے یقینی سے بس یہی کہہ پایا۔

"اونہوں۔" معنی خیز مسکراہٹ لیے اس نے سر ہلکا سا نفی میں ہلایا۔ "تھینکس نہیں، فیس چاہیے۔" وہ بھی ذرا بھاری تھی۔

"جی؟" وہ کچھ نہ سمجھتے اس بے موقع کی ہنسی کو دیکھے گیا۔

"آج آپ نے اپنی پرسنل لائف مجھ سے شیئر کر کے مجھ پر جو اعتماد ظاہر کیا ہے، بس اسی کا تھوڑا سا فائدہ اٹھاتے ایک مرتبہ پھر دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتی ہوں۔" وہ ہنوز مسکرا رہی تھی۔ "امید ہے اس مرتبہ آپ مایوس نہیں کریں گے۔" اس نے کہتے ساتھ اپنی ہتھیلی سوار کے سامنے کر دی۔

بے شک یہ وہ مقام تھا جب سوار کے پاس آپشن ہی نہیں بچا تھا کچھ لمحے اپنے اندر منوا لینے کی طاقت لیے ہوتے ہیں۔ ثمامہ اگر منوانے کی مضبوط پوزیشن میں تھی تو سوار کے پاس مان لینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ ہلکا سا مسکرا کر اس نے ثمامہ کی بڑھی ہتھیلی کو ٹچ کرتے ساتھ واپس کھینچ لیا۔

"تھینکس، تو اس دوستی کی خوشی میں آج رات کا ڈنر ہم ایک ساتھ کریں گے۔ لیکن یاد رہے، ثمامہ ابراہیم کے ساتھ۔ میم ثمامہ کے ساتھ نہیں۔" اس کا لہجہ شوخ ہوا تو سوار بھی مسکرا دیا۔ اس بات کا مطلب وہ بخوبی سمجھتا تھا۔ موبائل ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"منظور ہے ثمامہ۔" وہ ابھی تک مسکرا رہا تھا۔ "لیکن اس دوستی ڈنر کا بل میری طرف سے ہوگا۔"

"آف کورس۔" وہ ایک دم دل سے ہنسی۔ سوار کے لبوں سے اپنا نام سننا کتنا خوب صورت لگا تھا۔

"لیکن دھیان رہے، میں بہت خوش خوراک ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ دروازے کی جانب بڑھا۔ "سوار کے ابھی اتنے برے دن بھی نہیں آئے۔"

"اللہ نہ کرے۔" وہ یک لخت سنجیدہ ہوئی۔ "اللہ آپ پر کبھی برا وقت نہ لائے۔" ثمامہ کی دعا نے دروازے کے باہر تک سوار کا پیچھا کیا جسے یہ دعائیہ کلمات آج بہت خوش آئند بہت اچھے لگے تھے۔ یہ جانے اور سمجھے بغیر کہ یہیں کہیں پھر ایک ان دیکھا جال دھیرے دھیرے اس کے گرد مضبوط ہونے لگا ہے۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ناولٹ

مصباح علی سید

منہل اپنی نانی اور مما کے ساتھ رہتی ہے۔ برابر کے پورشن میں اس کے ماموں رہتے ہیں جن کے بیٹے شجی کو وہ پسند نہیں کرتی۔ کالج کے ایک ٹرپ پر جاتے ہوئے اس کی دوستی ذیاج سے ہوگئی ہے۔

الحمید لیگی ملٹی نیشنل کمپنی ہے۔ اعظم لیاقت ''الحمیدز'' میں فنانس منیجر کے طور پر کام کررہا تھا، اس کے نامناسب رویے کی وجہ سے عابس حمید نے اسے ہٹا کر ہائم انصر کو ترقی دے کر اعظم لیاقت کی پوسٹ اسے دے دی۔ اعظم لیاقت ذات کی نفی کرنے والوں سے تو تھا نہیں، اس نے جاب چھوڑ دی لیکن وہ وقتاً فوقتاً آفس میں ملنے کے لیے آتا رہتا ہے۔

یونیورسٹی میں ہائم انصر نے ردابہ کو پروپوز کیا لیکن ردابہ نے اپنی محتاط فطرت کی وجہ سے سختی سے انکار کردیا۔ بعد میں ابا کے دوست کی بیٹی نکل آنے کی وجہ سے ہائم نے اپنی ماں نعیمہ خاتون کو ردابہ کے لیے رشتہ لے جانے پر مجبور کیا۔

ہائم اور ردابہ کی شادی ہوگئی لیکن نعیمہ خاتون کا پرانی رنجش کی وجہ سے ردابہ کے ساتھ سلوک اچھا نہیں ہے۔

زارا بھابھی کے بھائی طارق کی بیٹی نے دسویں میں ٹاپ کیا تو انہوں نے نعیمہ اور سب گھر والوں کو بھی بلایا۔ وہاں پر رابیل کی دوست گڑیا کے بھائی شرجیل کو تانیہ پسند آگئی۔

آفس کی اہم فائل گم ہونے کی وجہ سے ہائم بہت پریشان ہے۔

ردابہ امی کے گھر سے اپنے گھر آرہی تو اسے ہائم کسی لڑکی کے ساتھ ایک ریستوران میں بیٹھا نظر آیا جبکہ ردابہ کو لینے آنے کے لیے اس نے آفس میں مصروفیت وجہ سے انکار کردیا تھا۔

اعظم لیاقت نے ارضا فارما کی فائل میں رابعہ سے بہانے سے حاصل کرلی تھی جو ہائم نے مس رابعہ کو سرکو دینے کو کہا تھا۔ بعد میں پوچھنے پر وہ مکر گیا۔ عابس اسی فائل کی وجہ سے پریشان تھا کہ الزام اس پر آرہا تھا۔

شرجیل کے گھر والوں کی دعوت والے دن ہائم گھر دیر سے پہنچا تو ردابہ گیٹ پر ہی اونچی آواز میں اس سے لڑنے لگی۔ ہائم نے غصے میں کہہ دیا ''اگر تم طلاق چاہتی ہو تو میں نے تمہیں طلاق دی۔''

چھٹی اور آخری قسط

طلاق کا چار حرفی لفظ زمین پر بہت بھاری ہے، اور اگر زمین بھی بابل کی ہو تو دہلیز کے در و دیوار تک سسک اٹھتے ہیں، وہ الگ بات ہے، دہلیز کے آنسو، سسکیاں نہ سنائی دیتی، نہ دکھائی، البتہ محسوس ہوتی ہیں اور وقت کے ساتھ ان کا احساس صرف بولتا نہیں چیخ و پکار مچا دیتا ہے، وہی دبی دبی چیخ و پکار ردابہ کے گرد اکٹھی ہونے لگی تھی۔

اور جو سب سے پہلے اسے کو دھچکا لگا تھا، وہ منہل سے گھر میں دوسرے درجے کے شہری والا سلوک شروع ہونا تھا، اور یہ تو ہونا ہی ٹھہرا ہے، بچہ بے شک بچہ ہی ہوتا ہے لیکن بہر حال اپنے اور بیگانے کا فرق تو جانور بھی سمجھتا ہے وہ تو پھر انسانوں

کی بھیڑ میں منہل کو لے کر اترتی تھی۔
رومانہ بھابھی نے کچھ رعایت دی، وہ صرف گھر کی سیے ہی کام لے لیتیں، مگر سندس میں برداشت کم تھی، وہ ایک دو ٹکا بھی دیتی ساتھ رعب سے کہتی تھی۔

اسے کسی بات سے ہٹا بھی لیا کرو، کوئی تمیز سکھاؤ...... یا اپنی طرح ہٹ دھرم بنانا ہے۔"
یہ چابک وہاں سے برسنے شروع ہوئے تھے جہاں وہ پورے زعم سے آ بیٹھی تھی، اور پھر تو جیسے روٹین بن گئی کبھی رومانہ اس کی کلائی پکڑ کر کمرے سے باہر کرتے ہانک لگاتیں۔
"ردابہ اسے دیکھو، حسن وغیرہ کو پڑھنے نہیں دے رہی، بچپن میں عادت ڈالو دوسروں کی بات ماننے کی، ورنہ تمہاری طرح روئے گی ساری زندگی۔"
کبھی سندس بھابھی، اپنے بچوں تو کیا، خود

اپنے ہاتھ سے ٹوٹنے والی چیز بھی منہل کے سر لگا دیتیں، یہ کوڑے اُن کوڑوں سے زیادہ گہرے نیل چھوڑ رہے تھے جو اپنے گھر میں محسوس ہوتے تھے، وہاں تو ہائم بہت دل فریب مرہم رکھ دیتا تھا، مگر یہاں، احمد اور علی اس کے سگے بھائی کئی دن تک یاد دہانی کرواکروا، کھرنڈ نوچتے تھے۔

"امی! آپ بلاوجہ غصہ کررہی ہیں آخر سندس بھی ماں ہے، اگر منہل کی وجہ سے اس کے بچے ڈسٹرب ہوں گے، وہ تو بولے گی ناں۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے علی......" رومانہ دیور کی بات میں وزن ڈالنے کو بول جاتیں۔ "ہمارے بچوں کا بھی تو یہی گھر ہے۔ اب ہم تو ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا کر، میکے جانے سے رہے، ہم نے تو اپنے بچوں کا مستقبل دیکھنا ہے۔"

بہت کم عرصے میں اپنوں کے انداز میں منہل کا مستقبل اب بہت صاف دکھائی دینے لگا تھا۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا حسن (احمد کا بیٹا) کی سالگرہ تھی، گھر میں تو کبھی پہلے بھی نہیں منائی گئی تھی، احمد بھائی بچوں اور بیگم کو کہیں آؤٹنگ کروادیتے، کہیں کھانا کھا آتے، خوشی کا اظہار ہوجاتا تھا، اس دن احمد نے علی کے اور اپنے بچوں کے ساتھ ردابہ سے منہل کو بھی تیار کرنے کا کہا تھا، گئے تو سب خوشی خوشی تھے لیکن گھر آکر جو رومانہ بھابھی شروع ہوئیں۔

"توبہ ہے بھئی، ردابہ۔ تمہاری بیٹی سے تو اللہ ہی پناہ دے۔ منہل نے تو تھکا مارا ہمیں۔ ایک جھولے سے اتر دوسرے پر، ایک کھلونا رکھ، دوسرا۔ ہٹانے سے بھی باز نہیں آتی۔ یہ تو ضد میں تمہارا بھی ریکارڈ توڑے گی، مجال کسی ایک جگہ دل ٹک جائے۔"

آخری جملے نے ردابہ کو سن سا کردیا تھا۔ رومانہ کے اٹھتے ہی فریدہ کو شکایتی انداز سے دیکھا۔

"دیکھا کیسے کہہ کرگئیں ہیں بھابھی، میں، مُجی، حسن، علینہ۔ ان سب بچوں کے پیچھے کیسے خوار ہوتی تھی، ذرا سی چوٹ لگتی ہے بھاگ کر انہیں اٹھاتی ہوں، کیسی کیسی ضد کرتے ہیں میرے ساتھ، کبھی کسی کو نہیں جتایا۔ آپ کچھ بھی نہیں کہتیں۔"

"کہتی تو رہی تھی تجھے...... نہیں سمجھی تھی نا تم۔ کتنا سمجھایا، ہاتھ تک جوڑے مگر تو...... اور یہ کیا کہہ رہی ہیں، ابھی تو دنیا کے زبان لگے گی۔ بچوں والیوں کو اسی لیے سمجھوتے کا کہتے ہیں، جس ماں کے طلاق کا داغ لگ جائے اس کی بیٹیاں دھبوں سے بچتی نہیں ہیں، ردابہ! اب اپنے اندر برداشت پیدا کرو، کسی کا منہ تم بند نہیں کرسکتیں۔"

ذومعنی جملے گھر میں روٹین کی طرح گردش کرتے ہی تھے اور بہت سے مسئلے بننے لگے۔ اسکول میں جاب کرلینے سے شروع کے دن معمول کی طرح گزرے، منہل بڑی ہوئی، ضروریات بڑھیں، مہنگائی بھی بڑھ گئی، البتہ پرائیوٹ اسکول کی تنخواہ ویسے نہیں بڑھی تھی، کئی اور جگہ اپلائی کیا، مگر جیسی جاب ویسی ڈیمانڈ، ویسے بھی آج کل ٹرینڈ چلا ہے، ینگ اور فریش ڈگری ہولڈرز ہو۔ اُسے تعلیم چھوڑے کئی سال بیت چکے تھے، ہائم نے شروع میں منہل کے لیے چیک بھجوایا تھا، لیکن تب تو ردابہ کی انا کو گوارا ہی نہیں تھا وہ کچھ بھی ہائم سے لے، بہت آرام سے چیک واپس بھجوادیا تھا۔

"میں اپنی بیٹی کو بہت اچھے طریقے سے پال سکتی ہوں، سنبھال بھی سکتی ہوں۔"

"تمہیں میں نے دیا بھی نہیں، اپنی بیٹی کے استعمال کے لیے دیا ہے۔ اور یہ حق تم مرتے دم تک مجھ سے نہیں چھین سکتیں۔" ہائم نے اسی کے لہجے میں کہا تھا۔

"تو جب وہ خود استعمال کرنے جتنی ہوجائے بھیج دینا۔"

بات ختم ہوگئی، چند سال تو ویسے ہی گھر کا نظام اکٹھے چلتا رہا، پھر احمد نے گھر گرواکر نئے سرے سے تعمیر شروع کروائی، اپنا پورشن اس طرح سے بنوایا کہ الگ گھر ہی لگتا تھا، الگ گھر کے خرچے بڑھ گئے۔

تعمیر شروع کروائی، اپنا پورشن اس طرح سے بنوایا کے الگ گھر ہی لگتا تھا، الگ گھر کے خرچے بڑھ گئے، تو باقی خرچے سے ہاتھ لپیٹتے لپیٹتے مکمل ہی لپیٹ لیے۔ بعض اوقات تو وہ ماں کے پاس بیٹھتے ہی ایسے اخراجات کا منہ کھولتے کہ کوئی انہیں ہی دے دے تو پورا پڑے۔

علی کا ٹرانسفر دوسرے شہر ہوگیا، جس طرح کبھی کبھی آتا ویسے ہی دینے دلانے کی بات کرتا تھا۔ فریدہ اور گھر ردابہ کے پاس تھا، ان کی ضروریات بھی اُسے ہی پوری کرنا تھی۔ یہ تو وہ کام تھے جو اُسے کرنا ہی تھے جیسے تیسے گھن چکر بنی وہ کر بھی رہی تھی، ایک اور مسئلہ سامنے آیا تھا جب منہل نے یونی میں قدم رکھا اس کے رشتے کی فکر ہوئی تھی، کسی غیر نے نہیں اپنی ہی قریبی نازیہ آنٹی نے کہہ دیا تھا۔

"بے شک ردابہ کی بیٹی بہت خوب صورت ہے، ماں جیسی، مگر رشتہ آسانی سے ملنے والا نہیں اس کا، لوگ پہلا سوال یہی کریں گے، اماں ابا میں طلاق کس وجہ سے ہوئی۔"

وجہ تو کوئی تھی ہی نہیں کیا بتاتی آفس سے لیٹ ہونے پر؟ یہ تو بیوقوف سے بے وقوف شخص کو بھی عورت کا قصور لگے گا۔

☆☆☆

یہ گرمیوں کی سلگتی دوپہر کا قصہ تھا، ویک اینڈ تھا احمد ماں کے پاس آ بیٹھا رومانہ بھابھی ساتھ تھیں۔ ویسے بھی ان دنوں کم ہی میاں کو تنہا ماں کے پاس چھوڑتی تھیں۔ عورت اپنے مزاج کے خطرے کو کوسوں دور سے سونگھنے کی صلاحیت رکھتی ہے، وہ صرف سونگھ ہی نہیں چکی تھیں۔ بلکہ میاں کی ناک کا پورا بندوبست کرلیا تھا۔ باتوں میں ہی فریدہ نے احمد سے منہل کے رشتے کی بات کی تھی، کیوں کہ نازیہ آنٹی نے ہی بات دماغ میں ڈالی تھی۔

"رومانہ اپنے بیٹے کا اِدھر اُدھر رشتہ ڈھونڈ رہی ہے، گھر کی بچی نہیں دکھائی دے رہی، دوسرے تو سو طرح کے سوال کریں گے، احمد رومانہ کو تو سب پتا ہے، گھر کی بات گھر میں رہ جائے گی۔ تم احمد کو سمجھاؤ۔"

یہ نازیہ آنٹی کی سوچ تھی، لگتا نہیں تھا رومانہ اتفاق کرے گی، مگر کسی خوش فہمی کے تحت فریدہ نے پوچھ ہی لیا، احمد کی بھنویں سکڑیں، رومانہ کی پھیل گئیں، احمد بات سنبھال کر بولے تھے۔

"امی! یہ نئے دور کے بچے ہیں، ان کی مرضی کے بغیر کیسے کچھ کہہ دوں۔" ان کی مرضی کہتے ہوئے نگاہ رومانہ پر اٹھی تھی جہاں واضح انکار درج تھا۔ اس انکار کو انہوں نے ردابہ تک پہنچانے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"حسن سے پوچھوں گا، اور ابھی تو منہل بھی پڑھ رہی ہے۔"

☆☆☆

چند دن بعد کا قصہ ہے، علی اپنی فیملی کے ساتھ چھٹیوں پر آیا ہوا تھا، سب ہی فریدہ کے پورشن میں اکٹھے بیٹھے تھے۔ بہت دنوں بعد یوں سب کو اکٹھا دیکھ کر فریدہ بہت خوش تھیں۔ انہوں نے منہل کو چائے کے ساتھ اچھا سا اہتمام کرنے کو کہا تھا، اور خود بھی بچوں کے ساتھ آ بیٹھیں۔ جہاں احمد اپنے بچوں کے کارناموں پر فخر کر رہے تھے، وہاں علی اپنے بڑے بیٹے مجی کے رویے کو لے کر کچھ پریشان سا تھا۔ اس کی الٹرا ماڈرن کلاس کی دوستیاں، عیاش فطرت اور تعلیمی قابلیت میں صفر سب ہی کو معلوم تھا، اور اب کیا وہ بچپن سے ضدی ہٹ دھرم، اپنی بات ہر صورت منوانے والا تھا، سندس بھابھی نے کبھی روکا بھی تو نہیں، اکلوتا، اکلوتا کہتے ہر بات مانتی رہیں، اور اب وہ اکلوتا ان کا سر درد بنا تھا۔ علی باتوں باتوں میں اس کی نئی فرمائش نخوت سے بتا رہے تھے۔

"ضد بھی تو دیکھیں کیسی انوکھی کر رہا ہے۔ اٹلی شفٹ ہونا ہے، کوئی اس سے پوچھے اس کے باپ دادا نے اٹلی جانے والا جہاز نہیں دیکھا، وہ نواب کا بچہ وہاں رہائش کی بات کر رہا ہے۔"

احمد اس کی بات پر ہنس پڑے۔
"بچہ ہے یار! ہو جائے گا ٹھیک۔"
"کیا ٹھیک ہو جائے گا بھائی جان! پچیس کا ہونے والا ہے، گریجوئشن اس سے کمپلیٹ نہیں ہو رہا، اور خواب دیکھو نواب زادے کے، جیسے باپ منسٹر لگا ہے۔"
"تم اسے میرے پاس چھوڑ کر جاؤ میں سمجھاؤں گا اسے، فکر نہیں کرو۔"
رومانہ بھابھی یک دم سے بولیں۔
"تم اس کی شادی کیوں نہیں کر دیتے، رشتے طے ہو جائیں لڑکے اچھے بھلے ٹھیک ہو جاتے ہیں، نئی ذمہ داریوں کی فکر لگ جاتی ہے۔"
شجی اسی وقت باہر سے آیا تھا۔ رومانہ تائی کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اور نگاہیں کچن میں کام کرتی منہل کی متلاشی سی تھیں۔
اس کے ہٹ دھرمی سے مسکرانے پر علی اندر تک کلس گئے۔
"بیٹی والے بھی کچھ دیکھ کر ہی لڑکی دیتے ہیں، کون پاگل نہیں، ہے، جو اپنی بچی کو پھینک دے۔"
"حد کرتے ہیں علی آپ بھی۔" سندس کو بیٹے کی مسلسل برائی ناگوار گزری، رومانہ نے بھی تائید کی۔
"اچھا بھلا بچہ ہے تمہارا، خواہ مخواہ بدنام کر رکھا ہے۔ اور رشتے کا کیا مسئلہ ہے، امی بھی منہل کے لیے پریشان ہو رہی ہیں۔"
ردابہ نے چونک کر دیکھا۔ بیٹوں اور شجی کی تائیدی مسکراہٹ دیکھ کر فریدہ بھی یک دم تحیر میں آ گئیں، البتہ رومانہ نے بہت اطمینان سے اپنی بات جاری رکھی۔
"حسن ہو یا شجی ان میں فرق کیا ہے، دونوں گھر کے بچے ہیں، گھر کی بات گھر میں رہ جائے گی۔ کیوں امی؟"
فریدہ تو ایسے تھیں جیسے سٹی گم ہو گئی ہو ردابہ نے پل بھر ماں کے جواب کا انتظار کیا، پھر ہمت کر کے بولی تھی۔
"میرا خیال ہے آپ سب کو پتا ہے، منہل کی ماں میں ہوں امی نہیں۔"
"تو تمہیں کوئی اعتراض ہے اس رشتے پر۔" رومانہ کو آج موقع مل گیا، اپنی مرضی سب پر واضح کرنے کا "حسن کے لیے بھی تو تم نے امی سے کہلوایا تھا، حسن اور شجی میرے لیے ایک جیسے ہیں، ایک باپ دادا کی اولاد۔ میں تو کوئی فرق نہیں سمجھتی ان میں۔"
"لیکن میں سمجھتی ہوں۔"
چائے کی ٹرے لے کر آتی منہل کی اتنی اونچی آواز آج پہلی بار سب نے سنی تھی، سب ہی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ ٹرے میز پر رکھ کر مستحکم لہجے میں بول رہی تھی۔
"ممانی جان ان میں فرق ہے، تعلیم کا، عادات کا، کردار کا، رویے کا......اور رہی بات حسن بھائی کی، وہ میری ماں سے زیادہ نانو کی خواہش ہے، میری تو بالکل بھی نہیں۔ میری جو خواہش ہے وہ میری ماں سے چھپی نہیں ہے، میں انہیں بہت پہلے بتا چکی ہوں۔"
اس نے یہ بات جان کر کہی تھی کیوں کہ جس دن سے شجی آیا تھا اس کی حرکتیں، منہل کو دیکھنے کا انداز اسے اندر تک تپا رہا تھا۔ موقع تھا اس نے اپنی ناپسندیدگی واضح کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ سب کی تمسخرانہ نگاہیں دیکھ کر ردابہ کو اچھی خاصی سبکی کا احساس ہوا اور ڈپٹ کر منہل سے بولی۔
"تم اندر جاؤ اپنے کمرے میں، کیا میں موجود نہیں ہوں یہاں؟"
"دکھ بھی اسی بات کا ہے کہ آپ موجود ہیں۔" کہتے ہوئے منہل کی آواز بھرانے لگی، آنکھوں میں پانی کی چمک اکٹھی سی ہو گئی۔ "جنگ اُس محاذ پر لڑی جاتی ہے مما جان، جہاں کی جیت سے آپ کو فائدہ

ہو۔ ہر محاذ پر ہتھیار نہیں اٹھا لینے چاہئیں، اور آپ ہمیشہ غلط محاذ پر لڑتی رہی ہیں۔" کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے بے تحاشا پانی گرا، فریدہ نے سر جھکا لیا۔ روابہ کا بس نہیں چل رہا تھا اٹھ کر منہل کے دو چار لگا دے۔

"جاتی ہو اندر یا نہیں......"

"جا رہی ہوں۔ لیکن میرے بارے میں کوئی شخص بھی فیصلہ کرنے سے پہلے سوچ لے، میں لاوارث نہیں ہوں میرا باپ ابھی زندہ ہے۔"

وہ کہہ کر تیزی سے اپنے پورشن کی جانب بڑھی تھی، شجی اسے انتقامی نگاہ سے گھورے جا رہا تھا، جب کہ رومانہ اور سندس دونوں نے ایسے آنکھیں پھیلائیں جیسے گناہ کبیرہ ہوتے دیکھ لیا ہو۔

"استغفراللہ۔ اتنی زبان...... روابہ تو ایسی نہیں تھی امی۔" رومانہ کا طنز زبان پر آ ہی گیا۔ "یہ آگے جا کر پتا نہیں کیا، کیا گل کھلائے گی۔"

☆☆☆

اچھا بھلا خوش گوار ماحول کئی دن تک تنا رہا۔ روابہ نے اس کے خوب لتے لیے تھے، جو وہ چپ کر کے سنتی رہی، جو بولنا تھا بس اسی دن بولی تھی، پھر تو ایسے ہو گئی جیسے قوتِ گویائی سے محروم ہی ہو۔ کبھی کبھی کی ملاقات والے ذیاج نے بھی اس کی خاموشی محسوس کی تھی، کلاس بنک کیے وہ بہت دیر اس سے یہی پوچھتا رہا

"گھر میں کوئی مسئلہ چل رہا ہے؟"

مگر وہ پھیکا سا مسکرا دی۔

"میری پوری ذات مسلسل مسئلہ ہے، مزید کیا مسئلے چلیں گے میرے ساتھ۔"

"مت بولا کرو ایسے، مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔"

"کس بات سے۔ میرے بولنے سے، یا ان مسائل سے جو میرے اپنوں نے میرے لیے باقاعدہ اگائے ہیں۔"

"منہل! ماضی میں جو ہوا، وہ اب راکھ ہو چکا ہے، بلکہ مجھے تو ایسے لگتا ہے، وقت کی ہوائیوں نے وہ راکھ بھی اِدھر اُدھر پھیلا کر سب مٹا دی، تم بھی ہر وقت اسی سب کے پیچھے خود کو اداس مت کیا کرو۔"

"پہلی بات ذیاج! ماضی کبھی راکھ نہیں ہوتا، وہ تو نشان ہوتا ہے، تمغے جیسا نشان، اگر اس میں حماقتیں لغزشیں ہیں، تو عبرت، اگر فخر ہے، کارنامے ہیں تو، جزا...... میرے حصے میں عبرت آئی ہے، ماں کی لغزشوں، حماقتوں کا نچوڑ عبرت۔"

ٹوٹے لہجے میں کہتے ہوئے منہل کی آنکھوں میں پانی کا دھند لکا سا تھا، جو ذیاج کو اندر تک تیر کی مانند چبھ رہا تھا، اس نے نرمی سے سمجھانا چاہا تھا۔

"جب بھی امی، ابو سے چچی کی باتیں سنتا ہوں تو پتا نہیں کیوں مجھے ان پر بہت ترس آتا ہے، کبھی کبھی ایسا لگتا ہے وہ واقعی بے قصور تھیں۔ اور چاچو، ان کا تو جرم جیسے لگتا ہی نہیں، لیکن پھر بھی منہل، سزا ان کی اولاد کے حصے میں آئی۔"

سنتے ہی وہ یک دم پھٹ پڑی۔

"اور اتنی سی بات میری شادی شدہ ماں کی سمجھ میں تب نہیں آئی تھی۔" وہ گھٹنوں پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "جب گھونسلہ ٹوٹتا ہے تو سب سے پہلے اس میں رکھے انڈے دھم سے زمین پر گرتے ہیں۔ ہاں تنکے بھی گرتے ہیں، بکھرتے ہیں، لیکن انہیں ہوا اڑا کر کوئی نہ کوئی ٹھکانا دے ہی دیتی ہے، مگر ٹوٹے ہوئے انڈے، ان کا مقدر صرف خاک ہوتا ہے، اب اسے خاک کے اندر تک اترنے میں کتنا ٹائم لگے، یہ تو قسمت ہے ان کی۔" کہتے ہوئے منہل کے چہرا آنسوؤں سے تر بتر تھا۔ ذیاج جیسے لفظ تک بھول گیا، اتنے آنسو اس کی دھڑکن روک دینے کو کافی تھے، تب ہی اس نے فیصلہ کیا تھا، آج وہ چاچو سے بات ضرور کرے گا، بہت ہو گیا، اپنے لیے نہ لڑ سکے مگر کم از کم اپنی بیٹی کے حق میں تو اٹھیں۔

شجی تو ایسے لوگوں سے تھا، کوئی گھر کر دیکھ لے تو اس کی ناک کا مسئلہ بن جاتا تھا، لیکن اس دن تو منہل نے اتنے لوگوں میں، پٹاخ سے اس کی شان میں

قصیدہ پڑھ دیا۔ وہ اپنی بے عزتی برداشت کر لے، ممکن نہیں، جو کھانے پینے کی چیز کا انکار سن کر چپ نہیں رہتا تھا، یہ تو پھر اس کے کردار پر انکار کا دھبہ لگا تھا۔ وہ جان کر تایا کے گھر رک گیا کہ یہاں ہی ایڈمیشن لوں گا، اور حسن سے پڑھا کروں گا۔ بات اس طرح سے کی گئی، علی اور سندس کو بھی انکار نہیں ہوا۔

☆☆☆

شجی کو احمد کی طرف رہتے تین چار ماہ ہو گئے تھے، اور ان تین چار ماہ میں اس کی اپنی تائی سے بہت دوستی ہو گئی، رومانہ تو شروع دن سے زمانہ ساز عورت تھی۔ حسن مکمل خاموش طبع اور ایک پریکٹکل لڑکا تھا، گھر سے آفس، آفس سے گھر اور اپنا کمرہ، زیادہ سے زیادہ ہی نانی کے گھر ماں کو لے جاتا، اس کی بھی وجہ ماموں کی ہم مزاج لڑکی میں انٹرسٹ تھا، گھر کے سارے ہی کام احمد کے سر تھے شجی کے رہنے سے اس میں بڑی سہولت ہو گئی تھی، اس کے مطلب کی باتیں کرتے رہو، اور دنیا جہان کے کام نکلوالو، کبھی گھر جانے کا موڈ بنتا بھی تو ماں باپ کی ڈانٹ ڈپٹ پھر سے تایا کے گھر لے آتی۔

اس روز رومانہ کے میکے میں کسی بچے کا عقیقہ تھا سب ہی کے جانے کا پروگرام بن گیا۔ فریدہ کو کئی دن سے بخار آ جا رہا تھا، منہل ان کے خیال سے رک گئی۔ ویسے بھی جب اس نے شجی کو فنکشن میں جانے کے لیے خوب تیار دیکھا، وہ جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ لیکن پھر جانے ایسا کیا ہوا، شجی کیوں اور کب جلد گھر آ گیا، یا شاید وہ گیا ہی نہیں، کسی کو پتا بھی نہیں چلا۔ گیٹ کے انٹرنل لاک کی چابی گھر کے سب ہی افراد کے پاس ہوتی تھی، کھڑ کا دھڑ کا ہونے کا ہوا اور بادلوں میں محسوس نہیں ہو سکا۔ اور اب اس کے اندر کا شیطان پوری طرح منہل کے سامنے کھڑا خباثت سے مسکرا رہا تھا، سیاہ برستے بادلوں میں ہولناک گونج تھی، منہل کا سر دیوار میں لگنے سے خون ماتھے پر رس رہا تھا۔

"جاؤ نا نکلو سڑک پر...... کہو تو گیٹ کھول دیتا ہوں...... اور پھر کھلی سڑک پر اتنا بھاگنا کہ اپنے باپ تک پہنچ جاؤ۔ میں بھی دیکھتا ہوں، تمہاری یہ نازک قدم، فاصلے کو کیسے مٹا سکتے ہیں۔"

شجی کا بس نہیں چل رہا تھا منہل کی بے بسی پر قہقہوں کے ساتھ بھنگڑے بھی ڈالے۔ شجی اسے مزید ڈرانے کو ذرا گیٹ کی جانب بڑھا ہی تھا، ٹائر چرچرانے کی آواز کے ساتھ بہت سی روشنی بھی گیٹ کی درزوں سے اندر داخل ہو رہی تھی، جیسے ہی شجی نے گیٹ کھولنے کو ہاتھ بڑھایا کسی نے مخالف سمت سے گیٹ اندر کی جانب دھکیلا، جہاں شجی کی حیرت کی انتہا نہیں تھی، اندر کی جانب بڑھنے والے کے قدم منہل کو بھی چونکا گئے۔

کتنے دنوں بعد انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی اس موقعے پر جب شدت سے ان کی ضرورت تھی۔ جب کسی کے طعنوں تشنوں کے بعد حقیقت میں بدن چھلنی ہونے کے قریب تھا۔ اپنی بے بسی، گھبراہٹ میں یک دم مل جانے والی مہربان پناہ نے اسے بے قابو سا کر دیا، وہ دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے ان سے لپٹ گئی، بالکل ویسے جیسے کبھی بچپن میں ان کی ٹانگوں سے لپٹ کر سر چھپایا کرتی تھی، وہ ایسے ہی تھی جیسے سسکتے ہوئے دھواں دھار روئے گی۔

بیٹی کا بارش سے بھیگا لباس، ماتھے سے رستا لہو، بنا دوپٹے بدحواسی کا عالم، اور یوں بلکنا، اوپر سے سامنے کھڑا شیطان جو فرار کا رستہ دیکھ رہا تھا، بے قابو ہوتے غصے میں ہائم نے منہل کو اپنے اندر تک بھینچ لیا، اور نگاہوں کی تندی شجی پر جمی تھی، البتہ ذیاج اس کے گریبان پر کسی چیتے کی طرح جھپٹا تھا۔

"کیا کہا ہے، منہل کو۔"

ذیاج نے اس کے گریبان کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ کر زور سے جھنجھوڑا "بولو، بولو، میں کیا پوچھ رہا ہوں، کیا کہا ہے تم نے اسے، منہل کیا کہا ہے اس نے تمہیں، بتاؤ مجھے، خون پی جاؤں گا میں اس کا۔ ابھی کہ ابھی اسے زمین میں زندہ گاڑھ دوں گا،

بولو۔'' ذیاج فلک شگاف دھاڑا تھا
منہل ہائم کے ساتھ چپکی بری طرح کانپ رہی تھی، سسکیوں کے بیچ بس ایک ہی فریاد تھی۔

''بابا...... بابا پلیز، پلیز مجھے لے جائیں یہاں سے، بابا۔ اللہ کے واسطے۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے مار دیں، ختم کردیں۔ مگر، پلیز مجھے یہاں سے لے جائیں، کسی قبر میں ڈال دیں، کسی نہر میں پھینک دیں، یہاں سے لے جائیں، مجھے یہاں نہیں رہنا، پلیز بابا۔''

منہل کی پشت پر جمے ہائم کے ہاتھ غصے سے لرزنے لگے، دانت آپس میں جم گئے۔ نگاہ میں سرخی عود آئی، ذیاج نے فجی کو پیٹنا شروع کردیا۔

''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں تمہاری جان نکال دوں گا۔ کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ، بولو، الو کے پٹھے۔''

''جھوٹ بول رہی ہے وہ، بکواس کر رہی ہے۔ میرے پیچھے پڑی تھی بارش میں سیر کرنی ہے، آوارہ کہیں کی۔''

فجی کی مسلسل بکواس پر ذیاج نے اس کے چہرے پر گھونسا مارا تھا، فجی کا سر دیوار سے جا ٹکرایا۔

بادلوں سے یک دم تیز روشنی لپکی اور کڑک کر بجلی کہیں گر کر اٹھی تھی۔ بجلی کی گونج بادلوں کی رگڑ سے پھیلنے لگی، ادھ کھلے گیٹ میں ردابہ اور احمد ہونق زدہ کھڑے تھے۔ جو منظر تھا اور جو کچھ وہ سن چکی تھی کہیں بہتر تھا وہ بجلی آج ردابہ پر ہی کہیں باہر گر جاتی۔ ماں کو دیکھ کر تو منہل بالکل ہی بکھر گئی تھی۔ اسے پتا تھا اس کی ماں اس کی بات کا شاید یقین نہ کرے، اور پھر سامنے ذیاج بھی تو کھڑا تھا، وہی ذیاج جس کا نام تک سننا ردابہ کو گوارا نہیں تھا۔

☆☆☆

ذیاج اور منہل کی ملاقات ایک معمول کی طرح یونی کلاس فیلو کے طور پر ہوئی تھی، اور ایک دوسرے کے گڈ فرینڈ لسٹ میں تھے، یہ بھی ممکن تھا ایک شہر ایک یونی میں پڑھتے ہوئے ہمیشہ ہی ایک دوسرے سے لاتعلق رہتے، کیوں کہ باقاعدہ طلاق ہونے کے کچھ عرصے کے بعد ہی ہائم عابس صاحب کی منتیں کرکے باقاعدہ جاپان کی برانچ میں شفٹ ہوگیا تھا۔ سال بعد عید پر چند روز کے لیے آتا تھا۔ اور وہ چند روز بھی مستقل آرام کے بہانے کمرے میں گزرتے۔ جب گھبرا جاتا تو منہل کی آواز سننے کو فون کرتا، ملنے کی خواہش کا اظہار کرتا تو، ردابہ نے بہت التجاء سے کہا تھا۔

''میں جانتی ہوں تم اس کے باپ ہو، اور اس سے بے پناہ محبت کرتے ہو۔ لیکن یوں بار بار اس کے سامنے آکر، اس سے مل کر، مجھے اور اسے تکلیف سے مت گزارا کرو، پھر وہ نہیں سنبھلتی۔ میں سب بھول جانا چاہتی ہوں خدا کے واسطے مجھے اس اذیت سے مت گزارو۔''

اب جانے یہ ردابہ کی دل میں بسی محبت تھی جو چاہنے کے باوجود بھی وہ کم نہیں کرسکا۔ اس کا تقاضا تھا یا بیٹی کی نفسیات کا خیال...... وہ ایک دو بار کے بعد کبھی ملنے کیا دیکھنے تک نہیں گیا۔ بس اپنی تنہا دنیا فائلوں میں بسالی۔

ایسی ہی ایک دنیا کورس کی کتابوں میں ردابہ کے اندر بس گئی تھی، خود سے بھی چھپا کر ہائم کی تصاویر دیکھتی، طلاق نامہ تکتی اور پھر انہیں کہیں چھپا کر رکھ دیتی۔ شروع میں فریدہ نے اس کی دوسری شادی کی پوری کوشش کی مگر منہ سے تو وہ یہ کہہ دیتی ''پہلا تجربہ بہت اذیت ناک ہے۔'' اور دل میں خود کو ہزار بار کوستی تھی ''کہ تلخ تجربے کو ناکام اپنی ضد سے کیا، ورنہ ہائم تو ہرگز ناکام تجربہ نہیں تھا...... کاش...... کاش خود مرنے سے بہتر اس ضد کو مار دیتی۔''

منہل کے بے پناہ سوال آخر کیوں طلاق ہوئی۔ کا جواب صرف ایک جھڑکی تھا۔

''ہوگئی سپریشن، نہیں ساتھ رہنا تھا، بات ختم۔ مت مجھ سے بار بار ایک ہی بات پوچھا کرو۔''

''کیوں نہ پوچھوں، مما، آخر آپ کی طلاق

سے میں بھی تو متاثر ہوئی ہوں۔"
"کیا متاثر ہوئی ہو۔ سب کچھ کرتو رہی ہوں۔"
وہ ماں کو سب کچھ کیا بتاتی، جو باپ کے ساتھ رہنے سے شفقت کی صورت ملتا، اُس سپریشن کی مکمل تفصیل ذیاج سے ملی تھی۔ اسے اس کی دادی نے سنائی تھی یا ماں نے لیکن ایک ایک بات پوری جزیات سے پتا تھی، جو اس نے جوں کی توں منہل کو سنا ڈالی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک روٹین کا دن تھا، ردابہ اس دن احمد کی گاڑی میں تھی، اسے مارکیٹ جانا تھا راستے میں اس نے منہل کو کال کی کہ وہ یونی سے باہر آجائے تاکہ اسے بھی پک کرلیں۔ منہل ذیاج سے باتیں کرتی ہوئی گیٹ تک آگئی، وہ جب گاڑی میں بیٹھ رہی تھی تب ہی ذیاج نے ردابہ کو گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھے دیکھا، اور وہ چونک گیا۔ جس وقت ردابہ نے گھر چھوڑا اس وقت اجو اتنا بھی چھوٹا نہیں تھا، بالکل ہی کچھ یاد نہ رہے۔ پانچ چھ سال کا تو تھا، پھر گھر میں بہت سی تصویریں رکھی تھیں، چاچو کی دراز میں ہی منہل اور ردابہ کی تصویر ویسے ہی پڑی تھی۔ اسے حیرانی ہوئی اور پھر اس کی کھوج میں لگا، چند دن لگے تھے سب پتا چلنے میں۔ پھر تو دوستی رشتہ داری میں اور رشتہ داری خود ہی محبت میں ڈھل سی گئی۔
ردابہ کو تب پتا چلا تھا، ذیاج دراصل اجو ہے، جب وہ باقاعدہ اپنی مما زارا کو لے کر ردابہ کے گھر آگیا۔ ردابہ برسوں بعد یوں اچانک زارا بھابھی کی آمد پر اچھی خاصی حیران ہوئی تھی۔ اور جب پتا چلا اجو، منہل کے ساتھ پڑھ رہا ہے اور دونوں میں ایک رشتہ بھی پنپ چکا تو حیرانی فکر میں بدل گئی۔ ان سے تو وہ لیے دیے انداز میں مل ہی لی تھی لیکن ان کے جانے کے بعد منہل کی شامت آگئی۔
"کہاں سے ڈھونڈ لیے، اپنے رشتے دار تم نے۔ کہاں کہاں ان کی تلاش میں پھرتی رہی ہو۔"
"رشتوں کو ڈھونڈا نہیں جاتا مما! وہ تو خود آکر لپٹ جاتے ہیں۔ خون اپنے رنگ کو نہ پکارے، مگر کشش کو ضرور بھانپ لیتا ہے۔"
ردابہ اس کے جواب پر بھنا گئی۔
"منہل یہ کبھی مت بھولنا، ہمیں انہوں نے گھر سے نکال دیا تھا، بے گھر ہو گئے ہم ماں بیٹی۔"
منہل ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بہت تاسف سے بولی۔
"مما! آپ بھول رہی ہیں، ہمیں کسی نے نکالا نہیں تھا، بلکہ آپ خود سب چھوڑ آئی تھیں، میرے باپ سمیت اس کا گھر بھی۔"
"منہل......"
ردابہ کا یک دم اس پر ہاتھ اٹھ گیا، جہاں ردابہ کو اپنے اس عمل پر حیرت تھی وہاں منہل گال پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے ماں کو دیکھ رہی تھی۔
"دل دکھا آپ کا...... حالانکہ میرا مقصد آپ کا دل دکھانا نہیں تھا مما۔" اس کی آواز کی نمی آنکھوں سے چھلک پڑی "میں صرف اتنا پوچھنا چاہ رہی ہوں، میرے باپ کا گھر ہوتے ہوئے آپ نے مجھے لوگوں کی ٹھوکروں پر کیوں رکھا۔ میرے باپ نے دوسری شادی نہیں کی، سوتیلی ماں کا تو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ پھر آپ نے مجھے ان سے ملنے کیوں نہیں دیا۔ مجھے ان کی کمی محسوس ہوتی رہی، کیوں کبھی ان کی شکل دیکھنے نہیں دی، ایسا بھی کیا جرم تھا میرے باپ کا۔"
"میرے پاس تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں ہے، جاؤ یہاں سے۔"
"سپریشن آپ دونوں کے درمیان ہوئی ہے، لیکن مجھے کیوں علیحدہ کیا، مجھے اپنے بابا سے ملنا ہے۔"
ردابہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی، مگر منہل اس سے اجازت لے کر ہی پاس سے ہٹی تھی۔
"ٹھیک ہے، اگر تم اس سے ملنا چاہتی ہو، تو ملو۔ لیکن وہاں سے آکر اس کے قصے سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

یہ سب کہتے ہوئے جہاں خود ردابہ کو اپنے اندر بے نام آنسو گرتے محسوس ہوئے وہاں منہل کو ماں کے بنجر لہجے میں بہت سا درد محسوس ہوا تھا
"کیوں خود کو اتنی اذیت دے رہی ہیں۔ یہ کیسی سزا ہے، جو آپ نے خود کو خود ہی دی۔"
کچھ فیصلوں کے جواب نہیں ہوتے، کچھ پچھتاووں کے اقرار نہیں ہوتے، بس درد ہوتے ہیں، کچھ ایسا ہی درد ردابہ کو لگا تھا۔ اب اس کے پاس سوائے وہاں سے ہٹ جانے کے کوئی جواب تھا ہی نہیں منہل کے کسی سوال کا۔

☆☆☆

منہل اور ہائم کی پہلی ملاقات تو بے حد جذباتی سی رہی تھی۔ کتنے پل تو ایک دوسرے کو اجنبی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ خشک آنکھیں بیتے ماہ سال کی گرد سے بوجھل ہوئے، کتنے پل ان دونوں کی پلکوں پر لرز کر اٹھے، تو وہ "بابا" کہتے اتنے زور سے لپٹی چھڑانا مشکل ہو گیا تھا۔
"اتنی بڑی ہو گئی میری گڑیا...... مجھے پتا بھی نہیں چلا۔"
ہائم کی آواز دکھ سے رونده گئی تھی اس کا چہرا دونوں ہاتھوں میں تھامے بس دیکھے جا رہے تھے۔
"پتا تو تب چلتا جب مجھے اپنے ساتھ رکھتے، میرے ناز اٹھاتے، مجھ گرتی کو سنبھالتے۔۔۔ مما سے پوچھیں کیسے اتنا بڑا کیا، میرے اتنا بڑا ہونے میں انہوں نے کیا کیا سہا...... کیا کیا دیکھا۔"
ردابہ کے ذکر پر ہائم کا چہرا پھیکا سا ہو گیا۔ آنسو اندر ہی تھم سے گئے آواز کسی زندان سے نکلی تھی۔
"اس سے کیا پوچھوں، اس کا اپنا فیصلہ تھا یہ۔"
"کیوں مانا ان کا فیصلہ۔ جب آپ جانتے تھے، وہ بھی آپ کے بغیر زندگی کو زندگی کی طرح نہیں جئیں گی، تو کیوں ان کے احمقانہ فیصلے پر سر جھکا دیا۔ مرد تھے آپ، لڑتے، زبردستی کرتے، کچھ بھی کرتے مگر ان کی یہ بات نہ مانتے۔" اب اس کے پاس باپ کے لیے سوال ہی سوال تھے۔ "آپ کی بیٹی تھی میں، آپ کا فرض نہیں تھی، کیوں احتجاج نہیں کیا آپ نے۔ پہلے لمحے میں ہی اڑ رکھتے، کہہ دیتے بیٹی نہیں دوں گا، مما، کی ساری انا، ساری ضد صرف آپ کا یہ جملہ ہی توڑ دیتا بابا۔"
ہائم نے سوچا بھی نہیں تھا اس کی اپنی بیٹی اسے یوں لاجواب کر دے گی، کتنی دیر حیرت سے اسے دیکھے گیا
"تمہیں چھین کر اسے تکلیف دیتا، بس یہ خوف مار گیا مجھے......"
"خود کو بھی تو دی۔"
"لڑنے آئی ہو مجھ سے......"
باپ کی بے بس آواز پر منہل کے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کے گالوں سے پھسلتے ٹھوڑی سے ٹپکنے لگے۔
"ہاں مجھے لڑنا ہے آپ سے...... مما سے...... اس دنیا کے ہر اس فرد سے جو آپ کی علیحدگی کا سبب بنا۔ میرا خیال کیوں نہیں کیا کسی نے۔ بابا! میں ٹوٹی پھوٹی ہوں، مجھے اپنے سائے سے بھی ڈر لگتا ہے، قریب سے کوئی جھونکا گزرتا ہے، میں اس سے بھی لرز جاتی ہوں۔ میرا کوئی بہن بھائی بھی نہیں جس کے کندھے پر سر ٹکا کر رو ہی سکوں۔ کیوں کیا مجھ پر اتنا ظلم آپ دونوں نے۔"
ہائم نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ "ہو گئی تھی غلطی، معاف کر دو۔ اور چلو اٹھو منہ ہاتھ دھو۔ اتنے برسوں بعد تمہیں دیکھا ہے،، بابا کے پاس رونے کے لیے آئی ہو کیا۔ آج کا دن بابا اور بابا کی گڑیا کا ہے، اٹھو شاباش۔ آج میں اپنی بیٹی سے بہت سی باتیں کروں گا، بہت کچھ دکھاؤں گا تمہیں۔"
پھر ذیاج کو دیکھ کر پیار سے گھورا تھا۔
"اور اجو۔ تم بھی بھاگو یہاں سے، میری اور میری گڑیا کی پرائیویسی ڈسٹرب ہو رہی ہے۔"
"ارے واہ...... یعنی کہ جس نے یہ فاصلہ سمیٹا، اب وہی کھٹک رہا ہے۔ چاچو! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔"
"یہ میرا اور میرے بابا کے بیچ آیا فاصلہ تھا، تم

نہیں سمیٹتے تو ہم سمیٹ ہی لیتے۔"

منہل نے باپ ہی کی تائید کی تھی، اجو ان دونوں کی بنتی اکائی پر حیران سا تھا۔

پھر تو ایک معمول بن گیا تھا وہ یونی سے اکثر ہی باپ کو ملنے چلی جاتی، ردابہ کو فون پر بتا دیتی "آج میں بابا کے پاس رہوں گی، پلیز کھانے پر ویٹ مت کیجیے گا۔"

ردابہ نے بھی منع نہیں کیا۔ باپ ہے اس کا۔ یہی احسان کم تھا کہ اس نے بچپن میں بھی ڈسٹرب نہیں کیا۔ ہاں بس وہ خاموش ہو گئی تھی۔

کسی سے جیتنا ہے نہ ہی بازی مات کرنی ہے
مجھے خود سے اکیلے ضروری بات کرنی ہے
مجھے کچھ پل اگر اپنے تسلط سے رہائی دو
میں خود سے بات کر پاؤں، اگر نہ تم سنائی دو
(فاطمہ نجیب)

☆☆☆

منہل کے یوں آئے دن باپ سے ملنے پر ایک عجیب سی چیز ردابہ نے خود اپنے آپ میں محسوس کی، جس کا وہ اعتراف کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جب جب منہل وہاں سے ہو کر آتی بلا وجہ ردابہ اس کے قریب بیٹھ جاتی۔ بظاہر دھیان کہیں اور ہوتا تھا، لیکن لاشعور مہنل کے گرد بھٹکتا، کہ شاید کوئی حال احوال سننے کو ملے، لیکن منہل خاصی سنبھل کر بات کرتی تھی۔ ہائم سے ملنے جانے کی بات الگ تھی لیکن منہل کی ذیاج کے لیے پسندیدگی ردابہ سے برداشت نہیں ہوئی۔

"جس جہنم میں میں جھلس گئی اس میں تمہیں قطعاً نہیں پھونکوں گی، یہ بات ذہن سے نکال دو منہل۔"

"ہو سکتا ہے آپ کو وہ گھر جہنم لگتا ہو، مگر میں اتنے دن سے جا رہی ہوں، مجھے تو نہیں لگا کبھی۔ ایک اور ہی طرح کا سکون ہے وہاں، جتنی دیر بابا کے پاس بیٹھتی ہوں، کوئی سیسہ پلائی دیورا اردگرد محسوس ہونے لگتی ہے، آسمان، زمین سب یک دم میرے چاراطراف آجاتے ہیں۔"

"تمہارا دماغ خراب کردیا ہے ان لوگوں نے۔ تم جانتی نہیں ہو اس گھر کے اصول، قاعدے، قانون۔ ان کا سورج قدرت کے ساتھ نہیں، بلکہ ان کے حکم پر چلتا ہے۔"

"مما پلیز......"

ماں بیٹی کی اس خاموش بحث کا کوئی حل نہیں نکل رہا تھا۔ فریدہ کبھی ردابہ کو سمجھاتیں، کبھی منہل کو، پھر دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا، ہائم نے البتہ منہل کو بہت پیار سے سمجھایا تھا

"تمہاری ماں نے تمہیں زمانے کی سرد گرم سہہ کر بڑا کیا ہے، اس کی مرضی کے خلاف اگر جاؤ گی مجھے بھی دکھ ہوگا بیٹا۔"

☆☆☆

ہائم کی بات سے ایسے لگا تھا جیسے وہ ذیاج سے پیچھے ہٹ جائے، وہ سن کر چپ تھی، مگر دل دماغ چپ نہیں رہا۔ اس نے ذیاج کو متواتر قائل کیا تھا کہ وہ کسی بھی طرح بابا اور تایا ابو کو لے کر آئے۔ ذیاج کو کچھ بھی ہائم کو کہنے کی ضرورت نہیں تھی، اس کی ایک ایک بات، اس کے انداز سب خود بتاتے تھے کہ وہ منہل کے لیے کتنا سیریس ہے۔ اسے کہاں تک پناہ دے سکتا ہے۔ پھر کوئی باپ اپنی بیٹی کے لیے مضبوط پناہ کے ہوتے ہوئے کوئی اور فیصلہ کر سکتا ہے

اور اس دن تجی کی خباثت نے تو بھونچال مچادیا تھا، ہر فیصلہ خود بخود اپنی جگہ بناتا چلا گیا، جب وہ تڑپ تڑپ کر ماں کے سامنے رو رہی تھی۔

"آپ کی خود پرستی نے مجھے ذلت کے مقام تک پہنچا دیا۔"

پہلی بار ہائم بہت غصے میں بولا تھا۔

"اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد میں اپنی بیٹی کو یہاں کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا ردابہ، جہاں شیطان میری بچی پر گھات لگائے بیٹھا ہو، وہاں تو ہر نام نہاد محبت دم توڑ گئی اب...... میں اسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں، پلیز روکنا مت۔ کیوں کہ اب میں نہیں رکوں گا۔"

احمد تو منظر دیکھ کر جس قدر ہائم سے شرمندہ تھے

سو تھے، بہن سے نگاہ ملانے کے قابل نہیں رہے۔ معاملہ سمجھتے ہی تجی پر جب جھپٹے، اسے مارتے دھتکارتے گھر سے نکالا تھا، فریدہ خود سب دیکھ کر ہکا بکا تھیں۔

"تم مجھے اپنی ماں کو چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔ بیس برس میں نے تمہیں تنہا، پالتے گزارے، لمحے میں مجھے چھوڑ جاؤ گی، کیسے رہوں گی منہل میں تمہارے بغیر۔" ردابہ اس کے سامنے کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔

"یہ تو آپ کی انا تھی مما۔ جس نے آپ کو تنہائی بخشی۔ جہاں آپ نے سب کی، ہر رشتے کی ہر مقام پر بہت سہیں، کاش میرے لیے، اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے بھی اپنی انا کچل دیتیں۔ آج ہم یوں بکھرے ہوئے نہ ہوتے۔"

ردابہ کی ہچکی بندھ گئی۔

"منہل مجھ سے غلطی ہوگئی میرے بچے آئندہ کبھی کہیں نہیں جاؤں گی، کبھی ایک پل کو اکیلا نہیں چھوڑوں گی تمہیں...... پلیز پلیز، مجھے تنہا مت چھوڑو، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

اس نے منہل کا بازو پکڑ لیا ہائم کا دماغ کئی برس پیچھے چل پڑا، جب اس نے چھت پر منتیں کرتے ردابہ کی کلائی پکڑ لی تھی۔

"پلیز ردابہ! مجھے تنہا مت چھوڑو، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا، نہیں جی سکتا یار...... تمہارے بنا، مت کرو مجھ پر اتنا ظلم۔"

"منہل! میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں...... بچے میں ہر طرح کا کفارہ ادا کرنے کو تیار ہوں، پلیز......"

ردابہ کی آواز میں ہائم کو اپنی برسوں پرانی فریاد سنائی دے رہی تھی۔

"ردابہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں، ہر طرح کا کفارہ ادا کرنے کو تیار ہوں پلیز۔"

ہائم کے کان سرخ ہو کر پھٹنے کو تھے، کانوں کی بازگشت سماعتوں کا امتحان ٹھہری تھی۔ دل میں کوئی تلوار تھی جو اندر تک اترے جا رہی تھی۔ آج پھر وہ اپنی محبت کے آگے ہار گیا۔ کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی ردابہ کے آنسو اس کا دل بہا لے گئے۔ لیکن بیٹی کو بھی یوں لاوارث بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا کہ لوگ اسے مفت کا مال سمجھ کر لوٹ کھسوٹ شروع کر دیں۔

اس نے لمحے میں ماحول میں تنی دکھ کی چادر اپنے فیصلے سے ڈھیلی کی، وہ یک دم سامنے سے ہٹے اور اپنا فیصلہ ردابہ کو سنایا۔

"اگلے ہفتے ضماد بھائی منہل اور ذیاج کے نکاح کے لیے آ رہے ہیں، ذہنی طور پر تم تیار رہنا۔ بیٹی کو رخصت کر کے ہر ماں باپ کو تنہا رہنا ہی پڑتا ہے، اور ہاں اگر ہم میں علیحدگی ہونے سے پہلے، میں کسی حادثے میں پہلے ہی کہیں مر جاتا۔ تو منہل کی شادی کے بعد تمہیں تب بھی تنہا ہی سروائیو کرنا تھا۔ اس لیے خود کو، اپنے دل کو سنبھال لو، ردابہ۔"

جو گزر گیا، سو گزر گیا، نہ بیتی رت کا ملال کر
میں اداس ہوں، میرے دل ربا میری وحشتوں کا خیال کر
تو بھی فیض لے، ذرا درد سے، کبھی میر سا کوئی شعر لکھ
تجھے شاعری سے شغف تو ہے، کوئی دل نشیں سا کمال کر
(فاطمہ نجیب)

ہائم کہہ کر رکا نہیں، ذیاج حیرانی سے چاچو کو دیکھتا رہا گیا۔ ہائم کی پشت کو دیکھ کر ردابہ کا دل اتنا تیز دھڑک رہا تھا جیسے اب پھٹے کہ تب پھٹے۔ وہ بیس سالوں میں اپنے فیصلے پر اتنا نہیں پچھتائی تھی جتنا اس وقت پچھتائی تھی بس میں ہوتا تو زمین آسمان اپنی چیخوں سے ہلا دیتی، کاش زندگی میں کبھی کوئی ایک لمحہ واپس پلٹ لانے کا اختیار اگر انسان کو ہوتا تو وہ یقیناً وہ لمحہ ضرور پلٹ لاتی جب وہ ہائم کے دفتر باقاعدہ طلاق کا مطالبہ لے کر گئی تھی، ساری زندگی کی سب سے بڑی غلطی، جس پر وہ ہر روز ہزار بار پچھتاتی تھی۔

اور منہل اس بات کا یقین ہی نہیں کر رہی تھی کہ طلاق باقاعدہ ہو چکی ہے۔ کیوں کہ ذیاج سے مل کر اس کی زبانی تو صرف یہ پتا چلا تھا کہ ایک بار کہا تھا اور

چچی گھر چھوڑ گئیں۔ رجوع کی ہر طرح کوشش کی مگر مانیں نہیں۔ وقت بیت گیا، ذیاج نے بھی کچھ چھپانے سے کام نہیں لیا تھا بلکہ اس کے کیا اس کے گھر کے ہر فرد کے علم میں یہی بات تھی کہ ہائم نے صرف ایک بار طلاق دی تھی، اور پھر وہ ملک ہی چھوڑ گیا تھا۔ ردابہ کے مطالبے کا ہائم نے کسی کو کان و کان پتا لگنے نہیں دیا تھا۔ محبوبہ بیوی کی اس قدر ہٹ دھرمی، وہ شاید مزید کسی سے طعنے کی صورت سننا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے طلاق کے پیپر اس کے میکے کے بجائے ردابہ کے اسکول کے ایڈریس پر بھجوائے تھے، اور خود جاپان چلا گیا تھا۔

منہل نے بھی کوئی کاغذ ماں کے پاس کبھی نہیں دیکھا تھا، سپریشن کا لفظ سن رکھا تھا، اس کی تشریح ذیاج نے بتائی پھر جب چینل پر اس نے کسی مولانا کا بیان سنا اس کا دماغ ایک ہی لے پر سوچ رہا تھا۔

''دوبارہ نکاح۔'' مطلب مما اور بابا کا دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے، اسی بات کو ڈسکس کرنے اس نے اُس دن ذیاج کو بلایا تھا، مگر تب تو معاملہ ہی الٹ پلٹ ہو گیا تھا، ذیاج سے پہلے چچی نے اپنی خباثت دکھا کر، بات کہاں سے کہاں پہنچادی۔

پھر کئی دن بعد اس نے اپنی ماں سے ہی ڈسکس کیا۔ اسے یقین تھا، ردابہ اب اتنی ٹوٹ پھوٹ گئی ہے، وہ اس کی بات کو نہیں ٹالے گی، پھر جب اللہ نے راستہ رکھا ہے تو کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ لیکن اسے کیا پتا تھا اس کی ماں کی ضد نے ہر راستہ، ہر گنجائش اپنی انا کے زعم کی بھینٹ چڑھا دی، ہر راستے پر پتا نہیں کون سی انا قفل لگائے آگے بڑھتی رہی۔

بہت دیر کی بحث و تکرار کے بعد ردابہ نے اسے ڈپٹ کر کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے میں جھوٹ بول رہی ہوں، دماغ خراب ہے میرا، اپنی جنت کو چھوڑ کر خود کو دوزخ میں سلگتی رہتی۔'' کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

''کیوں کیا آپ نے ایسا، کسی نے سمجھایا نہیں، کسی نے نہیں بتایا، کہ ایسا مت کریں۔''

''دماغ خراب ہو گیا تھا میرا۔ ہوش میں نہیں تھی میں، اپنے سب رستے خود جلا دیے، خود پاؤں کاٹے تھے اپنے۔ لیکن خدا کے واسطے منہل، تم کبھی رشتوں میں انا کو اس نہج پر نہ لے جانا جہاں سے واپسی ممکن نہ ہو...... کھڈی پر کپڑا زیادہ تن جائے تو، تانے بانے کھنچاؤ سے ٹوٹ جاتے ہیں، انا کو بھی کھڈی پر چڑھنے مت دینا۔''

وہ کہتے ہوئے اس کے پاس سے اٹھی اور الماری کے لاکڈ ڈرا سے ایک کاغذ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ ہے میری بد نصیبی، میری انا، خود پرستی کی سزا۔ جس پر میں اپنا وجود خود کھڈی پر تنتی رہی۔''

منہل کاغذ دیکھ کر گم صم سی ہو گئی، اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اب کیا بات کرے، کیسے کوئی دلیل دے۔ ہر دروازہ خود ہی ماں نے خود پر بند کر دیا، بہت سے سوال اسے اندر ہی اندر کھانے لگے۔ دل کرتا تھا ایک ایک بات کی تفصیل پوچھے لیکن مما کی یک دم چپ نے جیسے اس کے ہونٹوں کو بھی سی دیا سوال بلبلوں کی مانند اندر پھولتے، پھٹ جاتے۔

☆☆☆

وہ ایک پھیلتی شام کا وقت تھا، ردابہ بے حد اداس تھی، دل تھا کسی چیز میں لگ ہی نہیں رہا تھا۔ کل منہل کا نکاح تھا ہر طرح کی تیاری مکمل ہو چکی تھی، احمد، اور رومانہ اس رشتے پر بہت خوش تھے، جہاں تک ممکن تھا انہوں نے تیاری میں مدد بھی کی حالانکہ ہائم نے بہت سختی سے کہا تھا۔

''منہل میری بیٹی ہے اور ہر طرح کی ذمہ داری میری ہے۔ کسی کو اس کے لیے پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔''

لیکن احمد اور رومانہ کا انداز یک دم بدل گیا تھا اور پرانی محبت خود بخود لوٹ آئی۔

''مانا تمہاری ذمہ داری ہے مگر ننھیال کا بھی کچھ

فرض بنتا ہے۔ ہم اتنا ہی کریں گے جیسا کہ ننھیال والے عموماً کرتے ہیں۔"

ہاں البتہ علی اور سندس اس رشتے پر خفا تھے یا نہیں لیکن شادی کا یہ کہہ کر بائیکاٹ کیا۔

"منہل کا تو پہلے ہی اس لڑکے کے ساتھ چکر چل رہا تھا۔ ماں سیدھے رستے نہیں مانی، تو اس نے ہمارا بچہ بدنام کر کے اپنا الو سیدھا کر لیا۔ ہمیں نہیں ایسے منافقوں کی شادی سے کچھ لینا دینا۔"

ہر ہر منظر کسی فلم کی طرح ردابہ کی آنکھوں کے آگے آ رکتا، اور یہ سوچ کر کل منہل کا نکاح ہے، وہ رخصت ہو جائے گی، یادوں میں اسے کیا دیا، باپ سے دوری، ماں کی تنہائی، بس...... کتنا سمجھایا تھا امی نے سب نے منہل کا سوچو اور میں صرف یہی سمجھی منہل کا کھانا پینا، تعلیم یہ تو سوچا ہی نہیں، ان سب سے ہٹ کر اس کی ایک اور زندگی بھی تو ہوگی، کاش ، کاش کبھی گھڑی کی سوئیاں واپس گھوم سکتیں۔

وہ اپنی سوچوں میں اتنی گم تھی اسے پتا بھی نہیں چلا اس کے رخسار اس کی اپنی آنکھوں کے پانی سے بھیگ رہے ہیں۔

منہل نے دور سے ماں کو اکیلے بیٹھے دیکھا، وہ ان کے قریب آ گئی اور پیچھے سے گلے میں بازو ڈالے ان کے رخسار سے رخسار ملا لیا۔

"کیا کر رہی ہیں یہاں اکیلی بیٹھیں۔"

اس نے پھیکا سا مسکرا کر اسے پچکارا۔

"کچھ بھی نہیں بس ویسے ہی۔ آؤ بیٹھو۔" اس کی کلائی پکڑ کر اپنے سامنے بٹھا لیا۔

"آپ رو رہی تھیں؟" اسے اچنبھا ہوا۔

"نہیں......" ردابہ نے اپنی آنکھیں صاف کر لیں

"میرے جانے سے اداس ہو رہی ہیں۔ تو میں ابھی بابا کو انکار کر دیتی ہوں، مجھے نہیں کرنا ذیاج سے شادی۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو۔" ردابہ اس کے ہاتھوں کی مہندی کے ڈیزائن کو خوشی سے دیکھتے بہت سی دعائیں اسے دے رہی تھی دعائیں دیتے دیتے یک دم چپ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

"منہل۔ اپنی ماں کی ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، کبھی بھی اپنے شوہر سے بدگمان مت ہونا، کبھی بھی، بھلے وہ بدگمانی درست ہی کیوں نہ ہو۔"

"کیا مطلب مما؟ اسے حیرت ہوئی تھی

"سادی سی بات ہے بچے، یہ بدگمانیاں تیزاب سے بھی زیادہ تیزی سے کام کرتی ہیں رشتے کو جھلسا کر بھدا بدنما کر دیتی ہیں، پھر وہ ساتھ اچھا لگتا ہے نہ ہی تنہا......"

منہل ردابہ کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے نا سمجھی کا عالم ہو۔ ردابہ نے اس کے رخسار کو پیار سے تھپکا۔ "میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے، اور لباس کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہوتا، جو آپ کے بدن کو نہ چھوئے، اس سے کچھ بھی ڈھکا نہیں ہوتا بلکہ وہ جسم کو دوسروں سے چھپا لیتا ہے۔"

"آپ کیا کہہ رہی ہیں، مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا۔" منہل کو یک دم کوفت ہوئی تھی

"عام سی بات تو کہہ رہی ہوں۔ ایک دوسرے کا لباس بننا، دوسروں سے خود کو چھپانا، خود کو ایک دوسرے سے مت چھپانے لگ جانا۔ کوئی بات کوئی پریشانی، کوئی بدگمانی دل میں چھپانے کے بجائے فوراً کھول لینا۔ میں بھی تو بدگمان ہوگئی تھی، صرف لمحہ بھر کے لیے ہاتم کو ایک لڑکی کے ساتھ دیکھ کر، یہ سوچا ہی نہیں اس کی کولیگ بھی ہو سکتی ہے، اور اس نے بھی اپنی پریشانی مجھ سے چھپائی، صرف میری طبیعت کے ڈر سے اور دلوں میں کیسا دراڑ کا عمل شروع ہو گیا۔ سب...... سب کچھ ہی اس دراڑ کی نظر ہو گیا۔"

"ایک بات سچ بتائیں گی، بالکل سچ۔"

"پوچھو۔"

"کیا واقعی آپ کو بابا سے نفرت ہوگئی تھی، ان کے ساتھ گزارا کوئی پل، کوئی لمحہ، کوئی خلوص آپ کو روک نہیں سکا، آپ کو دکھ نہیں ہوا ان سے علیحدہ

ہوتے، طلاق کا مطالبہ کرتے۔"

پل بھر کو ردابہ کے ہونٹ آپس میں ایسے پیوست ہوئے جیسے کبھی کھولنے نہ ہوں، پھر ایک تھکی سانس چہرے پر پھیل گئی

"مجھے کبھی اس سے نفرت نہیں ہو ہی نہ سکی منہل۔ کبھی بھی...... بس کچھ عجیب سی خودسری سما گئی تھی...... میں کبھی بھی ضدی نہیں تھی، نہ جھگڑالو، بڑے حوصلے کے ساتھ زندگی کے سارے مرحلے طے کیے تھے، بس ہوتا ہے کبھی کبھی صرف ایک بات، صرف ایک بات۔ آپ کے سارے صبر، حوصلے، برداشت کی دھجیاں بکھیر دیتی ہے، ہائم کا اس دن اونچا بولنا، مجھ پر چیخنا...... سہا نہیں گیا مجھ سے۔"

آنسو ٹپ ٹپ آنکھوں سے گرنے لگے "اللہ نے میاں بیوی کے رشتے کو بہت خوبصورتی، بہت استقامت بخشی، ہم کہتے ہیں کچا دھاگا، حالانکہ مضبوط ڈوری ہے، چھوٹ جائے پھر پکڑ لو، چھوٹ جائے پھر پکڑلو۔ عدت شوہر کے گھر گزارنے میں یہی حکمت ہے، ایسا ہو ہی نہیں سکتا دونوں سامنے ہوں اور رنجش دور نہ ہو، پھر رجوع کی گنجائش رکھ دی، اور یہ دوبارہ نکاح۔ ایک طلاق کے بعد بھی سہولت دے دی کہ تم آپس میں ہی دوبارہ نکاح کرلو۔ اللہ کو اس رشتے سے پیار ہے، شیطان دشمن۔ اور ہم شیطان کی راہ پر جلدی سے چل پڑتے ہیں، جب کہ بچے بچے کو پتا ہے انسان کی وجہ سے شیطان اپنے گھر جنت سے نکالا گیا۔ وہ بھلا انسان کو اپنے گھر میں سکون سے بسنے دے گا۔ لیکن ہمیں غصہ ضد، انا کے ہتھیار پکڑا کر ہمارے گھر ہم سے ہی تڑواتا ہے۔"

اس کے مسلسل آنسوؤں پر منہل نے آگے بڑھ کر اپنے دوپٹے سے ان کی آنکھیں صاف کیں۔

"اچھا روئیں تو نہیں، طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

"رو نہیں رہی، تمہیں سمجھا رہی ہوں۔ نکاح کا رشتہ کانچ کے خوش نما قیمتی گلدان جیسا ہوتا ہے، اور کانچ جتنا دیکھنے میں سخت ٹھوس ہوتا ہے اتنا ہی ہر مٹیریل میں خوب صورت۔ لیکن بیٹا کانچ کی چیز کو احتیاط اور عقل سے بچایا جاتا ہے، الٹے سیدھے ہاتھ نہیں مارے جاتے، مضبوطی سے پکڑتے ہیں، سنبھال کر رکھتے ہیں۔ کانچ کی احتیاط کی جائے تو برسوں استعمال پر بھی ویسا ہی چمکتا ہے، غصے میں اگر اسے کبھی پٹخ دو تو کرچیاں بکھیر دیتا ہے۔ اور کرچیوں کی چبھن بڑی جان لیوا ہے میرے بچے، چھلنی کر دیتی ہے، اور ہر ہر سوراخ سے لہو رستا ہے۔"

وہ کتنی دیر ایک دوسرے سے باتیں کرتی رہیں، آنسو، مسکراہٹ، یادیں سب بیچ میں آتا رہا یہاں تک کہ فضا میں خنکی بڑھ گئی۔

☆☆☆

ہر دلہن کی طرح منہل پر بھی روپ جوبن بن کر اترا۔ رخصتی کے وقت ہائم ردابہ کے سامنے آیا ہی نہیں، یقیناً اس کے چہرے کی تکلیف نے آج بھی تکلیف ہی دینی تھی۔ جاتے جاتے سب سے مل کر بنا دیکھے ردابہ کے قریب آکر کہا تھا۔

"جو ہونا تھا، وہ اب ہوگیا۔ پچھتاووں کو چھوڑ دو، باقی زندگی سہل ہو جائے گی۔"

آواز پر وہ چونکی ضرور مگر گردن نہیں اٹھائی، نگاہ تب اٹھائی تھی جب وہ آگے بڑھ گیا تھا۔

وہ سہ پہر کا وقت تھا، جب وہ اسکول سے گھر آنے کے بجائے ٹیکسی لے کر ائیر پورٹ چلی گئی۔ منہل نے رات ہی فون پر باتوں میں بتایا تھا۔

"بابا کل واپس جاپان جا رہے ہیں ناں، ذیاج کہہ رہے تھے ان کے جانے کے بعد ہی ہم ہنی مون ٹرپ رکھیں گے۔"

اس نے صرف یہ سنا تھا کہ ہائم جا رہا ہے، بنا رشتے کے دل کا دھڑکنا سمجھ سے باہر تھا۔ شاید ایک گلٹ تھا جس میں وہ مزید رہنا نہیں چاہتی تھی، وہ فلائٹ کی ٹائمنگ پتا کر کے ائیر پورٹ پر آخری بار

ملنے گئی تھی۔ منہل اور ذیاج ہائم کے پاس کھڑے تھے دونوں کو لپٹا کر سر چومے اور بہت پیار سے کہہ رہا تھا۔

''ایسا ممکن نہیں میاں بیوی میں جھگڑا نہ ہو، ناراضی نہ بنے، بدگمانی نہ آئے، لیکن اسے طویل مت کرنا، عدالت مت لگانا، فوراً اپنے کسی بڑے سے کہنا بس صلح کروادے۔''

وہ کہہ کر آگے بڑھا۔ انٹرنس کے بالکل قریب ردابہ کھڑی تھی، ہائم کو اس کی موجودگی کی قطعاً توقع نہیں تھی، اچھا خاصا چونک گیا۔

''میں مانتی ہوں ہمارا بے لوث رشتہ میری ہٹ دھرمی، میری نام نہاد انا سے ٹوٹا، لیکن یہ بھی سچ ہے ہائم میں نے اس رشتے کے کانچ کے ٹکڑوں سے بڑا درد سہا ہے، اور بڑا درد تمہیں دیا ہے۔ شاید ہی کوئی دن گزارا ہو، جب اس کرب سے جان چھٹی ہو۔ جانے سے پہلے مجھے ایک بار...... صرف ایک بار...... معاف کردو، میں شدت سے چاہنے کے باوجود تمہارے ساتھ کو بھلا نہیں پائی۔ محبت سے بار بار پروپوز کرنے والا ہائم آج بھی کہیں میرے اندر بستا ہے، یہ اذیت میری سانس بھی نکلنے نہیں دے گی۔ پلیز...... پلیز مجھے معاف کردو۔''

''مجھے تم سے کبھی گلہ ہوا ہی نہیں تھا ردابہ۔ ہاں اپنے الفاظ اور تمہاری کم عقلی پر بے حد افسوس رہا۔ اللہ ہمیں سکون دے۔ لوگوں کو خوش رکھنے کی کوشش کیا کرو، اللہ تمہیں خوش رکھے گا۔ اللہ حافظ۔''

ہائم کا شدت سے دل چاہا پیار سے اس کے گال تھپتھپا کر اسے حوصلہ دے، اسے ساتھ لگالے، نہیں تو کم از کم اس کے سلگتے رخساروں پر بہتے آنسو پونچھ دے، مگر یہ حق رہا کہاں تھا، قدم بہت بھاری تھے، مگر کبھی نہ پلٹنے کے لیے مخالف سمت اٹھنے لگے۔ اس کے جاتے قدموں کی تیز تیز دھمک ردابہ کو اپنے دل پر ایسے محسوس ہوئی، جیسے دل پر ایک کے بعد ایک پہاڑ ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہا ہو، اور اس میں اس کا وجود کچلا جاتا تھا۔ اس نے بے جان ہوتے کچلے وجود کو قریب لگی بینچ پر ٹکا لیا۔

ذیاج، منہل میں اب ہمت کہاں بچی تھی بڑھ کر ردابہ کے آنسو ہی پونچھ دیں، سُن سے کھڑے اسے دیکھے گئے۔ آنسوؤں سے کانپتی ردابہ کی پلکوں پر بس ایک خواہش دم توڑ رہی تھی، بس، بس ایک بار ہائم کے ہاتھ کا لمس، بھلے وہ اب اجنبی سہی، یا خواہش گناہ ہی سہی بس، ایک بار، ایک بار ہائم کے ہاتھ کا لمس، اس کی بانہوں کی گرفت۔ اسی بچی کچھی زندگی گزارنے کو خود پر محسوس کرلیتی، کاش۔

تو نے دیکھا ہے کبھی ایک نظر شام کے بعد
کتنے چپ چاپ سے لگتے ہیں شجر شام کے بعد
اتنے چپ چاپ کہ رستے بھی رہیں گے لاعلم
چھوڑ جائیں گے کسی روز نگر شام کے بعد
میں نے ایسے ہی گناہ تیری جدائی میں کیے
جیسے طوفان میں کوئی چھوڑ دے گھر شام کے بعد
شام سے پہلے وہ مست اپنی اڑانوں میں رہا
جس کے ہاتھوں میں تھے ٹوٹے ہوئے پر شام کے بعد
رات بیتی، تو گنے آبلے، اور پھر سوچا
کون تھا باعث آغاز سفر شام کے بعد
تو ہے سورج، تجھے معلوم کہاں رات کا دکھ
تو کسی روز مرے گھر میں اتر شام کے بعد
لوٹ آئے نہ کسی روز، وہ آوارہ مزاج
کھول رکھتے ہیں اسی آس پہ در شام کے بعد!

☆☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... زہرہ
میک اپ .... روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی .... موسیٰ رضا

کنیز زہرہ

انساں صفت

مرسلین طبیعت کی خرابی کی وجہ سے آج جلدی گھر آ گیا تھا۔ بھائیں بھائیں کرتے گھر نے استقبال کیا تو وہ کراہ کر رہ گیا۔ اسے گرم گرم چائے کی طلب ہو رہی تھی۔

اس نے کچھ سوچتے ہوئے قدم سیڑھیوں کی طرف بڑھا دیے۔ پہلی سیڑھی پہ قدم رکھتے ہی ایک سوچ نے اسے رکنے پہ مجبور کر دیا۔ کیا خبر یہ لوگ کہیں گئی ہوں۔ اس نے جیب سے موبائل نکالتے ہوئے عروس کا نمبر ملایا جو دوسری ہی گھنٹی پہ اٹھا لیا گیا تھا۔

''السلام علیکم۔ جی بھائی بولیں؟'' مصروف سے انداز میں کہتے ہوئے عروس کا انداز عجلت بھرا تھا شاید کچھ کر رہی تھی۔

''وعلیکم السلام۔ بولنا کیا ہے؟ میں گھر آیا ہوں تو سارا گھر خالی پڑا ہے کہاں ہو تم لوگ۔ میں اوپر آنے لگا تھا پھر سوچا تم لوگ کہیں گئے نہ ہو۔ میری تو پہلے طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ کیا اپنی نازک ٹانگوں کو زحمت دوں، پہلے فون ہی کر لوں۔'' مرسلین نے اکتائے ہوئے لہجے میں تفصیل سے بتایا تو عروس کھلکھلا دی۔

''ارے نہیں ہم اوپر ہی ہیں۔ آپ بھی اوپر ہی آ جائیں۔ نہیں ہو گی آپ کی ٹانگوں کو زحمت۔ بہت اچھا موسم ہو رہا ہے اس وقت۔'' اسے چڑاتے ہوئے اوپر آنے کا کہہ کر عروس نے جھٹ سے فون بند کر دیا۔ وہ جو اسے نیچے آ کے چائے بنانے کا کہنے والا تھا۔ ایک دم فون بند ہو جانے پہ فون کو کان سے ہٹاتا گھور کے رہ گیا۔ اب اسے ناچار دو منزلوں کی سیڑھیاں چڑھ کے تیسری منزل پہ جانا تھا۔

وہ لوگ پانچ بہن بھائی تھے۔ مرسلین سب سے بڑا تھا جو اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کر رہا تھا۔ پھر عروس تھی جو گریجویشن کے بعد تعلیم کو خیر باد کہہ کر امی سے گھر داری سیکھ رہی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے ہی رخسانہ تائی اسے آزر کے نام کی انگوٹھی پہنا کے جا چکی تھیں۔ عروس سے چھوٹی جڑواں بہنیں فروہ اور حورعین تھیں جو فرسٹ ایر کی طالبہ تھیں۔ جبکہ سب سے چھوٹا علی ابھی آٹھویں میں پڑھ رہا تھا۔

سامنے بچھی چارپائی پہ بیٹھی اماں اور عروس اچار کے لیے چھوٹے سے ٹوکرے سے کچے آموں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر رہی تھیں۔ دوسری چارپائی پہ فروہ ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی اس کے پاؤں کے پاس پیڑھی پہ بیٹھی حورعین اس کا پیڈی کیئر کرنے میں مصروف تھی۔

''السلام علیکم! ہائیں تم لوگ کیا کر رہی ہو۔ مجھے چائے کی طلب ہو رہی تھی اسی لیے تو اتنی جدوجہد کر کے اوپر آیا ہوں۔ چلو فروہ! بہت ہو گیا آرام اٹھ کے چائے بناؤ۔'' خوش گوار لہجے میں سلام کے بعد کہتے ہوئے وہ پاس ہی بچھی تیسری چارپائی پہ نیم دراز ہو گیا۔

''کیا ہے بھائی! چھٹی ریلیکس ہونے کے لیے کی تھی اوپر نیچے پھیرے لگانے کے لیے نہیں کی تھی۔ اب دو دو سیڑھیاں اتر کے نیچے جاؤں وہ بھی بس ایک کپ چائے کے لیے۔'' فروہ کو مرسلین کا آرڈر سن کے جیسے موت پڑی تھی وہ اسے گھور کر رہ گیا۔

"جو بھائی نے کہا ہے فوراً کرو جا کے۔ وہ کب جلدی آتا ہے آفس سے۔ کئی دن سے بے چارے میرے بچے کو نزلہ زکام ہے۔ مرسلین! بخار چیک کرنا تھا۔" فروہ کو گھرک کر ان کی متفکر نگاہیں مرسلین پہ جم گئیں تو وہ اتنی محبت پہ نہال سا ہو گیا۔ جبکہ فروہ نے مدد طلب نظروں سے حورعین کو دیکھا تھا۔

"امی! اس کے پیروں پہ تو موئسچرائزر لگایا ہے ابھی۔ یہ اٹھے گی تو میری ساری محنت اکارت چلی جائے گی۔ میں فارغ ہو گئی ہوں نا میں بھائی کو چائے، تھرمامیٹر اور بخار کی ٹیبلٹ لا دیتی ہوں۔" حورعین نے پیڑھی سے اٹھ کر سامان سمیٹتے ہوئے کہا تو فروہ اس پہ ممنون نظر ڈالتی وہیں چارپائی پہ پاؤں لٹکائے لٹکائے ہی نیم دراز ہو گئی۔ عروس انہیں دیکھ کے مسکرا دی۔ وہ دونوں جڑواں تھیں، جتنا لڑتی تھیں

پیار بھی ان میں اتنا ہی تھا۔

"اچھا مرسلین! میں نے کہا تھا آتے ہوئے اپنی پھوپھو کی طرف سے ہو کے آنا، گئے تھے وہاں؟" نصرت بیگم نے آم کی گٹھلی نکال کر اسے عروس کے حوالے کیا۔ وہ تھک گئی تھیں اس لیے ٹوکے سے ٹکڑے کرنے والی محنت اب عروس کر رہی تھی۔

"جی اماں! گیا تھا۔ انہوں نے آپ کی ایک امانت بھی دی ہے مجھے، یہ لیں یہ کمیٹی کے پیسے اور وہ معذرت کر رہی تھیں۔" اس نے اٹھتے ہوئے جیب سے خاکی لفافہ نکال کر ماں کو تھمایا۔

"ارے! معذرت کیسی۔ کمیٹی میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ یہ کیا کمیٹی تو پورے پچاس ہزار کی تھی یہ تو صرف تیس ہزار ہیں۔" مرسلین کی بات کاٹتے ہوئے انہوں نے پیسے گنے تو چونک گئیں۔ پیسے عروس کو تھما کر اس سے مخاطب ہوئیں۔

"میں آپ کو یہ ہی تو بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ پھوپھو کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی اور ان کی پینشن بھی نہیں آئی تھی اس لیے انہوں نے مجبوری میں کمیٹی میں سے ہاسپٹل کا بل کلیئر کر دیا۔" نصرت بیگم سے نظریں چراتا وہ سچائی بتا گیا۔ اس کی توقع کے عین مطابق نصرت بیگم آگ بگولا ہو چکی تھیں۔ وہ جانتا تھا اب پھوپھو کے ساتھ ساتھ اس پہ بھی نزلہ گرنے والا ہے۔

"لو دیکھو غضب خدا کا۔ نہ پوچھا نہ بتایا لے کے اکٹھا بیس ہزار کمیٹی میں سے رکھ لیا۔ کیسی عورت ہے بھئی۔ اور ایک تم ہو کاٹھ کے الو اٹھا کے تیس ہزار ہی لے آئے ایک بار نہیں پوچھا کہ پھپھی ایک فون کر کے پوچھ ہی لیتیں یا واپس کب کرو گی۔" غصے سے لال بھبھوکا ہوتے چہرے سے وہ مرسلین کو بے نقط سنا گئیں۔

"میں نے پوچھا تھا اماں! ارسل کہہ رہا تھا کہ اچانک ہی پھوپھو کو ہاسپٹل لے جانا پڑا۔ اسی وقت اگر اپینڈیکس کا آپریشن نہ ہوتا تو پھوپھو کی جان کو خطرہ تھا۔ وہ ہاسپٹل میں بھاگ دوڑ کرتا کہ آپ کو فون کر کے اجازت لیتا۔ پھوپھو نے کہا ہے وہ جلد واپس کر دیں گی۔ میں نے تو آپ سے کہا تھا پھوپھو کو دیکھ آتے ہیں مگر آپ ہی کو فرصت نہیں تھی۔" شرمندہ سے لہجے میں بتاتے ہوئے آخر میں شکوے سے پُرنظر ماں پہ ڈالتا وہ گلہ کر گیا۔

"ارے چھوڑو تم ارسل کو بھی ایسی کون سی ہیروں جڑی نوکری ہے جو مل کے نہیں دے رہی۔ یہ ماں بیٹا ایک جیسے ہیں۔ اپنی چادر میں خوش رہنے اور محنت کر کے مقام حاصل کرنے کے بجائے دوسروں کے مال پہ نظر رکھتے ہیں۔" جب سے احمد صاحب نے ارسل کی سالگرہ پہ اسے بائیک گفٹ کی تھی تب سے نصرت بیگم ہاتھ دھو کے اپنی بیوہ نند اور ان کے بیٹے ارسل کے پیچھے پڑی تھیں۔ ان کی بات سن کے جہاں مرسلین بھنا گیا وہیں پاس ہی نیم دراز فروہ بھی کھول کے رہ گئی۔

ارسل خوددار تھا۔ وہ ایک قابل انجینئر تھا، جلد نا سہی بدیر اسے جاب مل جانی تھی پھر وہ پھوپھو کو فروہ کے لیے بھیجنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ نصرت بیگم کا رشتے کو پرکھنے اور نبھانے کا پیمانہ اور تھا جبکہ فروہ کو وہ خاموش پُراعتماد سا ارسل اچھا لگتا تھا۔ احساسات خوشبو کی مانند ہوتے ہیں جو بنا بتائے بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ نصرت بیگم اپنی بیٹی کی خواہش جان کے بھی نظر انداز کر رہی تھیں بس اپنی انا کی خاطر۔

"تمہیں بڑی ہمدردی چڑھ رہی ہے پھوپھو سے؟ ارے مانا کہ تم نے پھوپھو اور باپ کی خواہش پہ سر جھکا کے آرزو سے منگنی کر کے ایک اچھے بیٹے ہونے کا فرض نبھایا ہے۔ اب ایسا بھی کیا ہے کہ تم بالکل ہی ان کے غلام بن کے رہ جاؤ اور اپنی ماں سے ہی سوال جواب کرنے لگو۔" نصرت بیگم اب چٹنی کے لیے بچے ہوئے آموں کے چھلکے اتار کے انہیں باریک کاٹ رہی تھیں۔ جبکہ عروس پاس پڑے جگ سے ٹرے میں پانی انڈیل کے اچار کے لیے کٹے آم دھو رہی تھی۔

"رہنے دیں بھائی! اماں کو تو بس آزر بھائی ہی

اچھے لگتے ہیں، وہ اچھا کماتے جو ہیں۔ حالانکہ وہ بھی ان کی سسرال سے ہی ہیں۔ مگر کیڑے انہیں ہمیشہ پھوپھو کی فیملی میں نظر آتے ہیں۔" فروہ سے ضبط نہ ہوا تو وہ بول اٹھی۔

"ارے رہنے دو تم بی بی! آزر اور ارسل کا کیا مقابلہ۔ کہاں آزر، خاندان کا سب سے لائق فائق قابل لڑکا۔ سونے پہ سہاگا اس کی ٹھاٹھ باٹھ والی جاب۔ کہاں سارے جہاں کا آوارہ گرد ارسل جسے نوکری ہی نہیں مل کے دے رہی۔ بھئی آزر سے عروس کا نصیب جڑنا تو ہماری خوش نصیبی ہے۔ سارے خاندان کی مائیں مرتی ہیں آزر پہ۔"

جوش خطابت میں بولتے ہوئے وہ غلط جملہ کہہ گئی تھیں۔ جہاں مرسلین اور فروہ پیچ و تاب کھا کے رہ گئے وہیں عروس شرما گئی۔

"واہ واہ کیا بات ہے۔ میری اماں کی یعنی آزر بھائی پہ سارے خاندان کی مائیں مرتی ہیں، لڑکیاں نہیں۔" حورعین جو ٹرے میں چائے، کباب، بخار کی ٹیبلٹ اور پانی لے کر آتے ہوئے ان کا آخری جملہ سن چکی تھی، کھلکھلا کر ہنس دی۔

"اوہو میرا مطلب تھا اپنا داماد بنانے کے لیے مرتی ہیں۔" کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے انہوں نے کہا تو فروہ کے علاوہ سب ہنس دیے۔

☆☆☆

نصرت بیگم نے ثروت کے کمیٹی میں سے بیس ہزار رکھ لینے والے جرم کو معاف نہیں کیا تھا۔ وہ کر بھی نہیں سکتی تھیں۔ ثروت کی ہوئی ناانصافی کو وہ بیس ہزار مرتبہ ہر ایک کے سامنے دہرا کر ہی سکون لینے والی تھیں۔ ثروت سے ان کی روایتی چپقلش تھی۔ ثروت ان کی ایک ہی نند تھی۔ زاہد اور احمد صاحب کی لاڈلی بہن۔ قسمت سے غریب گھرانے میں بیاہے جانے کے بعد کچھ اور بھی ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ اس پہ ان کا حق سے آرزو کا رشتہ مرسلین کو دینا اور مرسلین اور احمد صاحب کا سرِ تسلیم خم کر دینا نصرت بیگم کو کھلا تھا۔ وہ اپنی بہو بہت اونچے خاندان سے لانا چاہتی تھیں۔ لیکن احمد صاحب کو کون سمجھاتا اور حیرت تو انہیں مرسلین پہ تھی کیسے فرماں برداری سے اس قبول صورت سی آرزو کے لیے ہاں کہہ دی۔ وہ اس رشتے سے ناخوش تھیں اور اس بات کا اظہار کرنے میں وہ کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی تھیں۔ ابھی بھی کئی دن سے وہ روز آئے گئے کے سامنے پھوپھو کی برائیاں کرتیں جس پہ فروہ اور مرسلین شرمندہ سے ہو جاتے۔ البتہ عروس انہیں حق بجانب سمجھتی تھی۔

اس دن پھوپھو آرزو کے ساتھ رکشہ میں سوار ہو کے چلی آئیں۔ فروہ انہیں لاؤنج میں ہی لے آئی۔ مرسلین ابھی آفس سے نہیں آیا تھا۔ حورعین، علی کو پڑھا رہی تھی جبکہ احمد صاحب بھی اپنے آفس میں تھے۔ عروس رات کے کھانے کی تیاری میں تھی۔ نصرت بیگم انہیں دیکھ کے ایسے بن گئیں جیسے کوئی جان پہچان ہی نہ ہو۔ سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ آرزو فروہ کو دیکھ کے رہ گئی۔ فروہ کو یک لخت سبکی کے گہرے احساس نے اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔

"بھابھی! میں آپ سے ایک درخواست کرنے آئی تھی۔" ثروت نے مدّعا بیان کرنے سے پہلے حسب عادت تمہید باندھی۔

"ابھی تو تم نے میری کمیٹی میں سے پورے بیس ہزار مارے ہیں۔ اب کیا ہوا؟ کیا مانگنے آ گئی ہو۔ دیکھو مہنگائی کا زمانہ ہے مجھے بھی اپنے بھرے پرے خاندان کو چلانا ہوتا ہے، بچے ماشاء اللہ دو کے علاوہ سب پڑھ رہے ہیں۔ تم یہ فرمائشی دفتر اپنے بھائی کے آنے پہ سجایا کرو میرے پاس تو سچ بات ہے فالتو پیسہ نہیں۔" ساگ کے پتے توڑتی نصرت نے پوری بات سنے بنا ثروت بیگم کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"بھابھی میں ایسا کچھ بھی نہیں کہنے والی تھی۔ رہی بات بیس ہزار کی تو وہ میں جلد واپس کر دوں گی۔ آپ مجھ سے بدگمان مت ہوں بس۔ تب بھی اگر احمد بھائی، زاہد بھائی کے پاس اسلام آباد نہ گئے ہوتے تو میں آپ کے پیسے کبھی استعمال نہیں کرتی۔ ارسل نے آپ کو بتانا چاہا تھا مگر آپ کا فون خراب تھا

شاید۔" کمزور لہجے میں وضاحت دیتے ہوئے ثروت بیگم تفصیل سے بتاتی چلی گئیں تو نصرت کو یاد آیا واقعی ان دنوں ان کا موبائل خراب تھا۔

"اچھا اچھا۔ مجھے پتا ہے کیسے واپس کرو گی اب، ایک ایک ہزار کر کے۔ بھئی میں نے رقم گنوائی تھی رقم ہی لوں گی۔ کریانہ جمع کرنے کا شوق نہیں ہے مجھے۔" تنک کر کہتے ہوئے ـــــ ساگ کے نئے بنڈل کی گرہ کھولنے لگیں۔

"مامی! آپ کو آپ کے پیسے پورے ہی ملیں گے۔ اللہ نے بڑا کرم کیا ہے ارسل بھائی کو جاب مل گئی ہے۔ اگلے ماہ ان کی تنخواہ آتے ہی سب سے پہلے آپ کے بیس ہزار ادا کریں گے۔ خدایا محلے کی ہر عورت کو مت کہا کریں، یہ سب وہ آ کے امی سے بات کرتی ہیں اور امی کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔" کب سے خاموش کھڑی آرزو کی برداشت کی حد ختم ہو چکی تھی۔ احترام ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے جب وہ بولی تو عام سا لہجہ سب کچھ واضح کرتا ہوا سا تھا۔ فروہ برداشت کے مراحل سے گزرتی چائے بنانے کے بہانے کچن میں چلی گئی۔

"ثروت! تم نے اپنی بیٹی کو بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی۔" اسے تیکھے چتونوں سے گھورتے ہوئے انہوں نے ثروت سے کہا تو وہ شرمندہ سی ہو گئیں۔

"آرزو! جاؤ جا کر کچن میں دیکھو، فروہ کیا کر رہی ہے۔ میں بات کر رہی ہوں نا۔ تم بڑوں کے بیچ میں مت بولو۔" ثروت بیگم کے لہجے میں سرزنش تھی دفعتاً آرزو کی کٹورہ سی آنکھیں گدلے پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ وہ نظریں جھکائے پلکیں جھپکتے ہوئے آنسو اندر دھکیلتی کچن میں چلی آئی۔

"ارے آرو! تم یہاں کیوں چلی آئیں، میں چائے لا ہی رہی تھی۔" عروس نے مضمحل سی آرزو کو آتے دیکھا تو گال پہ ہاتھ رکھ کے پیار سے پوچھنے لگی۔ وہ سب اسے پیار سے آرو کہتی تھیں۔ تیکھے نقوش کی مالک پرکشش سی آرزو کے اس گھر کی بہو بننے پہ نصرت بیگم کے علاوہ کسی کو اعتراض نہیں تھا۔ وہ سچے دل کی مالک سادہ مزاج لڑکی سب کو ہی اچھی لگتی تھی۔ ابھی بھی عروس کے پوچھنے پہ بس وہ مسکرا کے رہ گئی۔ عروس کوئی جواب نہ پا کے ٹرے اٹھائے لاؤنج کی طرف چل دی۔

"مجھے معاف کر دو آرزو! اکثر امی کا تم لوگوں کے ساتھ رویہ عجیب تر ہوتا ہے۔ مگر میں ہزار کوشش کے باوجود بھی ان کا دل پھوپھو کی طرف سے صاف نہیں کر پاتی۔" غیر مرئی نقطے پر نظر جمائے فروہ اس سے معذرت کرنے لگی۔

"میری پگلی فرو! چھوڑو یہ ساری باتیں، یہ لو مٹھائی کھاؤ۔ ارسل بھائی کو جاب مل گئی ہے اور اس خوشی پہ سب سے زیادہ حق تمہارا ہی تو ہے۔ بھابھی جی جلدی سے منہ کھولو۔" وہ اس کی ہمراز تھی۔ وہ لوگ تقریباً ہم عمر تھیں جیسے وہ مرسلین بھائی کی اور آرزو کی پسندیدگی جانتی تھی۔ ایسے ہی آرزو بھی اپنے اکلوتے بڑے بھائی اور پھولوں جیسی دوست فروہ کے دل کا راز جانتی تھی۔ ابھی بھی وہ اسے چھیڑتے ہوئے اس کا موڈ نارمل کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ مسکرا کر لڈو فروہ کے منہ میں ڈال دیا۔

"کچھ باتیں خدا کی طرف سے ہوتی ہیں اور کتنی بہترین ہوتی ہیں۔ اب پھوپھو نے خود تمہاری اور بھائی کی شادی کی خواہش کر دی۔ اگر بھائی اپنی پسندیدگی امی تک پہنچاتے تو امی کبھی نہیں مانتیں۔" فروہ نے لڈو نگلتے ہوئے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"اللہ تعالیٰ بے شک ہمارے لیے بہترین فیصلے کرتا ہے۔ مگر کچھ مصلحتوں کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان پہ اللہ کی مرضی کا پردہ ڈلا رہے۔ میں نے پھوپھو تک اپنی پسندیدگی پہنچائی تھی تاکہ وہ خود یہ بات لے کے یہ معاملہ سلجھا لیں۔ دوسری صورت میں امی میرے ساتھ آرزو پہ بھی شک کرتیں جو مجھے کسی صورت برداشت نہیں تھا۔" کچن میں آتے مرسلین نے ایک گہری نظر آف وائٹ سوٹ میں ملبوس آرزو پہ ڈالتے ہوئے راز کی بات بتائی تو فروہ مسکرا دی۔ جبکہ شرماتے ہوئے فروہ کی اوٹ میں چھپ گئی

"اچھا جی! اور ہم سب سمجھتے رہے کہ یہ پھوپھو کی خواہش ہے۔ اوئے ہوئے لیلیٰ مجنوں۔ اندر جا رہی ہوں میں، کباب میں ہڈی بننے کا کوئی شوق نہیں مجھے۔ ویسے کوئی بات شات کرنی ہے تو کرلیں پھر اندر آجائے گا۔" کھی کھی کرتی اندر جانے لگی تو اس کا بازو دبوچے کھڑی آرزو بھی اس کے پیچھے ہولی۔

"فروہ کی بچی، زیادہ ہوشیار نہیں ہو گئیں تم۔" کچن سے نکلتے ہی آرزو نے اسے اندر دھکیلتے ہوئے زوردار دھپ لگائی تھی۔ ان کی آوازوں کی بازگشت سنتا مرسلین مسکرا دیا۔ احمد صاحب اس کے ساتھ ہی گھر آئے تھے، اندر سے ان کے قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں، وہ مطمئن سا اندر کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

فاخرہ خالہ کا فون آیا تھا کہ وہ آج چکر لگائیں گی۔ نصرت خاتون کے جیسے پاؤں زمین پہ نہیں ٹک رہے تھے۔ وہ اکلوتی تھیں، ایک مدت وہ بہن کی کمی محسوس کرتی رہیں۔ کالج لائف سے جو فاخرہ سے دوستی ہوئی تو وہ ہی ان کی بہن بن گئیں۔ فاخرہ خالہ تھیں بھی بہت اچھی نیک دین دار سی۔ ان کے آنے سے سارا گھر ہی خوش ہوتا تھا مگر نصرت کو جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل جاتی تھی۔ ان کو کوئی مشکل پیش آتی تھی سارے زمانے سے پہلے وہ فاخرہ سے کہتی تھیں، یہ الگ بات کہ پھر پورے زمانے سے کہتی تھیں۔ دل کی بات دل میں رکھنے کی تو وہ عادی ہی نہیں تھیں۔ ان کے برعکس فاخرہ کبھی کسی سے کچھ نہیں کہتی تھیں نصرت بیگم اکثر ان کے گھر جاتیں تو انہیں ان کی نند، دیورانی یا بھابھی کے ناروا سلوک کی خبر ملتی۔ خیر بھی فاخرہ کی نند، بھابھی یا دیورانی میں سے کوئی دیتی۔ ان کے پوچھنے پہ فاخرہ پردہ ڈالنے کی کوشش کرتیں تو نصرت بیگم عقیدت سے دہری ہو جاتیں۔ ان کے صبر کے قصے وہ بیٹیوں کے سامنے سناتیں اور کہتی جاتیں۔

"بھئی بڑی صابر عورت ہے میری فاخرہ مجھے تو اتنا صابر بننے کا کوئی شوق نہیں کہ لوگ مجھے اپنا غلام ہی سمجھ لیں۔ بھئی میں تو اسے سمجھاتی ہوں۔ مگر وہ سمجھے تب نا۔" نصرت بیگم ابھی بھی یہ کہتے ہوئے لاؤنج کے اور دروازے کے کئی چکر لگا چکی تھیں۔

"السلام علیکم! کیسی ہو نصرت بہن آپ؟" کئی پھیرے لگانے کے بعد نصرت بیگم جب ایک بار پھر دروازے پہ پہنچیں تو فاخرہ بیگم نے انٹری دے ہی دی۔

"وعلیکم السلام! بسم اللہ میری بہن اتنے عرصے بعد مجھ سے ملنے آئی ہے۔ ہو گئی نند کی بیٹی کی شادی؟" انہیں بصد احترام اندر لاتے نصرت بیگم کچن میں کھڑی عروس کو چائے بنانے کا اشارہ کرتی فاخرہ کے ساتھ اندر چل دیں۔ فاخرہ نند کی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں کراچی گئی تھیں۔

"ہاں الحمدللہ ہو گئی بس اللہ تعالیٰ اسے اپنے گھر میں آباد رکھے۔ بھئی میری نند فصیحہ تو ارادہ کر کے آئی تھیں کہ مجھے لے کے ہی جائیں گی اور کوئی بات سنی ہی نہیں انہوں نے۔" سیاہ برقع میں ملبوس لاؤنج کے صوفہ پہ براجمان گوری چٹی رنگت اور پرکشش نقوش والی فاخرہ بولیں تو موتیوں جیسے دانتوں کی لڑی جگمگانے لگی۔ نصرت بیگم اکثر ان کی چمکتی رنگت کو نورانی چہرہ کہتی تھیں۔ عروس چائے کے لوازمات رکھ گئی تھی۔ چائے پیتے ہوئے انہوں نے سامنے رکھی ہر چیز کی تعریف کی۔ حورعین اور فروہ کالج میں تھیں۔ علی اسکول گیا ہوا تھا۔ مرسلین اور احمد صاحب حسب معمول آفس میں تھے۔

"ہاں تو اہمیت دیں بھی کیوں نا۔ ایسی صابر بھابھی ملے گی اسے کہیں۔ بھئی مجھ سے بھی جب بھی ملاقات ہوئی تمہاری تعریف میں اسے رطب اللسان ہی پایا۔ ماشاءاللہ کیا نصیب ہے تمہارا، ایک میں ہوں پورے خاندان کو بس مجھ میں برائیاں نظر آتی ہیں۔" ان کی تعریف کرتے کرتے نصرت بیگم اچانک رنجیدہ نظر آنے لگیں۔

"کیا ہوا خیریت، اتنی پریشان کیوں ہو تم؟" فاخرہ بیگم نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔ اتنے سالوں کا ساتھ تھا محبت تو انہیں بھی تھی نصرت سے۔ اور نصرت تو تھیں ہی اس انتظار میں کہ کب فاخرہ پیار سے پوچھیں اور کب وہ اپنا غم کہیں۔

"ارے کیا کیا بتاؤں میں۔ میری نند نے کمیٹی میں سے پورے بیس ہزار رکھ لیے بہانہ کیا تھا جی اچانک بیمار ہوگئی تھی۔ اوپر سے ٹھیک ہوتے ہی میرے گھر چلی آئی۔ جھوٹی معافی تلافی کے بعد منہ اٹھا کے میری پھولوں جیسی فروہ کا رشتہ اپنے نکھٹو ارسل کے لیے مانگ لیا۔ کہتی کیا ہیں کہ ارسل کو نوکری مل گئی ہے۔ اب اللہ جانے نوکری وہ دوسرے ہی مہینے چھوڑ دے تو پھر۔ ویسے بھی کہاں میری سگھڑ سلیقہ مند خوب صورت سی فروہ اور کہاں قبول صورت ارسل۔" انہیں تفصیل سے بتاتے ہوئے نصرت کے لہجے میں حقارت تھی۔

"اتنی بدگمانی اچھی نہیں، ہوسکتا ہے وہ واقعی بیمار ہوں اور ارسل کو اگر نوکری مل گئی ہے تو وہ نکھٹو کیسے ہوا۔" فاخرہ نے جرح کا سا انداز اپنایا۔

"ارے میری بھولی بہن! تم نہیں جان سکتیں میری پریشانی۔ تم تو ساری زندگی لوگوں کو معاف کرتی آئیں، مجال ہے کبھی محلے کی کسی عورت نے یہ کہا ہو کہ فاخرہ نے اپنی نند یا بھابھی یا دیورانی کے خلاف کچھ کہا ہے۔ تم تو فرشتہ صفت ہو میری بہن! میں اتنے بڑے ظرف کی مالک نہیں۔" دل جمعی سے ان کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے وہ قطعیت سے بولیں تو ایک طنزیہ مسکراہٹ فاخرہ کے تراشیدہ ہونٹوں پہ آکے ٹھہر گئی۔

"یہ ٹھیک ہے کہ میں اپنے رشتے داروں کی برائیاں محلے کی عورتوں میں نہیں کرتی مگر کہیں بھی نہیں کرتی یہ سچ نہیں ہے۔ میں بھی انسان ہوں، دل کی بات دل میں رکھوں تو مر جاؤں۔ تم جانتی ہو جب میری بھابھی میرے ساتھ ناانصافی کرتی ہیں تو میں ان کا گلہ کس سے کرتی ہوں؟" پاؤں جوتوں سے آزاد کرتی وہ صوفے پہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئیں۔

"کس سے کرتی ہو؟" نصرت جو ششدر سی ان کی بات سن رہی تھیں۔ جب بولیں تو ان کے سوالیہ لہجے میں بلا کا استعجاب تھا۔

"اپنی بھابھی سے۔ میری بھابھی نے ایک دفعہ میرا سونے کا سیٹ کھو دیا تھا۔ میں جانتی تھی وہ چھپا چکی ہیں۔ میں بہت دکھی ہوئی تھی کس سے کہتی اس لیے سسرال آتے ہی میں نے اپنی نند کو بتایا۔ اس نے مجھے تسلی دی۔ اس دن کے بعد وہ سمجھتی ہے کہ میری سب سے بڑی رازدار وہ ہے۔ پھر ایک دفعہ میری جیٹھانی نے میری کمیٹی ڈلوانے سے اس لیے انکار کر دیا کہ میں جانے ٹائم پہ دے بھی پاؤں گی کہ نہیں۔ غربت بھی کیسا مذاق ہے نا انسان سے انسانیت کا درجہ ہی چھین لیتا ہے۔" وہ دیوار پہ لگے مصنوعی پھولوں پہ نظر جمائے کہہ رہی تھیں۔ ان کی حسرت زدہ آنکھوں میں ثروت کی آنکھوں سی بے بسی جھلکی تھی۔ وہ شرمندہ سی ہوگئیں۔ جبکہ فاخرہ کہہ رہی تھیں۔

"اس دن بھی میں بہت دکھی تھی۔ جانے دل میں کیا سمائی کہ اٹھ کے میکے چلی آئی۔ اپنی بھابھی سے اپنی جیٹھانی کی خوب برائیاں کیں۔ اس دن کے بعد سے بھابھی کو لگتا ہے کہ میری سب سے بڑی ہمراز وہ ہیں۔ تب کے بعد سے ان کی برائیاں ان سے ہی کرتی ہوں۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ جبکہ سب کی نظر میں، میں صبر بھی کرتی ہوں میری بھابھی میرے سسرال میں میری کوئی بات نہیں کہتیں۔ کیوں کہ وہ میری بہترین ہمراز ہیں۔ میری نند میرے میکے میں خاموش رہتی ہے کیوں کہ رازداری کا مان قائم رکھتی ہے۔ یہ نند بھابھی، دیورانی جٹھانی، ساس بہو، یہ رشتے برے نہیں ہوتے یار! ہم برے یا اچھے ہوتے ہیں۔ میں بھابھی کا معاملہ اللہ پہ نہ چھوڑتی تو کیا کرتی۔ اپنے اکلوتے بھائی کو خود سے بدظن کرتی؟ اور جیٹھانی صاحبہ نے اپنی نظر میں ٹھیک ہی کیا ہوگا ان دنوں واقعی ہمارے حالات دگرگوں تھے۔" آج جیسے انہوں نے اپنا دل کھول کے نصرت کے سامنے رکھ دیا تھا۔ نصرت آج بھی نہ سمجھتیں تو غضب کرتیں۔

"مجھے سمجھ میں نہیں آرہی کہ میں کیا بولوں۔ تم نے تو مجھے لاجواب کر دیا ہے۔" افسردگی سے کہتی نصرت واقعی خود احتسابی کے مراحل سے گزر رہی تھیں۔

"تمہیں کس نے کہا میں فرشتہ صفت ہوں؟

اس دنیا میں کوئی بھی فرشتہ صفت نہیں ہے نصرت بی بی! نہ ہی کوئی شیطان صفت ہے۔ ہم سب انسان ہیں یار اور ہم میں سے بہترین وہ ہے جو صحیح معنوں میں انسان صفت ہے۔ تم لوگوں کو اپنے جیسا انسان سمجھ کے پرکھو گی نا تو وہ بھی تمہیں تمہاری طرح ہی مجبوریوں میں جکڑے ہوئے ہی نظر آئیں گے۔ کیا شادی ہو جانے پہ بہنوں کا حق بھائیوں پہ ختم ہو جاتا ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو تم ہر دوسرے روز اپنے میکے کیوں جاتی ہو، کیا تم عرش سے اتری ہو۔" تلخ لہجے میں کہتے ہوئے وہ پھر پوچھ گئیں۔ شرمندگی میں ڈوبی نصرت کی آواز ہی نہیں نکلی۔

"میری مانو تو ارسل کے رشتے کو ہاں کہہ دو۔ اس دنیا میں غلطیوں سے پاک کوئی نہیں تم بھی نہیں اس لیے لوگوں میں خامیاں ڈھونڈنا بند کر دو۔ لوگوں کے معاملات خدا پہ چھوڑ دو۔ جس کے قبضے میں سب فیصلوں کا اختیار اور ہماری جانیں ہیں۔" بردباری سے کہتی ہوئی فاخرہ، نصرت کی آنکھوں میں دیکھنے لگیں جہاں شرمندگی، ندامت، پچھتاوا کیا کچھ نہیں تھا۔

"کوئی بات نہیں انسان ہیں ہم، غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ تم انہیں سدھارنے کی کوشش کرنا۔ اچھا میں چلتی ہوں اپنا خیال رکھنا۔" ان کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کے تسلی دیتی فاخرہ اٹھ کے کمرے سے نکل گئیں۔ باہر کافی دیر سے کھڑی باتیں سنتی فروہ نے فرط جذبات میں انہیں گلے لگا لیا۔

"شکریہ خالہ! آپ دنیا کی سب سے اچھی خالہ ہیں۔ جیسے آپ نے میرا مقدمہ لڑا ہے ویسے تو میں خود بھی امی کو قائل نہ کر پاتی۔" فروہ نے نم آنکھوں سے کہتے ہوئے انہیں زور سے بھینچا۔

"ارے ارے کیا کرتی ہو لڑکی! بوڑھی خالہ کی پسلیاں توڑو گی کیا؟" گھٹی گھٹی آواز میں کہتی وہ اسے پیچھے کرتی پھر گویا ہوئیں۔

"خالہ بھی کہتی ہو شکریہ بھی کہتی ہو۔ تم میرے لیے میری کشف کی طرح ہو۔ میں کیسے تم سے ناانصافی ہونے دیتی۔ اب اجازت دو کافی دیر ہو گئی ہے گھر چلوں۔ لڑکیاں دیکھ رہی ہوں گی اماں ابھی تک نہیں آئیں۔" مسکراتے ہوئے انہوں نے کہا تو فروہ کی ممنون آنکھیں احساس تشکر کے گہرے احساس سے چھلکی تھیں۔ کچن سے آتی عروس نے حیرت سے اس کے آنسوؤں کو دیکھا جبکہ حور عین بیسٹ آف لک کا اشارہ کرتی فاخرہ کو گیٹ تک چھوڑنے چلی گئی۔

☆☆☆

آج کا دن بہت اجلا تھا۔ کئی دن کے بعد دھوپ نکلی تھی۔ ثروت بیگم صحن میں پھیلی دھوپ میں چارپائی بچھائے بیٹھی مٹر چھیل رہی تھیں۔ آج ناسازی طبیعت کی وجہ سے آرزو کالج نہیں گئی تھی اس لیے چاولوں کی ٹرے لیے وہ بھی وہیں چارپائی پہ آ بیٹھی۔ کل ارسل کو پہلی تنخواہ ملنی تھی وہ میلاد کروانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

ان کے ہاں شروع سے روایت تھی خوشی ہمیشہ اللہ کے نام کی شروعات سے مناتے تھے ابھی بھی اسی سلسلے میں آرزو تھوڑے تھوڑے کر کے چاول چن کے رکھ رہی تھی۔ کل مکس سبزی پلاؤ وہ گھر میں بنانے والی تھی۔ وہ ہر کام ہمیشہ حسب توفیق ہی کرتے تھے۔ اس بار تو ویسے بھی ان پہ بیس ہزار کا قرض تھا۔ ثروت کو بھابھی کی کوئی بات بری نہیں لگتی تھی۔ لیکن اس دن جس طرح نصرت نے ان کے محنتی بیٹے کو نکھٹو کہہ کے رشتہ مسترد کیا تھا اس بات کا انہیں قلق تھا۔

انہوں نے اپنی دونوں اولادوں کو پیٹ کاٹ کاٹ کر پڑھایا تھا۔ ارسل کو انجینئرنگ کرنے کے باوجود نوکری دیر سے ملی تھی۔ شاید ان کے نصیب میں ہی اپنی لاڈلی فروہ کو بہو بنانا نہیں لکھا تھا۔ اس دن بھی رشتے سے انکار کی بات پہ انہوں نے ارسل کی آنکھوں کے بجھتے دیوں کو دیکھا تھا۔

"کیوں انسان کی خواہش تتلی کے پروں جیسی ثابت ہوتی ہے ابھی لگتا ہے کہ ہم بڑھ کے تھام چکے ہیں۔ دوسرے ہی پل لگتا ہے کہ ہم ایک خوش رنگ گمان میں تھے۔ جو چیز ہمیں اپنی دسترس میں لگ رہی تھی وہ تو دراصل ایک سراب تھی۔ اور جو چیز ہماری خواہشات

میں بدرجہ اتم موجود تھی وہ تو ہم سے بے حد دور ہے۔" ابھی بھی دکھی لہجے میں سوچتے ہوئے دو آنسو ان کی آنکھوں سے چھلک کر ان کی شال میں سما گئے۔

"امی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ چھوڑیں آپ یہ سب مت کریں میں ہوں نا، میں کرلوں گی۔" پاس ہی بیٹھی مگن سی آرزو کی نظر پڑی تو وہ بے چین ہو اٹھی ان کے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر ان سے مٹر کی ٹوکری چھیننے لگی۔ وہ اس قدر محبت پہ مسکرا دیں۔

"ارے پگلی کچھ نہیں ہوا مجھے۔ ضروری نہیں ہوتا کہ تکلیف صرف جسم کی ہی ہو۔ کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جو روح تک کو داغ جاتے ہیں۔ ایسے ہی بس ایک خیال آ گیا تھا۔"

"اس خیال کی ایسی کی تیسی جو میری امی کو تنگ کرے۔ مجھے بتائیں کیا خیال آیا ہے؟" ان کے چہرے کی جھریوں میں اٹکے آنسو کے قطرے کو اپنے آنچل سے صاف کرتی آرزو نے جارحانہ انداز میں بازو فولڈ کرتے ہوئے کہا جیسے وہ خیال سامنے آ گیا تو اس سے بھڑ جائے گی۔ ثروت مسکرا دیں۔ تب ہی دروازے پہ اطلاعی گھنٹی بجی۔

"خیال سے بعد میں بھڑ لینا پہلے باہر جا کے دیکھو کون ہے۔" ثروت بیگم نے اس کے کاندھے پہ ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا تو وہ چادر درست کرتی باہر کو ہولی۔

"السلام علیکم! کیسی ہو بیٹا؟" اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ہی ماموں کے ساتھ ممانی کو دیکھ کے حیران رہ گئی سلام کا جواب بھی نہ دے سکی۔

"ارے بلڈوزر کی طرح سامنے کیوں کھڑی ہو اندر نہیں بلاؤ گی ہمیں۔ کیا یہیں پہ حیرت سے بے ہوش ہونے کا ارادہ ہے۔" ماموں اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے حال احوال پوچھنے لگے تب ہی پیچھے سے ظاہر ہوتی حورعین سامنے آ کے اسے چھیڑ گئی۔ مامی بھی اس کے حیران ہونے پہ شرمندہ سی ہو گئیں۔ وہ انہیں لیے اندر کی طرف آ گئی۔

"اماں! دیکھیں آج آپ سے ملنے کون آیا ہے۔" ثروت بیگم کی ان کی طرف پشت تھی وہ پلٹیں تو جیسے ساکت رہ گئیں پھر سنبھل کے فوراً بھائی بھابی سے ملیں۔ نصرت ان کے گھر بہت کم آتی تھیں۔ شاید انہیں یہ تین کمرے کا چھوٹا سا گھر اپنے شایان شان نہیں لگتا تھا۔ آرزو بھاگ کے اندر سے دو کرسیاں لے آئی۔

"خوش رہو کالج نہیں گئیں آج؟" کرسی پہ بیٹھتے ہوئے احمد صاحب نے پوچھا تو ثروت سے باتیں کرتی نصرت بھی متوجہ ہو گئیں۔

"طبیعت ٹھیک نہیں تھی ماموں! اس لیے آج کالج نہیں گئی۔" چاولوں کی ٹرے اٹھاتے ہوئے اس نے بتایا تو احمد صاحب اس کا حال پوچھنے لگے۔

"آرو! چائے بناؤ دیکھ نہیں رہیں ماموں ممانی آئے ہیں۔" خوشی سے کانپتے لہجے میں کہتی ثروت بیگم نے اسے کچن کی طرف روانہ کیا۔ حورعین بھی مسکراتی ہوئی اس کے پیچھے چل دی۔

"ثروت! میں نے ہمیشہ تمہارا دل دکھایا۔ ہمیشہ تمہیں صرف نند سمجھا مجھے آج احساس ہو رہا ہے میں کتنی بڑی غلطی پہ تھی۔ میں فرشتہ نہیں ہوں اور غلطی سے مبرا تو بس وہ ہوتے ہیں نا، مجھے معاف کر دو۔" نصرت بیگم نے ان کا ہاتھ جوڑتے ہوئے کچھ اس لجاجت سے کہا کہ دم بخود ان کے جملے سنتی ثروت نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"بھابی! ایسا مت کہیں مجھ سے خود سو غلطیاں ہوئی ہوں گی۔ معاف کرنے کا حق تو اس پاک ذات کو ہے جو غلطیوں سے بے نیاز ہے۔ میرے بھائی میرے لیے بابا جیسے ہیں بھابی اور آپ میری بڑی بھابی۔ جانتی ہیں نا بڑی بھابی ماں کہلاتی ہے اور آپ مجھ سے معافی مانگ کے مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔" ثروت کے چہرے پہ سکون ہی سکون تھا۔ ان کی آنکھوں میں چمکتی نمی ان کی سچائی کی گواہ تھی۔

"تم بہت اچھی ہو ثروت! میں ہی تمام زندگی تمہیں ہمارے درمیان موجود رشتے کے نام نہاد پیمانے پہ تول کے تمہیں غلط سمجھتی رہی۔" ان کی شرم ساری ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"بس بھابی! اب اور کچھ نہیں کہیے گا اور اگر

واقعی آپ نے میری طرف سے دل صاف کر لیا ہے تو اپنی فروہ میری جھولی میں ڈال دیں۔ میری بڑی خواہش ہے کہ فروہ میری بہو بنے۔" ثروت نے انہیں روکتے ہوئے ان کے سامنے اپنے دوپٹے کا پلو پھیلاتے ہوئے کہا تو نصرت جو یہ سمجھ ہی نہیں پا رہی تھیں کہ بگڑی ہوئی بات اب کیسے سنبھال کے اپنی بیٹی کی خوشیوں سے دامن بھر کے جائیں۔ وہ ثروت کی پھیلی چادر دیکھ کر دلوں کا حال جاننے والے رب کریم کی محبت پہ نہال ہو گئیں۔ وہی تو ہے جو دلوں کے حال جان کر معاف کرتا ہے۔ دھوپ ڈھل رہی تھی جب وہ گھر میں داخل ہوا۔

"فروہ کا نصیب اگر اپنوں میں جڑے تو اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ مجھے پتا ہے تم اسے مجھ سے زیادہ پیار سے ہی رکھو گی مگر میری ایک شرط ہے۔" انہوں نے مسکرا کے کہا تو جہاں ثروت کی مسکراہٹ تھمی تھی وہیں اسی طرف آتے ارسل کے پاؤں لڑکھڑائے تھے۔

"فکر نہ کرو یہ ایسا کچھ نہیں کہنے والی بس ہمیں بیٹی کے بدلے بیٹی چاہیے۔ ہم اب آئیں گے تو مرسلین اور آرزو کی شادی کی تاریخ لے کے جائیں گے۔ ہماری خواہش ہے کہ عروس کے ساتھ ہی مرسلین اور آرزو کا بھی نکاح کر دیا جائے۔ ان ہی دنوں ارسل اور فروہ کی بھی چھوٹی موٹی رسم کر لیں گے۔" احمد صاحب نے کھل کے مسکراتے ہوئے کہا تو سب مسکرا دیے۔

"لیکن بھائی صاحب! آرزو تو ابھی پڑھ رہی ہے۔" ثروت نے خوشی کے گہرے احساس سے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"اوہو تو پڑھتی رہے۔ فروہ بھی تو پڑھ رہی ہے۔ دونوں بچیاں پڑھ لیں پھر شادی کر لیں گے۔" نصرت نے کھلکھلا کے وضاحت کی۔ ارسل تیز قدم اٹھاتا سلام کرتے ہوئے آگے آ کے احمد صاحب کے سامنے سر جھکا گیا۔

"وعلیکم السلام! کیسا ہے ماموں کا شہزادہ؟" پہلے روایتی انداز میں سر پہ ہاتھ پھیرا پھر اٹھ کے گلے لگاتے ہوئے ان کے لہجے میں محسوس کیا جانے والا فخر و انبساط تھا۔ ارسل انہیں کسی طور بھی مرسلین سے کم عزیز نہیں تھا۔

"ٹھیک ٹھاک، آپ سنائیں؟" اماں کے پاس بیٹھ کر مسکراتے ہوئے وہ کھنکتے لہجے میں بولا تو ثروت بیگم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے بیٹے کی بلائیں لیں۔

"الحمدللہ بیٹے میں ٹھیک ہوں۔ شکر ہے اس ذات پاک کا جو لمحہ خیر و عافیت سے گزر جائے وہی غنیمت ہے۔" احمد صاحب نے بیٹھتے ہوئے کہا تو وہ مامی سے حال احوال دریافت کرنے لگا۔

"اچھا ماموں! میں ذرا فریش ہو آؤں۔" کچھ ہی دیر میں اٹھتے ہوئے اس نے اجازت چاہی تو احمد صاحب مسکرا کے سر ہلا گئے۔ وہ ایک ترنگ میں گنگناتا ہوا اندر کی طرف بڑھ گیا۔

"کیا بات ہے جیجا جی! بڑا گنگنایا جا رہا ہے۔" کچن سے لوازمات کی ٹرے تھامے نکلتی حور عین نے اسے چھیڑا تو وہ رک کر بے اختیار قہقہہ لگا بیٹھا۔

"بہت خوش ہوں سالی صاحبہ میں۔ گنگنانے کی بات کرتی ہو۔ میرا دل چاہتا ہے میں ناچنے لگ جاؤں۔ انقلاب آیا ہے آج اماں کو ان کے بھائی بھابھی اور مجھے میری بہن کی بھابھی ملی ہے۔" آفس بیگ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ارسل نے پھر قہقہہ لگایا تھا۔

"یہ خوشی مہنگی پڑنے والی ہے آپ کو۔ میں تو دونوں طرف سے نیگ لوں گی پہلے بہن بن کے پھر سالی بن کے۔ شادی تک اچھی خاصی اماؤنٹ جمع کر لیں۔" حور عین نے لہجے میں شرارت سموتے ہوئے کہا تو اس کے سر پہ ہاتھ رکھتا ارسل سنجیدہ ہوا۔

"تم سب سے پہلے میری بہن ہو پھر کوئی اور رشتہ ہے ہمارا اور بہن کو اپنے بھائی کی جیب پہ پورا پورا حق ہوتا ہے پگلی۔" اسے مان دیتا وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تو حور عین نے لائٹ پنک شرٹ اور بلیک پینٹ میں ملبوس پرکشش سے ارسل کو دور تک دیکھا۔ بے شک دھنک کے رنگوں سے سجے دن دور نہیں تھے۔

☆☆

مکمل ناول

اُمِّ ہانی

میں آج پورے چھ سال بعد اس کے سامنے، اس کے گھر کے لان میں بیٹھا تھا۔ بید کی کرسیاں میرے سامنے بچھی تھیں جن پہ وہ اور فہد ساتھ ساتھ بیٹھے تھے اور میرے برابر کی کرسی خالی تھی کیونکہ مسٹر عقیل اس وقت گھر پہ موجود نہیں تھے سامنے دھری میز پہ چائے کی پیالیوں میں شکر گھولتے ہوئے اس نے درمیانے سائز کی پیالی فہد کی طرف اور بڑے سائز کی میری طرف بڑھائی تھی۔ وہ آج بھی اس بات کو یاد رکھے ہوئے تھی کہ میں چائے معمول سے زیادہ اور بڑی پیالی میں پیتا ہوں۔ نجانے وہ کیا کیا یاد رکھے ہوئے تھی؟ شاید سب کچھ ہی اور اسی بات کو سوچ کر میری رہی سی ہمت بھی رخصت ہو رہی تھی۔ میں نے دکھ سے اسے دیکھا جو سر جھکائے، چائے کی پیالی دونوں ہاتوں سے تھامے چسکیاں بھر رہی تھی۔

فہد معمول کی گفتگو کر رہا تھا۔ اور میں ''ہوں ہاں'' میں جواب دیتا بس اسی پہ نظریں جمائے ہوئے تھا جو بالکل خاموش تھی۔ یوں جیسے اسے ساری گفتگو میں کوئی دلچسپی نہ ہو اور دلچسپی تو مجھے بھی رتی بھر نہ تھی۔ میں تو بس وہاں اس سے ملنے آیا تھا۔ اس سے معافی مانگنے۔ میں نے فہد کو دیکھا اور پھر اسے...... فہد اس سے کوئی آٹھ دس برس ہی چھوٹا ہوگا۔ اسی احساس کے ساتھ میرا دل چاہا کہ چائے کی وہ پیالی حلق میں انڈیلنے کے بجائے میں اپنے اوپر ڈال لوں۔ یہ میں ہی تو تھا جس نے اسے وہاں لا بٹھایا تھا جہاں کی وہ

بالکل مستحق نہیں تھی۔ لیکن دس سال پہلے مجھے یہ سب درست اور وہ اسی قابل لگی تھی۔

"اوکے سر۔ مجھے اجازت دیں۔ میں نے جم جانا ہے۔ پھر ملاقات ہوگی آپ سے۔ کھانا کھا کر جایئے گا۔ سیم! انہیں کھانا کھائے بغیر مت جانے دینا ورنہ بابا ناراض ہوں گے۔ سی یو دین۔" اس نے بھی پرتپاک انداز میں اس سے مصافحہ کیا۔

وہ چلا گیا تو میں اپنی جگہ پہ بیٹھ گیا۔ میں یہ نہیں سمجھ پارہا تھا کہ مجھے بات کہاں سے شروع کرنا چاہیے لیکن اس خاموشی کو کسی نے تو توڑنا تھا اور پھر میں یہاں دس سال بعد آیا ہی کیوں تھا۔ ۔ یقیناً خاموش بیٹھنے کے لیے تو نہیں۔ سو میں نے پیالی میز پہ رکھتے ہوئے بالآخر ہمت کر ہی ڈالی۔

"مجھے بہت پہلے یہاں آجانا چاہیے تھا۔"

"مگر میں تو آپ کے آج آجانے پہ بھی حیران ہوں۔" وہ بنا کسی طنز کے بولی تھی لیکن نجانے کیوں مجھے اس کا کہا جملہ سخت چبھا تھا۔

"دس سال بعد ملنے آیا ہوں تم سے۔" ندامت کے مارے آواز میرے اندر سے پھنس پھنس کر نکل رہی تھی۔

"دس سال، دو ماہ اور بارہ دن۔" اس نے سر جھکائے زیرلب دہرایا۔

"تمہیں اتنا یاد ہے۔"

"مجھے کیا نہیں یاد؟" ایک تمسخرانہ مسکراہٹ نے پل بھر کو اس کے لبوں کو چھوا تھا، جس میں کیا کچھ ابھر کر نہ ڈوبا تھا۔ دکھ، خود اذیتی، شکوہ، تباہی کی داستان اور موجب۔ اس کے سامنے بیٹھا واحد انسان۔ منصور حنان۔

"میں عشوہ کو طلاق دے رہا ہوں۔" قدرے توقف سے میں نے خود کو بولتے پایا۔ اس نے کرنٹ کھا کر مجھے بے یقینی سے دیکھا۔

"اگر آپ یہ سب میری وجہ سے کررہے ہیں تو پلیز مت کریں۔ ایک جذباتی فیصلہ آپ نے دس سال قبل کیا تھا اور مزید ایک اور آپ اب کرنے جارہے ہیں۔"

"میں یہ فیصلہ تمنا کی وجہ سے کررہا ہوں۔ میں سب جان گیا ہوں کہ عشوہ نے کیا ڈرامہ رچایا تھا۔ تمہیں کیسے پھنسایا تھا۔ وہ کیسی ہے مجھ سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ عشوہ ایک اچھی ماں نہیں ہے۔ میری بیٹی کی تربیت اس عورت کے ہاتھوں ہوئی تو وہ بھی اس جیسی ہوجائے گی جو میں نہیں چاہتا۔"

"آپ اب بھی غلط ہیں۔ وہ ایک اچھی عورت ہی نہیں تھی اور یہ بات آپ سے بہتر کون جاسکتا ہے۔"

"سیمی۔" میں نے کچھ الجھتے، کچھ سوالیہ انداز سے اسے دیکھا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے اسے سیماب کے بجائے سیمی کہا تھا۔ آخر اس نے یہ بات کیوں اور کیا سوچ کر کی تھی؟ کچھ تو تھا جو وہ مجھے جتارہی تھی۔

"میں ہمیشہ سے سب جانتی تھی کیونکہ میں آپ کی شادی سے پہلے آپ کا ای میل اکاؤنٹ دیکھ چکی تھی۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر جتاتے ہوئے، نرمی سے بولی۔

☆☆☆

میں اپنی پیدائش کے چھ سال تک اپنے والدین کی اکلوتی اولاد رہا ہوں۔ جو شادی کے چار سال بعد منتوں مرادوں اور بہت علاج کے بعد حاصل ہو۔ میں، منصور حنان، اپنے والدین کی اکلوتی اولاد جس شے پہ ہاتھ رکھتا وہ میری ہوجاتی تھی۔ جس چیز کی ضد کرتا، وہ پوری کردی جاتی تھی۔ کوئی کھانا، کوئی کھلونا، کوئی خواب، کوئی خواہش جس کا میں نام لے لیتا ممکن تھا بھلا کہ وہ حاصل نہ ہوئی ہو۔ میرے لاڈ اٹھانے کو ننھیال اور ددھیال میں ایک پوری فوج موجود تھی اور امی ابو کی شہہ الگ سے تھی جس نے مجھے بہت لاڈلا اور ضدی بنادیا تھا۔ سو یوں پورے چھ سال...... نہیں...... پورے چھ سال، تین ماہ اور دس دن حنان ولا پہ مجھ اکلوتے کی حکومت قائم رہی اور حکومت کرنا بھلا کسے برا لگتا ہے؟ مجھے بھی اچھا لگتا تھا۔

پھر میری اس راجدھانی میں شراکت کرنے وہ چلی آئی۔ جس کی پیدائش کے پہلے دن سے، ہی میں اس

سے نفرت کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ جس کی پیدائش سے پہلے ہی امی اس کا اس طرح سے ذکر کرنے لگی تھیں کہ میں اس سے بری طرح چڑنے لگا تھا۔ اس کے آنے پہ ایسے جشن منایا گیا کہ میں عجیب قسم کے حسد کا شکار ہو گیا۔ گو کہ امی بہت پہلے سے اس کے متعلق میری ذہن سازی کر رہی تھیں کہ میں اس کے وجود کو قبول کر لوں لیکن یہ سب میرے لیے کسی طور آسان نہیں تھا۔

''ہمارے گھر جو بے بی آئے گا وہ تمہارا ہو گا۔'' امی نے میرے ننھے ہاتھوں کو چومتے ہوئے مجھے بتایا۔

''کہاں سے آ رہا ہے وہ بے بی؟'' میں حد درجے حیران ہوا۔

''ہمارا بے بی۔ اللہ جی اسے بھیجیں گے ہمارے گھر۔ پھر وہ ہمارے گھر رہے گا ہمیشہ۔ تمہارا بھائی یا بہن بن کر۔''

مجھے ایسے کسی رشتے کی ضرورت ہی کہاں تھی بھلا؟ میرے لیے امی ابو اور ان کی محبت ہی کل کائنات تھی۔

''لیکن مجھے کسی بے بی کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اللہ میاں کو بولیں، وہ اسے اپنے پاس رکھیں یا کسی اور کو دے دیں۔ ہمیں نہیں چاہیے۔'' میں نے صاف جواب دیا۔

''تم اس سے کھیلنا۔ وہ تمہیں اچھا لگے گا۔'' امی نے پیار سے میرے گالوں کا بوسہ لیا۔

''میرے پاس کھیلنے کو بہت سے کھلونے ہیں۔ مجھے مزید کسی کھلونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے منہ بسورتے جواب دیا۔

میرے دوست بہت تھے میرے ساتھ کھیلنے کے لیے، جو کھیل کر اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے۔ میرے گھر رہ نہیں جاتے تھے، وہ بھی ہمیشہ کے لیے۔

''مگر اس جیسا کھلونا تمہارے پاس کوئی ایک بھی نہیں ہے اور نہ ہی کسی اور کے پاس ہو گا۔''

''مجھے ایسے کھلونے کی ضرورت نہیں ہے جو کسی کے پاس نہ ہو۔'' میں کسی صورت امی کی باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔

پھر امی اکثر بیمار رہنے لگیں۔ وہ کبھی کبھار بستر سے بالکل اٹھتی ہی نہیں تھیں اور کبھی بنا کچھ کھائے ہی الٹیاں کیے جاتی تھیں اور اسی وجہ سے گھر کے کام کاج کے لیے ابو نے ایک کل وقتی ملازمہ رکھ لی تھی۔ امی کا خیال رکھنے کے لیے کراچی سے چھوٹی خالہ آ گئی تھیں۔ چھوٹی خالہ مجھے بہت پسند تھیں اور میں ہمیشہ ان کے آنے پہ امی کے بجائے ان ہی کے پاس سویا کرتا تھا لیکن اس بار جب چھوٹی خالہ نے مجھے یہ کہہ کر اپنے پاس سلانے کی کوشش کی کہ امی بیمار ہیں اور اب سے وہ مجھے اپنے پاس نہیں سلا پائیں گی تو میں ضد میں آ کر چھوٹی خالہ کے پاس سونے سے انکاری ہو گیا۔

''میں امی کے پاس ہی سوؤں گا۔ مجھے آپ کے پاس نہیں سونا۔''

''لیکن ہمیشہ تو تم میرے پاس سوتے ہو نا مونی!''

''ہمیشہ سوتا ہوں۔ اب نہیں سوؤں گا۔ امی بیمار ہیں تو مجھے ان کے پاس سونا ہے تا کہ انہیں کچھ چاہیے ہو تو دے سکوں۔ ان کا خیال رکھ سکوں۔''

خالہ میری بات پہ محض ہنس کر رہ گئی تھیں۔

اور پھر ہوتا کچھ یوں تھا کہ رات کو میں ضد کر کے امی کے پاس سوتا لیکن صبح روز میری آنکھ خالہ کے بستر پہ کھلتی۔ میں چلاتا کہ مجھے یہاں اٹھا کر کیوں لایا گیا ہے لیکن خالہ مجھے بہلا پھسلا کر میرا دھیان بٹانے میں کامیاب ہو ہی جاتی تھیں۔ آخر کو تھا تو میں ایک بچہ ہی۔ پھر بھلے کتنا ہی ضدی کیوں نہ ہوتا؟

پھر وہ دن بھی آ ہی گیا جب ابو رات کے کسی پہر امی کو ہسپتال لے گئے اور میں سوتا ہی رہ گیا۔ صبح اٹھا تو امی کو نہ پا کر خالہ سے سوال کیا۔ خالہ مجھے خوشی خوشی بتانے لگیں کہ میری چھوٹی سی بہنا آئی تو میرا موڈ سخت خراب ہو گیا۔ چھوٹی یا بڑی مجھے کسی بھی قسم کی بہنا کی ضرورت نہیں تھی۔ شاید بھائی ہوتا تو میں وقت کے ساتھ اسے قبول بھی کر لیتا مگر بہن کا بھلا میں نے اچار ڈالنا تھا کیا؟ میری دوستوں میں کوئی بھی لڑکی نہیں تھی اور نہ ہی مجھے ارد گرد لڑکیوں کے ساتھ ان کے گھر گھر،

باجی باجی جیسے بور کھیل کھیلنا پسند تھے۔
"امی کہاں ہیں؟" اسی خراب موڈ کے ساتھ میں نے خالہ سے سوال کیا۔
"امی ابو بہنا کو ہسپتال سے لینے گئے ہیں اور پتا ہے آج نانی بھی آجائیں گی۔" خالہ نے پیار سے مجھے سمجھانا چاہا لیکن اس وقت وہ بھی مجھے سخت بری لگ رہی تھیں۔
"جب میں نے کہا تھا کہ مجھے کوئی بے بی، وے بی نہیں چاہیے تو کیا ضرورت تھی اللہ میاں کو اسے بھیجنے کی اور امی ابو کیوں گئے اسے لینے۔ وہ خود آجاتی۔ اللہ میاں کے پاس سے تو کسی طرح آئی ہی ہے نا۔" اور خالہ کی صورت ایسی تھی کہ وہ ہنسیں یا روئیں۔
"وہ چھوٹی ہے نا مونی۔ اکیلے کیسے آتی، گم جاتی تو؟" خالہ اپنے تئیں مجھے احساس دلانے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن وہ منصور حنان ہی کیا جو دوسرے کے لیے ذرا بھی ہمدردی کا جذبہ دکھا دیتا۔
"تو گم جاتی۔ بس یہاں نہ آتی۔ کوئی اور لے جاتا اسے، لیکن بس یہاں نہ آتی وہ۔" خالہ نے مجھے سمجھانے کی کوشش ترک کر ڈالی۔
مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اس روز سارا دن میں نے ایک ہی کام کیا تھا اور وہ تھا امی ابو کا انتظار۔ نہ میں اسکول گیا، نہ ہی کھیلنے۔ بس منہ بنا کر ایک طرف بیٹھا رہا۔ شام تک امی تو نہ آئیں البتہ کراچی سے نانی اور بڑے ماموں ضرور آگئے۔ میں ان سے بھی خفا خفا رہا۔ سب آنے والی کی خوشی چھوڑ چھاڑ میرا غم لے کر بیٹھ گئے کہ مجھے کیا ہوا۔ اور یہی تو میں چاہتا تھا کہ بس میں ہی ہر ایک کی توجہ کا مرکز رہوں۔ سب مجھے دیکھیں، مجھے پوچھیں، میرا خیال رکھیں۔
رات تک ابو، امی کے ساتھ ساتھ گرم چادر میں لپٹی ایک ننھی سی جان کو بھی لے کر آگئے تھے جسے میں نے دیکھنا تک گوارا نہ کیا۔ میں اس بات پہ حیران تھا کہ امی کو کیا ہوا؟ وہ کیوں اتنی نقاہت کا شکار ہو چلی تھی۔ اس بے بی سے جس کو سب میری بہنا کہہ رہے تھے، مجھے اس لیے بھی چڑ تھی کہ جب سے اس کا ذکر شروع ہوا تھا، امی تب ہی سے بیمار رہنے لگی تھیں اور اب اس کے آنے پہ بھی امی بستر پہ لیٹی تھیں۔ سب نے باری باری اسے اٹھاتے پیار کیا، سوائے میرے۔ سب خوش دکھ رہے تھے، ہنس رہے تھے، اسے چوم رہے تھے، سوائے میرے۔ ایک میں ہی تھا جو حسد، جلن، نفرت کا شکار ہوا جا رہا تھا۔
"مونی۔ یہ دیکھو بہنا۔ ادھر آؤ، دیکھو تو کتنی پیاری ہے۔ بالکل آپ جیسی۔" نانی اسے گود میں اٹھائے چومتے ہوئے مجھے بلا رہی تھیں۔
"مجھے نہیں دیکھنا اسے...... اور اگر یہ اتنی پیاری ہے تو اسے آپ کراچی لے جائیں، ہمیں نہیں چاہیے۔ ہے نا امی؟ ہمیں یہ نہیں چاہیے نا۔" امی کی طرف تائیدی نظروں سے دیکھا۔ امی مجھے دیکھتی رہ گئیں۔ ابو سختی سے بولے۔
"مونی۔ یہ کیا بدتمیزی ہے۔ نانی سے ایسے بات کرتے ہیں؟"
"بس اس بے بی کو آپ ہاسپٹل واپس دے آئیں۔ انہیں کہیں کسی اور کو دے دیں۔ آپ کے پاس میں ہوں نا، آپ کا بیٹا۔ تو آپ کو کسی اور بے بی کی کیا ضرورت تھی؟" میں ابو کی منت کرنے پہ اتر آیا تھا۔ سو ابو بھی نرم پڑ گئے۔
"مونی، بیٹا۔ یہ بہنا ہے نا آپ کی۔ چھوٹی بہنا۔ آپ اس کے بھائی جان ہیں۔ جیسے میں پھپھو کا بھائی جان ہوں۔ جیسے ماموں امی کے بھائی جان ہیں۔ میرے پیارے بیٹے تو آپ ہی ہیں لیکن یہ بھی میری بیٹی ہے۔" ابو پیار سے مجھے بازو میں اٹھاتے ہوئے میرے گال چومتے مجھے سمجھا رہے تھے۔
"مجھے پتا ہے کہ اب سب اسے ہی پیار کریں گے، اسے ہی اٹھائیں گے، اسے ہی لاڈ کریں گے۔ امی اسے اپنے پاس سلائیں گی...... اور مجھے نہ کوئی پیار کرے گا، نہ اپنے پاس سلائے گا۔ مجھے سب پتا ہے، مجھے کوئی پیار نہیں کرے گا اب سے۔" میں چلاتے ہوئے ابو کی گود سے اترا اور بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا گیا اور دروازہ دھاڑ سے بند کر دیا۔ پیچھے میرے نام کی پکار

سب کے لبوں پہ تھی لیکن میں نے کسی کی نہیں سنی۔

☆☆☆

"روبی۔ تمہیں اس بچی کے بجائے مونی پہ توجہ دینا ہوگی۔ وہ ابھی اس کو قبول نہیں کر پا رہا۔ اسے سمجھانے کے ساتھ ساتھ اسی طرح پیار اور توجہ دو، جیسے تم پہلے دیا کرتی تھیں۔ ابھی اسے محض ڈر ہے، تحفظات ہیں کہ اس کی اہمیت سیماب کے آنے سے کم ہو جائے گی۔ اگر اس نے اس بات کو ذرا بھی محسوس کر لیا تو بہت برا ہوگا۔ وہ بہت حساس بچہ ہے اور ایسے بچوں کا خاص طور سے خیال کرنا پڑتا ہے ورنہ اس قسم کی باتوں کا اثر ان کے ننھے سے دماغ پہ بہت برا پڑتا ہے۔" یہ نانی تھیں جو امی کو سمجھا رہی تھیں۔

"اصل میں اتنے سال اکیلا رہا ہے نا تو اسے کسی کے ساتھ کی عادت نہیں رہی۔ وقت کے ساتھ ساتھ سمجھ جائے گا لیکن تمہیں اسے پہلے سے زیادہ محبت اور توجہ دینا ہوگی تاکہ وہ بالکل بھی اس بات کو محسوس نہ کرے کہ اس کے لیے تمہارے پیار میں کسی قسم کی کمی واقع ہوئی ہو۔ تم سمجھ رہی ہو نا؟"

"سمجھ رہی ہوں امی! لیکن وہ کبھی اتنا ضدی نہیں تھا جتنا اب ہو گیا ہے۔ جتنی بدتمیزی وہ اب کر رہا ہے اس نے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ کوئی بات ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا، بس وہی اپنی ضد پہ اڑا رہتا ہے۔ کل حنان اس کے اسکول گئے تھے، وہاں سے بھی اس کی پڑھائی اور رویے سے متعلق شکایات ملی ہیں۔ مجھے تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا ہے کہ اسے کیسے ڈیل کروں؟" امی میری وجہ سے بے حد پریشان تھیں۔

"دیکھو بیٹا وہ یہ سب تمہاری توجہ حاصل کرنے کے لیے ہی کر رہا ہے۔ اس کی اہمیت کسی طور کم نہیں ہوگی۔ سب پہلے کی طرح رہے گا تو وہ خود بخود سمجھ جائے گا اور سیماب کے وجود کو بھی تسلیم کر لے گا۔" امی سر ہلا کر کسی سوچ میں گم ہو گئیں۔

نانی کے سمجھانے کے نتیجے میں امی نے پہلے سے بھی زیادہ میرا خیال رکھنا شروع کر دیا۔ جب تک میں گھر میں ہوتا، امی بھی میرے سامنے سیماب کو نہیں اٹھاتی تھیں۔ نہ ہی اسے پیار کرتیں۔ یہ کام نانی اور خالہ کیا کرتی تھیں۔ رات میں بھی میں امی کے پاس سونے لگا تھا اور سیماب نانی کے پاس۔ سیماب کو نہلانے دھلانے کا کام بھی نانی کیا کرتی تھیں جبکہ میرا سارا کام امی اپنے ہاتھوں سے کیا کرتی تھیں۔ جب کبھی سیماب رو رہی ہوتی تو امی بہت بے چین ہو کر اسے دیکھتیں، تب میں خاص طور سے امی کے تاثرات جانچنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

کبھی کبھار امی اسے اٹھانے کو آگے بھی بڑھتیں کہ اسے بھوک لگی ہوگی لیکن نانی بڑے طریقے سے یا تو انہیں ہٹا دیتیں یا خالہ بڑے طریقے سے میرا دھیان بٹا دیتیں۔ میں سب سمجھتا تھا، لیکن میں نے اب احتجاجاً چیخنے چلانے کے بجائے کچھ نئے طریقے اختیار کر لیے تھے۔ کبھی عین سیماب کے بھوک کے وقت جب وہ رونے لگتی تو میں بھی بھوک کی رٹ لگا دیتا۔ امی ایسے میں کبھی میری طرف دیکھتیں تو کبھی سیماب کی طرف۔ اور بالآخر وہ سیماب کو روتا چھوڑ کر میری بھوک کی رٹ کو خاموشی میں بدلنے کے لیے کچن کی جانب چل پڑتیں اور نانی فیڈر بنا کر سیماب کے منہ میں ٹھونس کر اسے جھلانے لگتیں۔ ساری شام میں امی کو اپنے ساتھ لگائے رکھتا۔ کبھی وہ مجھے ہوم ورک کرا رہی ہوتیں جو سیماب سے پہلے میں خود کرتا تھا لیکن اب مجھ سے ہوم ورک بھی غلط ہونے لگا تھا اور مجھے امی کی مدد درکار ہوتی تھی۔ کبھی میرے ساتھ لڈو، کارڈز، سونا چاندی کھیل رہی ہوتیں جنہیں سیماب کی پیدائش سے پہلے کبھی میں نے منہ بھی نہیں لگایا تھا۔ کبھی مجھے گود میں لیے ٹی وی پہ کارٹون دیکھ رہی ہوتیں جن میں سیماب کی وجہ سے میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

لیکن ایک بات جو میں محسوس کرتا تھا وہ یہ تھی کہ میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی امی کی توجہ سیماب کی طرف ہی رہتی تھی۔ جیسے ان کے کانوں میں بول تو میں رہا ہوں لیکن وہ آواز سیماب کی سن رہی ہوتی تھیں۔ جیسے وہ بیٹھی میرے ساتھ ہوتی تھیں لیکن ان کی نظریں سیماب کی جانب بھٹک رہی ہوتی تھیں۔

جیسے وہ رات کو مجھے ساتھ سلاتیں لیکن رات میں مجھے سوتا چھوڑ کر سیماب کے پاس چلی جاتیں۔ سو اپنی پوری کوشش کے باوجود بھی امی کی محبت اور توجہ کا واحد مرکز "میں" نہیں رہا تھا۔ میں اپنی ساری کوششوں میں ایک ایک کر کے کامیاب ہونے کے باوجود گویا ناکام ہو گیا تھا اور یہی بات مجھے اندر ہی اندر کاٹ رہی تھی۔

☆☆☆

اس روز نانی مجھے اپنے ساتھ کسی رشتے دار کے ہاں لے کر گئی تھیں کیونکہ امی کو سیماب کو انجکشن لگوانے جانا تھا اور ایسے میں امی کا سیماب کے ساتھ ہونا ضروری تھا۔ یہ نانی کا خیال تھا۔ نانی کے ساتھ جانے سے قبل میں یہ بات نہیں جانتا تھا لیکن وہاں فرحت آنٹی کے پوچھنے پہ نانی کے منہ سے اصل بات سن کر میرا پورا وجود آگ کے لپٹوں کی زد میں آ گیا تھا۔ میں نے اسی وقت خود کو کرسی سے جان بوجھ کر نیچے گراتے ہوئے گلا پھاڑ پھاڑ کر رونا شروع کر دیا۔ اس سے میرے آنسوؤں کو نکلنے کا بہانہ بھی با آسانی مل گیا اور مجھے گھر جانے کا رستہ بھی۔ نانی فوراً مجھے لے کر گھر لوٹ آئی تھیں۔ گھر پہنچ کر امی کو نہ پا کر میرے رونے میں مزید تیزی آ گئی اور خالہ نانی کے لاکھ سمجھانے پہ بھی روتا ہی چلا گیا۔ دراصل یہ آنسو میری بے بسی پہ بہہ رہے تھے کہ میں چاہ کر بھی امی کو سیماب سے دور نہیں کر پا رہا۔ دوپہر تک امی ابو سیماب کو لے کر گھر لوٹے تو میں بھاگ کر امی سے لپٹ گیا۔

"کیوں مجھے چھوڑ کر گئی تھیں؟ اس کو لے گئیں اور مجھے چھوڑ گئیں۔" میں زار و قطار روتے ہوئے شکایت کر رہا تھا۔

"موتی بیٹا۔ بہنا کو انجکشن لگنا تھا نا اس لیے لے گئے تھے۔ آپ کو لے کر جاتے تو ڈاکٹر انکل آپ کو انجکشن لگا دیتے۔"

"ہاں تو لگا دیتے، لیکن مجھے ساتھ لے کر جاتیں۔" میری بات سن کر امی ابو نے حیرت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا کیونکہ انجکشن وہ شے تھی جس سے میں بہت ڈرتا تھا اور اب سیماب سے حسد کی وجہ سے میں وہ تک لگوانے کو تیار ہو گیا تھا۔

"آپ کو انجکشن لگتا تو آپ روتے۔ آپ کو درد ہوتا۔ اس لیے نہیں لے کر گئے۔ آپ کو تو انجکشن سے ڈر لگتا ہے نا۔" ابو نے مجھے گود میں لینے کی کوشش کی لیکن میں امی کی گود سے اترنے کو ہرگز تیار نہیں تھے۔

"میں اب بھی تو رو رہا ہوں صبح سے۔ اس سے زیادہ رو رہا ہوں جتنا انجکشن کے وقت روتا ہوں۔ اس سے زیادہ درد ہوا ہے جتنا انجکشن لگنے پہ ہوتا ہے۔ اب میں زیادہ ڈر گیا ہوں ابو۔" میں روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ امی ابو پریشان ہو کر مجھے سن رہے تھے، دیکھ رہے تھے۔ میں نے پہلے بھی ایسا برتاؤ نہیں کیا تھا۔

"ایسے کیوں کہہ رہے ہو؟ ہم آ تو گئے ہیں۔" امی نے میرے گالوں پہ پیار کرتے ہوئے میرے آنسو پونچھے۔

"جیسے آج آپ دونوں مجھے چھوڑ کر گئے تھے اور اسے لے گئے ویسے ہی ایک دن مجھے آپ ہمیشہ کے لیے چھوڑ جائیں گے۔ مجھے پتا ہے سب۔" میں روتے ہوئے ہچکیاں لے رہا تھا۔ امی نے مجھے خود سے بھینچ لیا اور خود بھی رونے لگیں۔ ابو مجھے سمجھانے کی کوشش کرنے لگے۔

"ہم کیوں اپنے بیٹے کو چھوڑ کر جائیں گے؟ ہمارا ایک ہی تو بیٹا ہے۔ اتنا پیارا، بہادر اور لاڈلا۔ کبھی نہیں چھوڑیں گے ابو اپنے بیٹے کو۔"

"اب آپ کو بیٹی کو مل گئی ہے نا۔ میری ضرورت جو نہیں رہی آپ کو۔ میں کسی دن اسکول سے اپنی مس ارم کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ وہ مجھے آپ سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔ میں ان کا بیٹا بن جاؤں گا۔"

"نہیں بیٹا۔ آپ تو ہمارے پیارے بیٹے ہیں۔ سیمی تو بیٹی ہے نا۔ بیٹے تو آپ ہی ہیں اور بیٹوں کی بات الگ ہوتی ہے۔ ان کی جگہ بیٹیاں نہیں لے سکتیں۔" اور ابو کی کہی اس بات پہ میرے بہتے آنسو

تھم گئے تھے اور اس بات نے بچپن سے میرے ذہن میں جگہ بنا ڈالی تھی کہ بیٹوں کی بات الگ ہوتی ہے، ان کی جگہ بیٹیاں کبھی نہیں لے سکتیں۔ یہ میری سیماب پہ برتری کا پہلا احساس تھا جو ابو نے مجھے دلایا تھا اور جو پھر ساری زندگی شدید تر ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

نانی اور خالہ بھی بھلا کب تک ہمارے ہاں رہتیں۔ انہیں کبھی تو جانا ہی تھا اور امی اسی بات کو لے کر پریشان تھیں کہ ان کے جانے کے بعد کیا ہوگا کیونکہ اب تک نانی ہی سیماب کو سنبھال رہی تھیں اور خالہ، امی دونوں مل کر مجھے۔

''روبی ہم ساری زندگی تو تمہارے پاس نہیں رہ سکتے۔ اتنے مہینوں سے یہیں پڑے ہوئے ہیں۔ پیچھے زہرہ بھی اکیلی کیسے گھر کو سنبھالے گی۔ تمہیں اب اکیلے ہی مونی اور سیمی کو سنبھالنا ہوگا۔

''مگر کیسے امی؟ آپ نے دیکھا نہیں ہے کہ یہ مجھے سیمی کے پاس بھی بھٹکنے نہیں دیتا۔ ہتھے سے ہی اکھڑنے لگتا ہے، مجھے اس کے آس پاس دیکھ کر بھی۔ میں کیسے دونوں کو اکٹھے دیکھوں گی۔ اچھا آپ نہیں رک سکتیں، تو ثمینہ کو رہنے دیں میرے پاس۔''

''تمہاری سب باتیں ٹھیک ہیں لیکن کوئی بھی ساری زندگی تو تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا نا۔ تمہیں اپنے بچوں کو خود پالنا ہے۔ خود بڑا کرنا ہے۔ ۔ ویسے بھی مونی کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جتنی تم اس کی ماں ہو اتنی ہی سیمی کی بھی ہو۔

''تمہیں ہی اسے حقیقت کا سامنا کرنے کے قابل بنانا ہوگا۔ تم یہ کر سکتی ہو کیونکہ یہ اتنا بھی ناممکن نہیں، جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے۔ تم اس کی ماں ہو، وہ تمہارا باپ نہیں ہے۔ ماں باپ بچوں کو اپنے حساب سے چلاتے ہیں نا کہ بچوں کے حساب سے خود چلنے لگتے ہیں۔'' امی خاموش تھیں۔

''مونی کو آہستہ آہستہ احساس دلاتی رہو کہ سیمی اس کی چھوٹی بہن ہے اور بڑے بھائی بہنوں کا خیال رکھتے ہیں۔ تم روزانہ اس کی ذہن سازی کرو گی تو بالآخر وہ سیمی کی طرف مائل ہونے لگے گا۔ اسے قبول کرنے کے ساتھ پیار بھی کرنے لگے گا۔ بس اس سارے کے دوران کبھی مونی کو نظر انداز مت ہونے دینا۔'' امی بس نانی کو دیکھ کر رہ گئیں۔

''انسان کا بچہ پالنا جہاد کرنے کے برابر ہے بیٹا۔ سب کاموں میں سب سے افضل یہی ایک کام ہے کہ انسان کو انسان کی تربیت پہ مامور کیا گیا ہے۔ ماں کی گود میں ایک نسل سنوارنے کے لیے ڈالی جاتی ہے۔ اب ماں پہ ہے کہ وہ اسے محنت اور محبت سے سنوار دے یا کم ہمتی اور لاپروائی سے بگاڑ دے۔''

نانی سامان باندھ رہی تھیں تو میں بھی ان کی مدد کروا رہا تھا۔ سامان باندھتے ہوئے میں نے نانی سے پوچھا۔

''آپ کو چھوٹے بچے اچھے لگتے ہیں نانی؟''

''چھوٹے بچے تو سب کو ہی اچھے لگتے ہیں۔ مجھے بھی لگتے ہیں۔''

''لیکن مجھے تو نہیں لگتے۔ میں نے اپنی ذہین آنکھوں سے نانی کو دیکھتے ناک سکوڑی۔

''تو آپ یوں کیوں نہیں کرتیں کہ سیماب کو اپنے ساتھ لے جائیں کیونکہ آپ کے پاس تو کوئی چھوٹا بچہ نہیں ہے اور یوں بھی آپ ہی کہتی ہیں کہ وہ آپ کی بیٹی ہے اور پھر آپ کو پسند بھی ہے۔ جب بڑے ہو کر مجھے لگا کہ مجھے چھوٹے بچے اچھے لگتے ہیں تو ہم اسے واپس لے آئیں گے۔'' نانی میری بات سن کر مجھے دیکھتی رہ گئیں، پھر میرا ہاتھ تھام کر مجھے برابر بٹھاتے ہوئے بولیں۔

''بچے ہمیشہ اپنے ماں باپ کے پاس رہتے ہیں۔ خاص کر چھوٹے بچے۔ اور اس کے امی ابو تو یہاں ہیں نا تمہارے پاس تو پھر وہ وہاں کیسے رہے گی اتنی دور؟''

''اسے کیا پتا کہ اس کے ماں باپ کون ہیں؟ وہ تو ابھی کسی کو پہچانتی بھی نہیں ہے اور نہ بولتی ہے۔ بس اسے رونا آتا ہے اور کچھ نہیں۔ آپ اسے لے جائیں

گی تو وہ کوئی میری طرح روئے گی تھوڑا کہ اسے امی کے پاس جانا ہے۔ یہاں بھلا کون سا امی اسے دیکھتی ہیں۔ اچھا ہے آپ اسے لے جائیں تو سب خوش رہیں گے۔ ہم سب بھی اور وہ، آپ سب بھی۔" میں نے نانی کو گویا لاجواب کر دیا تھا۔ وہ پھر کافی دیر تک خاموش ہی رہیں اور میرے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے سوچتی رہیں۔

"مونی۔ کیا سیمی تمہیں بالکل اچھی نہیں لگتی؟" کافی دیر بعد انہوں نے سوال کیا۔

"بالکل بھی نہیں۔ ایک قطرہ بھی نہیں۔" میں نے یوں منہ بنایا گویا کارمینا کی گولی نگل لی ہو۔

"اس میں اچھا کیا ہے؟ رونے اور سونے کے علاوہ وہ کرتی بھی کیا ہے کہ مجھے اچھی لگے۔ جب وہ روتی ہے تو میرا دل کرتا ہے اس کے منہ میں کچھ ٹھونس دوں اور جب وہ سوتی ہے تو دل کرتا ہے کہ وہ سوتے سوتے میں مر جائے اور پھر کبھی نہ اٹھے۔ اتنی بری لگتی ہے وہ مجھے۔" میں نے صاف اپنے جذبات کا اظہار کیا تو نانی کے میرے بالوں میں چلتے ہاتھ وہیں ساکت ہو گئے اور وہ پتھرائی نظروں سے مجھے بس دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

نانی اور خالہ کے جانے کے بعد بھی امی مجھے اپنی بھرپور توجہ دیتی تھیں لیکن اب سیماب کو بھی انہیں دیکھنا پڑتا تھا گو اس سلسلے میں ابوان کے ساتھ پورا تعاون کر رہے تھے لیکن بہت جگہوں پر ابو ہتھیار ڈال دیتے۔ رات کو سیماب ابو کے ساتھ سوتی تھی۔ صبح تو میں اسکول چلا جاتا تھا تو یقیناً امی سیماب کو سنبھالتی تھیں لیکن شام میں میرے لوٹنے کے بعد ابو ہی سیماب کی دیکھ بھال کرتے پائے جاتے تھے۔ ویسے تو ابو کا سیماب کو سنبھالنا بھی مجھ پہ ناگوار گزرتا تھا لیکن امی کے مقابلے میں نسبتاً خاصا کم۔ ابو نے اپنی ساری مصروفیات سیماب کی نذر کر ڈالی تھیں۔ آفس کے بعد جم جانا، دوستوں سے ملنا، ٹی وی پہ اپنے من پسند پروگرام دیکھنا۔ ان کی زندگی اب دو چیزوں کے گرد گھومتی تھی، آفس اور سیماب...... اور یہ چیز مجھے بہت تنگ کرتی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ میں امی پہ ایک نئے عذاب کی صورت میں نازل ہوا۔ جوں ہی امی کا دھیان اپنے کسی کام کی جانب ہوتا میں فوراً سے سیماب کے سر پر پہنچ جاتا۔ کبھی اس کو زور کی چٹکی کاٹ کر بھاگ جاتا اور وہ سوتے سے جاگ کر یک دم رونے لگتی۔ امی کو یہی لگتا کہ وہ سوتے میں ڈر گئی تب ہی رو رہی ہے۔

پھر جب سیماب نے کروٹ لینا شروع کر دی تو امی اس کے اردگرد بہت سے تکیوں کی باڑھ بنا کر جاتیں جسے وہ بے چاری تو کبھی نہ ہٹا سکی البتہ میں جو موجود تھا ہٹانے کے لیے۔ سو نہ صرف میں تکیے ہٹا جاتا بلکہ اسے جان بوجھ کر بستر کے کنارے پہ بھی لٹا جاتا تاکہ اگلی کروٹ لینے پہ وہ سیدھا نیچے ہو اور ہوتا بھی ایسا ہی تھا۔ کچھ دیر بعد ہی اس کے گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے کی آواز پہ امی بھاگ کر اس کی جانب لپکتیں لیکن تب تک میں اپنا کام دکھا کر ایسا لاتعلق بنا اپنے کام میں محو ہو جاتا کہ امی مجھ پہ شک کی کوئی وجہ ڈھونڈ ہی نہیں پاتی تھیں۔

پھر جب اس نے قدم قدم چلنا شروع کیا تو یہ میں ہی تھا جس کی بدولت اکثر وہ اپنے واکر سمیت سیڑھیوں سے نیچے پڑی ہوتی۔ کبھی جسم کے مختلف حصوں پہ خراشیں ہوتیں تو کبھی بدن کے کسی حصے پہ نیل پڑا ہوتا۔ اس سب کے باوجود صحیح سلامت بھی اور سارے گھر میں اس کی قلقاریاں گونجتی تھیں جو مجھے کاٹنے کو دوڑتیں۔ آخر وہ کتنی ڈھیٹ تھی کہ اسے میرا اٹھایا کوئی قدم بھی زیادہ نقصان نہیں پہنچا پاتا تھا۔

"جی امی۔ اب تو مونی کی طرف سے مجھے بڑی تسلی ہے۔ اب وہ بالکل بھی مجھے پہلے کی طرح تنگ نہیں کرتا، نہ ہی ضد کرتا ہے۔ ہاں یہ ہے کہ سیمی کے قریب بھی نہیں پھٹکتا مگر ہمارے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ اب وہ پہلے جیسا بی ہیو نہیں کرتا۔" اس روز میری معصوم امی نانی کو فون پہ بتا رہی تھیں اور میں دل

ہی دل میں ان کی سادگی سے محظوظ ہو رہا تھا کیونکہ انہیں معلوم ہی نہیں ہو سکا کبھی کہ میں ان کی بیٹی کے ساتھ کیا کرتا پھرتا ہوں۔

"مونی۔" ایک روز ہوم ورک کراتے ہوئے امی نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے پکارا۔ میں نے سر اٹھا کر ان کی جانب دیکھا تو مجھ سے پوچھنے لگیں۔

"تم سیمی کو سیماب کیوں بلاتے ہو؟" یہ سچ تھا کہ میں نے سیماب کو آج تک کبھی غلطی سے بھی سیمی نہیں بلایا تھا۔ میں اسے ضرورت پڑنے پہ سیماب پکارتا تھا یا امی کی طرف دیکھ کر کہہ دیا کرتا تھا کہ "آپ کی بیٹی نے یہ کیا، آپ کی بیٹی رو رہی ہے" وہ کبھی میرے لیے سیمی یا میری بہن نہیں بن سکی۔

"آپ نے اس کا جو نام رکھا ہے، میں اسی سے پکاروں گا۔" میں اپنا کام کرنے کے دوران بڑی رسانیت سے بولا۔

"ہاں لیکن ہم سب تو اسے سیمی بلاتے ہیں۔"

"آپ سب اسے پیار سے سیمی بلاتے ہیں جبکہ مجھے اس سے کسی قسم کا پیار نہیں ہے۔" میرے جواب پہ امی ٹھٹکی تھیں۔

"تمہیں اب بھی وہ بری لگتی ہے؟"

"مجھے وہ بری نہیں...... زہر لگتی ہے۔" امی کو صاف جواب دیتے میں اپنا کام کرنے لگا اور میرے جواب نے پھر امی کو کوئی کام نہیں کرنے دیا۔ انہیں جو یہ لگنے لگا تھا کہ میں نے ان کی بیٹی کے وجود کو قبول کر لیا ہے تو ان کی اس خوش فہمی سے میں انہیں باہر نکال لایا تھا۔

☆☆☆

میں امی کا لاڈلا تھا تو سیماب ابو کی۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ وہ امی کی نسبت ابو سے زیادہ قریب تھی۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ ہمیشہ سے میں نے اسے امی کے قریب ہی نہیں ہونے دیا۔ نہ ہی میری وجہ سے ایسی کوشش امی نے کبھی کی تھی۔ ویسے تو اسے ابو کے قریب بھی نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن یہاں شاید مجھ سے چوک ہو گئی تھی۔ میں ساری کوششیں اسے امی سے دور رکھنے کی کرتا رہا تھا اور نتیجتاً وہ ابو کے قریب ہو گئی تھی جس کا احساس مجھے اب ہو رہا تھا۔

اس روز ابو اسے گود میں اٹھائے باہر لان میں بیٹھے ہوئے تھے اور اسے گدگداتے مختلف قسم کی نظمیں سنا رہے تھے تو میں مارے حسد کے ابو کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میری اسکول سے گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اور ہوم ورک میں تقریباً ختم کر چکا تھا۔

"مجھے کہانی سننا ہے۔" میں نے غصے سے منہ پھلاتے ہوئے ابو سے کہا۔

"لیکن یہ اسٹوری ٹائم نہیں ہے۔"

"یہ پوئمز ٹائم بھی نہیں ہے۔"

"کہانی تو تم امی سے سنتے ہو نا وہ بھی رات کو۔"

"لیکن مجھے ابھی اور اسی وقت سننا ہے۔ وہ بھی آپ سے۔ اسے نیچے اتاریں۔ یہ اب چل سکتی ہے اور مجھے گود میں بٹھا کر کہانی سنائیں۔" میں کسی ضدی بچے کی طرح سیماب کو ان کی گود سے پرے کرنے لگا۔

"آرام سے مونی۔ یہ گر جائے گی۔" ابو نے نرمی سے میرا ہاتھ پرے کیا۔

"تو گر جائے...... ویسے بھی یہ سارا دن گرتی ہی رہتی ہے۔" مجھے مزید غصہ آنے لگا۔

"تمہاری بہن ہے یہ۔ چھوٹی بہن کو ایسے کہتے ہیں کیا؟" ابو نے سختی سے کہتے مجھے گھورا۔

"میری کوئی بہن وہن نہیں ہے۔ یہ صرف آپ کی اور امی کی بیٹی ہے۔ آپ لوگوں کو ضرورت تھی تو اللہ میاں سے اسے لے آئے۔ مجھے تو کوئی ضرورت نہیں تھی۔" ابو نے سیمی کو گود میں اٹھائے اٹھائے ہی اسے سامنے لگے جھولے پہ بٹھا کر اس کی سیٹ بیلٹ باندھ کر اسے جھولا دیا اور واپس آ کر میرے برابر میں بیٹھ گئے۔ میرا موڈ سخت خراب ہو چکا تھا۔

"تم کیوں سیمی سے اتنا چڑتے ہو مونی؟ کیا وہ تمہیں ذرا سی بھی اچھی نہیں لگتی؟" وہ پیار سے مجھ

سے پوچھ رہے تھے۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ابو نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

''بھائی تو بہنوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ کیا کبھی تم اس کی حفاظت کرو گے؟'' ابو جیسے کہیں کھوئے کھوئے سے انداز میں بظاہر پوچھ مجھ سے رہے تھے، لیکن دراصل یہ سوال ان کا خود سے تھا۔

''میں اس کا گارڈ نہیں ہوں۔'' میں نے برا سا منہ بنایا۔ ابو نے سرد نگاہوں سے مجھے دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولے۔

''اللہ ہی تمہیں ہدایت دے تو دے مونی کہ تم سب دیکھ سکو، سمجھ سکو۔ میری دعا ہے کہ وہ وقت جلدی آجائے ورنہ کہیں تم کوئی بڑا نقصان نہ کر بیٹھو۔''

اور ابو کی دعا قبول ہوتے ہوتے اتنا وقت گزر جانا تھا، یہ اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

ابو کی سیماب کے لیے اس قدر فکر مندی نے مجھے پہلے سے زیادہ حاسد بنا ڈالا تھا اور اسی آگ میں جلتے ہوئے میں ایک روز اسے اٹھا کر باہر لے گیا تھا، وہ بھی امی کو بغیر بتائے یا ان سے پوچھے۔ گھر سے خاصے فاصلے پہ لا کر میں اسے ایک طرف بنے نالے کی ریلنگ تک لے آیا اور اسے وہیں چھوڑ دیا۔ اب میں یوسفؑ کے گیارہ بھائیوں کی طرح اتنا ظالم بھی نہ تھا کہ اسے کنویں میں پھینک دیتا۔ یوں بھی میں کنواں کہاں سے تلاش کرتا۔ وہ سفید سا فراک پہنے، سر پہ دو چھوٹی چھوٹی پونیاں بنائے، وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے مٹی اڑاتے ہوئے کھیلنے لگ گئی تھی۔ ساتھ ساتھ مجھے دیکھتے ہوئے ہنستی گویا وہ وہاں بیٹھنے اور کھیلنے سے محظوظ ہو رہی ہو۔ آہستہ آہستہ میں اسے دیکھتا ہوا الٹے قدموں واپس پلٹنے لگا تھا۔

''بھا۔'' وہ ہنستے ہوئے مجھے دور جاتا دیکھ کر بولی تو میرے قدم وہیں رک گئے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ان لفظوں میں کیا تھا لیکن ان کی کشش ثقل نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ میں ایک قدم مزید پیچھے نہ ہٹ سکا۔ کیا وہ بولتی تھی؟ اگر ہاں، تو اب تک میں اس بات سے ناواقف کیوں تھا۔ اگر نہیں تو اس نے جو پہلا لفظ بولا تھا وہ میرا اس کا رشتہ تھا۔ ''بھا'' یعنی بھائی...... جو امی اکثر اسے سکھاتی تھیں کہ بھائی بولو۔ یہ بھائی ہے...... مونی بھائی۔ لیکن وہ کبھی نہیں بولی تھی۔ اب بولی بھی تو کہاں آ کر کہ مجھ سے قدم بڑھانا مشکل ہو گیا۔

''کیا کبھی تم اس کی حفاظت کرو گے؟'' ابو کا سوال مجھے واپس لوٹنے پہ مجبور کرنے لگا۔ میں یوسفؑ کے بھائیوں سا کیسے ہو سکتا تھا؟ میں اس کا سوتیلا بھائی تو نہیں تھا تو پھر کیسے اسے کنویں میں پھینک کر جا سکتا تھا۔ میں اپنے ہی ابو کو یعقوبؑ کیسے بنا سکتا تھا جو اس کی جدائی میں روتے روتے بینائی کھو دیتے۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ وہ اپنے ننھے وجود سمیت مجھ سے لپٹ گئی اور میں نجانے کس کیفیت میں اسے اٹھائے گھر لوٹ آیا۔

''کہاں چلے گئے تھے۔ تم مونی، سیمی کو لے کر۔ میں بہت پریشان تھی۔'' مجھے داخل ہوتے ہی امی نے سیماب کو فوراً مجھ سے جھپٹنے والے انداز میں اٹھا لیا اور اسے ٹٹولنے لگیں کہ کہیں میں نے اسے کچھ کر تو نہیں دیا۔ میں خاموشی سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

''امی۔ کیا یہ بولتی ہے؟'' میں نے اسے دیکھتے امی سے پوچھا۔ امی نے حیرت سے میری جانب دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔

''لیکن آج اس نے مجھے ''بھا'' بلایا ہے۔'' میں نے ستے چہرے سے امی کو بتایا۔ امی نے خوش ہوتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

''بولو بھائی...... مونی بھائی...... بولو۔''

''بھا......'' اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو امی خوشی سے گویا پاگل ہی ہو گئیں۔

''دیکھو مونی۔ یہ تمہیں بلا رہی ہے...... بھا کہہ رہی ہے...... میری بیٹی نے آج پہلا لفظ بولا ہے...... اپنے بھائی کو بلایا ہے۔''

اور یہی بات تو مجھے کاٹ رہی تھی کہ اس نے پہلا لفظ اس انسان کے لیے، اس رشتے کے لیے بولا

جس نے کبھی اسے قبول ہی نہیں کیا۔ میں امی کو خوش وہیں چھوڑ کر پھر سے باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

جوں جوں سیماب بڑی ہو رہی تھی، وہ میری توجہ چاہنے لگی تھی۔ بھا کھلائے گا...... بھا سلائے گا...... بھا میرے ساتھ کھیلے گا...... بھا مجھے باہر لے کر جائے گا...... میں بھا کے ساتھ سوؤں گی۔ اس کی اس قسم کی فرمائشوں کی میں قطعاً پروا نہیں کرتا تھا لیکن جب بھی وہ ایسی معصومانہ ضد کرتی تھی تو امی ابو میں سے جو بھی وہاں موجود ہوتا، میری طرف بغور ضرور دیکھتا شاید یہ جانچنے کے لیے کہ میں کیسا تاثر دوں گا۔ اور میں سپاٹ چہرہ لیے، اس کی فرمائش کو مکمل نظر انداز کر کے یوں اپنے کام میں لگا رہتا جیسے میں نے تو کچھ سنا ہی نہیں ہے۔ جیسے میں خاص اس وقت بہرا ہو جاتا ہوں، جب وہ میرا نام لے کر کوئی بات کرتی ہے یا مجھے بلاتی ہے۔ بس ایک لمحے ابو امی میری طرف دیکھا کرتے اور جب میں کسی قسم کا [illegible] عمل ظاہر نہ کرتا تو وہ سیماب کو بہلا لیا کرتے تھے۔ وہ میری طرح ضدی نہیں تھی کہ ایک بات کو پکڑ کر بیٹھ جاتی۔ وہ بہت جلد اور با آسانی بہل جایا کرتی تھی مگر نجانے کیوں میں، میں اپنے اندر کہیں بہت شرمندگی محسوس کرتا تھا۔ گو کہ میں جلد اس کیفیت سے باہر نکل آتا تھا

پھر میں نے قدم قدم پہ اس سے چھیننا شروع کر دیا۔ امی جب بھی ہمیں کچھ بنا کر دیتیں، میں اس کے حصے کا بھی ہڑپ کر جاتا۔

ابو کبھی ہم دونوں کے لیے کچھ خرید کر لاتے تو ضد کر کے دونوں ہی لے لیتا تھا پھر ابو نے ہم دونوں کے لیے ایک جیسے کھلونے، ایک جیسی چیزیں لانا شروع کر دیں تاکہ میں ضد نہ کر سکوں تو میں اس کے حصے کی چیز چپکے سے توڑ ڈالتا یا چھپا دیتا تھا تاکہ وہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ایسے کام میں اتنی ہوشیاری سے کرتا تھا کہ کبھی پکڑا نہیں گیا۔

☆☆☆

سیماب نے اسکول جانا شروع کیا تو ہماری اس مقابلے بازی کا ایک نیا دور شروع ہوا جس میں کبھی وہ شامل ہی نہیں تھی۔ یہ مقابلہ تو سراسر میری جانب سے تھا۔ وہ مجھ سے کہیں زیادہ قابل اور ذہین تھی اور یہ ایک اور پہلو تھا جس سے میں اس سے حسد کا شکار ہو چلا تھا۔ گو کہ میں کسی طور پہ بھی ذہانت میں اس سے کم نہ تھا لیکن وہ بس ایک قدم ہی سہی، مگر مجھ سے آگے ضرور تھی۔ وہ اسی اسکول میں داخل ہوئی تھی جہاں سے میں نے اپنی بنیادی تعلیم حاصل کی تھی اور اسے بہت سے اساتذہ وہی ملے تھے جو میرے ہوا کرتے تھے۔ جب ابو گھر آ کر یہ بتایا کرتے کہ میرے ہی استاد ان کی بیٹی کی تعریف ان کے بیٹے سے زیادہ کرتے ہیں تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ گو کہ انہوں نے کبھی بھی یہ بات میرے سامنے نہیں کی تھی، وہ گھر کے کسی کونے کھدرے میں امی کو یہ بتا رہے ہوتے تھے کہ میری فلاں مس نے کہا ہے۔

”یوں تو یہ بھی منصور کی طرح ذہین اسٹوڈنٹ ہے لیکن یہ اس کی نسبت اپنی اسٹڈیز میں زیادہ سیریس ہے اور اس کی ہینڈ رائٹنگ بھی منصور سے زیادہ اچھی ہے۔“

اور اس دن لازمی طور سے یا تو امی ابو سیماب کو سوتے میں چلاتے ہوئے پاتے یا اس کا کوئی پسندیدہ لباس، جوتا، بیگ، کتاب میرے ہاتھوں تباہ ہو جاتا۔ اپنے اندر کی جلن مجھے کسی شے کو جلا کر تو نکالنا ہوتی ہی تھی۔ سیماب نہ سہی، اس کی من پسند چیزیں ہی سہی۔ آخر میں ہی اندر سے کیوں جلتا رہتا، یہ آگ اس تک بھی تو پہنچنا چاہیے تھی نا۔ لیکن جب کبھی اس کی کوئی شے جلی ہوئی، ٹوٹی ہوئی، پھٹی ہوئی پائی جاتی امی تو نہیں مگر ابو مجھ پہ ایک گہری نظر ضرور ڈالا کرتے تھے، جیسے میرا اندر تک ایکسرے کر رہے ہوں۔ ایسے میں، میں بالکل بے نیاز ہو جاتا یا منظر سے ہٹ جانا مناسب سمجھتا کیونکہ ایک تو مجھے ابو کی نظریں اپنے وجود کے آر پار اترتی محسوس ہوتیں اور دوسرا مجھے اندر سے اتنی کمینی سی خوشی ہوتی سیماب کے رونے سے کہ

مجھ سے چھپائے نہیں چھپ رہی ہوتی تھی۔ اور ابو پہ ظاہر کرنے کا میں متحمل نہیں ہو سکتا تھا اور میں نے یہ جاننے کی کبھی کوشش ہی نہیں کہ ابو ایسے کسی بھی موقع پہ مجھے ہی ایسے کیوں دیکھا کرتے تھے۔ سیماب خاموشی سے اپنی تباہ حال چیزوں کو دیکھتی اور ان دیکھا کر دیتی۔ میں نے کبھی اسے امی ابو سے شکوہ کرتے نہیں سنا۔ نجانے کیوں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ جانتی ہے کہ اس کی چیزوں کو کوئی اور نہیں میں ہی برباد کرتا ہوں لیکن پھر وہ میری شکایت امی ابو سے کیوں نہیں کرتی تھی۔ بس اسی بات کا مجھے جواب نہیں ملتا تھا۔

☆☆☆

اس دن ابو کے کچھ مہمان آئے تھے۔ سیماب نے امی کے ساتھ کچن میں خاصا کام کرایا تھا۔ پھر امی کو چائے بنا کر بھی دی۔ امی اسے محبت سے دعا دے رہی تھیں، جب میں کچن میں داخل ہو رہا تھا۔ سیماب کی آنکھوں میں دنیا جہاں کی چمک سما گئی تھی اور یہ بات مجھ سے قطعاً برداشت نہیں ہو سکی تھی۔ عین اسی وقت امی کی مجھ پہ نظر پڑی تو ان کا رنگ اڑ گیا۔ میں وہاں سے تیزی سے نکلا۔ امی مجھے آوازیں دیتی رہیں لیکن میں نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ سیماب کے کمرے کے باہر سے گزرتے ہوئے میں نے اندر جا کر اس کی وارڈ روب سے اس کا پسندیدہ فراک نکال کر برابر والے اسٹور میں چھپا دیا۔

''وہ ابو کو مجھ سے دور کر چکی تھی، اب امی کو بھی مجھ سے دور کر رہی ہے۔ وہ میری ہر چیز پہ قبضہ کر لینا چاہتی ہے اور میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔'' اپنے کمرے میں آ کر میں نے سب اٹھا اٹھا کر پٹخا تھا۔

اسی رات اسٹور میں چھپا سیماب کا ایک فراک قینچی سے تار تار کرتا اپنا غبار نکال رہا تھا تو ابو نجانے کب میرے سر پہ آ کر کھڑے ہو گئے کہ مجھے پتا ہی نہیں چل سکا۔ میرے ہاتھوں سے قینچی چھوٹ کر پاؤں پہ جا لگی لیکن وہ تکلیف اس تذلیل سے کم تھی جو اس لمحے میں ابو کے سامنے کھڑا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے مارے خفت کے سر جھکا لیا تھا۔ ابو مجھے کچھ بھی کہے بغیر بڑی خاموشی سے وہاں سے چلے گئے تھے۔ لیکن میں نجانے کتنی دیر وہیں سر جھکائے کھڑا رہا تھا۔

اگلی صبح میں ناشتے کی میز پہ بھی سر جھکائے ناشتا کرتا رہا۔ ابو معمول سے کہیں زیادہ خاموش تھے۔ انہوں نے نہ تو مجھے مخاطب کیا اور نہ امی سے کوئی بات کی۔ ناشتا ختم ہوتے ہی وہ سیماب کو گاڑی میں آنے کا کہہ کر باہر چلے گئے۔ میں خود ہی خاموشی سے گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ جا کر بیٹھ گیا تھا۔

''آج تم آگے بیٹھ جاؤ۔'' سیماب نے مجھے حیرت سے دیکھا اور اگلی نشست پہ جا بیٹھی۔ اس شام بھی ابو خاموش تھے اور ان کی خاموشی مجھے کاٹنے لگی تھی اور اس سے اگلے بہت سے دنوں میں ابو خاموش ہی رہے۔ وہ مجھ سے تو کیا کسی سے بھی ضرورتاً ہی مخاطب ہوتے تے۔

''تمہارے ابو کو کیا ہوا ہے مونی؟'' ایک روز امی نے تشویش کا اظہار کیا تو میں نے لاعلمی سے شانے اچکا دیے۔ مگر اندر سے میں شرمندہ تھا۔ ابو کی یہ خاموشی مجھ سے برداشت نہیں ہو پا رہی تھی۔ اسی شام ابو واک کے لیے قریب پارک جانے لگے تو میں بھی ان کے پیچھے لپکا۔

''ابو! آج میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔'' انہوں نے میری بات سن کر محض سر ہلا دیا اور خاموشی سے چل دیے۔ پارک پہنچ کر وہ بجائے جاگنگ ٹریک کی طرف جانے کے وہیں ایک بنچ پہ بیٹھ گئے اور آنے جانے والوں کو دیکھنے لگے۔ میں بھی ان کے برابر میں بیٹھا، سوچ ہی رہا تھا کہ بات کیسے شروع کروں کہ ابو نے میری طرف دیکھے بنا ہی کہا۔

''تمہیں نہیں لگتا کہ جو بات کرنے تم گھر سے اتنی دور آئے ہو، وہ اب تمہیں کہہ دینا چاہیے۔'' میں مزید شرمندہ سا ہو گیا اور ساتھ ہی مجھے سیماب پہ مزید غصہ آنے لگا۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا اسی کی وجہ سے تو ہو رہا تھا۔ نہ وہ ہوتی، نہ یہ سب ہوا ہوتا۔

''ابو جی...... اس رات......'' میں نے بات

جان کر ادھوری چھوڑ دی کہ آگے وہ بات چلائیں۔
"اسی جیسی بہت سی راتوں کا حساب دو تو اس رات پہ آؤ ورنہ بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"
ابو مجھ سے میرے سارے گناہوں کا اعتراف چاہتے تھے۔
"اس رات کی حرکت اور اس جیسی بہت سی راتوں کی حرکتوں کی واحد وجہ آپ کی بیٹی ہی ہے۔ وہ مجھ سے کسی بھی جگہ آگے نکلے میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ جب اسکول میں اس کی تعریف کی جاتی ہے یا کہیں بھی اسے سراہا جاتا تو مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ نہ مجھے یہ اچھا لگتا ہے کہ کوئی اسے مجھ سے زیادہ پیار کرے...... نہ مجھے یہ اچھا لگتا ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ خوش رہے۔" میں نے صاف صاف ابو کو بتا دیا۔
"اور بھی کچھ ایسا ہے جو تم محسوس کرتے ہو؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔
"کیا یہ بہتر نہیں ہے مونی کہ تم خود کو اس قابل بناؤ کہ لوگ سیمی سے زیادہ تمہیں سراہیں۔ تم سے پیار کریں۔ تمہیں چاہیں۔ یہ سب کو لگتا ہے کہ وہ تم سے زیادہ ذہین ہے لیکن یہ مجھے نہیں لگتا۔ وہ تم سے آگے اس لیے ہے کیونکہ وہ اپنا پورا دھیان پڑھائی پہ لگاتی ہے اور تم اپنا زیادہ دھیان اس بات پہ لگاتے ہو کہ تم اسے کیسے نقصان پہنچاؤ۔ کس کس طریقے سے اسے تنگ کرو۔ اگر تم اپنی توجہ پڑھائی پر دو تو تم اس سے کئی گنا آگے ہو۔ مجھے یاد ہے کہ تم اس جتنے تھے تو اس سے کہیں زیادہ آگے تھے، لیکن اس کی پیدائش کے ساتھ ہی تم نئے رستے پہ چل پڑے۔ وہ رستہ جس پر چل کر انسان سمجھتا ہے کہ وہ دوسرے کو نقصان پہنچا رہا ہے لیکن دراصل وہ خود فریبی کا شکار ہوتے، خود کو ہی نقصان پہنچا رہا ہوتا ہے۔ جو آگ تم اس کی چیزوں کو لگاتے ہو، جو توڑ پھوڑ تم اس کی چیزوں کے ساتھ کرتے ہو، وہ دراصل تمہاری ذات کے ساتھ ہو رہی ہے۔ ابھی یہ سب تمہیں نظر نہیں آ رہا، کیونکہ تم چھوٹے ہو لیکن جلد آ جائے گا۔ ابھی تمہیں سمجھ میں بھی نہیں آ رہا کیونکہ تم ناسمجھ ہو لیکن جلد تم پہ ہر شے کی حقیقت آشکار ہو جائے گی۔ اور رہی یہ بات کہ تمہاری امی اور میں سیمی کو تمہاری نسبت زیادہ چاہتے ہیں تو یہ محض تمہارا خیال ہے۔ ہمارے لیے تم دونوں برابر ہو بلکہ شاید پہلی اولاد ہونے کی وجہ سے تم کچھ زیادہ ہی عزیز ہو۔ نجانے تمہیں یہ کیوں لگتا ہے کہ ہم تم سے سیمی کے مقابلے میں کم پیار کرتے ہیں۔ ہم والدین کی اس قسم سے ہیں جو بیٹوں کو بیٹیوں کی نسبت زیادہ چاہتے ہیں کیونکہ بیٹے ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں، سہارا بنتے ہیں اور بیٹیاں تو ہوتی ہی پرائی ہیں جنہیں چاہ کر بھی ہم پاس نہیں رکھ سکتے۔ اسی لیے تم ہمیں زیادہ پیارے ہو بھلے تم مانو یا نہ مانو۔
مونی! سمجھ میں آتا کہ میں تمہاری شخصیت کی اس گرہ کو کیسے کھولوں جو معلوم نہیں کیسے اور کہاں جا لگی ہو؟ میں باپ ہو کر کچھ نہیں کر پا رہا تمہارے لیے۔ تمہاری شخصیت کے اس جھول کے لیے کیونکہ وہ تم خود ہی ہو جو اپنے لیے سب کر سکتے ہو۔ تم خود اپنے اندر کے اس حسد کو نکال سکتے ہو۔ یہ کام کوئی بھی تمہارے لیے نہیں کر سکتا سوائے تمہارے۔"
میں سر جھکائے ابو کی ساری باتوں کو سن رہا تھا لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، واحد بات جو مجھے سمجھ میں آئی تھی وہ یہ تھی کہ میں سیمی سے زیادہ اہم ہوں۔ امی ابو کے لیے کیونکہ میں ان کی پہلی اولاد ہوں کیونکہ میں بیٹا ہوں اور کیونکہ میں زیادہ ذہین ہوں۔ ابو ایسا سمجھتے تھے تو یقیناً امی بھی ایسا ہی سمجھتی ہوں گی اور باقی سب کیا سمجھتے ہیں وہ میرا مسئلہ کبھی رہا نہیں تھا۔ نجانے ابو نے یہ بات مجھے رستے پہ لانے کے لیے کی تھی یا وہ واقعی دل سے کہہ رہے تھے لیکن میں مطمئن ہو گیا تھا کہ سیماب چاہے کچھ بھی کر لے وہ میرے برابر کبھی کھڑی نہیں ہو سکتی۔ وہ پنے اور میرے درمیان کے اس فرق کو کبھی مٹا نہیں سکتی جو قدرت نے قائم کیا تھا۔
"کیا میں امید رکھوں کہ تم خود کو بدلنے کی کوشش کرو گے؟" ابو نے بڑی امید سے پوچھا تو میں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھتے اثبات میں ہلا دیا۔ ابو ہولے سے مسکرائے اور میرا شانہ تھپکا۔

"چلو، اب مل کر واک کرتے ہیں۔" ہم دونوں اب جاگنگ ٹریک پہ دوڑتے ہوئے خوش گوار گفتگو کررہے تھے۔

☆☆☆

اس روز کے بعد سے ایک طویل عرصے تک میں نے گھر میں کبھی سیماب کی کامیابیوں کے حوالے سے کچھ نہیں سنا تھا۔ یقیناً وقت کے ساتھ وہ نالائق ہوگئی تھی کیونکہ چھوٹی کلاسز میں تو سب ہی تیس مار خان بنے پھرتے ہیں۔ اچھے گریڈز لینا وہ بھی بڑی کلاسز میں کوئی آسان کام نہیں ہوتا اور میں پہلے کی نسبت اب پڑھائی میں پھر سے بہت اچھا جارہا تھا کیونکہ اب میں نے اس کو خاطر میں لانا چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے ابو امی مجھ سے بہت خوش تھے۔

"مونی اس بار پھر سے کلاس میں فرسٹ آیا ہے۔" امی کھانے کی میز پہ بڑے مان سے ابو کو بتارہی تھیں۔ ابو اب مجھے داد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے میری کامیابیوں کو سراہ رہے تھے۔ ابو کی تعریف سے مجھے بہت حوصلہ ملتا تھا۔ سیماب چپ چاپ کھانا کھارہی تھی۔ وہ خاموش ضرور تھی لیکن میری طرح حسد اس کے چہرے پہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ خیر مجھے اس سے کیا غرض تھی کہ وہ مجھ سے حسد محسوس کرتی ہے یا نہیں۔ میرے لیے اتنا بہت تھا کہ اب اس گھر میں میری تعریفیں ہوتی ہیں، اس کی نہیں۔

اس رات وہ کمرے میں آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پینٹنگ تھی، جو اس نے میری طرف بڑھائی تھی۔

"یہ آپ کے اچھے رزلٹ کے لیے بھا......" وہ معصومیت سے مسکرائی تھی اور میں نے اس کی بھی زحمت نہیں کی۔

ابھی میں کہنے ہی والا تھا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ میری نظر اس پینٹنگ پر پڑی جہاں ایک ندی کنارے سورج کے غروب ہونے کا منظر قید تھا۔ اتنی جامع اور خوب صورت پینٹنگ شاید میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

"یہ کس نے بنائی ہے؟" میں توصیفی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس پینٹنگ میں واقعی میرا دل اٹک گیا تھا۔

"آپ کو پسند آئی؟" وہ پرجوش سی ہوکر پوچھ رہی تھی۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ مجھے بہت پسند آئی لیکن میں نے جان کر الفاظ کو روک لیا تھا۔

"بس اچھی ہے۔" حالانکہ میں اس سے نظریں نہیں ہٹا پارہا تھا۔

"یہ میں نے بنائی ہے۔" وہ اس پہ بھی خوش تھی کہ میں نے اسے قبول کیا اور اس کی اس بات پہ میں جی بھر کر حیران ہوا تھا۔

"تم نے؟" میں اس سے پہلے نہیں جانتا تھا کہ وہ اتنی زبردست پینٹر ہے وہ بھی اتنی سی عمر میں۔

"جی، میں پینٹنگ کرتی ہوں۔" وہ خوشی خوشی بتارہی تھی۔ میں نے چہرے کے تاثرات یوں بنالیے کہ اس میں کون سا کمال ہے اور پینٹنگ کو ایک طرف رکھ دیا جیسے میں اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن خاموش ہوگئی۔ میں نے اسے شکریہ جیسے الفاظ سے نوازنا بھی گوارا نہ سمجھا۔ وہ کچھ دیر کھڑی رہی۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی یا شاید وہ میری طرف سے کسی قسم کے تبصرے کی منتظر تھی۔ جب اگلے بہت سے پل وہ وہیں کھڑی رہی تو میں نے بے حد سفاکی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب جاؤ گی یا یہیں کھڑی رہو گی۔"

اس کا چہرہ یک دم بجھ گیا تھا اور وہ خاموشی سے لوٹ گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اس کی بنائی پینٹنگ کو دوبارہ اٹھا کر غور سے دیکھا۔ بلاشبہ میں ماننے پہ مجبور ہوگیا تھا کہ وہ ایک کمال کی آرٹسٹ تھی۔ سیماب سے حسد کی ایک اور وجہ نے میرے اندر سر اٹھایا تھا۔

اسی رات میں نے اسے لان میں ٹہلتے ہوئے ابو سے بات کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرا دل کیا میں باہر جاکر دیکھوں کہ وہ ابو سے میری کیا شکایتیں لگارہی ہے۔ مگر اتنے میں میری دوست کی کال آگئی

جوائینڈ کرنا زیادہ ضروری تھا کیونکہ وہ میری زندگی کا پہلا کرش تھی۔ میرے سے دو سال سینئر ''حورین۔''

☆☆☆

حورین سے میری ملاقات دو ماہ پہلے ہمارے کالج کے اسپورٹس ویک میں ہوئی تھی جہاں وہ دوسرے کالج کی طرف سے آنے والی گرلز باسکٹ بال ٹیم کی کیپٹن تھی۔ چونکہ وہ کیپٹن تھی اس لیے سب سے نمایاں تھی اور اس کی اسی انفرادیت نے ہی مجھے متاثر کیا تھا۔ میں شرط لگا کر کہہ سکتا تھا کہ اگر وہ کیپٹن نہ بھی ہوتی تو بھی اتنی ہی منفرد اور نمایاں دکھتی تھی کیپٹن ہو کر۔ اس میں ایک عجیب سا سحر تھا جو مجھے حصار میں لے چکا تھا۔ میرا سارا دھیان کھیل کے بجائے اس پہ تھا۔ اس کی ٹیم ہار گئی تھی اور وہ کچھ بجھی بجھی سی تھی تب ہی میں آٹو گراف لینے اس کے پاس گیا۔

''آٹو گراف پلیز۔'' میں نے شرٹ کی جیب سے پین نکال کر اپنی ہتھیلی آگے بڑھادی۔

اس نے حیرت سے پلکیں پٹ پٹاتے ہوئے کچھ ناگواری سے مجھے اوپر سے نیچے تک جانچتے ہوئے دیکھا۔

''ہارنے والوں سے کون آٹو گراف لیا کرتا ہے؟'' شاید اسے لگا تھا کہ میں اس کا مذاق اڑا رہا ہوں لیکن وہ ٹھیک کہہ رہی تھی کہ ہارنے والوں سے کون آٹو گراف لیتا ہے اور وہ ہاری ہی کب تھی وہ تو جیتی تھی ...... میرا دل...... ہار تو میں گیا تھا...... اپنا دل۔

''آپ دے دیں، آپ کا کیا جاتا ہے۔'' میں بھی ڈھیٹ بن گیا۔

''اپنے کالج کے دوستوں میں لے جا کر میرا مذاق اڑاؤ گے کہ دیکھو اس ہارنے والی سے آٹو گراف لایا ہوں۔'' اس نے اب کی بار کچھ غصے سے مجھے دیکھتے طنز کیا۔ میں نے جلدی سے سر نفی میں ہلایا۔

''بالکل بھی نہیں۔ بس آپ مجھے جنونی سمجھ کر دے دیں۔'' اس نے چند ثانیے مجھے دیکھا اور پھر میرے ہاتھ کو۔ کچھ سوچا اور میری ہتھیلی تھام کر اس نے وہاں لکھا۔

''دا فیکٹ دیٹ پیوپل ایکچوئلی وانٹ مائی آٹو گراف از کریزی۔''

ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ چھوڑ، مسکراتے ہوئے جیسے مجھے کچھ جتایا اور اپنا بیگ تھام کر چل دی۔ میں نے اپنے ہاتھ پہ لکھا اس کا آٹو گراف پڑھا اور اس کے پیچھے بھاگا۔ اس نے نام نہیں لکھا تھا مگر وہ میں پہلے سے اسٹیج پہ سن چکا تھا حورین نشاط۔ میں نام کے لیے ہرگز پیچھے نہیں بھاگا تھا۔ مجھے تو اس کا نمبر چاہیے تھا۔

''مس، اپنا نمبر تو دیتی جائیں۔'' میں اس کے برابر تیز تیز چل رہا تھا۔

''کیوں......؟ جنونیوں کو نمبر بھی چاہیے ہوتا ہے۔'' اس نے اب کی بار مسکراہٹ دبانے کی کوشش کی تھی۔

''جو لوگ اچھے لگتے ہیں، ان سے رابطہ ہونا چاہیے نا۔'' میں نے بلاتکلف صاف جواب دیا۔

''ویری شارپ۔'' وہ رک کر مجھے جانچنے والے انداز میں دیکھتی ہوئی ہونٹ سکوڑ کر بولی۔

''تو بولیں نمبر۔ آپ لیٹ ہو رہی ہیں اور میں بھی۔'' میں نے اس کی ٹیم اور کوچ کو دور جاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ اس نے بھی اسی سمت دیکھا، پھر میری طرف اور پھر میرے پھیلے دوسرے ہاتھ کے اور ہاتھ تھام کر تیزی سے اپنا نمبر لکھ کر پین میرے اسی ہاتھ میں تھمایا اور ایک جتاتی نظر مجھ پر ڈال کر مڑی۔ میں زیر لب نمبر دہرا کر مسکرا دیا۔

''میں کال کروں گا۔ منصور نام ہے میرا۔'' میں پیچھے سے چلایا۔ اس نے تیزی سے قدم بڑھانے کے دوران ہی پلٹ کر مجھے دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔

اور اسی شام میری اس سے فون پہ پہلی بار بات ہوئی اور یہ سلسلہ چلتا چلا گیا۔ وہ جانتی تھی کہ میں عمر اور کلاس میں اس سے پیچھے ہوں پھر بھی اسے ہماری

دوستی پہ کوئی اعتراض نہیں تھا اور مجھے تو یوں بھی نہیں تھا۔ وہ میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی لیکن جلد ہی میں جان گیا تھا کہ کم از کم میں اس کی زندگی میں آنے والا پہلا لڑکا ہرگز نہیں تھا۔ اس کی اور لڑکوں سے بھی دوستی تھی جس پہ میں نے دبا دبا سا احتجاج بھی کیا تو اس نے بہت طریقے سے مجھے سمجھایا۔

"وہ سب میرے دوست ہیں جیسے تم ہو۔ انہیں تو کوئی اعتراض نہیں میری کسی سے دوستی پہ بھی۔ پھر تمہیں کیا مسئلہ ہے؟"

"مجھے مسئلہ ہے کہ میں کسی سے بھی تمہیں شیئر نہیں کر سکتا۔" اس لمحے میں بالکل ضدی سا بچہ بن گیا، جس کی بات پہ وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

"ایک انسان کے کئی دوست ہوتے ہیں۔ اس میں شیئرنگ والی کیا بات ہے بھلا؟ تم بالکل بچے ہو منصور! بڑے ہو جاؤ ورنہ دنیا تمہیں کھا جائے گی۔"

اب میں اسے کیا بتاتا کہ مجھے شراکت بالکل پسند نہیں، کسی کو بھی نہیں ہوتی۔ مجھے اپنی زندگی میں جو بھی انسان چاہئیں ان کی زندگی میں بس میں ہی میں ہوں۔ لیکن میں اسے یہ بات سمجھا نہیں پا رہا تھا۔

☆☆☆

اور ایسی ہی ایک رات تھی جب میں اس سے فون پہ بات کر رہا تھا تو ابو آ گئے تھے۔ انہوں نے میری کسی قسم کی گفتگو نہیں سنی تھی لیکن وہ جو حوالے دے رہے تھے اس سے لگتا تھا کہ کسی اور نے میری حورین سے دوستی سے متعلق انہیں بتایا تھا۔ انہیں ان تمام قیمتی تحائف کے متعلق بھی معلوم تھا جو میں حورین کو وقتاً فوقتاً دیتا رہا تھا اور مجھے چند ثانیے لگے تھے یہ جاننے میں کہ وہ کوئی اور نہیں سیماب ہی تھی جس نے ابو کو میری اور حورین کی دوستی کے متعلق بتایا تھا۔ وہ اس وقت کمرے کے دروازے سے لگی سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ ابو نے نہ صرف میری بے عزتی کی تھی بلکہ حورین کا نمبر بھی ری ڈائل کر کے اسپیکر آن کیا تھا۔ ابو نے اس کی ایک بھی سنے بنا اسے خوب لتاڑا تھا۔ نجانے ابو کو کیا ہو گیا تھا وہ کبھی ایسے غصہ نہیں کرتے تھے جیسا کہ اب کر رہے تھے۔ پھر وہ ایک ہی بار بولی تھی اور جب بولی تو میری دنیا اندھیر کر گئی۔

"آپ کو کس نے حق دیا ہے کہ آپ میرے بارے میں یہ سب کہیں۔ آپ ہوتے کون ہیں مجھے یہ سب کہنے والے۔ اگر میں سب چپ چاپ سن رہی ہوں تو اس کا ہرگز مطلب نہیں کہ آپ بولتے چلے جائیں۔ میں نے آپ کے بیٹے کی منتیں نہیں کی تھیں، یہ خود آیا تھا میرے پیچھے۔ نہ ہی میں اس سے دوستی کرنے میں انٹرسٹڈ تھی اور نہ ہی اب اسے قائم رکھنے میں ہوں۔ مجھے رتی بھر بھی فرق نہیں پڑے گا اگر یہ دوستی نہ رہے تو...... بلکہ اتنی انسلٹ کروانے کے بعد تو میں اس پہ تھوکنا تک پسند نہ کروں دوستی تو بہت دور کی بات ہے۔" اس نے صاف میری اوقات واضح کر دی تھی۔

اس کے بعد ابو نے کیا کیا کہا تھا میں نہیں جانتا تھا۔ میں تو حورین کے الفاظ کے اثر سے ہی نکل پا رہا تھا کہ کسی اور طرف دھیان دیتا۔ وہ جو کہتی تھی کہ دنیا مجھے کھا جائے گی تو اس دنیا میں سب سے پہلے کھانے والی تو وہی تھی۔

یہ تھی میری اہمیت اس کی زندگی میں کہ میرے ہونے نہ ہونے سے اسے فرق نہیں پڑتا تھا۔ ہفتہ میں نے اسی سوگ میں گزارا اور ہفتے بعد جب ہوش آیا تو یہی کہ یہ سب سیماب کا کیا دھرا تھا اور اب مجھے اس سے حساب برابر کرنا تھا۔ انتقام کی آگ نے میری سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں ماؤف کر دیں حتیٰ کہ میں یہ بھی نہ سوچ سکا کہ بھلا سیماب کو میری اور حورین کی دوستی سے متعلق اتنی تفصیلی معلومات کہاں سے ملی ہوں گی۔

"تم نے ابو کو بتا کر اچھا نہیں کیا۔" میں کینہ توز نظروں سے اس کے کمرے کے دروازے میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں نے؟" وہ بے حد حیران تھی۔

"تم نے مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے یا بچہ، جو تمہاری چالاکیوں کو سمجھ نہ سکتا ہو۔ میں سب جانتا ہوں کہ مجھے

نیچا دکھانے کے لیے تم کیا کیا کرتی ہو تم جلد ہی اس کا نتیجہ بھگت لوگی۔" اسے دھمکاتے ہوئے میں پلٹ گیا۔

اس رات وہ میرے کمرے میں اپنی صفائی پیش کرنے آئی تھی لیکن میں نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اسے شٹ اپ کال دے دی تھی۔

"اپنی معصومیت کے رونے کسی اور کے آگے رونا جو تمہیں جانتا نہ ہو۔ میں سب جانتا ہوں کہ تم نے مجھے ابو کی نظروں سے گرانے کے لیے یہ سب کیا ہے۔ اب اپنی شکل گم کرواور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" میرے اس طرح چلانے پہ وہ رو دی تھی۔

"مجھ سے قسم لے لیں، میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ میں تو جانتی تک نہیں کہ......"

"گیٹ لاسٹ۔" میں اتنے زور سے چلایا کہ وہ بری طرح سہم کر مجھے دیکھتے، منہ پہ ہاتھ رکھے وہاں سے بھاگ گئی تھی۔

محض اس پر چلا لینے سے میرے اندر کی آگ کہاں ٹھنڈی ہونا تھی بھلا۔ اس نے میرا بہت بڑا نقصان کیا تھا۔ پہلے امی، پھر ابو اور اب حورین کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کی تھی۔ اب کی بار میں ایسا مزا چکھانا چاہتا تھا کہ وہ ہمیشہ یاد رکھتی۔

☆☆☆

میں اسے ابو امی کی نظروں میں گرا کر ہر حال میں بدلا لینا چاہتا تھا اور اس کے لیے مجھے زیادہ پلاننگ کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں' میں نے اس کا کمپیوٹر کھولا تھا۔ میری قسمت تھی کہ اس کا ای میل اکاؤنٹ باآسانی کھل گیا کہ اس کا پاس ورڈ پہلے سے انٹر تھا۔ میں نے اس سے الٹے سیدھے میسج اپنے بنائے ایک فرضی اکاؤنٹ پہ بھیج دیے تھے۔ ایسے میسجز جو کوئی پڑھتا کانوں کو ہاتھ لگاتے نہ تھکتا۔ بس اب ابو کے کان بھرنے کی دیر تھی جو ایسا مشکل امر نہ تھا۔

"آپ کو لگتا ہے کہ میں ہی غلط ہوں اور آپ کی پاک باز بیٹی بہت اچھی ہے جس نے میری مخبری کی ہے تا کہ مجھے بدنام کر سکے۔ اس کے اپنے کیا کرتوت ہیں، وہ آپ نہیں جانتے۔ جان جائیں تو کبھی شرم سے سر نہ اٹھا سکیں۔

ابو خاموشی سے میری شکل دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں بالکل سپاٹ تھیں۔

"بلائیں اسے اور کہیں کہ اپنا اکاؤنٹ کھول کر دکھائے ہمیں۔ ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

"اس بات کو ختم سمجھو مونی۔" وہ پھر سے کتاب پڑھنے لگے۔ ابو نے مجھے جانے کے لیے کہا لیکن میں اس بات کو اتنی آسانی سے ختم نہیں کر سکتا تھا۔ میری اس قدر تذلیل کے ساتھ ہی ختم ہو سکتی تھی۔

"کیوں ابو۔ بات کو ختم کیوں سمجھوں؟ جب بیٹے کی بات تھی تو آپ نے مجھے وضاحت کے لیے ایک موقع نہیں دیا اور خوب ذلیل کیا۔ اب بیٹی کی بات آئی ہے تو آپ اسے کور کر رہے ہیں۔ اگر ہم دونوں برابر ہیں آپ کے نزدیک تو اسے بھی کٹہرے میں کھڑا کر دیں، بالکل اسی طرح جیسے مجھے کھڑا کیا تھا۔ اسی طرح سزا سنائیں جیسے مجھے سنائی تھی ورنہ میں سمجھوں گا کہ وہ آپ کے لیے سب کچھ ہے اور میں کچھ بھی نہیں۔" ترپ کا پتا میں نے پھینک دیا تھا، اب تماشا دیکھنا باقی تھا۔ ابو کو میں نے ایموشنلی بلیک میل کیا تھا جیسے عموماً میں کیا کرتا تھا۔ یہ میرا ایک کارآمد ہتھیار تھا۔ ابو نے کچھ سوچا اور پھر اسے بلا بھیجا۔

"سیمی۔ بھائی چاہتا ہے کہ تم اپنا ای میل اکاؤنٹ چیک کرادو اسے۔" سیماب نے کچھ حیرت سے ابو اور پھر مجھے دیکھا، جیسے اسے سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ وہ الجھن میں مبتلا تھی۔

"مجھے نہیں، ابو کو۔" میں نے تصحیح کی اور اسے جتا دیا کہ اس کا اکاؤنٹ ابو چیک کرنا چاہتے ہیں تا کہ اس کے دماغ کی تہ میں اندر تک یہ بات بیٹھ جائے کہ ابو اسے شک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ بے اعتبار سمجھ رہے ہیں۔

اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کو خوف دکھائی دیا پھر اگلے لمحے اس نے سر ہلاتے، بنا کوئی اعتراض کیے ابو کے کمپیوٹر پہ اپنا اکاؤنٹ کھول دیا۔ ابو نے سامنے جگمگاتی ای میلز کھول کر پڑھیں اور تاسف سے آنکھیں پھاڑ کر اسکرین کو دیکھتی سیماب کو دیکھا۔ بنا ایک لفظ کہے ابو وہاں سے چلے گئے۔ میرے چہرے پہ ایک کمینی سی مسکراہٹ در آئی۔ میں نے پھر بنی سیماب کو دیکھا اور چہ چہ کرتا وہاں سے چلا آیا۔ آگے وہ خود سمجھ دار تھی کہ میں اس سے اپنا بدلہ لے چکا ہوں۔

اس رات بہت میٹھی نیند آئی تھی مجھے کیونکہ میں جانتا تھا کہ ایک لڑکے کا کسی لڑکی سے چکر کوئی اتنی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی جتنی کسی لڑکی کے اکاؤنٹ سے ایسی ای میلز کا نکلنا جو اس کا سر شرم سے جھکا دے۔ وہ ابو کی نظروں میں گر چکی تھی، کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔ میرا بدلہ پورا ہو چکا تھا اور اندر کی آگ ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔

☆☆☆

صبح بہت روشن اور چمکیلی تھی۔ کچھ عرصے میں صبح جلدی اٹھ کر لان میں ایکسر سائز کیا کرتا تھا۔ میں ایک سائز کرنے باہر لان میں آیا تو ابو وہاں پہلے سے چہل قدمی کر رہے تھے۔ ان کے چہرے کے اضطراب سے ظاہر تھا کہ وہ ساری رات سو نہیں سکے۔ مجھے آتا دیکھ کر میری طرف بڑھے۔

''مونی۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔ آؤ، پارک تک چلتے ہیں۔'' وہ ایک رات میں ہی جیسے بہت بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے۔ بیٹی کے کرتوت دیکھ کر کوئی باپ بھی سر اٹھا کر نہیں چل سکتا تو پھر ابو کیسے اپنی چہیتی کی ایسی حرکتیں دیکھ کر سکون سے رہ سکتے تھے۔ ابو کے لیے مجھے بہت افسوس ہوا تھا کیونکہ میں ان سے محبت کرتا تھا۔ ان کا جھکا سر اور کاندھے میرے دل کو پچھتاوے کے چوکے لگا رہے تھے لیکن سیماب کے لیے دل میں رتی بھر بھی افسوس نہیں تھا۔ اسی لیے ابو کے لیے ابھرنے والا تاسف چند منٹوں میں ہی ہوا ہو گیا تھا۔

پارک میں ایک بنچ پہ ہم دونوں براجمان ہو گئے۔ ابو خاموش تھے اور سر جھکائے ہوئے تھے۔ مجھے ان پہ بے حد ترس آیا۔ وہ بولے تو آواز بے حد نحیف و نزار تھی۔

''مجھے لگا تھا مونی کہ وقت کے ساتھ ساتھ تم سمجھ دار ہوتے جاؤ گے تو کچھ سنبھل جاؤ گے لیکن میں غلط تھا یا شاید خوش فہم تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ شاید سیماب جتنی محبت تم سے کرتی ہے، وقت کے ساتھ تمہاری نفرت اس کی محبت کی گرمی سے پگھل جائے گی مگر میں یہاں بھی غلط تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ تمہیں احساس ہوگا کہ تم ایک بہن کے بھائی ہو اور اس بہن کی حفاظت تم پہ فرض ہے تو تم اپنا فرض نبھاؤ گے مگر میں یہاں بھی غلط تھا۔ پتا نہیں میں ایک بیٹے کو لے کر اتنا خوش فہم اور پر امید کیوں ہو گیا تھا۔ شاید ہر باپ ہی ہوتا ہوگا۔ مجھے ہمیشہ سے ہی شک تھا کہ سیماب کو جب بھی کوئی ایسا نقصان ہوا ہے جس کی وجہ ہم سمجھنے سے قاصر ہیں تو اس میں تمہارا ہی ہاتھ رہا ہے لیکن میرے پاس ثبوت نہیں تھا لیکن اس رات ثبوت اور گناہ گار دونوں مجھے بیک وقت مل گئے تھے۔ تم جانتے ہو کہ میں کس رات کی بات کر رہا ہوں۔''

اس رات پہ میں نادم تھا اور میں نے ان سے معافی بھی مانگ لی تھی۔ وہ مجھے معاف بھی کر چکے تھے تو اب میری پرانی حرکتوں کو دہرانے وہ مجھے یہاں کیوں لائے تھے؟

''تم جانتے ہو مونی کہ تب میں اتنے دن سے تمہاری طرف دیکھ کیوں نہیں رہا تھا کیونکہ میں تمہیں شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نہ ہی خود شرمندہ ہونا چاہتا تھا کہ میں نے کیسی تربیت کی ہے تمہاری کہ تم اپنی ہی بہن کے دشمن بن چکے ہو۔ اسے نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اس کا وجود آج بھی تمہیں کھٹکتا ہے اور ایک باپ کے لیے اس سے بڑھ کر افسوس کا مقام کیا ہوگا کہ اس کی ایک

اولاد، اس کی دوسری اولاد کو زک پہنچا کر سکون محسوس کرتی ہے۔ میں تو بدنصیب سکون سے مر بھی نہیں سکتا، یہ سوچ کر کہ میرے بعد میری بیٹی کا کیا ہوگا۔ وہ اپنے بھائی کے ہاتھوں ہی کہیں کوئی بڑا نقصان نہ اٹھالے، یہ خوف مجھے کسی پل چین نہیں لینے دیتا اور یہی سوچ سوچ کر میں سو نہیں پاتا۔ بیٹے باپ کا سہارا ہوتے ہیں، نجانے وہ کون سے بیٹے ہوتے ہوں گے؟" ابو کی باتوں نے مجھے کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ میرے دل کو دھچکا سا لگا تھا۔ ابو آخر مجھ سے اتنے ناامید کیوں ہو رہے تھے۔ اب میں نے ایسا کیا کیا تھا جو یہ سب کہنے کی نوبت آ گئی تھی۔

"کل جو کچھ ہوا وہ نہیں ہونا چاہیے تھا مونی۔ اس بات کا مجھے افسوس ہے لیکن اس سے زیادہ اس بات کا دکھ ہے کہ یہ سب تم نے اپنی بہن کے ساتھ خود کیا۔ صرف اور صرف اسے بدنام کرنے کے لیے۔" آسمان میرے سر پہ گر گیا تھا اور اس کا بار مجھے ہلنے نہیں دے رہا تھا۔ یہ ابو کیا کہہ رہے تھے؟

"بھائی بہنوں کی عزت کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان کے رکھوالے ہوتے ہیں۔ تم کیسے بھائی ہو جو اپنی بہن کی عزت کو دو کوڑی کا کرنے کے لیے اتنا گر چکے ہو۔ ایسی اوچھی حرکتیں کر رہے ہو۔ تم نے یہ سب کہاں سے سیکھا ہے مونی۔ کس نے یہ سب تمہیں سکھا دیا ہے۔ میں نے یا تمہاری ماں نے تو تمہیں ایسا نہیں بنایا پھر تم کیسے ایسے بن گئے؟ اتنے منتقم مزاج تو ہمارے خاندان میں سات نسلوں تک کوئی نہیں رہا جتنا تم ہو۔ میں نے زندگی میں کون سی ایسی غلطی کر دی جو میرے سامنے آ رہی ہے۔ میں تو پوری عمر تمہاری ہدایت کی دعائیں ہی کرتا رہا ہوں پھر کیسے میری کوئی ایک دعا بھی تمہارے حق میں قبول نہیں ہوئی؟"

مجھے لگا تھا وہ رو رہے ہیں۔ موت واقع ہونا کسے کہتے ہیں اس وقت میں جان گیا تھا۔ اس ایک پل نے مجھے موت جیسی تکلیف سے آشنا کرا دیا تھا۔

بوڑھا باپ، جوان اولاد کی حرکتوں سے اکتا کر اسی کے سامنے بیٹھا رو رہا تھا تو کیا یہ اولاد کے لیے ڈوب مرنے کا مقام نہیں ہوگا۔

"لوگ کہتے ہیں بہنیں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ سیماب تمہاری سگی بہن ہے مونی۔ پھر بھی تم نے اس کے ساتھ یہ سب کیا۔ میں رات سے یہی سوچ رہا ہوں کہ اپنی معصوم بیٹی کی عزت کا رکھوالا میں کسے بنا کر جاؤں تاکہ میرے مرنے کے بعد وہ عزت کی زندگی گزار سکے لیکن مجھے ایسا کوئی نظر نہیں آتا۔ ایسے لگتا ہے کہ وہ اپنے ہی گھر میں سب سے زیادہ غیر محفوظ ہے۔" ابو کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ میں ہلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

وہ کچھ دیر وہاں بیٹھے رہے پھر خاموشی سے اٹھ کر چلنے لگے اور میں نجانے کتنے گھنٹے وہیں بیٹھا رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ابو کو سب کیسے پتا چلا کہ یہ سب میں نے کیا تھا۔ ان کے پاس کیا ثبوت تھا کہ اس سب میں میرا ہاتھ تھا۔ لیکن دکھ، تکلیف اور بے عزتی کا جو احساس میرے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا وہ موت کے مترادف ہی تھا۔ اس قدر بے عزتی تو میں نے زندگی میں کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ ایک پل کو دل کیا کہ اپنے اس شیطانی بھیجے میں پوری چھ گولیاں اتار دوں لیکن یہ جو مجھ جیسے بزدل انسان ہوتے ہیں نا جو خود کی محبت میں مبتلا ہوتے ہیں، یہ اپنی جان نہیں لے سکتے۔ اپنی جان اتنی عزیز ہوتی ہے کہ دوسروں کی زندگی عذاب بنا دیتے ہیں۔

گھر جانے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، اسی لیے پورے دو ہفتے بعد میں دوستوں سے ملنے چلا گیا۔ میرا ابجھا بجھا چہرہ اور آنکھوں کے گرد حلقوں نے ہی میری تباہی کی داستان سب پہ کھول دی تھی۔ میں جو سب میں بیٹھ کر حورین کی محبت کے قصے سنایا کرتا تھا، اب بالکل خاموش اور لٹا پٹا سا بیٹھا تو انہیں لگا کہ میں حورین کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہوں۔ اب میں انہیں کیا بتایا کہ میں کس بات پہ ایسا ہو چکا ہوں۔ میں اپنی باپ کی نظروں میں مزید گر گیا تھا۔ جو کنواں میں نے

سیماب کے لیے کھودا تھا اس میں خود ہی جا گرا تھا۔ اپنے مکروہ گناہوں کی داستان میں کسی کو بھی نہیں سنا سکتا تھا، اپنے بچپن کے دوستوں کو بھی نہیں۔ ہماری ذات کے کچھ مکروہ پہلو ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہم بس خود پہ ہی ظاہر کرتے ہیں، دنیا کے قریبی سے قریبی رشتے پہ بھی نہیں کر سکتے۔

کسی نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا یوں جیسے وہ سب پہلے سے ہی جانتے تھے کہ مجھ پہ کیا بیت چکی ہے۔

"اپنی کیا حالت بنالی ہے، وہ بھی ایک لڑکی کے لیے۔" عزیز نے بہت ہمدردی اور نرمی سے کہا تھا۔

"دفع کر اسے یار اور آگے بڑھ۔ زندگی ایک لڑکی پہ ختم نہیں ہو جاتی، جو تو مجنوں بن کر بیٹھ گیا ہے۔" زلفی نے میرا شانہ تھپکا۔

"وہ لڑکی دو نمبر تھی۔ اچھا ہوا تیری جان چھوٹ گئی اس سے۔ پتا بھی ہے کتنے لڑکوں سے دوستیاں تھیں اس کی۔ جسے تو محبت سمجھ رہا تھا وہ اس کے لیے محبت کہیں سے بھی نہیں تھی۔ وہ تو بس تجھے استعمال کر رہی تھی۔" حسیب نے مجھے تسلی دی۔

"ہاں یار! روما اسی کے کالج میں پڑھتی ہے اور وہ بتا رہی تھی کہ اس کی تو نجانے کتنے لڑکوں سے دوستی ہے۔ سب سے پیسے اور تحائف لے کر وہ ایک طرف ہو جاتی ہے۔ وہ تجھے بھی استعمال کر رہی تھی۔ یہ جو غریب گھروں کی لڑکیاں ہوتی ہیں نا یہ ایسے ہی بڑے گھروں کے لڑکوں سے دوستیاں کر کے ان سے پیسے اور تحائف بٹورتی رہتی ہیں۔ محبت تھوڑا ہی کرتی ہیں۔" زلفی نے میری دل جوئی کی۔

"تجھے اس سے بہت بہتر لڑکی مل جائے گی۔ ابھی تجھے انکل کی نظروں میں خود کو ایک بہترین انسان ثابت کرنا ہے۔" پچھلی ساری باتیں میری سمجھ میں آتی تھیں کہ میں ایک ہارا ہوا مجنوں بنا پھر رہا تھا اسی لیے وہ میری دل جوئی کر رہے تھے لیکن ابو کی نظروں سے میں گر چکا ہوں، یہ انہیں کیسے پتا چلا اس بات پہ میرا ماتھا ٹھنکا۔

"تو کیسے جانتا ہے کہ ابو نے مجھے ذلیل کیا ہے؟" میں نے زلفی کو گھورا کہ اس کا ایکسرے کرنے جا رہا ہوں، وہ بھی نظروں سے۔

سب کو باری باری دیکھا جن کے چہروں کے رنگ میرے اس سوال پر اڑے تھے۔ کہیں کوئی گڑبڑ تھی جس کی بو مجھے آ رہی تھی لیکن میں اب تک بے خبر تھا۔ میرے بہت کریدنے پہ عزیز بول ہی پڑا۔

"زلفی نے انکل کو سب بتایا تھا۔" زلفی مجھ سے نظریں چراتا ایک طرف کھڑا تھا۔ میں نے غصے میں آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔

"یہ سب تیرا کیا دھرا تھا۔ میری پیٹھ میں خنجر تو نے گھونپا ہے، کمینے اور میں کیا سمجھتا رہا۔" میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کا منہ نوچ ڈالتا۔ وہ میرا دس سالہ پرانا دوست تھا۔ اس سے ایسی امید میں مر کر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے راز اس نے ابو کو بتا دیے تھے۔ سب دوستوں نے بیچ بچاؤ کرا کے مجھے پرے کیا۔

"دیکھ مانی۔ میں نے یہ سب تیرے بھلے کے لیے کیا ہے۔ بھلے تو مجھے مار، بھلے مجھے گالیاں دے...... لیکن مجھے تیری بھلائی عزیز تھی۔ اسی لیے مجھے اس حد تک جانا پڑا۔ وہ تجھے ٹریپ کر رہی تھی اور تو ہماری ایک سننے کو تیار نہیں تھا۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ تو اتنا دور نکل جائے جہاں سے واپسی ممکن نہ رہے۔ تو دن بدن اس کے لیے سیریس ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی رستہ نہیں تھا ہمارے پاس۔ اسی لیے ہمیں انکل کو سب بتانا پڑا۔"

میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ یک دم سب غبار، غصہ، آگ پہ جیسے کسی نے ٹھنڈا پانی ڈال دیا تھا۔ ان سب کو وہیں چھوڑ کر میں گھر چلا آیا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی پہلی نظر ایک کونے میں کتاب لیے بیٹھی سیماب پر پڑی، جس کا رنگ مجھے دیکھ کر اڑا تھا۔ میں نے اسے دیکھا اور بس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جسے میں الزام دے رہا تھا وہ سراسر بے گناہ تھی اور میں اس سے بدلہ لینے کے لیے کیا کر چکا تھا۔

☆☆☆

اس عمر میں عشق عاشقی کوئی نئی بات نہیں ہے وہ بھی ایک مرد کے لیے۔ یہ بات سب ہی جانتے ہیں۔ ابو بھی اس واقعے کو شاید بھول جاتے اگر میں نے سیماب کے ساتھ وہ حرکت نہ کی ہوتی۔ سیماب بھی اس دن کے بعد سے بجھ سی گئی تھی۔ پہلے وہ میری توجہ حاصل کرنے کے لیے میرے آگے پیچھے پھرا کرتی تھی۔ کسی نہ کسی طرح اپنی محبت جتاتی رہتی تھی کہ اسے میری پرواہ ہے۔ اب وہ مجھ سے مکمل کٹ چکی تھی۔ اتنی سی عمر میں وہ کملا کر رہ گئی تھی۔ باپ اولاد سے کب تک ناراض رہ سکتا ہے۔ رفتہ رفتہ ابو مجھے پہلے کی طرح مخاطب کرنے لگے تھے لیکن میں اب ان سے نظریں جھکا کر بات کرتا تھا۔ نجانے کیوں مجھ میں ہمت ہی نہ ہوتی کہ ابو سے نظریں ملاؤں۔ سیماب سے البتہ وہ پہلے سے زیادہ محبت کرنے لگے تھے، اس کا خیال وہ کسی قیمتی آبگینے کی طرح رکھتے تھے جیسے کہیں پھر سے ان کا اپنا بیٹا ہی ٹھیس نہ پہنچا دے۔ اور یہ بات میرے لیے جتنی باعث تکلیف تھی اتنی ہی باعث حسد بھی تھی۔ البتہ امی ہمیشہ سے میرے ساتھ ویسی ہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے ابو نے میری کسی ایک بھی حرکت کے بارے میں انہیں نہ بتایا ہو۔ وہ جیسی سیماب کے ساتھ تھیں، اس سے زیادہ ہی اچھی میرے ساتھ تھیں۔

زلفی سے میں اس دن کے بعد کبھی نہیں ملا حالانکہ اس نے بہت کوشش کی تھی مجھے منانے کی۔ پھر تھک ہار کر وہ خود ہی ایک طرف ہو گیا تھا اور یوں ہمارا دس سال پرانا ساتھ تمام ہو گیا تھا۔ لیکن اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ پہیلی اب تک نہ سلجھ سکی تھی کہ ابو کو میری اس حرکت کی خبر کس نے دی۔ یہ بات تو زلفی بھی نہیں جانتا تھا کہ میں سوچتا کہ یہ ضرور اس کا کیا دھرا ہے۔

حورین میرے لیے ایک قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ میں بھی زندگی میں آگے بڑھ چکا تھا۔ دوبارہ مڑ کر میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ کالج لائف ختم ہو چکی تھی اور اب یونیورسٹی لائف تھی جہاں حورین جیسی کئی تتلیاں میرے گرد منڈلاتی تھیں اور میری بھی ان سے بس وقت گزارے کی دوستی تھی اور اس بات سے ابو بخوبی واقف تھے۔

"تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے مونی۔" کھانے کی میز پہ وہ اکثر پوچھا کرتے۔ ان کا رویہ پہلے سے بہتر تھا لیکن اب ہم دونوں میں ہی وہ بے تکلفی نہ رہی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے ابو کے رشتے کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اب میرا کسی سے شکوہ بنتا نہیں تھا۔

"بہت اچھی۔" مجھے اچھا لگتا جب جب وہ میری پڑھائی کا مجھ سے پوچھا کرتے تھے۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی یونیورسٹی میں ٹاپ کرو۔" بہت عرصے بعد ابو نے مجھے لے کر اپنی کسی خواہش کا اظہار کیا تھا اور ابو کی اس چاہت کو پورا کرنے اور ان کی نظروں میں پھر سے اپنا کھویا ہوا مقام پانے کے لیے میں نے دن رات محنت شروع کر دی۔

سیماب اور ایوب کی روز رات لان میں بیٹھک لگا کرتی تھی، جہاں دونوں نجانے کیا راز و نیاز کیا کرتے تھے۔ میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھ دیکھ کر حسد کا شکار ہوتا تھا۔ دل کرتا تھا اسے ہاتھ سے پکڑ کر چلتا کروں اس گھر سے جو میرے باپ کو مجھ سے دور کر چکی تھی۔ اس وقت میں خود کو حق بجانب سمجھتا تھا کہ جو کچھ بھی میں نے اس کے کیا ٹھیک کیا۔ وہ اسی قابل تھی۔ میں اب بھی زیادہ غصہ آنے پر اس کی کتابیں چرا کر آتش نذر کر دیا تھا۔ اس کی وارڈ روب سے اس کے من پسند لباس اٹھا کر کچرے کے ڈھیر میں پھینک آتا تو کبھی راہ چلتی کسی بھکارن کو دان کر آتا۔ ایسا کرتے ہمیشہ مجھے سکون ہی ملا تھا۔

یونیورسٹی کے پہلے سمسٹر میں، میں نے ٹاپ ہی کیا تھا۔ ابو کا رویہ پہلے سے بہت بہتر بلکہ قریب قریب نارمل ہو چکا تھا۔ لیکن نجانے کیوں جب بھی اتفاقی طور پر میں ان کی جانب دیکھتا تو مجھے لگتا ان کی

نظریں اب تک مجھ سے شکوہ کناں ہیں۔ وہ مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ کیوں میں اپنی ہی بہن کے ساتھ ایسا کرتا ہوں۔ کبھی کبھی یہ سوال مجھے اتنا تنگ کرتا ہے کہ اس سے نجات پانے کے لیے میں سگریٹ پھونکنے لگتا۔ کبھی کمرے میں چھپ کر تو کبھی چھت پہ۔ کبھی سڑک پہ آوارہ گردی کرتے تو کبھی کسی پارک کے بنچ پر بیٹھ کر۔ یہ شاید میرے اندر کا گلٹ تھا جو مجھے چین سے نہیں رہنے دیتا تھا۔ میرا اندر ہی مجھ سے سوال کرتا تھا کہ کیوں مجھے سیماب سے اس قدر نفرت ہے۔ امی ابو کے بعد میرا سب سے قریبی رشتہ میری بہن کا ہی تو ہے۔ ایک ہی ایک بہن تھی جو مجھے بچپن سے کھٹکتی تھی۔ لیکن ان سوالوں کا کوئی جواب میرے پاس نہیں تھا۔

☆☆☆

سیکنڈ سمسٹر میں ایک جونیئر سے خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ اس کا نام عشوہ تھا۔ اپنی کلاس میں وہ سب سے زیادہ حسین تھی اور اسے اپنے حسن کا ادراک بھی تھا۔ اسی وجہ سے وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی سوائے میرے۔ ہم دونوں کے مابین دوستی کا آغاز نوٹس کے لین دین سے ہوا تھا چونکہ میں کلاس کا ٹاپر تھا اور یہ بات بہت جلد میرے جونیئرز تک بھی پہنچ گئی تھی۔ عشوہ کو کسی اسائنمنٹ میں میری مدد درکار تھی اسی لیے وہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی آئی تھی۔

''کیا میں آپ کا کچھ وقت لے سکتی ہوں؟''
میں لائبریری میں پچھلے دن کا لیکچر نوٹ کررہا تھا، جو غیر حاضری کی وجہ سے مس ہوگیا تھا جب وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔

''کہیے۔ کوئی کام تھا مجھ سے۔'' وہ وہیں بیٹھ گئی۔

''مجھے کچھ سوال سمجھ میں نہیں آرہے، پلیز اگر آپ مجھے گائیڈ کردیں۔'' اس کے اسائنمنٹ کے سوال میں نے دیکھے جس کا سارا میٹریل میرے پاس پڑا تھا۔

''میں کل نوٹس لادوں گا۔ آپ وہاں سے چیک کرلیجیے گا۔ پھر بھی سمجھ میں نہ آیا تو میں سمجھا دوں گا۔''

اگلے دن میں نے اسے اپنے تمام نوٹس اٹھا کر دے دیے تھے۔ بس یہیں سے ہماری دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ بعد ازاں وہ اپنی تمام اسائنمنٹس خود بنانے کے بجائے مجھے اٹھا کر دے دیتی اور میں بخوبی اپنا سارا کام چھوڑ کر اس کے کام پہلے کرتا۔ ہم دونوں ہر جگہ ساتھ دیکھے جانے لگے، یہاں تک کہ ہم دونوں کا ذکر خاص و عام کی زبان پہ تھا۔ باقاعدہ طور پہ ہم نے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہم جانتے تھے کہ دونوں کی طرف ہی پسندیدگی اب محبت کا روپ دھار چکی ہے۔ ہم آئے دن کلاسز بنک کرکے کہیں نہ کہیں گھومنے چلے جاتے۔ کبھی جناح سپر کی کسی مہنگی بوتیک میں گھسے کپڑے خرید رہے ہیں تو کبھی کسی ریسٹورنٹ میں لنچ اڑا رہے ہیں۔ عشوہ کے زندگی میں آنے کے بعد میں سب کچھ جیسے بھول ہی گیا تھا حتیٰ کہ اپنی پڑھائی کو بھی۔ ابو کی خواہش تھی کہ میں ہر سمسٹر میں ٹاپ کروں لیکن وہ مجھے تب یاد رہتی اگر میرا فوکس پڑھائی پہ رہتا۔ میں تو دن رات عشوہ کی عشوہ کی برداریوں میں ہی مگن تھا اور یوں سیکنڈ سمسٹر میں ٹاپ پوزیشن کی بجائے میں تھرڈ آیا تھا۔

''تمہارا رزلٹ کیوں ڈاؤن چلا گیا ہے مونی؟'' ابو مجھ سے پوچھ رہے تھے اور میں کچھ شرم سار سا بیٹھا توجیح بیان کررہا تھا۔

''اس سمسٹر میں کچھ ٹیچرز ایسے تھے جو مجھے اتنے اچھے نہیں آتے تھے، اسی لیے رزلٹ پہ اثر پڑا۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔''

ابو نے میری اس وضاحت پہ کوئی باز پرس نہیں کی تھی۔ لیکن مجھے کہیں اندر افسوس ہوا تھا۔ پر میں بھی کیا کرتا کہ دل پڑھائی پہ آمادہ نہ تھا۔ سیماب کے بارے میں دماغ کھپانے کا میرے پاس اب وقت نہیں رہا تھا۔ اب میرے سارے وقت پہ عشوہ کی حکومت تھی۔

☆☆☆

تھرڈ سمسٹر شروع ہوا ہی تھا کہ ایک روز عشوہ بے حد پریشان سی یونیورسٹی آئی تھی۔ میرے بہت کریدنے پر اس نے اپنے لیے آئے رشتوں کے بارے میں مجھے بتایا۔

"تم انکار کردو۔ کہہ دو کہ ابھی تم نے پڑھنا ہے۔" مارے باندھے پاس ہونے والی کے لیے پڑھائی کا بہانہ بنانا اس صدی کا سب سے بڑا لطیفہ تھا۔

"اتنا آسان نہیں ہے یہ سب۔ سارے رشتے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور جس رشتے پہ ڈیڈ بہت خوش ہیں وہ خاصے امیر لوگ ہیں اور دل و جان سے اس رشتے کے حق میں بھی ہیں۔ ڈیڈ بھی یہی چاہتے ہیں کہ کم از کم منگنی ہوجائے۔ شادی میری پڑھائی ختم ہونے کے بعد کرلیں گے۔ ان رشتوں سے انکار کروں گی تو کوئی اور آجائے گا۔ آخر کب تک میں ٹالتی رہوں گی منصور۔" کچھ سوچ کر میں نے فیصلہ لیا اور اسے تسلی دی۔

"میں اپنے پیرنٹس سے بات کرتا ہوں۔ وہ جلد ہی تمہارے گھر میرا پروپوزل لاتے ہیں۔"

"لڑکے والے میرے نام پلاٹ کرنے کو تیار ہیں۔" اپنے کیوٹکس لگے ناخنوں کو دیکھتے وہ مجھے بتارہی تھی۔

"ہم بھی کوئی ایسے گئے گزرے نہیں ہیں۔ یہ تو میں بھی کرسکتا ہوں۔" میری غیرت کو جوش آیا۔ وہ یک دم کھل اٹھی۔

"سچ میں منصور۔ تم مجھ سے اتنی محبت کرتے ہو؟"

"اس سے کہیں زیادہ۔" خود دھیلا نہ کمانے والا باپ کی کمائی کے زعم میں ایسے بڑے دعوے کررہا تھا۔

اس رات میں نے امی سے عشوہ کے بارے میں بات کی تھی کہ وہ ابو کو منا کر اس کے گھر میرا رشتہ لے کر جائیں۔ امی کچھ پریشان ہوگئیں۔

"اتنی جلدی کیا ہے منصور۔ ابھی تو تم پڑھ رہے ہو۔ پھر کوئی اچھی سی جاب ڈھونڈنا تو کردیں گے شادی بھی۔" امی کو اب میں کیسے سمجھاتا کہ جلدی کس بات کی ہے۔ ہم دل والوں کے دکھڑے بڑے کہاں سمجھتے ہیں۔

"امی، سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کے بہت رشتے آرہے ہیں۔ اس کے والدین اس کا رشتہ کہیں اور کرنا چاہتے ہیں اور میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔" امی یوں مسکرادیں جیسے کسی بچے کی نادانی پہ کوئی بڑا مسکرادیتا ہے۔

"لڑکیاں عموماً اس قسم کی باتیں کرکے لڑکوں کو پریشرائز کرتی ہیں۔ یہ بہت پرانے طریقے ہیں۔" امی کی اس بات پہ مجھے کچھ غصہ آگیا۔

"وہ ایسی نہیں ہے۔ بہت اچھی اور شریف خاندان کی لڑکی ہے۔ اگر اس کی مجبوری نہ ہوتی تو وہ کبھی مجھے فورس نہ کرتی۔" میں یوں کہہ رہا تھا جیسے اس کا سارا شجرہ نسب کھنگال چکا تھا۔ اسے جانے مجھے چند ماہ ہی تو ہوئے تھے اور میں کیسے دعوے سے کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، میں تمہارے ابو سے بات کرتی ہوں۔" امی فوراً پسپائی اختیار کرتے ہوئے بولیں۔ شاید جوان بیٹے کے سامنے کھڑے رہنے سے وہ ڈر گئی تھیں۔

نجانے امی نے ابو کو کیا کہہ کر راضی کیا ہوگا کہ صبح ناشتے کی میز پہ ہی ابو نے انتہائی سنجیدگی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس لڑکی کا پتا اپنی ماں کا دے دو اور اسے بتادینا کہ ہم کل شام کو اس کے گھر آئیں گے۔" میرا تو خوشی کے مارے ٹھکانا ہی نہ تھا۔ دل کیا اڑ کر عشوہ کے پاس پہنچ جاؤں اور اسے یہ خوش خبری سنادوں۔

امی ابو اگلے روز ہی اس کے گھر میرا رشتہ لے کر گئے تھے۔

میرے لیے پیچھے وقت کاٹنا مشکل ہوگیا تھا۔

نجانے وہاں کیا ہو رہا ہوگا، یہ سوچ کر ہی میں بے چین تھا۔ کاش کہ میں ساتھ ہی چلا جاتا۔ لان سے اندر اور اندر سے لان میں، چھت پہ، سیڑھیوں پہ گھوم پھر کر وقت گزار رہا تھا جب امی ابو وہاں سے لوٹے تھے۔ ابو نے ایک خاموش نگاہ میری خوشی سے تمتماتے چہرے پہ ڈالی اور اندر چلے گئے۔ امی بھی ان کے پیچھے مجھے نظر انداز کر کے جا چکی تھیں۔

کہیں ان کی طرف سے انکار تو نہیں ہو گیا۔'' لحظہ بھر کو میں نے سوچا۔ آخر میں کیسے بھول گیا تھا کہ اس کے ایک سے بڑھ کر ایک رشتے آ رہے ہیں اور وہ پلاٹ نام کرانے والے امیر لوگوں کا رشتہ۔ اسے تو میں بھول ہی چکا تھا۔ یاد آنے پہ میری بے چینی سوا ہو گئی۔ میں اندر امی ابو کے پاس گیا۔

''آخر کوئی بتائے گا بھی کہ کیا ہوا ہے؟'' جب میرے اضطراب پہ بھی وہ کچھ بتانے کو تیار نہیں ہوئے تو بے شرموں کی طرح مجھے خود ہی پوچھنا پڑا۔

''پوری دنیا چھوڑ کر ایک یہی لڑکی ملی تھی تمہیں؟'' ابو کے لہجے میں مایوسی واضح تھی۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ یہ کیوں کہہ رہے ہیں۔

''کسی جگہ رشتہ جوڑتے ہوئے خاندان بھی دیکھا جاتا ہے۔ بیٹا خالی صورت پہ کوئی ساری زندگی نہیں گزار سکتا۔ شرافت پہلا معیار ہوا کرتی ہے۔'' امی نے ابو کی بات کے اثر کو نرمی سے زائل کرنا چاہا تھا۔

''کیا مسئلہ ہے اس کے خاندان میں؟'' میں چونکا۔ امی کی بات مجھے بہت بری لگی تھی۔ امی نے ابو کو دیکھا اور ابو نے مجھے۔

''جانتے بھی ہو کہ وہ کس خاندان سے ہے۔ اس کے آباء میراثی رہے ہیں۔ اس لڑکی کے دادا طبلہ نواز تھے اور ابا بھی کئی سال تک اسی پیشے سے منسلک رہے ہیں۔ یہ تو اب اس نسل نے کالجوں یونیورسٹیوں کا رخ کیا ہے۔ بیٹے نے کسی امیر خاندان کی لڑکی پھانس کر اس سے شادی کی تو یہ لوگ پرانے محلے سے حال میں ہی یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔'' ابو غصے سے بتاتے چلے جا رہے تھے۔ عشوہ کے خاندان کے لیے ایسے الفاظ میں وضاحت مجھے سخت بری طرح چبھی تھی۔

''جو بھی ہے مجھے شادی عشوہ سے ہی کرنا ہے چاہیے اس کا خاندان کیا ہی ہو۔'' میں نے ہٹ دھرمی سے صاف جواب دیا تھا۔

''یہ جان کر بھی کہ۔'' امی نے تاسف سے مجھے دیکھا۔ انہیں لگا تھا کہ یہ سب سن کر میں خود ہی پیچھے ہٹ جاؤں گا لیکن میں اپنی جگہ سے انچ بھر بھی نہ ہلا تھا۔

''سب کچھ جان کر بھی عشوہ کے علاوہ میں کسی سے شادی نہیں کروں گا۔ یہ بات آپ لوگ کان کھول کر سن لیں۔'' میرا لہجہ بہت برا ہو گیا۔

''رشتہ کرتے ہوئے شرافت دیکھنا ضروری ہوتی ہے۔'' ابو کی بات میری جان جلا گئی تھی۔

''کیا بدمعاشی دکھائی ہے ان لوگوں نے؟ کسی کا قتل کیا ہے۔ ڈاکے مارے ہیں یا فحاشی کے اڈے چلاتے ہیں وہ لوگ جو آپ کب سے شرافت کے لاگ الاپ رہے ہیں۔ زندگی میں نے عشوہ کے ساتھ گزارنا ہے اس کے خاندان کے ساتھ نہیں۔ آپ لوگوں کو ٹھیک لگتا ہے تو رشتہ طے کر دیں ورنہ مجبوراً مجھے سب خود ہی کرنا پڑے گا۔ پھر مت کہیے گا کہ بیٹے نے پوچھا تک نہیں۔ کیونکہ جب آپ کو میری خوشی سے زیادہ شرافت پیاری ہے تو مجھے بھی آپ کے رشتے سے زیادہ اپنی محبت عزیز ہے۔''

میں نے شاید ہی کبھی اتنی بدتمیزی سے ان دونوں کو مخاطب کیا ہو جیسے ابھی کیا تھا۔ وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

''جو لڑکیاں موسیقی کی ایسی رسیا ہوں کہ اسی خاندان سے تعلق رکھتی ہو، وہ دل تو لبھاتی ہیں، گھر نہیں بساتیں۔''

''عشوہ ایسی نہیں ہے۔ اور اگر آپ لوگوں نے کسی قسم کی دخل اندازی کی تو میں بھول جاؤں گا کہ میرے کوئی ماں باپ بھی ہیں۔'' یہ کہتا میں وہاں سے

اٹھ آیا تھا۔ میری بدتمیزی کے کیا اثرات نکلنا تھے میں بھول کر عشوہ کو فون پہ تسلیاں دیتا مزے کی نیند سو گیا تھا۔ آنکھ کسی شور کے باعث کھلی تو رات کے دو بج رہے تھے۔ کھڑکی کے پار، ڈرائیو وے پہ ایمبولینس آئی کھڑی تھی اور اس میں ابو کو لے جایا جا رہا تھا۔ میں بھاگتا ہوا نیچے پہنچا تو ایمبولینس جا چکی تھی۔ امی ساتھ گئی تھیں اور سیماب لان کی سیڑھیوں پہ بیٹھی رو رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے ابو کو؟" اس نے ایک زخمی نگاہ مجھ پہ ڈالی جس میں کئی سوال تھے۔ ان سوالوں سے نظریں چراتے میں نے پریشانی سے دوبارہ پوچھا تھا۔

"بولتی کیوں نہیں ہوا کو کیا ہوا ہے؟"

"ہارٹ اٹیک۔"

میں وہیں ڈھے سا گیا تھا میری گستاخی نے میرے باپ کو اس حال تک نہیں اس سے کہیں آگے پہنچا دیا تھا۔ اس دنیا سے پار، دوسری دنیا میں۔ منصور حنان نے اپنے باپ کی جان لے لی تھی۔ یہ سب کیسے ہوا، کیوں ہوا۔ میں نہیں جانتا۔ میں جیسے کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں ابو کی آخری رسومات ادا کر رہا تھا۔ ہمارے گھر کی دنیا پل بھر میں تلپٹ ہو چکی تھی اور یہ سب میری وجہ سے ہوا تھا۔ میں نے کئی دن تک خود کو کمرے میں بند کر دیا تھا۔ سیماب دروازہ بجاتی اور کھانا باہر رکھ کر چلی جاتی۔ وہ امی کو بھی سنبھال رہی تھی اور تعزیت کے لیے آنے والوں کو بھی۔ میں تو بس کمرہ پکڑے ماتم منا رہا تھا۔ عشوہ سے میری کوئی بات نہیں ہوئی تھی نہ ہی میرا دل کیا تھا۔ امی سے نظریں ملانے کی ہمت نہ تھی سو کس منہ سے ان کے سامنے جاتا۔

ہفتے بعد میں یونیورسٹی کی شکل دیکھی تو۔ عشوہ مجھے دیکھتے ہی میری جانب لپکی۔

"منصور۔ آئی ایم سوری۔" وہ یوں کہہ رہی تھی کہ جیسے سب میں اسی کا عمل دخل ہو۔

"سب دوست گھر آئے ایک سوائے تمہارے اور تم جانتی تھیں کہ میں تمہارا منتظر ہوں گا پھر بھی تم نے اس دکھ کے موقع پر آنا ضروری نہیں سمجھا۔" اتنے دن سے یہ شکوہ میرے دل میں تھا جو میں نے اس کے سامنے آتے ہی کہہ ڈالا۔

"میں آنا چاہتی تھی منصور لیکن مجھے لگا کہ میرے وہاں آنے سے مسائل مزید بڑھ جائیں گے۔ آنٹی یقیناً مجھے اس سب کا قصوروار سمجھتی ہوں گی۔ ان حالات میں تم خود سوچو کہ میں وہاں کیسے آتی؟ آ جاتی تو کتنا ہنگامہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں نہیں آئی۔ پھر بھی تمہیں لگتا ہے کہ میں غلط ہوں تو میں ابھی اسی وقت تم سے معافی مانگتی ہوں اور تمہارے اور تمہارے ساتھ تمہارے گھر جا کر آنٹی سے تعزیت کرتی ہوں۔"

مجھے لگا کہ وہ اپنی جگہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میرا غم و غصہ اس کی معذرت سے ختم ہو چکا تھا۔ اس میں اس کا کیا قصور تھا بھلا؟ قصور تو سب میرا تھا۔

☆☆☆

گھر میں اب غیر معمولی خاموشی کا راج قائم تھا۔ امی مجھ سے کم کم ہی مخاطب ہوتی تھیں حالانکہ میں ان کے قدموں میں سر رکھ کر اپنے کیے کی معافی مانگ چکا تھا۔ بظاہر وہ مجھے معاف کر چکی تھیں لیکن نجانے کیوں ان کا انداز پہلے سا نہیں رہا تھا۔ شاید میرا جرم اتنا چھوٹا نہیں تھا کہ اتنی آسانی سے معاف ہو جاتا۔ کچھ جرم معاف ہو کر بھی سزا کاٹتے رہتے ہیں۔ سیماب پہلے سے کہیں زیادہ خاموش ہو گئی تھی۔ اپنا زیادہ وقت وہ امی کے ساتھ گزارتی تا کہ انہیں تنہائی محسوس نہ ہو۔ مجھے اس بات پر بھی غصہ آتا کہ وہ اس موقع پر فائدہ اٹھاتے میرے اور امی کے رشتے کو مزید کمزور کر رہی ہے۔

☆☆☆

کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ وقت بڑا استاد ہے۔ جو مرہم وقت لگاتا ہے کسی حکیم کے پاس دستیاب نہیں ہوتے۔ ابو کا دکھ بھی گزرتے وقت کے ساتھ مندمل ہو کر ایک یاد بن کر رہ گیا تھا۔ میری پڑھائی ختم ہو چکی تھی۔ ابو کے آفس میں ہی مجھے جاب مل گئی تھی کہ ان

کا دوران سروس انتقال ہوا تھا۔ سو یوں مجھے کچھ خاص محنت نہیں کرنا پڑی۔ عشوہ سے تو میں نے پہلے ہی عدہ کرلیا تھا کہ جاب ملتے ہی ہمارا رشتہ پکا ہو جائے گا۔ سو جاب ملنے کی دیر تھی کہ میں ایک بار پھر سے امی کے سر ہو گیا۔

"آپ عشوہ کے ہاں کب چل رہی ہے؟" امی نے مجھے یوں دیکھا جیسا میرا دماغ الٹ گیا ہو۔ انہیں میرے سوال پر یقین کرنے میں وقت لگا تھا۔

"اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی تم نے اس لڑکی کا خیال دل سے نہیں نکالا۔ کچھ تو اپنے باپ کی موت کا لحاظ کرلو مونی۔ انہیں مرنے کے بعد تو اذیت مت دو۔"

"جو کچھ بھی ہوا ہے میری وجہ سے ہوا ہے اس کی وجہ سے کچھ نہیں ہوا۔ آپ اسے کس بات کا الزام دے رہی ہیں؟"

"تمہارے ابو کو اس لڑکی سے تمہارا رشتہ ہونا بالکل قبول نہیں تھا اور میں وہ کام کیسے کرسکتی ہوں جس میں ان کی مرضی شامل نہیں تھی۔"

"وہ میری محبت ہے امی اور میں اسی کے ساتھ ایک پرسکون زندگی گزار سکتا ہوں۔ خوش رہ سکتا ہوں۔ ابو اب چلے گئے ہیں۔ ان کی خواہشات اور پسند ناپسند یاد رکھنے کے بجائے آپ کو میری پسند کا خیال کرنا چاہیے جو زندہ ہے۔" میں یہ نہیں کہنا چاہتا تھا لیکن میں نے نجانے کیسے یہ سب کہہ دیا۔ میں اتنا خودغرض نہیں بننا چاہتا تھا لیکن میں بن رہا تھا۔

امی کتنی دیر میرا چہرہ دیکھتی رہیں جیسے انہیں میری بات نے بہت دکھ دیا ہو، شاید وہ مجھ میں اپنا بیٹا تلاش کررہی تھیں جو انہیں مل نہیں رہا تھا۔

"ٹھیک کہا تم نے۔ مرنے والوں کو بھول جانا چاہیے جیسے تم بھول چکے ہو۔ اب جیسا تم چاہو گے ویسا ہی ہوگا۔ میں چلوں گی تمہارے ساتھ یہ رشتہ لے کر لیکن میری ایک بات یاد رکھنا کہ جس رشتے میں ماں باپ کی دعائیں شامل نہ ہوں وہ کبھی خوشی اور سکون کا باعث نہیں بن سکتا۔ اور تمہارے اس رشتے کی بنیاد میں تمہارے باپ کی موت شامل ہے۔" شاید وہ جوان بیٹے کے سامنے ڈٹ نہیں سکتی تھیں۔ اسی لیے فوراً مان گئی تھیں۔ لیکن ان کی بات نے مجھے تکلیف دی تھی۔

"آپ مجھے بددعا دے رہی ہیں؟"

"ماں ہوں اس لیے ایسا نہیں کرسکتی۔" اس وقت انتہا کی بے بس تھیں اور میں اسی بے بسی کا فائدہ اٹھاتے اگلے دن ہی انہیں عشوہ کے ہاں لے گیا تھا۔ امی نے کسی روبوٹ کی طرح وہاں سارے معاملات طے کیے تھے۔ جو بھی تھا اب سب کچھ میری مرضی کا ہو رہا تھا۔ میں اسی میں خوش تھا۔

☆☆☆

عشوہ جلد ہی میری بیوی بن کر اس گھر میں آگئی تھی۔ اس کا اس گھر میں کیا مقام ہے یہ میں نے اس پہ باور کردیا تھا۔ وہ امی سے بالکل اسی محبت سے پیش آتی جیسے کہ میں آتا تھا اور سیماب سے اتنا ہی دور رہتی جتنا کہ میں رہا کرتا تھا۔ میرے رشتوں کو وہ میری نظر سے ہی دیکھ رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ اچھی بیوی ہے۔ اچھی بہو ہے۔ لیکن شاید امی اس سے اتنا خوش نہیں تھیں اور سیماب کیا سمجھتی تھی اس سے مجھے کوئی سروکار تھا ہی نہیں۔ پھر بھی عشوہ کو امی سے شکوہ تھا کہ وہ اس کو بیٹی تو دور بہو تک نہیں تسلیم کرتیں۔

"سارا دن وہ مجھ سے جتنی بات کرتی ہیں اس کا حساب انگلیوں پہ لگایا جاسکتا ہے میرے سے کوئی کام نہیں کہتیں۔ مجھے کسی خاطر میں نہیں لاتیں۔ مجھے لگتا ہی نہیں ہے کہ میں اس گھر کا فرد ہوں۔ یہ گھر یہ لوگ میرے ہیں۔ اس گھر میں اجنبیت کے احساس کے سوا مجھے کچھ نہیں ملا۔" اس رات میرے آفس سے پہ عشوہ کا موڈ سخت خراب تھا۔

"وہ بات نہیں کرتیں تو تم خود سے ان سے بات کرلیا کرو۔ ان کے کہے بغیر ان کے کام کردیا کرو۔ آہستہ آہستہ تمہاری اس گھر میں خود ہی جگہ بن جائے گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہونے میں وقت لگتا ہے۔ تم جانتی ہو نا کہ اس شادی میں ان

کی مرضی شامل نہیں تھی۔ اب تم ہی تھوڑا صبر سے کام لے لو۔"

"یہ سب کرنے سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔ نہ میری جگہ بنے گی نہ ہی مقام بدلے گا۔ امی کو بہو سے زیادہ بیٹی پسند ہے اور وہ وہی کرتی ہیں جو وہ کہتی ہے۔ اتنی سی لڑکی نے سارا گھر اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔ جن گھروں کی مالکن بیٹیاں بنی بیٹھی ہوتی ہیں وہ کبھی بہوؤں کے نہیں ہوسکتے۔" وہ سیماب سے عاجز تھی۔

میں نے اسے تسلی دی کہ میں امی سے بات کروں گا۔

"آپ نے اسے اب تک دل سے قبول نہیں کیا تب ہی اس سے بات تک کرنا گوارا نہیں کرتیں۔" اس رات میں امی کے پاس گیا تھا۔ سیماب انہیں دوائیاں دے رہی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر اس نے کمرے سے نکل جانا ضروری سمجھا تا کہ میں تنہائی میں امی کے ساتھ کچھ وقت گزار سکوں۔ وہ اپنی پڑھائی امی کی گرتی صحت اور تنہائی کی وجہ سے چھوڑ چکی تھی۔ اب وہ بس امی سا سایہ ان کا خیال رکھا کرتی تھی اور یہ بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔

"قبول کیا ہے تب ہی وہ اس گھر میں ہے۔ نہ کیا ہوتا تو یہاں چلتی پھرتی دکھائی نہ دیتی۔"

"اسے لگتا ہے کہ وہ اس گھر میں اجنبی ہے۔ آپ اسے اپنائیت کا احساس دلائیں گی تو ہی آپ دونوں کی آپس میں بن سکے گی۔ میں کب تک آپ دونوں کے درمیان ایک پل کا کام کروں گا۔"

"اس گھر میں سب ہی ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ ماں، بیٹے کے لیے۔ بہن بھائی کے لیے۔" ابو کی وفات کے بعد نجانے کیوں امی اتنی تلخ ہوگئی تھیں اور مجھے لگتا تھا اس سب میں سیماب کا ہاتھ ہے جو امی کے سر پر سوار یقیناً ان کی برین واشنگ کرتی رہتی ہے۔ انہیں میرے خلاف ورغلاتی رہتی ہے۔ پہلے وہ ابو کے ہوتے یہی کام ان کے ساتھ کرتی تھی اب اس نے امی کو پکڑ لیا تھا لیکن اپنا کام نہیں چھوڑا تھا۔

"سیماب کو ہر وقت ساتھ چپکائے رکھنے سے کہیں گنا بہتر ہے کہ آپ عشوہ کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ ڈویلپ کریں۔ آپ نے زندگی بہو کے ساتھ گزارنا ہے بیٹی کے ساتھ نہیں۔ عقل مند عورتیں وہی ہوتی ہیں جو بہوؤں کو بیٹیوں کا مقام دیتی ہیں اور بیٹیوں کو پرایا سمجھتی ہیں۔"

امی میری اس بات پہ کافی دیر میری صورت دیکھتی رہیں حتیٰ کہ میں ان کے اس طرح دیکھنے سے چڑ گیا اور پہلو بدل کر رہ گیا۔

"بیٹیاں کسی بھی عمر میں ہوں، ماں کا دکھ سمجھتی ہیں۔ یہ کام کبھی بہوئیں یا بیٹے نہیں کرسکتے۔" مجھے امی کی اس بات سے دکھ ہوا تھا۔ غصہ بھی آیا تھا۔

"ابو کہتے تھے کہ سیماب کبھی میری جگہ نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ ایک بیٹی ہے۔ انہیں میری اہمیت کا احساس تھا کہ میں ایک بیٹا ہوں۔ ان کا سہارا ہوں۔ آپ کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے۔ بجائے اس بات کا احساس کریں آپ بیٹی کو بیٹے پہ فوقیت دے رہی ہیں۔ مت بھولیں کہ آج نہیں تو کل اسے اس گھر سے چلے جانا ہے۔ تب رہنا آپ نے ہمارے ساتھ ہی ہے۔ بہو سے بنا کر رکھنے میں آپ کا اپنا فائدہ ہے۔" میں نے انہیں ابو کی کہی بات یاد کروائی تو وہ جیسے میری اور ابو کی نادانی پہ ہنس دیں۔

"ہاں سیماب کبھی تمہاری جگہ ہو بھی نہیں سکتی۔ کیونکہ جو دکھ تم نے دیا وہ بیٹی کبھی نہیں دے سکتی۔ تمہارے ابو بھی یقیناً موت کے وقت جان گئے ہوں گے کہ جسے وہ سہارا سمجھ رہے تھے وہی انہیں لے ڈوبا۔ جہاں تک فائدے نقصان کی بات ہے تو اب کسی بات میں کوئی فائدہ نہیں رہا مونی۔ اب تم جاؤ اور جاتے ہوئے لائٹ بند کرجانا۔ میں سونا چاہتی ہوں۔" وہ کروٹ بدل کر لیٹ گئیں اور میں ان کی آخری بات پر اپنا غصہ دبا کر چپ چاپ وہاں سے نکل آیا۔

☆☆☆

عشوہ نے اپنا بی ایس مکمل کرلیا تھا۔ اب وہ

نوکری کرنا چاہتی تھی لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ گھر اور امی پر دھیان دے۔ میں کوئی روایتی اور ظالم شوہر نہیں تھا لیکن نجانے کیوں اس کی نوکری کے حق میں بھی نہیں تھا۔

"سارا دن گھر پہ پڑے رہ کر میں کیا کروں؟ نہ کوئی بات کرنے والا ہے اور نہ ہی دل لگانے والا۔ میں نے اتنی تعلیم حاصل کی ہے تو کچھ تو فائدہ ہونا۔"

"وہ نہیں بات کرتیں تو تم خود بات کرلیا کرو۔ خود سے دل لگاؤ گی تو دل بھی لگ ہی جائے گا۔ اب اس گھر میں آئے تمہیں خاصا وقت ہوچکا ہے۔ ایڈجسٹ ہوجانا چاہیے تھا۔" وہ میری بات پہ نخوت سے ہنسی۔

"جب تک سیماب اس گھر میں ہے میں کبھی سیٹ نہیں ہوسکتی۔ اس کی میرے آرپار اترتی نظریں مجھے یوں ٹٹولتی ہیں جیسے میں گناہ گار ہوں۔ جیسے میں رخصت ہوکر نہیں بھاگ کر اس گھر میں آئی ہوں اور میں نے ہر شے پہ قبضہ کررکھا ہے۔ وہ اس گھر کو اپنی ملکیت سمجھتی ہے۔ اپنی مرضی سے سارے گھر کو چلاتی ہے۔ سیاہ سفید کی مالک بنی بیٹھی ہے۔ میری کہیں کوئی جگہ ہے ہی کہاں اس گھر میں۔"

یہ نند بھابھی کا ازلی حسد اور بغض بول رہا تھا۔ بن بیاہی نندیں یوں بھی بھابھیوں کی آنکھ میں کھٹکا کرتی ہیں۔ سیماب اگر مجھے لاکھ پسند بھی ہوتی تو بھی عشوہ کی ان باتوں کی وجہ سے میں اس سے بدگمان ہوچکا ہوتا۔ یہ اور بات تھی کہ میں تو ازل سے اس سے بدگمان تھا۔

"تم اسے نظر انداز کرو۔ اس کی کوئی اوقات نہیں ہے اس گھر میں شروع سے۔ یہ گھر تمہارا ہے اور تمہارا ہی رہے گا۔"

"بات صرف سیماب کی نہیں ہے۔ جتنی پاکٹ منی آپ مجھے دیتے ہیں اس میں میرا گزارا نہیں ہوتا۔ مجھے مزید پیسے چاہئیں۔ اسی لیے میں اپنا کمانا چاہتی ہوں۔"

"میں تمہیں مزید پیسے بھی دوں گا۔ بس یا کچھ اور؟"

"آپ نے شادی سے پہلے پلاٹ نام کرنے کی بات کی تھی۔ اس کا کیا ہوا؟ امی کل مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔" وہ اب لاڈ سے میرے گلے کا ہار بنی بیٹھی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ جوش وجذبات میں ایک بات منہ سے نکال دی تھی جواب وہ مجھے یاد کرار ہی تھی۔

"آنٹی کو کیا پتا میں نے ایسی کوئی بات کی تھی؟"

"میں نے اسی وقت بتادیا تھا جب پہلی بار انکل آئے تھے۔ اسی وجہ سے تو وہ اس رشتے پر راضی ہوئی تھیں۔ ہر ماں باپ کی طرح انہیں بھی اپنی بیٹی کا فیوچر عزیز ہے اور وہ اسے سیکیور کرنا چاہتی ہیں۔"

"دیکھتا ہوں۔" آفس سے تھکا ہارا میں گھر آیا تو عشوہ کی یہ گردان مجھے ذرا نہیں بھائی تھی۔ ان دونوں آڈٹ کا کام چل رہا تھا اور مصروفیت بہت زیادہ تھی۔ گھر آکر میں سکون چاہتا تھا اور گھر میں بھی سکون رخصت ہوچکا تھا۔

"ویسے آپ، سیماب کی شادی کا کیوں نہیں سوچتے؟ اچھا ہے ناوقت سے اپنے گھر کی ہوجائے۔ بیٹیوں کو اپنے گھر کا جتنی جلدی ہو کردینا چاہیے۔ اس طرح امی اور میرے درمیان جو دوری ہے وہ بھی دور ہوجائے گی۔"

اس بارے میں واقعی میں نے اب تک نہیں سوچا تھا۔ عشوہ کی اس بات پہ میں چونکا تھا۔ اس کی بات میں وزن پاکر میں نے امی سے بات کرنے کا فیصلہ کیا لیکن امی ابھی اس حق میں نہیں تھیں۔

"وہ ابھی کم عمر ہے۔ اتنی جلدی کیا ہے شادی کی۔"

"ابھی سے آپ اس کے رشتے دیکھنا شروع کریں گی تو کسی اچھی جگہ شادی ہوسکے گی۔" یہ بھائیوں والی فکر ہرگز نہیں تھی۔ یہ تو اس سے جان چھڑانے کا بہانہ تھا۔

"اس کی شادی کی تم فکر مت کرو۔ تمہاری خالہ مجھ سے پہلے سے بات کرچکی ہیں حماد کے لیے وہ بھی ابھی پڑھ رہا ہے۔ جب تعلیم مکمل کرلے گا تو دیکھیں

گے۔" بالا ہی بالا وہ اتنا کچھ طے کیے بیٹھی تھیں اور مجھے بھنک بھی نہ لگنے دی۔ میں غصے میں وہاں سے چلا آیا۔

☆☆☆

اس بات کو چند دن ہی گزرے تھے کہ ایک رات وہ سب کچھ ہو گیا جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں آفس سے لوٹ کر شام کی چائے پی کر کمرے میں آرام کی غرض سے لیٹنے چلا گیا تھا۔ رات کے کھانے میں ابھی وقت تھا۔ اچانک عشوہ بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی اور رنگت اڑی ہوئی تھی۔

"منصور۔ اٹھیں۔ جلدی میرے ساتھ۔" وہ مجھے جھنجوڑتے ہوئے بولی۔

"ہوا کیا ہے؟" اچانک کچی نیند سے جاگنے کی وجہ سے میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔

"چل کر خود دیکھ لیں کیا ہوا ہے۔" وہ جتنی تیزی سے آئی تھی اتنی تیزی سے واپس کمرے سے نکل گئی تھی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی نکلا تھا۔ چپل بھی الٹی سیدھی پاؤں میں اڑسائی تھی۔

عشوہ ٹیرس کی طرف گئی تھی جہاں کا دروازہ اس نے باہر سے بند کر دیا تھا۔ دروازہ کھولنے پر سامنے نیم تاریکی میں جو دو چہرے دکھائی دیے انمیں سے ایک سیماب کا تھا اور دوسرا میرے لیے انجان تھا۔ فوری طور پر میں سمجھ ہی نہیں سکا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ عشوہ نے فوراً اسے اونچا اونچا بولنا شروع کر دیا۔

"اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ آپ کی بہن یہاں ٹیرس پہ اس لڑکے کے ساتھ کیا گل کھلا رہی ہے۔" سیماب کے چہرے پہ سراسیمگی تھی اور وہ سر نفی میں ہلاتے کہہ رہی تھی۔ میں بت بنا کھڑا سب دیکھ اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ سراسر جھوٹ بول رہی ہیں بھا، میں تو اس لڑکے کو جانتی تک نہیں۔" وہ میری جانب بڑھی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر کپکپا رہے تھے اور سانس دھونکنی سی تیز چل رہی تھی۔

"سیماب۔ تم اس موقع پر سارا الزام میرے سر ڈال کر یوں انجان بن گئی ہو جیسے سارا قصور میرا ہو۔ کیا تم مجھ سے اتنی ہی محبت کرتی تھیں؟" سامنے کھڑا لڑکا کہہ رہا تھا۔ میں اسے پہچان چکا تھا۔ وہ برابر والا زمان تھا۔ یہ لوگ چند ماہ پہلے ہی یہاں شفٹ ہوئے تھے۔ آتے جاتے میں اسے کئی بار دوستوں کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ اپنی حرکات و سکنات کے اعتبار سے وہ مجھے کوئی اتنا اچھے کردار کا لڑکا نہیں لگتا تھا۔

"منصور۔ میں نے خود ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ نجانے کب سے یہ کھیل ہماری ناک تلے کھیلا جا رہا تھا۔ اب پکڑی گئی ہے تو کیسے مکر رہی ہے۔ بہانے بنا رہی ہے۔"

"جھوٹ مت بولیں بھابھی۔ اپنا گناہ میرے سر مت تھوپیں۔ یہ لڑکا مجھ سے نہیں آپ سے ملنے آیا تھا۔" سیماب چیخی اور ساتھ ہی میرا ہاتھ اس کا گال لال کر گیا۔ اس کی مجال کیسے ہوئی تھی کہ وہ اپنے کالے کرتوتوں میں میرا بیوی کا نام لے رہی تھی۔

"بکواس کرتی ہو۔ میری بیوی پہ الزام لگا رہی ہو۔ اپنے کرتوت چھپانے کے لیے جھوٹ بول رہی ہو۔ میں تمہاری جان نکال دوں گا۔" سیماب گال پہ ہاتھ رکھے بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ساتھ ہی میں نے سامنے کھڑے اس لڑکے کا گریبان تھام لیا۔

"اور تمہاری مجال کیسے ہوئی میرے ٹیرس تک پہنچنے کی؟ میں تمہارا خون کر دوں گا۔ میرا ہاتھ اٹھنے ہی والا کہ سامنے کھڑا لڑکا فوراً اپنا آپ چھڑاتے پھنکارا۔ عشوہ نے بھی مجھے پیچھے کیا کہ کہیں میں کچھ کر ہی نہ گزروں۔

"کیا کر رہے ہیں منصور؟"

"تمہاری بہن ہی بلاتی تھی مجھے یہاں۔ اتنا غصہ ہے تو پہلے بہن کو لگام دو جواب بڑی معصوم بنی کھڑی ہے جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو۔"

مجھے پرے کرتا وہ پیچھے کھڑی سیماب پہ ایک نظر ڈال کر ٹیرس سے اپنے ٹیرس پہ کود گیا۔ میں وہیں کھڑا

اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ عشوہ آگے بڑھ کر میرا کاندھا ہلاتے کہہ رہی تھی۔

"ایسے کیسے جانے دیا آپ منصور۔ اتنی آسانی سے اتنا بڑا معاملہ کیسے ختم کر سکتے ہیں آپ؟"

"تو کیا اپنی عزت کو چوراہے پہ لٹکا دوں؟ اس کا خون کر کے کود جیل چلا جاؤں وہ بھی اس بدذات کے لیے جو نجانے پیدا ہی کیوں ہوئی؟"

"آپ کیوں جیل جائیں۔ یہ جو کھڑی ہے عزت کا جنازہ نکالنے والی اسے کیوں قید میں نہیں ڈالتے؟" عشوہ ہاتھ نچا نچا کر بولی۔ میں نے مڑ کر پتھر بنی سیماب کو دیکھا۔ اس کا ہاتھ تھام کر اسے گھسیٹ کر نیچے لاتا امی کے کمرے میں پٹخ دیا۔

"امی اس نیک اولاد کو سنبھالیں جس کی جوانی ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے اور یہ ٹیرس پر چڑھی ہماری عزت کا جنازہ نکال رہی ہے۔" سیماب امی کے بستر پر آنسو بہاتے سر جھکائے پڑی تھی۔

"کیا بکواس کر رہے ہو اپنی بہن کے بارے میں؟" امی نے سیماب کو اٹھا کر اپنے ساتھ لگا لیا جس کے رونے میں تیزی آگئی تھی۔

"یہ چھپ چھپ کر اوپر کسی لڑکے سے ملتی تھی۔ آج عشوہ نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے اس لڑکے کے ساتھ۔"

"امی۔ یہ جھوٹ ہے سب۔ میں ایسی نہیں ہوں امی۔ آپ جانتی ہیں میں ایسی نہیں ہوں۔ میں نے تو آج تک کسی لڑکے سے بات تک نہیں کی۔ ملنا تو دور کی بات ہے۔" امی کے سامنے بلکتے وہ بالکل ایک معصوم بچی لگ رہی تھی جو ماں کی گود سے نکل کر بے رحم دنیا میں جھونک دی گئی تھی۔

"میں نے خود پکڑا ہے تمہیں اس لڑکے کے ساتھ۔ کیا یہ سب جھوٹ ہے؟ وہ لڑکا جو کچھ کہہ رہا تھا کیا وہ جھوٹ تھا؟" میں پہلے سے بھی زور سے چلا اٹھا۔ میرا دماغ پھٹنے والا تھا۔

"ہاں سب جھوٹ ہے۔ بالکل ویسا ہی جھوٹ جیسا آپ نے تب بولا تھا جب میرے ای میل اکاؤنٹ سے آپ نے خود میسجز ٹائپ کر کے اپنے بنائے ایک اکاؤنٹ پہ بھیجے تھے تاکہ مجھے بدنام کر سکیں۔ میں تب بھی بے گناہ تھی اور آج بھی بے گناہ ہوں۔ تب وہ سازش آپ نے رچائی تھی۔ آج آپ کی بیوی نے رچائی ہے۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چلائی تھی۔ میں ساکت رہ گیا تھا۔ نجانے کیوں مجھے لگا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ اس کی آنکھیں ایک سچے انسان کی آنکھیں اور اس کا لہجہ کسی بہادر کا لہجہ تھا۔

"امی۔ وہ لڑکا مجھ سے نہیں بھابھی سے ملنے وہاں آیا تھا۔ رنگے ہاتھوں انہوں نے نہیں، میں نے انہیں پکڑا تو اپنا آپ......"

"بکواس کرتی ہے یہ۔" عشوہ اس کی بات کاٹ کر چلائی تھی۔ اپنا گناہ مجھ پہ تھوپ رہی ہے۔ مجھے کیا پڑی ہے اپنا شوہر چھوڑ کر کسی اور کے پیچھے جانے کی۔ یہی ہے کہ جس کے جذبات قابو میں نہیں ہیں۔ اس لیے کب سے کہہ رہی ہوں کہ اس کی شادی کروا دیں لیکن یہاں کوئی سنتا ہی کہاں ہے میری۔ اب کھل گیا نا گل، جوان بیٹیاں کوئی گھر میں بٹھانے کی چیز نہیں ہوتیں۔ ان کو جتنا جلد ہو اپنے گھر کا کر دینا چاہیے۔" عشوہ غصے سے چلا رہی تھی۔

"میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ اپنے مرے ہوئے باپ کی عزت کا پاس ہے مجھے۔ لیکن وہ سچ کہا کرتے تھے کہ ان کے بعد میری جان اور عزت کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ میں اپنے ہی گھر میں بھی محفوظ نہیں رہی۔ نجانے کتنی بار میری عزت کا جنازہ اپنے بھائی کے ہاتھوں ہی نکلے گا۔" وہ بلک بلک کر رو دی تھی۔ میں کتنی دیر ساکت کھڑا سب سنتا رہا تھا۔ سب دیکھ رہا تھا۔ نجانے کس چیز نے مجھے پتھر کر دیا تھا کہ ہلنے کی مجال نہیں ہو رہی تھی۔ ابو یہی سب تو کہا کرتے تھے میرے بارے میں۔

"منصور آپ کچھ کہتے کیوں نہیں؟ دیکھیں یہ کیسے مجھ پہ اپنا گناہ تھوپ رہی ہے۔" عشوہ نے مجھے جھنجوڑا تو جیسے میں ہوش کی دنیا میں لوٹا تھا۔

''میں اسے اسی لڑکے کے ساتھ چلتا کرتا ہوں جس کے ساتھ یہ پکڑی گئی ہے۔'' بہت دیر بعد میں نے کہا۔ عشوہ نے فوراً دخل اندازی کی۔ اس کے ساتھ کیسے چلتا کر سکتے ہیں اسے؟ وہ تو شکل سے ہی کوئی لوفر لگتا ہے۔ کل کو اسے نکال باہر کیا تو پھر یہیں پڑی ہوگی کوئی نیک شریف آدمی دیکھ کر نکاح کر دیں جو اسے عزت سے رکھے۔ اس نے تو ہماری عزت کا پاس کیا نہیں لیکن ہمیں تو اس گھر کی بیٹی ہونے کے ناطے اس کی عزت کا بھرم رکھنا ہوگا۔'' اس کی بات میں دم تھا۔ اس لیے میں خاموش ہوگیا۔

''کل اس کا نکاح ہے امی۔ اور میں ایک سے دوسرا لفظ نہیں سنوں گا۔ آپ خالہ سے بات کریں اگر وہ مان جائیں تو ٹھیک ورنہ میں اپنے ایک جاننے والے سے کل ہی نکاح پڑھوا رہا ہوں۔'' امی اور سیماب روتے ہوئے میری شکل دیکھ کر رہ گئیں اور میں وہاں سے نکل آیا۔ عشوہ بھی میرے ہم قدم تھی۔ وہ ساری رات میں نے دکھتے سر اور بے چینی میں جاگتے گزارتی تھی۔ ساری رات نجانے کیوں سیماب کا کہا وہ ایک جملہ میرے کانوں میں گونجتا رہا۔

''ہاں سب جھوٹ ہے۔ بالکل ویسا ہی جھوٹ جیسا آپ نے تب بولا تھا جب میرے ای میل اکاؤنٹ سے آپ نے خود میسجز ٹائپ کر کیا پنے بنائے ایک فیک اکاؤنٹ پہ بھیجے تاکہ مجھے بدنام کر سکیں۔ میں تب بھی بے گناہ تھی اور آج بھی بے گناہ ہوں۔''

وہ سب جانتی تھی لیکن خاموش رہی۔ اتنے سال بس خاموش ہی رہی۔ یہ بات میرے دل و دماغ سے جا نہیں رہی تھی۔ کیسا عجیب سا لہجہ تھا اس کا جیسے سچ اسی ایک لہجے اور جملے پہ ختم ہوگیا تھا۔ ساری رات آنکھوں میں کاٹ کر فجر کے قریب میری آنکھ لگ گئی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح میں جاگتے ہی امی کے کمرے میں گیا تھا۔ امی کی متورم آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ساری رات روتی رہی ہیں، سوئی نہیں ہیں۔ سیماب بھی وہیں ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی لیکن وہ خاموش تھی یا رو نہیں رہی تھی۔ شاید اپنی قسمت کے فیصلے کی منتظر تھی کہ اب تقدیر اس کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔

''آپ نے خالہ سے بات کی یا میں کروں؟''

''وہ مجھ سے افتاد کی وجہ جاننا چاہتی ہے کہ آخر ایسا کیا ہوگیا کہ ہم آج کے آج سیمی کا نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ کیا وجہ بتاتی کہ اس کا بھائی اور بھابھی اسے اس گھر سے چلتا کرنا چاہتے ہیں وہ بھی آج ہی؟ یا کل جو کچھ ہوا وہ بتا دیتی تاکہ سارے خاندان میں رہی سہی عزت کا جنازہ نکل جاتا۔ میری بے گناہ بچی سنگسار کرنے لائق ٹھہرائی جاتی۔'' امی کا لہجہ دکھی نہیں تھا ٹوٹا ہوا تھا۔ بات کے اختتام پر وہ رو دی تھیں۔

''میں خود خالہ سے بات کرتا ہوں۔'' میں اٹھنے لگا تو امی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''وہ اتنی جلدی حماد کی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ وجہ میں اسے بتا نہیں سکتی۔ اپنی بیماری کا بہانہ تک میں نے اس سے بنا ڈالا ہے لیکن وہ میری یہ مجبوری سمجھنے کو تیار نہیں ہے کیونکہ اس کی اپنی کئی مجبوریاں ہیں۔ اسے حماد کے ساتھ نازش کی شادی بھی کرنا ہے۔ نازش کا ابھی کہیں رشتہ نہیں ہوا۔ وہ کیسے بیٹی سے پہلے بیٹے کی شادی کر دے؟'' وہ بالکل بے دلی دکھائی دے رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے پھر میں اس کی شادی وہیں کروں گا جہاں مجھے مناسب لگے گا۔''

''یہ ظلم مت کرو بیٹا۔ میں جانتی ہوں یہ بے قصور ہے۔ اگر تمہیں اعتراض ہے تو میں اسے تمہاری نانی کے ہاں بھجوا دیتی ہوں۔ یہ وہیں رہ لے گی۔ تب تک حماد کی تعلیم بھی مکمل ہوجائے گی اور میں اس کی شادی کر دوں گی لیکن یہ ظلم مت کرو۔'' امی نے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ ایک پل کو میرا دل ماں کے جڑے ہاتھوں کو دیکھ ڈانوڈول ہوا تھا۔

''نانی کے ہاں رہنے کا لوگوں کو کیا جواز دیں

گے ہم؟لوگ کیا کہیں گے کہ بھائی دو دن بٹھا کر نہ کھلا سکا؟"عشوہ چمک کر بولی۔"میں کچھ بھی کہہ دوں گی۔تم دونوں پہ بات نہیں آئے گی۔"امی رو دینے کو تھیں۔

"منصور اس کی رشتہ جہاں بھی کرے گا دیکھ بھال کر کرے گا۔یوں بھی آج ایک جگہ آنکھ مٹکا چل رہا تھا تو کل کہیں اور گل کھلائے گی۔ہم کب تک اس کی رکھوالی کریں۔بہتر ہے اپنے گھر کی ہو جائے۔"

مجھے لگا عشوہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔میں اٹھ کر چلا آیا تھا۔شام تک سیماب کے نکاح کی ساری تیاری ہو چکی تھی۔

"نکاح خوان آنے والے ہیں اور عقیل صاحب بھی۔سیماب کو بولیں کہ تیار ہو جائے۔"

عشوہ امی کے کمرے میں پیغام دے آئی تھی۔

مسٹر عقیل میرے ایک دوست کے ماموں تھے۔ان کی بیوی کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا اور وہ دوسری شادی کرنا چاہتے تھے۔وہ ایک ذمہ دار لڑکی چاہتے تھے جو گھر سنبھال سکے۔میں نے ان سے کال پہ بات کی تھی کہ وہ میری بہن سے شادی کر لیں۔میری بات سن کر وہ شاکڈ رہ گئے تھے۔

"ہماری عمروں میں خاصا فرق ہے منصور۔یہ ممکن نہیں ہے۔تم یہ سب کیوں کرنا چاہتے ہو؟اپنی کم سن بہن کے لیے اسی کا کوئی ہم عمر ڈھونڈو۔"

"امی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اور وہ چاہتی ہیں کہ سیماب کا کسی اچھی جگہ رشتہ ہو جائے۔ایسے میں مجھے آپ ہی بہتر آپشن لگے ہیں۔"یہ کوئی دلیل نہ تھی جس کی بنا پہ وہ سیماب سے شادی کے لیے رضا مند ہو جاتے۔اور یہی ہوا تھا وہ نہیں مان رہے تھے۔

"تم اس کے لیے کوئی اچھا رشتہ تلاش کرو منصور۔یہ جوڑ کسی طرح بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

"سر!سیماب کا بچپن میں ایک ایکسیڈنٹ ہوا تھا جس کی بنا پہ اب وہ ساری زندگی ماں نہیں بن سکتی۔ایسے میں ہم کسی کنوارے لڑکے سے اس کی شادی کر کے اس لڑکے کو سزا کیوں دیں اور کوئی بھی کنوارا لڑکا کیوں اس سے شادی پہ مانے گا۔ہر کوئی اولاد کا سکھ چاہتا ہے۔آپ سمجھ رہے ہیں نا سر کہ ہم اس رشتے پہ کیوں اصرار کر رہے ہیں؟"عشوہ نے یکدم فون میرے ہاتھ سے جھپٹ کر عجلت میں جھوٹ بولا تھا اور میں اس کی شکل دیکھتا رہ گیا تھا۔کیسی ہوشیاری سے اس نے بات سنبھال لی تھی۔

"اوہ۔آئی ایم سوری۔"وہ جیسے کسی سوچ میں پڑ گئے تھے۔

"ٹھیک ہے۔میں نکاح کے لیے تیار ہوں۔"

وہ مان گئے تھے اور شام کو انتہائی سادگی کے ساتھ سیماب کا نکاح عقیل صاحب سے ہو گیا تھا۔نکاح کے بعد امی نے جب مسٹر عقیل کو دیکھا تو وہ جیسے وہیں ڈھے گئی تھیں۔

"اس زیادتی کے لیے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی منصور۔کبھی بھی نہیں۔"وہ بے تحاشا رو رہی تھیں۔ان کی حالت پہ لحظہ بھر کو میرا دل کانپا تھا۔وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔

سیماب خاموشی سے امی سے مل کر اور مجھ سے بنا ملے رخصت ہو گئی اور اس کے بعد وہ کبھی اس گھر میں لوٹ کر نہ آئی تھی۔امی کا اس سے فون پہ رابطہ رہتا تھا یہ مجھے عشوہ سے پتا چلتا رہتا تھا۔شاید وہ اس سے ملنے بھی جاتی رہی تھیں لیکن نہ میں کبھی اس سے ملا نہ ہی وہ یہاں آئی حتیٰ کہ تمنا کی پیدائش پہ بھی وہ نہیں آئی تھی۔نہ ہی اس نے مجھے کبھی فون کیا تھا۔ہم اس کے لیے مر گئے تھے۔یا یہ میں ہی تھا جس نے اس کے لیے سب رشتوں کو مار دیا تھا۔پھر زندگی میں بہت کچھ ایسا ہو کہ وہ دن آ گیا جب میں سیماب سے خود ملنے گیا تھا۔دس سال بعد۔نہیں دس سال دو ماہ بارہ دن بعد۔

☆☆☆

میری زندگی کی داستان بھی ایسی عجیب ہے کہ کبھی کبھار میں حیران سی زندگی کو دیکھتی ہوں کہ یہ اتنی الجھی اور مشکل پسند کیوں ہے۔کیا یہ سب کے لیے ایسی ہی ہے یا اس نے خاص میرا انتخاب کیا ہے۔کاش کہ یہ تھوڑا آسان ہوتی۔میری زندگی کی ہر مشکل کا

سرا میرے اپنے بھائی سے جڑتا ہے۔ میرا اپنا سگا بھائی منصور حنان، کیا کوئی یقین کر سکتا ہے کہ میرا بھائی ہی میرا سب سے بڑا حاسد اور دشمن تھا۔ میری بربادی میں کسی دوسرے کا نہیں میرے اپنے بھائی کا ہاتھ رہا ہے۔

میں سیماب حنان۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا یہی محسوس کیا کہ ایک بہت اونچی اور گہری خلیج بھائی اور میرے درمیان حائل ہے جسے میری محبت اور خلوص بھی پاٹ نہیں سکے۔ میں جب جب پیار سے اس کی طرف متوجہ ہوئی وہ ہمیشہ مجھے دھتکار دیتا جیسے میں اس کے لیے کوئی رشتہ نہیں بوجھ ہوں۔ کوئی مصیبت، کوئی آفت ہوں جسے وہ خود سے دور کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں، باتوں اور لب و لہجے میں ہمیشہ کے لیے حقارت اور نفرت کے ملے جلے جذبات محسوس کیے تھے۔ جب ذہن چھوٹا معصوم سا بچہ تھا تو وجہ میں بھی سمجھ نہیں سکی۔ بس اتنا واضح محسوس کرتی تھی کہ وہ امی کو مجھ سے دور کرنے کے لیے ہمیشہ خود سے قریب رکھتا تھا۔ ایسے میں ابو نے مجھے اپنے سے قریب کر لیا کہ میں کہیں اکیلی نہ پڑ جاؤں۔ میں امی کی جانب ہمکتی تو یوں لگتا کہ امی بھا کی طرف دیکھتی تھیں۔ اپنی بیٹی کو گلے لگانے کے لیے انہیں بیٹے سے سرٹیفکیٹ چاہیے تھا۔ میں ہمیشہ سے بھا کو خوش کرنے کے لیے اس سے اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیاں شیئر کرنے کی کوشش کرتی رہتی کہ شاید کسی طرح میں اس کے دل میں گھر جا کر جاؤں لیکن بدلے میں مجھے بس دھتکار ملی۔

یوں میرا سارا بچپن گزرتا چلا گیا۔ جب میں لڑکپن میں داخل ہوئی تو اب میری فیلنگز بھی میری طرح میچور ہو چکی تھیں۔ اب میں بھا کے رویے کے پیچھے چھپی وجہ کو سمجھنے کے قابل ہو گئی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ وہ میری ہر کامیابی سے حسد کرتا ہے۔ میری خوشیوں کو تباہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ مجھ سے ہر نعمت کو چھین لینا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں بس روتی رہوں اور میری آنکھیں ہمیشہ نم رہیں۔ ا

یک دن ابو نے مجھے بٹھا کر سمجھایا تھا۔

”سیمی بیٹا! آپ کو پتا ہے نا کہ آپ بہت ذہین ہو۔ ٹیچرز آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں اور بھائی کو یہ بات بری لگتی ہے۔ اس لیے اپنی کسی کامیابی کا ذکر اپنے بھائی کے سامنے مت کیا کرو۔ آپ اچھی پینٹر ہو، ڈیبیٹر ہو، کلاس کی ٹاپر ہو، مانیٹر ہو یہ سب باتیں بھائی کو کبھی نہیں بتانا۔ نہ اس کے سامنے امی اور مجھے بتانا۔“

”ایسا کیوں ابو؟“ میں حیران تھی۔

”کیونکہ وہ یہ سب نہیں ہے تو اسے برا لگتا ہے کہ وہ کیوں نہیں ہے اور آپ کیوں ہو۔ جب کوئی بھی ہم سے آگے نکل جاتا ہے تو ہمیں لازمی برا لگتا ہے۔ جیسے اس دن فریحہ کے نمبر آپ سے زیادہ آ گئے تو آپ روتی رہی نا کمرے میں چھپ کر، بالکل اسی طرح بھائی کو بھی برا لگتا ہے۔ اسی لیے آپ اس کے سامنے یہ سب مت بتایا کرو۔“ میں نے سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور ابو سے عہد کیا کہ میں بھا کے سامنے ایسی کوئی بات نہیں کیا کروں گی۔“

اپنی تمام کامیابیاں میں ابو سے تب ڈسکس کرتی جب بھا اکیڈمی جاتا یا دوستوں سے ملنے۔ وہ دونوں میری کامیابیوں پہ بہت خوش ہوتے تھے۔ مجھے گفٹ بھی دیتے تھے لیکن ساتھ تاکید کرنا نہ بھولتے کہ یہ گفٹ بھائی کو نہیں دکھانا۔ کبھی غلطی سے بھی بھا کو سن گن مل جاتی تو اس رات میرا کوئی ڈریس چیتھڑوں میں تبدیل ہو جاتا یا پھر میری کوئی فیورٹ بک ٹی پھٹی ملتی۔ کوئی بھی ایسی چیز جسے میں جی جان سے سنبھال کر رکھتی تھی تباہ حال ہو جاتی یا پھر غائب۔ پہلے مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسے ہوا لیکن پھر بھا کے چہرے پہ ایک کمینی سی مسکراہٹ مجھے بتا دیتی کہ یہ سب بھا نے کیا ہے۔ پھر بھی میں امی ابو کو ان کی شکایت نہیں لگاتی تھی کیونکہ اندر ہی اندر میں جان گئی تھی کہ بھا لا علاج ہے۔ تاہم اپنے اندر کا غبار اتارنے کے لیے میں نے ڈائری لکھنا شروع کر دی۔ جو باتیں انسان کسی سے کہہ نہیں پاتا وہ اندر جمع ہوتی

رہیں تو بہت تباہی مچاتی ہیں۔ اپنی ذات میں ایسی تباہی مجھے نہیں چاہیے تھی اسی لیے میں نے یہ اپنی کلاس ٹیچر سے پوچھا تھا۔

"مس۔ جب ہمارے پاس کوئی بھی نہ ہو جس سے ہم اپنے پرابلمز ڈسکس کر سکیں تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" مس میری بات پہ غیر سنجیدگی سے لیتے ہوئے ہنس دی تھیں۔

"ایسی کون سی پرابلمز ہو گئیں اس عمر میں؟" نجانے بڑے کیوں یہ سمجھتے ہیں کہ بچوں کے ساتھ کوئی مسائل نہیں ہو سکتے۔ وہ زندگی کی تلخیاں محسوس نہیں کرتے۔ ان کی زندگی میں بس سکون اور آسانی ہوتی ہے اور دکھ انہیں چھو کر بھی نہیں گزرتے۔

"پرابلمز تو ہر کسی کے ساتھ ہوتی ہیں مس۔ بس کچھ کا سولوشن ہوتا ہے اور کچھ کا نہیں۔" میں حد درجے سنجیدہ تھی تو مس بھی سنجیدہ ہو گئیں۔

"سب ٹھیک ہے نا سیماب؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اگر کوئی ڈسکس کرنے والا نہ ملے تو انسان کو چاہیے کہ وہ سب کچھ ایک ڈائری میں لکھتا رہا کرے۔ کاغذ پہ سب لکھ دینے سے بھی دل کا بوجھ کم ہو جایا کرتا ہے۔" اور تب سے میں نے اپنے دل کا سارا بوجھ کاغذ کے حوالے کرنا شروع کر دیا تھا۔ روز رات میں سونے سے پہلے میں ڈائری لکھ کر سویا کرتی تھی۔

☆☆☆

یہ اس رات کا ذکر ہے جب ہمارے ہاں ابو کے ایک کولیگ کی دعوت تھی۔ امی سارا دن کچن میں کام کر کے شدید تھک چکی تھی۔ اسی لیے ڈنر کے بعد میں نے انہیں برتن دھونے سے منع کر دیا۔ امی وہیں کچن کارنر میں رکھی کرسی پہ بیٹھی مجھے دیکھتی رہیں اور ڈنر کے لوازمات پہ ہلکی پھلکی بات چیت کرتی رہیں۔ ڈنر کے سارے برتن میں نے دھو کر، سکھا کر سمیٹ دیے اور چائے کا گرما گرم کپ امی کو لا کر تھما دیا تو امی نے پیار سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا تھا۔

"بیٹیاں واقعی بہت پیاری اور والدین کی ہمدردی ہوتی ہیں۔ خوش رہو۔ آج میری ساری تھکن دور ہو گئی۔" میں خوش تھی، بہت خوش کیونکہ امی نے مجھے اس طرح پیار کیا تھا۔ ان الفاظ میں مجھے سراہا تھا جو میرے لیے بہت معنی رکھتے تھے۔ جب امی کی نظر کچن کے دروازے کی طرف اٹھی تو انکا رنگ جیسے کسی رنگ کاٹ نے چوس لیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں بھا کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حسد اور رقابت کی آگ دکھائی دیتی تھی۔ وہ وہیں سے لوٹ گیا تھا۔ امی نے اسے پکارا بھی لیکن وہ رکا نہیں۔

اس رات میری ریڈ فراک میری وارڈ روب سے غائب ہوئی تھی۔ اور دو دن بعد وہ مجھے اسٹور سے تار تار ملی تھی۔ میں جانتی تھی کہ یہ بھا نے کیا ہے لیکن پھر بھی خاموش رہی۔ لیکن اس سب کے دوران میں نے نوٹ کیا کہ ابو بھا سے خفا خفا سے تھے۔ تو ایک روز کیرم کھیلنے کے دوران میں نے ان سے پوچھا تھا۔

"آپ بھا سے کیوں ناراض تھے؟"

"میں ناراض نہیں تھا بس شاکڈ تھا۔"

"کس بات پر؟"

"اپنے تمام خدشات کو حقیقت کے روپ میں دیکھ کر ہر انسان شاکڈ ہوتا ہے۔ پہلے مجھے شک تھا لیکن اس رات یقین ہو گیا جب میں نے اپنی آنکھوں سے سب دیکھا۔ اس کی حرکتیں ہی ایسی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیسے سمجھایا جائے؟" ابو سخت کبیدہ خاطر تھے۔ ابو نے بھا کی کسی خاص حرکت کا ذکر نہیں کیا تھا۔ نہ ہی یہ بتایا کہ ان کا کون سا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔

"آپ کو پتا چل گیا کہ انہوں نے میری فراک کاٹی ہے؟" میری بات سن کر ابو حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔

"تم جانتی تھیں کہ وہ یہ سب کرتا ہے تو تم نے کہا کیوں نہیں بیٹا؟"

"کہنے سے کیا ہو جاتا ابو۔ آپ اگر ان کو ڈانٹیں گے تو وہ مجھ سے مزید ناراض ہوں گے اور میری مزید شامت آئے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ مجھ

سے نفرت کرتے ہیں اور میں نے ایسا ہمیشہ سے دیکھا ہے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ یہ میری زندگی کا سب سے برا دکھ ہے کہ میرا اپنا بھائی مجھے نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔" بات کے اختتام تک میری آواز بھرا گئی تھی۔ ابو نے مجھے خود سے بھینچ لیا تھا۔ وہ میرا سر تھپکتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"وہ تو احمق ہے بیٹا۔ تم تو سمجھدار ہو۔ تم ایسے روؤ گی میں کمزور پڑ جاؤں گا۔ جب تک تمہارا باپ تمہارے سر پر ہے کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔" ابو کی ڈھارس میرے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ باپ بیٹیوں کے لیے ایسے ہی مضبوط قلعے ہوا کرتے ہیں جن میں چھپ کر وہ ہر آفت سے محفوظ ہو جاتی ہیں۔

"مجاہد ٹھیک کہتا ہے کہ مجھے منصور کو کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس لے کر جانا چاہیے تھا۔ میں نے بہت دیر کر دی۔ بہت لاپروائی برتی۔ اب پانی پلوں کے نیچے سے بہہ چکا ہے۔" ان کے لہجے میں تاسف اور پچھتاوا بول رہا تھا۔

☆☆☆

انہی دنوں بھا ضرورت سے زیادہ فون پر چپکا دکھائی دیتا تھا۔ ابو اسے نوٹ ضرور کر رہے تھے لیکن کہتے کچھ نہیں تھے۔ ایک شام میں اور ابو لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے جب بھا کا بیسٹ فرینڈ زلفی ابو سے ملنے آیا تھا۔ بھا اس وقت اکیڈمی گیا ہوا تھا۔ ابو نے مجھے اندر بھیج دیا تھا کہ امی سے کہہ کر زلفی کے لیے چائے بنواؤں۔ جب میں چائے لے کر آئی تو ابو پہلے کی نسبت غصے میں تھے۔ میرے وہاں آنے پہ وہ دونوں ہی خاموش ہو گئے تھے۔ میں نے صرف زلفی کے منہ سے یہ سنا تھا۔

"انکل میرے یہاں آنے کا مانی کو پتا نہ چلے پلیز۔"

"تم بے فکر رہو۔" ابو نے اسے تو تسلی کرا دی لیکن خود بے چین ہی رہے۔ انہوں نے مجھ سے بھی شیئر نہیں کیا کہ زلفی کیوں آیا تھا ملنے۔ میں نے بھی پوچھنا ضروری نہیں سمجھا۔ شام میں جب بھا اپنے کمرے میں بیٹھا کال پر بات کر رہا تھا تو ابو نے اس کے کمرے پہ دھاوا بول دیا۔

"یہ جو تمہارے دماغ پر عشق عاشقی سوار ہے نا اور جس کی مد میں تم آئے دن کبھی اپنی ماں اور کبھی باپ سے پیسے مانگ لے کر جاتے ہو میں سب جانتا ہوں اور اس محترمہ کو بھی جو تم جیسوں کو خوب ہی الو بنانا جانتی ہے۔ اس کا تو کام ہی یہی ہے تم جیسے گدھوں کو اپنی انگلیوں پر نچانا اور ان سے رقم تحائف بٹورنا۔" ابو کم غصے میں آتے تھے لیکن جب آتے تو اگلے کا سانس خشک کر دیتے تھے۔

ہفتے بعد جب وہ کمرے سے نکلا تو سیدھا میرے کمرے میں آیا اور اس نے مجھے دھمکی دی کہ ابو کی نظروں میں اسے گرانے کے لیے میں نے جو حرکت کی ہے وہ اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ میں اپنی جگہ حیران تھی کہ اسے یہ کیوں لگا کہ اس سب میں میرا ہاتھ ہے جب کہ میں تو اس لڑکی کا نام تک نہیں جانتی تھی۔

ابو آئے تو میں باہر تک نہیں نکلی۔ یوں بن گئی جیسے سو رہی ہوں۔ ابھی میں کسی سے کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن میرے کہنے کی تو نوبت ہی نہ آئی۔ اس سے پہلے ہی وہ ہوا جس کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

اگلی شام موسم بہت اچھا تھا۔ صبح بارش ہوئی تھی اسی وجہ سے شام کی ہوا ٹھنڈی تھی۔ ابو آفس سے جلدی اٹھ آئے تھے اور رستے سے سموسے اور جلیبی لے آئے تھے۔ میں نے جلدی جلدی گرما گرم سموسے اور جلیبی کی پلیٹوں میں نکال لیں اور مزیدار سی الائچی والی چائے بنا کر لان میں لے آئی۔ ابو بھی فریش ہو کر آ گئے تھے اور امی سے باتیں کر رہے تھے۔ بھا گھر پر ہی اپنے کمرے میں تھا۔ ہم تینوں موسم انجوائے کرتے ہوئے چائے کا مزا لے رہے تھے۔ پھر مغرب سے پہلے ہم اندر چلے آئے۔

امی مغرب کی نماز کے بعد رات کے کھانے کی

تیاری کرنے کچن میں گئیں تو میں بھی ان کی مدد کے لیے ساتھ ہولی۔ ابو کچھ دیر آرام کرنے کمرے میں چلے گئے تھے تب ہی بھا ان کے پیچھے گیا تھا۔ کچھ دیر ہی گزری تھی کہ مجھے ابو کے بلانے کی آواز سنائی دی۔ میں ہاتھ دھو کر ان کی سننے گئی۔ وہ مجھے اپنے کمپیوٹر پہ اپنا ای میل اکاؤنٹ کھولنے کا کہہ رہے تھے۔ ابو کے کمپیوٹر پہ اپنا میل اکاؤنٹ کھولا۔ اسکرین سامنے تھی۔ ابو حال ہی میں کی جانے والی ای میلز پڑھ رہے تھے۔ جن کے الفاظ نے میرے کانوں سے دھواں نکال دیا تھا۔ ایسی ای میلز کرنا تو دور میں نے آج تک پڑھی تک نہ تھیں۔ ابو نے تاسف سے مجھے دیکھا۔ ان نظروں میں سے نظریں چراتی زمین میں گڑھ گئی۔ اپنی صفائی میں مجھ سے ایک لفظ تک نہ کہا گیا۔ ابو کمرے سے جا چکے تھے۔ بھا نے میرا اترا چہرہ اور جھکا سر دیکھ کر مجھ پہ حقارت سے چہ چہ کرتے یہ باور کرا دیا کہ بھلے یہ سب اس کیا دھرا ہو لیکن وہ مجھے ابو کی نظروں میں گرا چکا ہے۔ میری کردار کشی میرا اپنا سگا بھائی میرے باپ کے سامنے کر چکا تھا۔ وہ جا چکا تھا اور میں وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔ بھلا میرے پاس ثبوت ہی کیا تھا کہ یہ سب میں نے نہیں کیا اور بھا نے مجھے پھنسایا ہے۔

یکدم مجھے ہوش آیا۔ میں نے اسکرین کو دیکھا۔ میرے اکاؤنٹ سے جو میلز کی گئی تھی ان کی ٹائمنگ شام کی تھی۔ تب جب میں امی ابو کے ساتھ موسم انجوائے کر رہی تھی۔ میری بے گناہی کا ٹھوس ثبوت میرے ہاتھ تھا لیکن اس سے بھی پہلے مجھے اس اکاؤنٹ کو دیکھنا تھا جس پہ میلز کی گئی تھیں۔ اتفاق سے جو کوئی بھی نہیں جانتا تھا حتیٰ کہ ابو تک نہیں، میں ایک چھوٹی موٹی کمپیوٹر ایکسپرٹ تھی۔ بہت زیادہ نہ سہی لیکن ای میل اکاؤنٹس میں نے کئی بار ہیک کیے تھے۔ میں نے اسی وقت کھٹا کھٹ کی بورڈ پہ انگلیاں چلاتے وہ اکاؤنٹ ہیک کیا جس پر میلز کی گئی تھیں۔ وہ اکاؤنٹ ایک دن پہلے بنایا گیا تھا اور اس پر میری میلز کے سوا کوئی میل نہ تھی جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ایک فیک اکاؤنٹ تھا اور اس کا مقصد ہی یہی تھا کہ اس پہ میرے اکاؤنٹ سے میلز بھیجی جاتیں۔ میری بے گناہی کے یہ دو ثبوت کافی تھے۔ ابو کا کمپیوٹر اسی طرح چھوڑ کر میں باہر چلی آئی تھی۔

ابو لان میں ایک طرف خاموش بیٹھے تھے۔ میں ان کے سامنے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی تھی۔

''ابو میرا یقین کریں یہ سب میں نے نہیں کیا۔ میں ایسا سوچ تک نہیں سکتی۔ آپ کی عزت کی مجھے بہت پروا ہے اور اپنی عزت کی اس سے زیادہ۔ کیا میں آپ کو ایسی لگتی ہوں؟'' ابو خاموش تھے۔ میرا دل ان کی خاموشی پہ نئے سرے سے دکھی ہو رہا تھا۔

''میں آپ کو بتانا چاہتی تھی کل، لیکن بتا نہیں سکی۔ بھا سمجھتا ہے کہ اس کی شکایت میں نے آپ کو لگائی ہے۔ اس کو میں نے آپ کی نظروں سے گرانے کے لیے اس کا راز فاش کیا ہے۔ وہ کل مجھے دھمکا کر گیا تھا کہ وہ مجھے اس سب کی سزا دے گا۔ ابو چپ چاپ میری بات سن رہے تھے۔

''یہ سب میں نے نہیں کیا ابو اس کا ثبوت بھی ہے میرے پاس۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ جو ای میلز میرے اکاؤنٹ سے کی گئی ہیں وہ اس وقت کی گئیں جب ہم تینوں یہاں باہر لان میں تھے۔ یقیناً بھا نے میرے کمرے میں جا کر میرے کمپیوٹر سے کی ہوں گی۔ آپ ٹائم دیکھ سکتے ہیں ابو اور وہ اکاؤنٹ بھی میں آپ کو دکھا سکتی ہوں جس پہ میلز کی گئی ہیں کہ وہ بنا ہی کل ہے۔ ابو کیا یہ دو ثبوت میری بے گناہی کے لیے کافی نہیں ہیں؟'' آخر تک میری آواز بھرا گئی تھی۔ ابو نے جھکتے ہوئے مجھے کاندھوں سے تھاما اور میرے آنسو صاف کیے۔

''تم کوئی ثبوت بھی نہ لاتیں تو بھی میں جانتا تھا کہ میری بیٹی کتنی معصوم ہے۔''

ابو کے اس ایک جملے پہ میں پھوٹ پھوٹ کر روتی ابو کے گلے لگ گئی۔ کیسا یقین تھا میرے باپ کے لہجے میں جس نے مجھے معتبر کر دیا تھا۔ ہم بیٹیوں کے لیے تو باپ کا یقین ہی سب سے بڑا مان ہوتا

ہے۔ جسے اوڑھ کر ہم ہر بات سہہ جانے کو تیار ہوتی ہیں۔

"میری سیماب کوئی ایسا کام کر ہی نہیں سکتی جس سے اس کے باپ کا سر جھکے۔ اس کا غرور خاک ہو۔ اس کا مان ٹوٹے۔" میں روئے چلی جارہی تھی۔ ابو کی آواز بھیگ گئی تھی۔

"تمہیں ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا۔ میں اس بات سے دکھی نہیں ہوں کہ تم نے یہ سب کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم ایسا نہیں کرسکتیں۔ میری جان ایسا کبھی کر ہی نہیں سکتی۔ دکھ مجھے اس بات کا ہے کہ یہ سب میرے بیٹے نے میری بیٹی پہ الزام لگانے کے لیے کیا ہے۔ ایک بھائی نے اپنی بہن کے لیے ایک ماں جائے نے ......" ابو کی آواز کانپ گئی اور وہ بھی میرے ساتھ خاموش آنسو بہانے لگے کتنی دیر ہم دونوں خاموشی سے روتے رہے تھے۔

"میں اس بات سے ڈر گیا ہوں کہ میری دی ہوئی اس چھت تلے میری ہی بیٹی میرے بیٹے کے ہاتھوں محفوظ نہیں ہے۔ وہ اس کی عزت کا رکھوالا نہیں ہے۔ وہ اس کے سر کا سایہ نہیں ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ مجھے کبھی کچھ ہوجائے تو وہ کتنا شیر ہوجائے گا۔ کیا کچھ نہیں کرے گا پھر وہ تمہارے ساتھ۔ کاش کہ کبھی ایسا نہ ہو۔ تمہیں کسی محفوظ ہاتھوں میں سونپنے تک میں زندہ رہوں۔" میں نے ابو کے فکرمند چہرے کو دیکھا۔ "بھائی بہنوں کا مان ہوتے ہیں لیکن یہ کیسا شیطان صفت بھائی ہے جو اپنی بہن کو ہی نیچا دکھانے کے لیے اس حد تک چلا گیا ہے؟"

میں نے ابو کی آنکھیں صاف کی تھیں۔ ان کے آنسو اپنی انگلی کی پوروں میں چن لیے تھے۔

"میں بہت ڈر گیا ہوں یمی، میں بہت زیادہ ڈر چکا ہوں تمہارے لیے۔ میں کس پہ بھروسا کروں تمہارے معاملے میں میری بچی۔" میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے میرے باپ نے چوم لیے تھے۔

"اللہ آپ کا سایہ میرے سر پہ سلامت رکھے گا۔ اللہ کبھی مجھے تنہا نہیں چھوڑے گا۔ بیٹیوں کے باپ ہمیشہ ان کے سر پہ پڑتی دھوپ کو خود پہ اوڑھ لیتے ہیں۔ اللہ اس سائے کو میرے سر سے نہیں چھینے گا ابو۔" میں انہیں ایک بودی سی تسلی ہی دے سکتی تھی۔

"یہ سب اپنی ماں کو مت بتانا بیٹا۔ اپنے لاڈلے کی ان حرکتوں کی تاب وہ نہیں لاسکے گی۔" میں نے ابو کی تاکید پہ سر ہلا دیا۔ اس رات کھانا ہم نے اپنے اپنے کمروں میں کھایا تھا۔ نجانے ابو نے امی کو کیا کہا ہوگا لیکن میں نے پڑھائی کا بہانہ بنا کر اندر رہنا ہی مناسب سمجھا تھا۔

☆☆☆

نجانے ابو نے بھا کو کب کیسے کیا کہا تھا کہ اگلا پورا دن وہ گھر سے غائب تھا۔ امی نے ابو سے پوچھا تو انہوں نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

"ہوگا کہیں یہاں وہاں۔ اپنے دوستوں کے ساتھ۔" امی ابو کے اس اکھڑپن پہ خاموش ہوگئی تھیں۔ ابو اکثر ہی بھا کی کسی حرکت پہ ایسے نالاں رہتے تھے۔

شام جب وہ گھر لوٹا تو میں اپنی کتاب لیے باہر سیڑھیوں پہ بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں اپنے آپ کو سمیٹ گئی۔ ایک تادیبی نظر مجھ پر ڈال کر وہ اندر چلا گیا تو میرا خشک ہوا سانس بحال ہوا۔ اس کے بعد میں نے بھا سے بات کرنا اور اس کے سامنے جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان جو بھی دوریاں تھیں میں نے انہیں تسلیم کرتے مان لیا تھا کہ یہ کبھی دور نہیں ہوسکتیں کیونکہ کوشش یکطرفہ تھی۔ اس لیے میں نے ایک طرف ہوجانا بہتر جانا تھا۔ وہ ابو کی نظروں میں مجھے تو نہیں گرا سکا لیکن خود ان کی اور میری نظروں میں گر چکا تھا۔

☆☆☆

اس دن کے بعد ابو میرا پہلے سے زیادہ دھیان رکھنے لگے تھے اور بھا سے کم ہی بات کرتے تھے۔ بھا اب ان کے سامنے نظریں جھکا کر رکھتا تھا۔ اس کی یونیورسٹی شروع ہوچکی تھی اور وہ کھانے کی میز پہ اکثر یونیورسٹی کے واقعات سناتا رہتا تھا۔ اس رات ابو نے

بہت نارمل طریقے سے بھا سے اس کی پڑھائی کا پوچھا تھا۔ اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ یونی میں ٹاپ کرے۔ بھا کا چہرہ یکدم کھل گیا تھا۔ ابو نے ایک عرصے کے بعد بھا سے اس کی پڑھائی کو لے کر کوئی بات کی تھی۔ کسی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

"بھا بہت خوش تھا جب آپ نے اس سے کہا کہ آپ اسے یونی کا ٹاپر دیکھنا چاہتے ہیں۔" رات لان میں واک کرتے ہوئے میں نے کہا تھا۔ ابو کے چہرے پہ ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"اولاد بڑی عجیب شے ہوتی ہے بیٹا۔ اس سے دور نہیں رہا جا سکتا۔ ناراض نہیں رہا جا سکتا۔ میری بھی یہی مجبوری ہے۔ میں کب تک اس سے خفا رہتا؟ اس کو لے کر میرے بھی چند خواب ہیں جیسے دوسرے والدین کے ہوتے ہیں۔"

مجھے ابو سے کوئی شکوہ نہیں تھا کہ وہ بھا سے پھر سے کیوں راضی ہو گئے۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ میں بھی یہ نہیں چاہتی تھی کہ ابو میری وجہ سے اس سے خفا رہیں حالانکہ وہ اب بھی مجھے ستانے سے باز نہیں آیا تھا۔ اب ابھی اکثر الماری سے میرے کپڑے تباہ حال ملا کرتے۔ عین ٹیسٹ سے پہلے میری کتاب میری اسٹڈی ٹیبل سے غائب ہوتی۔ میں شدید اکتاہٹ کا شکار ہو چلی تھی لیکن کیا کر سکتی تھی۔ وہ اپنے نام کا ایک نمبر کا ڈھیٹ انسان ثابت ہوا تھا جس پہ کچھ اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ شاید یہ سب کبھی ختم نہیں ہونا تھا جب تک ہم ایک چھت کے تلے رہ رہے تھے۔

"مجھے آپ سے شکوہ نہیں ہے ابو۔ میرے لیے آپ کا پیار اور توجہ ہی کافی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ اپنے بیٹے سے خفا ہوں۔" ابو نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"تمہارے حق میں ہم سے بہت زیادتی ہوئی ہے بیٹا۔ لیکن تم میری صابر بیٹی ہو جس نے کبھی شکایت نہیں کی۔" میں اب کیا کہتی۔

"روبی بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہے۔ بس وہ کھل کر اظہار کرنے سے ڈرتی ہے کہ کہیں منصور کا ردعمل شدید نہ ہو۔"

"جانتی ہوں ابو کہ امی بھا سے ڈرتی ہیں۔"

"ڈرتا میں بھی ہوں لیکن بس اس نالائق کو پتا نہیں چلنے دیتا۔"

ہم دونوں اس بات پہ ہنس دیے تھے۔ پھر ابو سنجیدہ ہو گئے۔ "اولاد جوان ہو جائے اس سے بغاوت کی بو بھی آنے لگے تو والدین ڈر جایا کرتے ہیں۔ وہ اس بڑھاپے میں اکیلا پڑ جانے سے ڈرتے ہیں۔ اولاد کو کھونے سے ڈرتے ہیں۔ یہ ڈر ہمارے ساتھ بھی چل رہا۔۔۔ ہمارے اندر بھی پل رہا ہے۔"

ابو ایسی باتیں کرتے مجھے بہت بوڑھے لگنے لگتے تھے۔ تب میں دل ہی دل میں ان کا سایہ اپنے سر پر سلامت رہنے کی دعائیں کیا کرتی تھی۔

☆☆☆

بھا سیکنڈ سمسٹر میں ہی تھا کہ اس کی پڑھائی کا گراف نیچے آنے لگا۔

وہ وجہ بھی سامنے آ گئی جس نے بھا کا دماغ پڑھائی کے بجائے کسی اور طرف لگا دیا تھا۔ امی کو ایک دن میں نے ابو سے بھا کے بارے میں بات کرتے ہوئے سنا تھا۔

"وہ بضد ہے جنان ..... کہ وہ اسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور میں اس کی ضد سے کتنا ڈرتی ہوں آپ جانتے ہیں۔"

"دیکھے بھالے بنا ہم اس کا رشتہ کیسے کر سکتے ہیں؟ یوں بھی ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے کہ شادی رچانے چلا ہے۔ اپنی پڑھائی تو پہلے مکمل کر لے۔" ابو کوئی اس بات سے خوش نہ تھے۔

"ابھی وہ صرف رشتہ پکا کرنے کا کہہ رہا ہے۔ شادی بعد میں ہوتی رہے گی۔" ابو جواباً خاموش ہو گئے تھے۔

اگلی صبح ابو نے بھا سے اس لڑکی کا پتا مانگا۔ پتا دیکھ کر ابو نے مجاہد انکل کو کال ملائی تھی جو اس علاقے کے ناظم رہ چکے تھے اور ابو کے بچپن کے دوست تھے۔

"مجاہد بھائی کا کیا کام بھلا؟" امی کو یہ

منطق سمجھ میں نہ آئی تھی۔
"ایک سے بھلے دو، دو سے بھلے تین۔ وہ اس علاقے کو اچھی طرح جانتا ہے اور یوں بھی اس کے خاصے تعلقات ہیں کہ اڑتی چڑیا کے پر بھی گنوا سکتا ہے۔ ہم رشتہ جوڑنے جارہے ہیں تو اگلوں کی معلومات رکھنا ضروری ہے۔ کل تک وہ کچھ نہ کچھ پتا کروادے گا۔ رپورٹ اچھی ہوئی تو کل ہی بات طے کرآئیں گے۔"
"کل تک آپ اس رشتے کے حق میں نہیں تھے اور آج بات پکی کرنے کی بات کررہے ہیں۔"
"روبینہ بیگم! جیسے آپ جوان بیٹے کی ضد سے ڈرتی ہیں۔ کچھ خوف مجھے بھی آتا ہے کہ اب بیٹے کے پاؤں کا ناپ باپ جتنا ہوچکا ہے اور سیانے کہتے ہیں کہ اس وقت سے باپ کو ڈرنا چاہیے۔" میں تو ابو کی بات کچھ بھی کچھ نہیں لیکن امی نے جن نظروں سے ابو کو دیکھا یقیناً وہ سمجھ گئی تھیں۔

☆☆☆

اگلا دن اتوار کا تھا جب امی ابو بھا کا رشتہ لے کر گئے تھے۔ ادھر بھا بڑی بے چینی سے ان کے لوٹنے کا منتظر تھا۔ میں اندر ہی اندر اس کی حرکتیں دیکھ کر ہنس بھی رہی تھی اور ڈر بھی رہی تھی کہ نجانے کیسی لڑکی کا انتخاب کیا ہوگا۔ کہیں بھابھی بھی بھا جیسی ہوئی تو اس گھر میں دانہ پانی مشکل ہوجائے گا۔ امی ابو لوٹے تو ان کے چہرے ستے ہوئے اور مایوس تھے۔ بھا کا ماتھا ٹھنکا تھا لیکن وہ خاموش رہا کہ شاید وہ خود کوئی بات کریں۔
جب بھا سے انتظار مشکل ہوگیا تو اس نے خود ہی پوچھ لیا کہ بات کیا ہے۔
ابو نے غصے سے اسے بتایا کہ وہ لوگ آبائی پیشے کے اعتبار سے موسیقار ہیں۔ ان کا رکھ رکھاؤ اور ماحول کسی طور ہم سے میل نہیں کھاتا تھا۔ لیکن بھا نے صاف الفاظ میں بتادیا تھا کہ وہ اسی لڑکی سے شادی کرے گا۔ زندگی میں پہلی وہ امی ابو سے ایسے بدتمیزی سے بات کررہا تھا۔ اتنا اونچا اونچا بول رہا تھا۔ ابو کے چہرے پہ اندر کا خوف کلبلانے لگا اور امی بھی سراسیمگی سے بیٹے کو دیکھنے لگیں۔ جاتے جاتے وہ دو تین چیزوں کو ٹھوکر مارتا، گراتا ہوا گیا تھا۔
امی نے بے چینی سے ابو کو دیکھا جو بالکل ساکت بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے سہارا دینے کا کہا۔ میں ڈرتے اور کانپتے وجود کے ساتھ ابو کو سہارا دیتی کمرے میں ان کے بیڈ تک چھوڑ آئی تھی۔
"تم جاؤ بیٹا۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔" ان کی آواز کانپ رہی تھی بالکل ان کے وجود کی طرح۔ تب میں نے جانا کہ والدین جتنا مضبوط خول خود پہ چڑھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اولاد کی ایک ٹھوکر سے وہ چکنا چور ہوجاتا ہے اور اندر سے ایک کانپتا ڈرتا وجود نکلتا ہے۔
اس رات نجانے کیوں ابو کا وہ کمزور سا سراپا میری نظروں سے جا ہی نہیں پارہا تھا اور پھر قریب دو بجے امی نے مجھے جھنجوڑا۔
"یمی اٹھو۔ تمہارے ابو کی طبیعت خراب ہے۔" میں ننگے پیر بھاگی تھی۔ ابو کو دیکھتے ہی میں نے ایمبولینس کو کال کی تھی۔ جب تک ایمبولینس آئی تھی میں نے انہیں پانی پلایا تھا۔ انہوں نے دل کے مقام پر ہاتھ رکھا ہوا تھا جہاں سے درد اٹھتا ان کے سارے وجود میں پھیل چکا تھا۔ نم آنکھوں سے میرے سر پہ ہاتھ رکھا تو میں اندر تک کانپ گئی۔ وہ میرے باپ کے ساتھ آخری ملاقات تھی یہ میں نہیں جانتی تھی۔
"بھا کو اٹھائیں امی۔" میں نے کہا تو ابو نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ وہ بھا کو اپنے سامنے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ایمبولینس آئی اور ابو کے ساتھ امی بھی چلی گئیں۔ میں وہیں گرتے پڑتے وجود کے ساتھ سیڑھیوں پہ بیٹھی رہ گئی۔ تب ہی بھا بھاگا بھاگا باہر آیا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ ابو کو کیا ہوا۔ اس پل میرا دل چاہا کہ میں اس کا گریبان تھام کر اس سے کہوں کہ تم بتاؤ میرے باپ کو کیا ہوا۔ آخر اس کو اس حال میں پہنچانے کی وجہ تم ہی تو ہو لیکن میں

بس خاموش رہی تھی۔ میرے بتانے پہ کہ ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے وہ شرمسار ہو کر وہیں میرے برابر بیٹھ گیا تھا۔ صبح فجر تک ہم دونوں اسی طرح سیڑھیوں پہ مجسمے بنے بیٹھے رہے تھے اور فجر کے وقت امی کا فون آیا تھا۔ وہ بے تحاشا رو رہی تھیں۔

"تمہارے ابو نہیں رہے۔"

مجھے لگا میں نے غلط سنا ہے۔ ابو کیسے اتنی جلدی ہمیں چھوڑ کر جا سکتے تھے۔ وہ مجھے کیسے یوں اکیلا کر سکتے تھے۔ بیٹا اتنا اہم تھا نا ان کے لیے کہ اس کی نا خلفی برداشت نہیں کر سکے اور بیٹی کا سوچا تک نہیں۔

بھا ابو کے جنازے کو کاندھا دے رہا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ اسے ابو کے قریب بھی نہ بھٹکنے دوں لیکن ابو کا بیٹے پہ یہی تو مان تھا۔ وہ مجھے کہتے تھے۔

"باپ کو بڑا مان ہوتا ہے کہ جب وہ اس دنیا سے جائے گا تو اس کا جوان بیٹا اسے کاندھا دے گا۔"

میں ابو کا یہ مان ان سے کیسے چھین سکتی تھی۔؟

"شکر ہے کہ میرا بیٹا ہے جو اپنے ہاتھوں سے مجھے قبر میں اتارے گا۔" وہ ٹھیک کہتے تھے کہ ان کے اسی بیٹے نے انہیں قبر تک پہنچا دیا تھا اور اب قبر میں بھی وہی اتارنے جا رہا تھا۔ اس سے زیادہ میں نہیں دیکھ سکی اور ابو کے کمرے میں چلی آئی۔ ان کی ایک ایک چیز کو چھوتے ہوئے میں ان سے سوال کر رہی تھی کہ اب کون میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہے گا کہ میں ہوں نا سیمی۔ تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔ اب کون میرے آنسو صاف کرتے مجھے گلے لگا کر کہے گا کہ میں تمہارا سہارا ہوں۔ سایہ ہوں۔ بھری دنیا میں سب سے زیادہ اکیلی تو میں ہی پڑ گئی تھی نا۔ کسی کا کچھ نہیں گیا تھا سب کچھ میرا ہی گیا تھا۔

☆☆☆

ابو کی وفات کے بعد میں نے امی کو بھی سنبھالا اور تعزیت کے لیے آنے والے مہمانوں کو بھی دیکھا۔ بھا نے تو بس کمرے میں خود کو بند کر دیا تھا۔ وہ شاید خود کو سزا دے رہا تھا یا پھر دنیا کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اسے کھانا دینے جاتی تو دروازہ بجا کر کھانے کی ٹرے باہر رکھ آتی۔ کبھی وہ کھا لیتا اور کبھی کھانا یونہی پڑا رہ جاتا۔ امی مجھ سے لازمی ہر کھانے پہ پوچھا کرتی تھیں کہ ان کے بیٹے نے کھانا کھایا یا نہیں۔ ان کو بیٹے کا دھیان ہمیشہ رہا تھا لیکن ابو کے جانے کے بعد اب مجھے لگنے لگا تھا کہ امی کے سب سے قریب میں ہی ہوں۔ شاید جن حالات نے ہم ماں بیٹی کو دور رکھا تھا اب وہی حالات ہمیں قریب لے آئے تھے۔ کبھی ان کے منہ میں نوالے ڈالتے ان کا خود پہ ارتکاز محسوس کر کے میں پوچھا کرتی تھی۔

"امی آپ ایسے کیا دیکھتی ہیں؟"

"دیکھتی ہوں کہ بیٹیاں کتنی پیاری ہوتی ہیں۔"

"ایسے کہیں گی تو آپ کا بیٹا ناراض ہو جائے گا۔" میں نے یونہی مذاق میں کہہ دیا تھا۔

"طوفان سے تب تک ڈرا جاتا ہے جب تک وہ آ نہیں جاتا۔ جب آ جائے تو پھر کیا ڈرنا۔ پھر تو سب تباہ ہو ہی جاتا ہے۔ ایک طوفان میرا گھر تباہ کر چکا ہے اور عورت ہمیشہ گھر کی تباہی سے ہی ڈرتی ہے۔"

پیاری تو میں ابو کو تھی جو چلے گئے لیکن ابو کہتے تھے کہ میں امی کو بھی پیاری ہوں بس وہ اظہار سے ڈرتی ہیں۔ نہیں، بلکہ وہ بھا سے ڈرتی ہیں۔ ابو کے جانے سے امی کا گویا سارا ڈر دور ہو گیا تھا۔ وہ نڈر اور بہادر ہو گئی تھیں۔ اس لیے اب انہوں نے بھا سے ڈرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ میں حیران سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

زندگی کب تک ایک ماتم میں گزاری جا سکتی ہے۔ جانے والے کا دکھ تو ختم نہیں ہوتا لیکن اس کی شدت وقت کے ساتھ کم ہو ہی جاتی ہے۔ ہماری زندگی بھی اب نارمل ہو رہی تھی۔ میں نے امی کی صحت اور اکیلے پن کو مدنظر رکھتے ہوئے مزید پڑھنے سے منع کر دیا تھا۔

"یہ کیا احمقانہ فیصلہ ہے سیمی؟" امی کو جب میں نے بتایا کہ اب میں کالج نہیں جاؤں گی تو وہ مجھے ڈانٹنے لگیں۔ مجھے پتا تھا کہ وہ میرے اس فیصلے پہ کبھی

خوش نہیں ہوں گی۔ خوش تو میں بھی کہاں تھی لیکن مجبوری انسان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیا کرتی ہے۔

''بس مجھے یہی مناسب لگ رہا ہے امی۔''

''تمہارے ابو کی بہت خواہش تھی کہ تم ڈاکٹر بنو۔ کیا تم اپنے مرے ہوئے، باپ کی خواہش کا احترام نہیں کروں گی؟''

''ابو کی خواہش اپنی جگہ لیکن میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتی۔ میں جانتی ہوں کہ یہ سب آسان نہیں ہے لیکن زندگی میں آسانی ملی ہی کب ہے امی۔ قسمت میں یہی لکھا تھا شاید۔'' ابو کی کیا یہ تو میری بھی خواہش تھی لیکن اگر میں اپنی خواہش کے پیچھے چل پڑتی تو عین ممکن تھا کہ ماں کو بھی کھو دیتی جسے میں نے برسوں بعد حل کر پایا تھا۔

''پڑھائی چھوڑنا بھلا اس مسئلے کا حل ہے؟''

''پڑھائی نہیں چھوڑ رہی، کالج چھوڑ رہی ہوں۔''

''ایک ہی بات ہے۔''

''ایک بات نہیں ہے۔ کالج نہیں جاؤں گی لیکن گھر بیٹھ کر پڑھوں گی بھی اور ایگزامز بھی دوں گی۔'' میں نے ان کا پیار سے ہاتھ تھام کر کہا۔

''لیکن ڈاکٹر تو نہیں بن سکو گی نا؟'' امی کو بڑا قلق تھا حالانکہ یہ ان کا نہیں ابو کا خواب تھا لیکن ابو کے بعد وہ ان کا خواب پورا ہوتے دیکھنا چاہتی تھیں۔

''زندگی میں ہر خواہش پوری ہو جائے یہ ضروری نہیں ہوتا امی۔'' مجھے بھی دکھ تھا لیکن میں اسے امی پہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ باپ کھو دیا تھا، ماں کھونے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ میں اس فیصلے سے خوش بھی ہوں اور مطمئن بھی لیکن اندر ہی اندر میں نے اس قربانی پہ بہت سارے آنسو بہائے تھے۔ بیٹیوں کی زندگی قربانی تو مانگتی ہے، میں نے بھی وہی قربانی دی تھی۔

☆☆☆

امی کو لگا تھا کہ ابو کی وفات کے بعد بھا بدل گیا ہے۔ وہ خاموش رہنے لگا تھا۔ اس نے بے جا کی ضد کرنا بھی چھوڑ دی تھی۔ وہ اب اس گھر کا واحد مرد ہے تو اس ذمہ داری کو سمجھ رہا ہے۔ میں امی کی اس بات سے متفق نہیں تھی۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ بھا اتنی آسانی سے بدل سکتا ہے۔ میں نے اس کا وہ روپ دیکھا تھا جس سے امی انجان رہی تھیں۔

اس دوپہر جب میں امی کے لیے کھانا بنا کر لے جا رہی تھی تو وہ امی کے گھٹنوں پر اپنا سر ٹکا کر نادم سا کہہ رہا تھا۔

''میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا تھا امی۔ نجانے غصے میں آ کر میں نے کیا کیا بکواس کر دی لیکن میرا مقصد آپ کو اور ابو کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔'' امی اس کے سر کے بال سہلا رہی تھیں۔ میں وہیں دروازے میں ہی کھڑی رہی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اندر جانا مناسب ہوگا یا نہیں۔

''اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔ ان کی اتنی سی زندگی لکھی تھی۔ کوئی بہانہ تو بننا تھا۔ شاید یہی بن گیا۔''

''لیکن میں جانتا ہوں آپ کے دل میں یہ بات جڑ پکڑ چکی ہے کہ میرے یوں بات کرنے کی وجہ سے ابو کو ہارٹ اٹیک آیا تھا۔ پلیز۔ مجھے معاف کر دیں۔ آپ معاف نہیں کریں گی تو میں کبھی خود کو معاف نہیں کر سکوں گا۔''

''اللہ تم پہ رحم کرے اور تمہارا باپ تم سے راضی ہو۔ ماں تو اولاد سے ناراض رہ ہی نہیں سکتی۔'' امی نے گہری سانس بھری۔ میں وہیں سے لوٹ آئی تھی۔

گھنٹے بعد جب امی کے لیے کھانا لے کر گئی تو امی بڑی مطمئن سی دکھائی دے رہی تھیں۔

''مونی بہت بدل گیا ہے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس بھی ہے اور وہ نادم بھی ہے۔'' میں نے امی کو حیرت سے دیکھا۔

''غلطی کا احساس؟'' وہ جسے غلطی کہہ رہی تھی میرے نزدیک وہ بھا کا سب سے بڑا گناہ تھا جو ناقابل معافی تھا۔

''وہ پچھتا رہا ہے بیٹا۔'' امی یکدم اس کی وکیل بن گئی تھیں۔ وہ سب بھول بھال گئی تھی لیکن میں نہیں

بھول سکتی تھی کہ میری زندگی کا سب سے بڑا خسارہ بھا کی وجہ سے ہوا ہے۔ میرے باپ کی موت میری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ تھی جسے کم از کم میں اتنی آسانی سے نہیں بھول سکتی تھی۔

"اس کے پچھتاوے سے ابو واپس آجائیں گے کیا؟" میں یوں مسکرائی کہ سارے جہاں کی تلخی میرے اندر سموگئی۔

"مانتی ہوں کہ نہیں آسکتے لیکن وہ بہت بدل گیا ہے ممی اور جو بدل جائے اسے پرانے حوالے یاد کرا کے شرمندہ نہیں کیا کرتے۔"

"وہ کبھی نہیں بدل سکتا۔" میرا دل ماننے پہ آمادہ نہیں تھا کہ بھا بدل سکتا ہے اور امی بھی جلد اس خوش فہمی سے باہر آگئی تھیں۔

☆☆☆

بھا کی پڑھائی مکمل ہو چکی تھی اور اسے ابو کے آفس میں ہی جاب بھی مل گئی تھی۔ یہ بالکل بیٹھے بیٹھے لاٹری نکل آنے جیسا تھا کہ بنا خوار ہوئے اور جوتیاں چٹخائے اسے اتنی اچھی نوکری مل گئی تھی۔ امی اس کی کامیابی پہ خوش تھیں۔

"بس اب کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر اس کی شادی کردوں گی تاکہ اس گھر کو سنبھالنے والی بھی آجائے اور مونی کو بھی سدھار دے۔"

"بچپن سے بگڑی اولاد کو ایک دھان پان سی لڑکی کے حوالے کر کے آپ مائیں چاہتی ہیں کہ وہ آتے ہی وہ کر دکھائے جو ایک عرصے سے آپ خود نہیں کر پائیں۔" میں امی کو چھیڑ رہی تھی۔ وہ ہنس دیں۔

"جیسا سدھار بیویاں لاتی ہیں، ماؤں کے بس کی بات نہیں۔ نجانے کون سا جادو ہوتا ہے جو آنے والی پھونکتی ہیں اور بیٹے بدل جاتے ہیں۔" کہیں امی کو اندر سے بیٹے کے لیے یہ خدشہ بھی تھا جو زبان پہ آرہا تھا۔ امی کے اندر نجانے کتنے راز پنہاں تھے جن تک کبھی میری رسائی نہ ہوسکی تھی۔

"خالہ بتول کی سدرہ بڑی سلیقے والی بچی ہے۔" بیٹھے بیٹھے امی اپنی بہوئیں ڈھونڈنے لگیں۔ میں ان کے سر پہ ہلکے ہاتھوں سے مساج کرنے لگی۔

"کرہی نا لے اتنے سلیقے والی بی بی سے آپ کا بیٹا شادی۔ اتنی سیدھی سادی لڑکی نہیں پسند آنے لگی آپ کے ہونہار بیٹے کو۔" میں نے بات مذاق میں اڑادی، امی نے فوراً اپنی لڑکی ڈھونڈ لی۔

"اچھا تو شمسہ کیسی رہے گی؟"

"امی یہ بات لکھوالیں کہ آپ کا بیٹا ہمیشہ سے باغی رہا ہے۔ وہ کبھی آپ کی بتائی لڑکی کے پلے نہیں بندھنے والا۔"

"اچھا تو کیا اس عشوہ جیسی بلا اٹھا کر لے آؤں۔" ان کا حلق تک کڑوا ہوگیا عشوہ کا سوچ کر ہی۔

دو دن بعد ہی امی کی ساری امیدیں، خواب اور خواہشات دم توڑ گئے جب بھا نے امی سے عشوہ کے گھر جانے کی بات کی۔ امی کے لیے یہ کسی شاک سے کم نہ تھا کہ وہ اب بھی اسی لڑکی کے حق میں دلائل دے رہا ہے۔ امی اور بھا کی بحث میں امی نے ہار مان لی تھی۔

"مائیں تو کتنے واسطے دے کر اولاد کو منالیا کرتی ہیں امی۔ آپ کو نہ منانا آیا اپنا بیٹا۔"

"باپ کی موت کا لحاظ نہیں کیا اس نے۔ وہ میرا کیا لحاظ کرتا۔ اپنا ہی بھرم ٹوٹ جاتا اسی لیے میں نے خاموشی سادھ لی۔ اپنی خوش فہمی کا جھوٹا بھرم قائم رکھنا بھی سکون کا باعث ہوتا ہے۔" میں نے دکھ سے امی کو دیکھا۔ کچھ اولادیں کیسی گلے کا پھانس بن جاتی ہیں۔ بھا ایسی ہی اولاد تھا۔

☆☆☆

امی بھا کے بہت اصرار پہ رشتہ لے بھی گئی تھیں اور پکا بھی کر آئی تھیں لیکن نہ وہ خوش تھیں نہ ہی مطمئن۔ خوش تو میں بھی نہیں تھی اور میں ڈر بھی گئی تھی۔ یونہی میرے دل کو عجیب سا خوف لاحق تھا نجانے کیوں؟ شاید میں اس بات سے ڈرتی تھی کہ جب بھائی کبھی میرا بھائی نہ بن سکا تو بھابھی تو پھر

پرائی تھی وہ کہاں سے اپنی ہو سکتی تھی۔

اس دن میرے کمپیوٹر میں کچھ مسئلہ ہو گیا تھا اور مجھے نیٹ سے کچھ ڈھونڈنا تھا۔ امی نے مجھے بھا کا کمپیوٹر استعمال کرنے کا کہا۔

"اسے پتا چلا تو ناراض ہو گا۔" میں شش و پنج کا شکار تھی۔ میں اس کی چیزوں سے ہمیشہ سے دور رہا کرتی تھی۔

"تم کون سا چوری کر رہی ہو۔ جاؤ جا کر یوز کر لو۔ کچھ کہا تو میں ہوں نا یہاں۔" میں اپنے نوٹس اٹھا کر اس کے کمرے میں چلی آئی۔ اس کا کمپیوٹر آن کر کے میں نے اپنا مطلوبہ ڈیٹا ڈھونڈ کر اپنے ای میل اکاؤنٹ کے ذریعے خود ہی بھیجنا چاہا تو بھا کی ای میل آئی ڈی از خود سامنے آ گئی۔ شاید وہ اسے بند کرنا بھول گیا تھا کیونکہ نہ اس کے کمرے میں کوئی آتا جاتا تھا اور نہ ہی اس کا کمپیوٹر استعمال کرتا تھا۔ وہاں کسی لڑکی کی کچھ معیوب تصاویر تھیں جنہیں دیکھتے ہی میرے کانوں کی لوئیں سرخ پڑ گئیں۔ وہ کوئی ماڈل گرل نہیں لگتی تھی لیکن اس نے لباس ایسا ہی پہن رکھا تھا جیسے وہ کسی بے ہودہ میگزین کے سرورق کا حصہ رہی ہو۔ اگر وہ بھا کی کوئی جاننے والی تھی تو میں اپنے ہی بھائی کے کردار کے بارے میں مشکوک ہو رہی تھی۔ کردار صرف عورت کا ہی نہیں ہوتا۔ مرد کا بھی ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ مرد کے کردار کو ہم پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ میں نے جلدی سے اپنا کام مکمل کیا اور کمپیوٹر بند کر کے کمرے میں چلی آئی۔ ساری رات وہ تصاویر میری آنکھوں کے آگے ناچتی رہیں۔ یہ سب امی سے کہتے مجھے شرم آ رہی تھی اسی لیے میں نے انہیں بھی نہیں بتایا۔

"ہو گی کوئی۔ مجھے کیا لینا دینا۔" میں نے اپنے ذہن کو ان واہیات تصاویر سے ہٹانے کے لیے پورا زور لگایا اور بالآخر میں کامیاب ہو ہی گئی۔ لیکن میرا بہت گہرا لینا دینا تھا اور یہ مجھے تب پتا چلا جب میں نے عشوہ بھابھی کو شادی کے بعد بنا میک اپ کے پہلی بار دیکھا۔ یہ وہی چہرہ تھا جو میں نے بھا کے کمپیوٹر پہ غیر مناسب لباس میں دیکھا تھا۔ تو وہ کوئی اور نہیں عشوہ ہی تھی۔ میرا دماغ گویا پھٹنے لگا تھا۔ میرے بھائی نے کس قسم کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ کیا اس کے نزدیک ایک لڑکی کے کردار کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ایک لڑکی بنا کسی رشتے کے اسے اپنی نامناسب تصاویر کھینچ کر بھیجتی ہے اور یہ سب اس کے لیے قابل قبول تھا محض اس لیے کہ اس سے اس کی شادی ہونے والی تھی، لیکن ابھی ہوئی تو نہیں تھی نا۔

میرے دل کے کسی کونے میں اگر بھا کے لیے ذرا سی بھی عزت کی کوئی رمق باقی تھی بھی تو اب وہ بھی نہیں رہی تھی۔ تصاویر والی بات میں نے دل کے تہ خانے میں دفن کر دی تھی۔ یہ وہ راز تھا جس کی امین میں تھی۔ اسے بیچ چوراہے میں پھوڑ کر میں خائن نہیں بننا چاہتی تھی۔ کچھ باتیں حیا کے پردے میں چھپ جاتی ہیں۔ میری حیا نے بھی اس راز پر پردہ تان دیا تھا۔

☆☆☆

عشوہ بھلے ایک بگڑی ہوئی لڑکی ہو یا نہ ہو لیکن اتنا ضرور تھا کہ وہ اچھی اداکارہ تھی۔ وہ بھا کی غیر موجودگی میں اردگرد سے بالکل لاپروا ہو کر بس ٹی وی کے سامنے بیٹھی کچھ نہ کچھ دیکھتی رہتی۔ دل کرتا تو یونیورسٹی چلی جاتی ورنہ دیر تک پڑی سوتی رہتی۔ نہ وہ امی کو بلاتی تھی نہ مجھے۔ الٹا وہ عجیب سی نظروں سے یوں دیکھتی کہ ہمیں ہماری اوقات یاد دلا دیتی کہ دیکھو اصل مالک تو میں ہوں تم دونوں تو ایک کونے میں پڑی کسی فالتو کباڑ کی حیثیت رکھتی ہو۔ جہاں کھایا وہیں برتن رکھ دیے۔ جہاں لیٹی سارا کمرہ تلپٹ کر دیا۔ غلطی سے ایک بار امی نے اسے ٹوکا تھا۔

"عشوہ کھانے پینے کے بعد برتن کچن میں رکھ دیا کرو۔ گھر کے ہر کونے سے برتن نکلنا اچھی بات نہیں ہے۔" اس نے امی کو ایسے دیکھا کہ ان کی جرأت کیسے ہوئی اسے ٹوکنے کی۔ ہاتھ میں تھاما ہوا جوس کا گلاس اس نے انڈیل دیا۔ سارا جوس گر کر فرش داغدار کر گیا۔ امی کے ماتھے پہ بل پڑ گئے۔ مجھ سے بھی خاموش نہ رہا گیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے بھابھی؟"
"تم چھوٹی ہو تو چھوٹی ہی رہو۔ میری ماں بننے کی ضرورت نہیں ہے۔" غصے سے وہ مجھ پہ پل پڑی۔ امی نے بھی جواباً اسے غصے سے دیکھا۔
"وہ تو چھوٹی ہے لیکن میں تو بڑی ہوں نا تم سے۔ تمہاری ساس ہوں جو ماں برابر ہی ہوتی ہے تو یہ کیا حرکت کی ہے تم نے میرے سامنے؟ یہ تہذیب ہے تمہاری؟"
"نہ تو آپ میری ماں ہیں نہ ماں برابر ہیں۔ اور میری تمیز و تہذیب پہ ایک لفظ بھی مت کہیے گا۔ میں بالکل برداشت نہیں کرنے والی چاہے کہنے والا کوئی بھی ہو۔" وہ انگلی اٹھا اٹھا کر بالکل جاہل عورتوں کی طرح بات کر رہی تھی۔ امی اور میں تو اس کا بدلا ہوا پینترا دیکھ کر حیران تھے۔ میرے سامنے سے گزرتے وہ پاس پڑی کرسی کو لات مارتے تن فن کرتی چلی گئی۔ میں اور امی وہیں حیران کھڑے رہ گئے۔
"یہ کیا تھا امی؟" دھڑکتے دل سے میں نے امی کو دیکھا تھا۔
"یہ وہ بلا ہے جو تمہارا بھائی اس گھر میں ہمارے سروں پر زبردستی اٹھا لایا ہے۔" وہ سر تھامے بیٹھی رہ گئی تھیں اور میں عشوہ سے مزید ڈر گئی۔
اس نے امی اور مجھ سے بدتمیزی پہ ہی بس نہیں کیا تھا۔ یہ سب اس نے معمول بنا لیا تھا۔ الٹا وہ بھا کے آنے پہ اس کے کان بھی بھرا کرتی تھی جو میں نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا۔ امی کی طرف سے اس کا دل میلا کرنا اور میرے خلاف تو ایک محاذ شروع دن سے قائم تھا۔ پہلے بھا کم تھا کہ وہ بھی چلی آئی تھی۔ میں نے امی سے سرسری سا تذکرہ کیا تھا۔
"بہو کے آنے سے بیٹے یوں بھی پرائے ہی ہو جاتے ہیں سیمی، اور مونی تو پہلے سے اتنا کٹھور تھا کہ اس پہ اب کیا افسوس کرنا۔" امی کو جب میں نے بتایا تو وہ ناگواری سے کہنے لگیں۔
بھا خود بھی ایک رات امی سے شکایت کرنے آیا تھا جس پہ امی نے اس کی ٹھیک ٹھاک کلاس لے ڈالی تھی۔ وہ امی کو مجھ سے دور رہنے کے مشورے بھی دے گیا تھا لیکن امی اب مجھ سے دور نہیں رہ سکتی تھیں۔ سارا دن ان سے بات کرنے ان کے کام کرنے، ان کی سننے والی واحد ہستی میں ہی تو تھی۔ مجھ سے دور ہو کر وہ اکتنا اکیلی پڑ جاتیں کیونکہ یہ بات امی اور میں، ہم دونوں جانتے تھے کہ عشوہ محض بھا کی برین واشنگ کر رہی تھی تاکہ ہمیں ایک طرف کرتے کرتے دیوار سے ہی لگا دے۔

☆☆☆

بھا کے آفس میں کچھ نئے پروجیکٹس شروع ہوئے تھے اسی لیے وہ آفس سے خاصا لیٹ آنے لگا تھا۔ عشوہ سارا دن ادھر ادھر پھرتی رہتی دل کرتا تو گاڑی نکال کر اپنے میکے چلی جاتی۔ وہ نوکری کرنا چاہتی تھی لیکن بھا چاہتا تھا کہ وہ اپنا وقت گھر کو دے۔ اب بھا کو کون سمجھاتا کہ وہ گھر میں دل لگانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اپنی بیوی کے خلاف بھلا وہ کب کسی کی ایک بھی سنتا تھا۔
انہی دنوں جب میں رات سونے سے قبل سارے گھر کے دروازے چیک کر کے سویا کرتی تھی تو میں نے ٹیرس کا دروازہ کھلا پایا تھا۔ ہمارے ہاں ٹیرس پہ جانے کا اتنا رواج نہ تھا۔ ہوا خوری کے لیے ہم لان میں جایا کرتے تھے صرف کپڑے ڈالنے کے لیے ٹیرس استعمال ہوتا اور اس دن تو کپڑے بھی نہیں دھلے تھے۔ اسی لیے میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ ٹیرس کا دروازہ کس نے کھلا چھوڑ دیا۔ پھر یہ ایک بار نہیں دو تین بار ہوا۔ ایک دن میں نے عشوہ کو خود ٹیرس پر جاتے دیکھا تھا۔ وہاں جا کر وہ کیا کرتی ہے یہ میں نہیں جانتی تھی۔ پہلی بار مجھے شک تب گزرا جب میں نے لان سے اوپر ٹیرس میں ایک کے بجائے دو سائے دیکھے۔ بھا گھر پہ نہیں تھا۔ امی اور میں نیچے تھے تو پھر دوسرا سایہ کس کا ہو سکتا تھا۔ میں اندر ہی اندر ڈر گئی تھی۔ کیونکہ اس کا صاف مطلب تھا کہ عشوہ کے ساتھ ٹیرس پہ کوئی موجود ہے جو کم از کم اس گھر کا حصہ نہیں تھا۔ وہ کون تھا یہ میں نہیں جانتی تھی لیکن اتنا جان گئی تھی کہ عشوہ جو بھی کر رہی ہے ٹھیک نہیں کر رہی۔ یقیناً وہ چھپ کر ٹیرس پہ کسی سے ملتی ہے۔ ہمارے ٹیرس سے ساتھ والوں

کا ٹیرس بالکل جڑا ہوا تھا اور دیواریں بھی چھوٹی تھیں کہ کوئی با آسانی وہاں سے چھلانگ لگا کر اتر سکتا تھا اسی لیے ہم ٹیرس کا دروازہ اندر سے بند رکھتے تھے۔ اتنی بڑی بات میں کسے بتاتی اور کون میری بات کا یقین کرتا وہ بھی بنا کسی ثبوت کے۔

☆☆☆

وہ میری زندگی کی بھیانک ترین رات تھی۔ کاش کہ میں اتنی بڑی بے وقوفی نہ کرتی اور جو ہو رہا تھا اسے ہونے دیتی لیکن نجانے میرے دماغ میں کیا سمائی تھی کہ میں گھر میں ہونے والی اس شرم ناک حرکت پہ خاموش نہیں بیٹھ سکی تھی۔ مجھے حیا آ رہی تھی کہ عشوہ جو اس گھر کی عزت تھی وہ گھر کی عزت کو ہی نیلام کر رہی تھی۔ شاید یہ میری قسمت تھی جو مجھے وہاں کھینچ کر لے گئی تھی۔ یہ سب کچھ اسی طرح ہونا تھا کیونکہ قدرت کی بھی کچھ پلاننگ ہوا کرتی ہے جو ہم نہیں جانتے۔ اس رات بھا آفس سے آ کر کچھ دیر سو گیا تھا۔ میں دھلے ہوئے کپڑے اتارنے اور ٹیرس پہ گئی تو دروازے کی کنڈی پہلے سے کھلی ہوئی تھی۔ بنا چاپ کیے ٹیرس کا دروازہ کھولتے میں اندر داخل ہوئی۔ وہ دونوں ٹیرس کے ایک نیم تاریک کونے میں موجود تھے جو آنے جانے والوں کو نظروں سے مخفی تھا۔ عشوہ نے اس لڑکے کے کاندھے پر سر ٹکا رکھا تھا جسے دیکھتے ہی میرا فشار خون بلند ہونے لگا۔ مجھے لوٹ جانا چاہیے تھا کیونکہ انہوں نے میری موجودگی کو محسوس نہیں کیا تھا لیکن اپنی شامت میں نے خود بلائی اور غصے سے پھٹ پڑی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟" وہ دونوں کرنٹ کھا کر پلٹے تھے۔ عشوہ گھبرا گئی تھی وہ اس سب کے لیے تیار نہیں تھی۔

"میں ابھی بھا کو بتاتی ہوں۔" ان دونوں نے میرے ارادے بھانپ کر ایک دوسرے کو دیکھا اور عشوہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔

"تم ایسا نہیں کرو گی سیماب، ورنہ میں وہ کروں گی جو تم کبھی سوچ بھی نہیں سکتیں۔" وہ دوٹوک انداز میں مجھے دھمکا رہی تھی۔

"میں بہت عرصے سے بس جان کر خاموش رہی ہوں کہ شاید تم باز آجاؤ لیکن تم بڑھتی ہی جا رہی ہو۔ تم جتنی گری ہوئی ہو بھا کو بھی تو پتا چلنا چاہیے۔" میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہی تھی۔ پیچھے سے اس لڑکے نے مجھے اس طرح دبوچ لیا کہ میں اپنا آپ چھڑا ہی نہیں سکی اور میں نے چلانا شروع کر دیا۔ صورت حال بگڑتی دیکھ کر عشوہ مجھے وہیں چھوڑ کر دروازہ بند کرتی اندر بھاگ گئی تھی۔ واپسی پہ وہ اکیلی نہیں تھی۔ بھا اس کے ساتھ تھا۔ اس سے پہلے کہ میں بھا کو کچھ بتاتی وہ اپنے کرتوتوں کا ملبہ مجھ پر ڈال چکی تھی۔ میں نے بہت وضاحت دینے کی کوشش لیکن وہ لڑکا بھی مجھے ہی الزام دے رہا تھا جسے میں جانتی تک نہ تھی۔ میں بری طرح سے پھنس چکی تھی۔ ثبوت اور گواہ میرے خلاف تھے اور بھا تو یوں بھی کبھی میرا اعتبار نہیں کرتا تھا۔ اسے تو مجھے نقصان پہنچانے کا موقع چاہیے ہوتا تھا۔ وہ لڑکا مجھ پہ سارا الزام ڈال کر اپنے ٹیرس پہ واپس کود گیا تھا۔ عشوہ یوں ہی معصوم بن گئی تھی تو پھر مجرم کون تھا؟ میں یعنی سیماب حنان۔

بھا مجھے کھینچتا ہوا امی کے کمرے میں لے گیا اور جا کر مجھے بستر پہ پٹخا۔ وہ جو بھی کہہ رہا تھا میں خاموش سے بت بنی سن رہی تھی۔ امی بے یقین تھیں کیونکہ انہیں اپنی بچی کی معصومیت اور بہو کی شاطر طبیعت کا پتا تھا۔ میں جتنی بھی صفائی دے رہی تھی بھا اسے جھٹلا رہا تھا، چلا رہا تھا۔ پھر نجانے مجھے کیا ہوا کہ میں پوری ہمت اور بہادری سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چلاتے ہوئے بولی تھی۔

"ہاں سب جھوٹ ہے۔ بالکل ویسا ہی جھوٹ جیسا آپ نے تب بولا تھا جب میرے ای میل اکاؤنٹ سے آپ نے خود مسیجز ٹائپ کر کے اپنے بنائے ایک فیک اکاؤنٹ پہ بھیجے تھے تاکہ مجھے بدنام کر سکیں۔ میں تب بھی بے گناہ تھی اور آج بھی بے گناہ ہوں۔ تب وہ سازش آپ نے رچائی تھی، آج آپ کی بیوی نے رچائی ہے۔" بھا کو میں نے منجمد ہوتے دیکھا تھا۔ وہ جیسے بالکل برف کا پتلا بن چکا تھا۔

میں نے امی کو سب بتانا چاہا تو عشوہ میری بات کاٹ کر چلانے لگی۔ وہ مجھ پہ گندے الزام لگا رہی تھی۔ کتنا آسان ہوتا ہے نا کسی پہ انگلی اٹھانا، اسے بدنام کرنا، اس کی کردار کشی کرنا۔ مجھے ابو یاد آئے تھے، بہت زیادہ، بے تحاشا۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو کبھی اس عورت کی یہ جرات نہ ہوتی۔ بھا خاموش تھا۔ اسے خاموش ہی رہنا تھا کیونکہ وہ تو کبھی میرا محافظ تھا ہی نہیں جو میرے حق میں بولتا۔ میرا اعتبار کرتا۔ امی مجھے گلے لگا کر رونے لگی تھیں۔ وہ ایک کمزور ماں تھیں، میرا بھلا کیا دفاع کرتیں۔ وہ بس رو سکتی تھیں، بھا کی منتیں کر سکتی تھیں کہ وہ یہ تمام الزام واپس لے لے۔

میں چاہتی تو تصاویر والی بات کھول کر ابھی کے ابھی ان دونوں کو دو کوڑی کا کر دیتی لیکن نجانے کیوں میں خود کو اتنا گرا نہیں سکی۔ میری اندر کی حیا کہتی تھی کہ کسی کا پردہ چاک کرنے سے کبھی نہ کبھی انسان خود بھی بے لباس ہو جاتا ہے۔ گو کہ اس وقت ان میاں بیوی نے مجھے بے لباس کرنے میں کوئی کمی چھوڑی نہیں تھی پھر بھی میں اس اقدام سے باز رہی تھی۔

بھا نے امی سے کہہ دیا تھا کہ وہ کل کی کل خالہ سے کہہ کر میرا اور حماد کا نکاح کر دیں ورنہ وہ خود کسی سے میرا نکاح پڑھوا دے گا۔ ہم دونوں بھا کی اس بات پہ شاکڈ رہ گئے تھے۔ یہ سب بالکل غیر متوقع تھا۔ چند منٹوں میں میری دنیا کیا سے کیا ہو گئی تھی جو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ بھا اور عشوہ جا چکے تھے۔ امی تاسف سے ہاتھ ملتے میری بدقسمتی کو رو رہی تھیں۔

"ہوا کیا تھا مجھے بتاؤ تو۔" میں نے امی کو سب بتا دیا۔ امی اپنا سر تھام کر بیٹھ گئیں۔

"یہ کیا حماقت کی تم نے سیمی۔ تم مجھے تو بتاتیں۔ جب پہلی بار شک ہوا تھا تو بتاتیں مجھے۔ پھر میں دیکھ لیتی کہ کیا کرنا ہے۔ میں ماں تھی، اس گھر کی بڑی تھی، جو میں کر سکتی تھی وہ تم سے نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تم نے کیا کیا سیمی۔" امی ٹھیک کہہ رہی تھیں کہ مجھے انہیں بتانا چاہیے تھا۔

بیٹیوں کو اپنے رازوں کا امین اپنی ماں کو ضرور بنانا چاہیے تاکہ وہ وقت آنے پہ ان کا دفاع کر سکیں، ان کی ڈھال بن سکیں۔ مجھ سے فاش غلطی ہوئی تھی جس کی سزا میں اب اپنی بدنامی کی صورت بھگت رہی تھی۔

اسی وقت امی اٹھیں اور انہوں نے خالہ کو فون ملایا تھا۔ آواز کو قدرے نارمل بنایا۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے لڑکھڑاتی زبان سے انہیں اپنا مدعا بیان کیا تھا۔

"آپا مسئلہ میرا نہیں ان کے ابو کا ہے۔ وہ حماد اور نازش کا رشتہ اکٹھے کرنا چاہتے ہیں۔ یوں ہتھیلی پہ سرسوں جمانے کے وہ بالکل حق میں نہیں ہوں گے۔ آپ کچھ عرصہ انتظار کر لیں۔ سیماب میری ہی بیٹی ہے اور ان شاء اللہ میرے ہی گھر آئے گی۔ اللہ آپ کو صحت دے۔ کچھ نہیں ہوتا۔ ہم سب ہیں نا۔" فون رکھتے ہوئے وہ ایک ہارے ہوئے انسان کی طرح بیڈ پہ ڈھے سی گئیں۔

"اب کیا ہوگا امی؟" ڈرتے ہوئے میں نے امی کی طرف دیکھا۔ ان کی اپنی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے کہیں روپوش کر دیں۔

"اب صرف دعا کی طاقت ہی تمہیں بچا سکتی ہے۔ دعا کرو کہ موئی اپنا فیصلہ بدل دے۔ اس کا دل اللہ پگھلا دے۔" امی پھر سے رو دی تھیں۔ وہ رات ہم دونوں نے روتے اور دعا کرتے گزاری تھی کہ کوئی معجزہ ہو جائے اور بھا اپنا ارادہ بدل لے۔

"اللہ جی ...... آپ جانتے ہیں میں بے گناہ ہوں۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا حتی کہ میں اس کے پاس تک نہیں پھٹکی پھر کیوں میری اتنی آزمائش لے رہے ہیں؟ کیوں مجھے اکیلا کر رہے ہیں؟ کوئی معجزہ کر دیں کہ صبح ہو تو سب ٹھیک ہو گیا ہو۔" میں اتنا رو چکی تھی کہ صبح تک میری آنکھیں بالکل خشک ہو چکی تھیں۔

لیکن صبح بہت بھیانک روپ لے کر اتری تھی۔ میری کوئی دعا کام نہ آئی تھی۔ جو سزا کل میرے حصے میں لکھی گئی تھی وہ اب بھی میرا مقدر بنی میری منتظر تھی۔

بھا یہ کہہ کر چلا گیا تھا کہ میرا نکاح اب وہ اپنے کسی جاننے والے سے کرا دے گا۔ امی دوپٹے میں

منہ دبے روئے چلی گئیں اور میرے ہونٹوں پہ گویا مہر لگ گئی تھی کہ میرے اندر کی سسکیاں اندر ہی دم توڑ گئیں۔ ابو بہت یاد آ رہے تھے۔ وہ ہوتے تو دیکھتے کہ ان کی لاڈلی کو کیسے زندہ درگور کیا جا رہا تھا۔

دوپہر کو عشوہ امی کے کمرے میں آ کر بتا گئی تھی کہ شام میں نکاح خواں اور مسٹر عقیل آئیں گے اسی لیے میں نے جو تیاری کرنا ہے کر لوں۔ اس کے تو انگ انگ سے میرے لیے قہقہے ابل رہے تھے جیسے کہتی ہو کہ میں نے کہا تھا نا کہ منہ بند رکھو، اگر تم مان گئی ہوتیں تو آج یہ سب نہ ہوتا۔ میرے دل سے پہلی بار اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر بددعا نکلی تھی۔

''کاش اللہ تمہاری بدکرداری کو تمہارے منہ پہ اس زور سے اٹھا کر پٹخے کہ تمہاری آنکھوں کی بینائی چلی جائے۔'' میں نے کبھی کسی کو بددعا نہیں دی تھی لیکن اب انجانے میں ہی سہی اسے دے دی تھی۔

شام میں نکاح خواں کے آنے سے پہلے امی نے مجھے ایک ہلکے سے کام والا جوڑا زبردستی پہنایا تھا۔

''اسی میں اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی۔''

میں امی کی اس بات پہ یوں ہنس دی جیسے میں پاگل ہوگئی ہوں۔ ایسے نکاح میں بھلا کیا مصلحت تھی؟ امی مجھے یوں ہنستے دیکھ کر رو دیں۔

''ایسے نہ ہنسو پیمی کہ میرا دل کٹ جائے۔'' ان کے جملے نے میری ہنسی کو بریک لگا دیا تھا۔ میں پھر ایسی جرات نہیں کر سکی۔

میرا نکاح کسی مسٹر عقیل نامی بندے سے پندرہ لاکھ حق مہر کے عوض طے پایا تھا۔ نکاح کے وقت بھا اور عشوہ وہیں موجود تھے۔ میں نے زخمی نظروں سے بھا کو دیکھا تو اس نے نظریں چرا لیں۔ میں اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ مجھ سے اس کی نفرت کیا اس سب کے بعد بس ہو جائے گی یا ابھی کچھ اور بھی باقی ہے۔ اسی تکلیف کو محسوس کرتے میں نے بنا کسی پس و پیش کے نکاح نامے پہ سائن کر دیے تھے۔

امی میری پاس سے اٹھ کر باہر گئی تھیں اور جب لوٹی تھیں تو ان کی آنکھوں میں مٹے مٹے آنسوؤں کے نشان اور ان کی مجھ سے چراتی نظریں مجھے چونکا گئی تھیں کہ کہیں کچھ اور بھی غلط ہوا ہے۔

''امی آپ ٹھیک ہیں؟'' میرے پوچھنے پہ امی نے مجھے دیکھا اور بس کتنے پہر جیسے دیکھتی ہی رہیں۔ ان کی کانچ جیسی بھوری آنکھیں نمکین پانیوں میں ڈوبی ہوئی تھیں اور میرا دل ڈوب ابھر رہا تھا۔ نجانے کیا ہوا کہ انہوں نے میرے آگے یکدم ہاتھ جوڑ دیے۔

''مجھے معاف کر دینا پیمی۔ میں تمہاری ڈھال نہیں بن سکی۔ تمہیں نہیں بچا سکی۔ اپنی ماں کو معاف کر دینا۔ ماؤں کو بہت مضبوط ہونا چاہیے لیکن میں ہمیشہ سے ہی کمزور ماں رہی ہوں۔ ہمیشہ سے میں نے تمہارا حق بھی تمہارے بھائی کو دے دیا۔ شاید میں نے بچپن سے یہ سب نہ کیا ہوتا تو وہ آج یوں غاصب نہ بنتا۔ ماؤں کی گود پہ جو ذمہ داری ہوتی ہے، میں ٹھیک سے نبھا نہ سکی۔ اولادوں سے جو مساوی سلوک رکھنا چاہیے وہ میں نہ رکھ سکی۔ اسی لیے میری ایک اولاد دوسرے کو تباہ کر چکی ہے۔'' اپنے حصے کی ساری زیادتیوں کا اقرار کرتے ہوئے وہ رو دی تھیں۔

''ایسے کیوں کہہ رہی ہیں؟ آپ نے تو میرے لیے بھا کی کتنی منتیں کی تھیں امی۔ آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اولادوں میں کبھی کوئی زیادہ پیاری ہو جاتی ہے امی۔ بھا آپ کو زیادہ پیارا تھا۔ دل پہ کسی کا اختیار نہیں ہوتا، آپ کا بھی نہیں تھا۔ لیکن مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ وہ آپ کا لاڈلا تھا تو میں ابو کی لاڈلی تھی۔ ہم دونوں نے اپنی جگہ اپنے اپنے لاڈ اٹھوائے ہیں۔'' ان کے بندھے ہاتھ میں نے کھول کر چوم لیے تھے۔

''ماؤں کو اولاد کے سامنے یوں ہاتھ جوڑ کر رونا نہیں چاہیے بھلے ان سے زیادتی ہی ہوگئی ہو۔ کیونکہ اولاد کو پیدا کرنے، پالنے میں وہ جتنا کھپ جاتی ہیں، اولاد کو ان کی چھوٹی موٹی زیادتی اس کے آگے معاف کر دینی چاہیے۔''

''اس سے بہتر تو ہوتا کہ میں انہی ہاتھوں سے اس نامراد کا گلا دبا دیتی۔'' میں بری طرح ٹھٹکی

تھی۔ کچھ تو ایسا تھا جو میں نہیں جانتی تھی۔ کچھ بہت غلط ورنہ امی کبھی بھا کے لیے اس حد تک بڑھا ہوا جملہ نہیں کہہ سکتی تھیں۔

"ایسا کیا ہوا ہے۔کیا کیا ہے بھانے۔ پلیز مجھے بتائیں امی۔" امی زور زور سے رونے لگ گئی تھیں اور روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"اس نامراد انسان نے تمہارا نکاح ایک شادی شدہ بڑی عمر کے مرد سے پڑھوادیا ہے۔" وہیں کھڑے کھڑے میرے جسم سے جان نکل گئی تھی اور میں ہلکی ہوکر بیڈ پہ گرگئی تھی۔ زبردستی کا نکاح وہ بھی ایک بڑی عمر کے شادی شدہ مرد سے کیا یہ میری سزا تھی؟ اس گناہ کی سزا جو میں نے کرنا تو دور کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

"اس کا بیٹا بھی ساتھ آیا ہوا ہے باپ کے نکاح میں شرکت کے لیے۔" بیٹے کا لفظ مجھ پہ مزید قیامت بن کر گزرا تھا۔ اور کچھ سننا باقی رہ گیا تھا کیا؟ کوئی لڑکی بھی یہ سب نہیں چاہتی جو میرے ساتھ ہوا تھا۔ بھلے کسی شہزادے کے خواب آنکھوں میں نہ بھی سجے ہوں تو بھی ہم لڑکیاں یہ تو چاہتی ہیں کہ زندگی کا ہمسفر ایسا تو ہو جس کے ساتھ چلنے سے زندگی سہل ہوجائے۔ یہ میری زندگی کس منجدھار میں جا پھنسی تھی۔

"میری نازک سی بچی کے ساتھ اس نے بہت برا کیا۔" امی منہ پہ ہاتھ رکھے اپنی سسکیوں کو دبانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھیں اور میں بس پتھر کی مورت میں ڈھلی سب دیکھ رہی تھی۔ انہیں حوصلہ تب دیتی جب میرے اپنے پاس حوصلہ ہوتا۔ میری تمام مجتمع ہمت ہوا ہوگئی تھی۔

"وہ رخصتی کا کہہ رہے ہیں۔ مغرب ہونے والی ہے اس لیے جلدی کردیں۔" عشوہ اندر آئی تھی اور بڑی رکھائی سے کہتی واپس چلی گئی تھی۔ امی نے ڈبڈبائی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں میکانکی انداز میں اٹھی۔ برابر پڑی چادر کو سر پہ اس طرح اوڑھا کہ میرا سر اور چہرہ اس میں چھپ گئے۔ امی کے گلے لگی تو ان کے آنسو میری آنکھیں بھی بھگو گئے۔ یہ میری رخصتی نہیں تھی یہ تو بڑی شان سے میرا جنازہ نکالا جا رہا تھا۔ بیٹیاں ایسے تھوڑا ہی ماں باپ کی دہلیز سے رخصت ہوتی ہیں جیسے میں ہو رہی تھی۔

"میرا اب اس گھر سے بس ایک رشتہ رہ گیا ہے اور وہ تب تک ہے جب تک آپ زندہ ہیں۔ جنہوں نے مجھے زندہ درگور کیا ہے، اب ان کے لیے میں زندہ نہیں ہوں۔" امی سے مل کر ان کی معیت میں کمرے سے باہر آئی تھی۔ لاؤنج میں کون کون کہاں کہاں تھا میں چادر کا پلو سامنے پڑے ہونے کی وجہ سے دیکھ نہیں سکی۔ امی مجھے مسٹر عقیل تک لائی تھیں اور میرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بس اتنا کہا تھا۔

"میری بیٹی بہت معصوم ہے۔ اس کا بہت خیال کیجیے گا۔" جواباً ایک بھاری بھرکم آواز میری سماعت سے ٹکرائی تھی۔

"آپ بالکل بے فکر رہیے آنٹی۔ یہ اب میری ذمہ داری ہیں۔ میری حفاظت میں ہیں۔"

لفظ حفاظت سے مجھے خوف آتا تھا کیونکہ یہ لفظ ابو کے بعد میرے لیے مکمل اجنبی ہوچکا تھا۔ میرا محافظ بس میرا باپ تھا جو کب کا منوں مٹی تلے جا کر سوگیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اس لفظ نے مجھ سے رخ موڑ لیا تھا۔

بھا میری طرف بڑھا تھا اور میں نے وہیں سے رخ پھیر کر باہر کی جانب کرلیا تھا۔ مجھے اپنے سر پہ اس کے ہاتھ کا دھرنا گوارا نہیں تھا۔ جس ہاتھ نے ہمیشہ نقصان دینے کا کام کیا ہو، اسے اب میرے سر پہ سایہ عافیت بن کر رکھنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ میں بھا اور عشوہ سے ملے بنا ہی نکل آئی تھی۔ جو رشتے اپنی موت آپ مرجائیں، ان کے لیے منافقت کا لبادہ اوڑھنا مجھے پسند نہیں تھا۔

☆☆☆

مسٹر عقیل سے میری باقاعدہ ملاقات فادی کی موجودگی میں ہی ہوئی جب وہ ہاتھ پکڑ کر کچھ کچھ شرماتے ہوئے اپنے آٹھ سالہ بیٹے کو ہلکی پھلکی سی تیار دلہن کے سامنے کرتے کہہ رہے تھے۔

"فادی۔ یہ آپ کی ماما ہیں سیماب۔ سلام

کروانہیں۔'' جس پہ فادی نے کچھ معصومیت سے مجھے اور پھر مسٹر عقیل کو دیکھا تھا۔

''پاپا یہ تو بالکل عفرا کی باربی ڈول جیسی ہیں۔'' شاید اس کا اشارہ میری کم سنی کی جانب تھا۔ مسٹر عقیل مسکرا دیے تھے۔ گو کہ وہ آٹھ برس کے بچے کے باپ تھے لیکن انہوں نے خود کو ایسے مینٹین کیا تھا کہ وہ کہیں سے بھی تین برس سے زیادہ کے نہ لگتے تھے۔ بارعب شخصیت کے حامل دکھنے میں ایک نفیس انسان تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک عجیب سا سحر تھا جو پہلی ملاقات میں ہی مجھے محسوس ہوا تھا۔

''میں انہیں ماما نہیں کہوں گا۔ سیم ٹھیک رہے گا۔'' فادی نے کچھ سوچ کر کہا۔

''ہیلو سیم، میں فہد ہوں۔'' اس نے اپنی ننھا منا سا ہاتھ میری جانب بڑھایا جسے میں نے بنا کسی تاثر کے تھام لیا۔ ابھی میں اتنی بہادر نہیں ہوئی تھی کہ ان غیر متوقع حالات کو قبول کرتے مسکرا کر سب بھول جاتی۔ فادی اپنا تعارف کروا کر چلا گیا تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ ہماری عمروں میں بہت فرق ہے سیماب۔ لیکن یقین کریں کہ پھر بھی میں پوری کوشش کروں گا آپ کے جذبات کو سمجھوں اور ان کی قدر کروں۔ پھر بھی کوئی کمی رہ گئی تو آپ مجھے ٹوک سکتی ہیں۔''

ایک جذبات سے عاری لڑکی جس کے اندر صرف موت کا سناٹا باقی بچا تھا سے مخاطب ہو کر کہا جا رہا تھا۔

''میری وائف کی ڈیتھ سال پہلے کینسر کی وجہ سے ہوئی تھی۔ فادی کو میں نے بہت مشکل سے ٹراما سے باہر نکالا ہے۔ اس پورے سال میں نے اپنا بزنس ایک طرف کر کے اس گھر اور اس پہ توجہ دی ہے کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس وقت فادی کو میری ضرورت سب سے زیادہ ہے۔ پیسے کا کیا تھا وہ تو کبھی نہ کبھی آ ہی جاتا ہے لیکن وہ وقت نہیں آنا تھا جس میں میرے بیٹے کو میری سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ جب تک وہ سنبھل نہیں گیا تب تک میں نے دوسری شادی کا سوچا بھی نہیں۔ شاید اب بھی نہ سوچتا لیکن اسے ایک ماں کی ضرورت تھی۔ عورت میں قدرتی طور پہ مامتا کا جذبہ ہوتا ہے۔ آپ بھلے کم عمر ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ مجھ سے کہیں گنا بہتر اس کا خیال رکھیں گی۔ باپ کبھی ماں کی کمی دور نہیں کر سکتا۔ جب مجھے لگا کہ اب وہ دوسری ماں کو برداشت کر لے گا تو ہی میں نے فیصلہ لیا کہ اب مجھے دوسری شادی کر لینا چاہیے۔ یہ شادی مجھ سے کہیں زیادہ اس کے لیے اہم ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میری نظر میں آپ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آپ بھی مجھے اتنی ہی عزیز ہوں گی جتنی سعدیہ تھی۔'' اپنا بھاری ہاتھ میں میرا نازک سا ہاتھ تھام کر انہوں نے کہا تو میں اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

''اس شادی کے لیے میں کبھی نہ مانتا اگر عشوہ، میرا مطلب آپ کی بھابھی نے مجھے آپ کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کے متعلق نہ بتایا ہوتا۔ وہ سب سن کر مجھے لگا کہ میں آپ کے لیے ایک اچھا لائف پارٹنر ثابت ہو سکتا ہوں۔ یوں بھی فادی کے ہوتے مجھے مزید اولاد کی کوئی ایسی چاہ بھی نہیں ہے۔ اس لیے آپ بے فکر رہیں میری طرف سے۔''

میں اس بات پہ چونکی تھی۔ ٹریجڈی، مزید اولاد تو کیا ان کو شادی پہ آمادہ کرنے کے لیے عشوہ نے میرے متعلق کوئی جھوٹ گھڑا تھا جو میرے علم میں نہیں تھا۔ یقیناً ایسا ہی تھا۔ لیکن اب میں کیسے جان سکتی تھی کہ وہ جھوٹ کیا تھا۔ مسٹر عقیل اور بھی بہت کچھ کہتے رہے جو میں اب غائب دماغی سے سن رہی تھی۔

زندگی کبھی بھی میرے لیے آسان نہیں رہی تھی اور اب جبکہ مجھے اس سے کوئی امید نہیں رہی تھی تو یہ میرے لیے کچھ کچھ آسان ہونے لگی تھی۔ مسٹر عقیل میری چھوٹی چھوٹی ضروریات کا خیال رکھتے تھے حالانکہ میں انہیں اپنی کسی ضرورت کا خود سے نہیں بتایا کرتی تھی۔ کچھ وہ خود سے پوری کر دیتے اور کچھ وہ مجھ سے اگلوا لیا کرتے تھے۔ ہم دونوں کے مابین میاں بیوی کے بجائے ایک مخلص سا دوستی کا رشتہ قائم

تھا جوان کی طرف سے زیادہ اور میری طرف سے کچھ روکھا پھیکا سا ہی نبھایا جا رہا تھا۔ البتہ فادی سے میری خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ عموماً بچے دوسری ماں کا وجود برداشت نہیں کرتے اور اس کی زندگی مشکل بنا دیتے ہیں۔ ہمارے کیس میں ایسا نہیں تھا۔ اس نے بخوشی مجھے قبول کیا تھا بھلے ماں کے بجائے ایک دوست، بڑی بہن کے روپ میں ہی کیا ہو لیکن وہ میرے ساتھ نہ صرف بے تکلف ہو گیا تھا بلکہ خوش بھی رہتا تھا۔ مجھے بھی وہ بالکل اپنے چھوٹے بھائیوں جیسا لگتا تھا یا یوں کہنا چاہیے کہ مجھے بیٹھے بٹھائے ایک بھائی مل گیا تھا۔ اس گھر میں اب اگر کوئی چیز مجھے خوشی دیتی تھی تو وہ فادی کا ساتھ ہی تھا۔ وہ مجھ سے اپنی ہر خوشی غم شیئر کیا کرتا تھا۔ ہم مل کر گھومتے، ٹی وی دیکھتے، پڑھتے پڑھاتے، کھیلتے ہنستے۔ زندگی میں سب یکدم اچھا اچھا سا ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے فادی کے ساتھ کی عادت ہو گئی تھی۔ وہ مجھ سے میری زندگی کے بارے میں سب سوال خود ہی کرتا جاتا اور میری اکثر باتیں وہ مسٹر عقیل تک بھی من و عن بیان کر دیتا۔

''پاپا...... سیم زبردست پینٹر ہے۔'' وہ میری بنائی پینٹنگ باپ کو دکھا رہا تھا۔

''زبردست یہ تو کمال کی ہے۔'' انہوں نے پینٹنگ کو بغور دیکھ کر محبت سے مجھے دیکھا تھا۔ پہلی بار ابو کے بعد کوئی برملا یوں سراہ رہا تھا۔ تعریف سننا کسے برا لگتا ہے؟ مجھے بھی اچھا لگا تھا۔ بلکہ بہت اچھا لگا تھا۔

ہم لڑکیاں محبت کے پیچھے ایسے بھاگتی ہیں جیسے جگنو مٹھی میں قید کرنا چاہتی ہوں۔ پھر محبت ہاتھ آنے پہ جی بھر کر خوش بھی ہوتی ہیں۔ مجھ پہ بھی ادراک ہو رہا تھا کہ مسٹر عقیل کا ساتھ مجھ پہ ایک مہربان بادل کی طرح تھا، دھوپ کی تپش سے بچا لینے والا، ہلکی کن من سی بوندا باندی ساتھ لانے والا۔ محبت بھرا ساتھ جس سے اب مجھے مانوسیت کے ساتھ محبت سی ہو چلی تھی۔ ایک مرد کے لیے میری پہلی پہلی محبت۔

''پاپا۔ سیم کو ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔'' ایک روز فادی نے میرے سامنے ہی مسٹر عقیل سے میری کبھی کی خواہش کا ذکر کر ڈالا تھا۔ مسٹر عقیل کی نظروں اور فادی کی بات پہ میں گڑبڑا گئی تھی۔

''تو تم کیوں ڈاکٹر نہیں بنیں سیماب؟ کیا نمبر نہیں آ سکے؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ میں اتنی ذہین تھی کہ یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ میں میرٹ پہ نہ آ سکتی۔ میری زندگی کے تو جھمیلے ہی اور تھے۔

''ابو کی وفات کے بعد امی کی طبیعت کی وجہ سے میں پڑھائی کو وقت نہیں دے سکتی تھی۔ اس لیے میڈیکل جیسی مشکل پڑھائی ممکن نہیں تھی۔''

''اب تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے نا۔ تم پھر سے پڑھائی شروع کر دو۔ میں تمہارا ایڈمیشن کرواؤں گا۔'' میں اور فادی اس بات سے اکٹھے ہی خوش ہوئے تھے اور یوں میری پڑھائی کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا تھا۔ میں اور فادی اکٹھے مسٹر عقیل کے ساتھ اسکول اور کالج جاتے اور واپس آتے۔ اکٹھے شام میں کتابیں لیے پڑھائی کرتے۔ کیسی مضحکہ خیز سچویشن تھی کہ ماں بیٹا اکٹھے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

مسٹر عقیل کے ساتھ نے مجھے پہلے سے کہیں زیادہ بااعتماد بنا دیا تھا۔ میری شخصیت جو بھا کی وجہ سے کہیں دب گئی تھی اب ابھر کر سامنے آ رہی تھی۔ میں پہلے جیسی سیماب نہیں رہی تھی اور اس سب کا سہرا مسٹر عقیل اور فادی کو جاتا تھا جنہوں نے مجھے اتنی محبت اور توجہ دی تھی۔ یہ شادی میری زندگی کا ایک خوشگوار واقعہ تھی جس کا ادراک مجھے وقت کے ساتھ ہوا تھا۔ زندگی میں اگر بھا نے میرے ساتھ کوئی اچھائی نہ چاہتے ہوئے کی تھی تو وہ میرے لیے مسٹر عقیل کا انتخاب تھا۔ مجھ جیسی کم عمر اور حالات کی ستائی لڑکی کو مسٹر عقیل جیسا نرم دل اور میچور شوہر ہی ملنا چاہیے تھا جس نے مجھے ہمیشہ ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا بالکل ویسے ہی جیسے میرا باپ مجھے بنا کر رکھتا تھا۔ جن لڑکیوں کو ان کے شوہر بھی ان کے باپ جیسے مل جاتے ہیں وہ بڑی خوش قسمت ہوا کرتی ہیں اور یہاں میں مانتی ہوں کہ میں انہیں خوش قسمتوں میں سے ایک تھی۔

جس دن میرا میڈیکل میں ایڈمیشن ہوا تھا امی

مجھ سے ملنے پہلی بار آئی تھیں۔ میں ان کے گلے لگ کر بہت روئی تھی۔ اس سے پہلے ہمارا بس فون پہ ہی رابطہ رہا تھا۔ نہ میں کبھی مڑ کر "حنان ولا" گئی نہ وہاں سے کوئی آیا تھا۔ حتیٰ کہ میری شادی کے چند ماہ بعد ہی بھا کے ہاں بیٹی کی ولادت ہوئی تھی۔ امی نے ہی مجھے فون پہ بتایا تھا۔ نہ میں خوش ہو سکی نہ ہی میں نے مبارک باد دی۔ میرے لیے یہ خبر اب ایسی ہی تھی جیسے کسی چوتھے محلے میں کوئی بچی پیدا ہوئی ہو جس کے ماں باپ کو میں نہیں جانتی تھی۔

مسٹر عقیل نے ایک دوبار مجھ سے میکے جانے کا پوچھا بھی تو میں نے صاف منع کر دیا تھا۔ انہوں نے بھی اسے میرا ذاتی معاملہ سمجھ کر مزید اصرار نہیں کیا تھا۔ اتنا تو وہ جان ہی گئے تھے کہ میں اپنی بھائی اور بھابی کو پسند نہیں کرتی اسی وجہ سے میکے جانے سے کتراتی ہوں۔ اس سے زیادہ نہ انہوں نے سوال کیا نہ میں نے بتانا ضروری سمجھا۔

"تم خوش ہو؟ عقیل تمہارا خیال تو رکھتے ہیں نا؟" میں خوش تھی یا نہیں یہ تو میں نہیں جانتی تھی لیکن بہت زیادہ مطمئن ضرور تھی۔ کم از کم اس سے زیادہ ہی بقتنی میں اپنے میکے میں نہیں تھی۔ امی میری طمانیت دیکھ کر خوشی خوشی میرے گھر سے گئی تھیں۔

☆☆☆

میں میڈیکل کے دوسرے سال میں تھی جب میں نے ایک گائنا کالوجسٹ کو وزٹ کیا تھا۔ ہماری شادی کو چار سال گزر چکے تھے اور اب تک میں نے ایک بار بھی کسی گائنا کو چیک نہیں کروایا تھا۔ اس دن امی کے بہت اصرار پہ ہی میں اپنا چیک اپ کروانے گئی تھی۔ ماں بننا ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے، میری بھی تھی۔ اسی لیے میں نے از خود مسٹر عقیل کے نوٹس میں لائے بنا ہی چیک اپ کرایا تھا۔ میرے کچھ ٹیسٹ ہوئے تھے جن کی رپورٹ نارمل آئی تھی۔ سب نارمل تھا لیکن ڈاکٹر چاہتی تھیں کہ میں اگلی بار اپنے ہزبینڈ کی ساتھ وہاں آؤں۔

"میں کل گائنا کالوجسٹ کے یہاں گئی تھی۔" رات سونے سے قبل میں نے سرسری ساذکر کیا تھا۔ مسٹر عقیل کے برش کرتے ہاتھوں کو جھٹکا لگا تھا۔ وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں ان کی ایسی نظروں سے کوفت زدہ ہو رہی تھی۔ کیا وہ واقعی فادی کے علاوہ کوئی اولاد نہیں چاہتے تھے۔ میرے لیے بھی فادی بہت عزیز تھا لیکن اپنی کوکھ سے اولاد کو جنم دینے کی خواہش کا میں گلا نہیں گھونٹ سکتی تھی۔

"لیکن کیوں......؟" ان کے سوال پہ اب میرا حیران ہونا بنتا تھا۔ بھلا کوئی شادی شدہ عورت، شادی کے چار سال گزرنے پہ کسی گائنا کالوجسٹ کے پاس کیوں جاتی ہے۔

"اپنا چیک اپ کروانے اور کس لیے۔" مجھے ان کا سوال برا لگا تھا اسی لیے میرا لہجہ کچھ ناگوار سا ہو چلا تھا۔

"وہی پوچھ رہا ہوں کہ کیوں۔ تم جانتی ہو نا کہ تم ماں نہیں بن سکتی تو پھر کیوں خود کو اس چکر میں ہلکان کر رہی ہو۔"

میں شاکڈ سی انہیں دیکھ رہی تھی۔ یہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ اتنی بڑی بات وہ اتنی آسانی سے کیسے کہہ رہے تھے اور انہیں ایسا لگا بھی کیوں کہ میں ماں نہیں بن سکتی؟

"آپ کو کس نے کہا کہ میں ماں نہیں بن سکتی؟"

"بچپن میں تمہارا جو کار ایکسیڈنٹ ہوا تھا اس میں تم اپنی ماں بننے کی صلاحیت کھو چکی ہو سیماب۔ کیا تم اس بات سے واقف نہیں ہو؟" میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ کون سا ایکسیڈنٹ؟ میرا تو آج تک کوئی ایکسیڈنٹ نہیں ہوا تھا۔

"یہ سب کس نے کہا آپ سے؟" میں پہلے سے بھی زیادہ شاکڈ رہ گئی تھی۔

"عشوہ بھابی نے مجھے نکاح سے پہلے سب بتا دیا تھا۔ لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم سب جانتی ہو گی۔ اوہ تو تبھی تم اس شادی سے خوش نہیں تھیں۔ اسی بات کو لے کر تم اپنے بھائی بھابی سے ناراض ہو نا؟ یقین کرو کہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ اپنی جگہ

ٹھیک تھے سیماب...... کیونکہ کوئی بھی کنوارا لڑکا ایسی لڑکی کو سب جانتے بوجھتے قبول نہیں کر سکتا جو اس کو اولاد کی خوشی نہ دے سکے۔ میرا انتخاب بھی اسی لیے کیا گیا کیونکہ میں پہلے سے ایک بیٹے کا باپ تھا۔ آئی ایم سوری۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم کچھ نہیں جانتیں۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ بات یوں اس موڑ پہ آ کر کھلے گی۔"

جانتی تو میں بھی نہیں تھی کہ یہ بات یوں اس موڑ پہ کھلے گی۔ تو یہ وہ جھوٹ تھا جو میرے بارے میں گھڑ کر مسٹر عقیل کو مجھ سے شادی پہ آمادہ کیا گیا تھا۔ میرا بھائی ہمیشہ اتنا گر جاتا تھا کہ مجھے نئے سرے سے حیرت ہوتی تھی کہ وہ یہ سب اپنی بہن کے ساتھ کر چکا ہے۔ اب اگر میں اس جھوٹ کو جھٹلاتی کہ یہ سب غلط تھا تو کیا مجھ سے سوال نہ کیا جاتا کہ پھر آخر کیا مجبوری تھی جس کی وجہ سے میرے بھائی بھابھی نے بڑی عمر کے مرد سے میری شادی کروادی اور اگر میں خاموش رہتی تو میں ساری زندگی اس خوشی اور رتبے سے محروم رہ سکتی تھی۔ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"تم بے فکر رہو مجھے نکاح سے پہلے ہی سب بتا دیا گیا تھا اس لیے مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے تمہیں قبول کیا ہے سیماب اور میں تمہارے ساتھ بہت مطمئن ہوں۔" وہ میرا ہاتھ تھام کر محبت سے مجھے تسلی دے رہے تھے۔ لیکن میں کیا کرتی کہ اب مجھے کسی صورت تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ میں جو بالکل نارمل تھی، کیسے خود پہ بانجھ ہونے کا ٹھپا برداشت کر لیتی۔ کیسے اپنی زندگی سے اتنی بڑی خوشی کو اتنی آسانی سے جانے دے سکتی تھی۔

"وہ بچپن کی بات تھی۔ اب سب ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہی ہیں کہ میں ماں بن سکتی ہوں۔" میں نے خود کو کہتے پایا تھا۔ اس وقت مجھے یہی سب ٹھیک لگا تھا۔ ایک بار پھر میں نے اپنے بھائی کی عزت کی خاطر خاموش رہنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ اسی میں میری عزت بھی قائم رہنا تھا۔ مسٹر عقیل میری بات سے جیسے جی اٹھے تھے۔

"تم سچ کہہ رہی ہو؟"

"میں اندر تک جل کر راکھ ہو گئی۔ میں ہی تو سچ کہہ رہی تھی باقی تو سب جھوٹ تھا۔"

"اب کی بار میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

ذہن میں کچھ حساب کتاب کرتے ہوئے میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مسٹر عقیل کے ڈاکٹر کے پاس جانے سے پہلے ہی میں اپنی گائنا سے مل کر اسے ساری صورتحال بتا چکی تھی۔ اسی لیے مسٹر عقیل کے جانے پہ وہ انہیں تسلی کروا رہی تھیں کہ سب نارمل ہے اور میں ماں بن سکتی تھی۔ مسٹر عقیل کے کچھ ٹیسٹ لیے گئے۔ واپسی پہ وہ خوش تھے لیکن میری خوشی کو تو جیسے ہمیشہ کی طرح میرے بھائی کی رزیل فطرت نگل گئی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ میری قسمت میں ہی اولاد کی خوشی نہیں تھی۔ شاید اس لیے کہ اللہ نے میرے لیے کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔

☆☆☆

سیماب کے اس گھر سے جانے کے بعد مجھ پہ بہت بڑے بڑے انکشاف ہونے لگے تھے۔ شاید یہ انکشاف پہلے ہی ہو جاتے اگر میں نے نگاہوں پہ تعصب کا چشمہ نہ لگا رکھا ہوتا یا میں ذرا سا بھی عقل اور ہوش سے کام لیتا۔

سیماب کے جانے کے بعد مجھے آہستہ آہستہ اور اک ہوا تھا کہ عشوہ نے امی کی کبھی خیر خبر نہیں لی تھی۔ وہ جو کہتی تھی کہ سیماب کی وجہ سے اس گھر میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہے تو اب تو اس کے راستے کی دیوار ڈھے چکی تھی پھر وہ کیوں اپنی جگہ نہیں بنا رہی تھی۔ کیوں اپنے گھر کی مضبوط عمارت قائم نہیں کر رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ ایسا کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی ہی نہیں جو اپنا گھر بنانا چاہتی ہیں، اس میں دلچسپی لیتی ہیں۔ امی سیماب کے جانے سے بہت زیادہ اداس رہنے لگی تھیں۔ ایک تو امی کی اداسی اور اکیلا پن، دوسری ان کی ناراضی، تیسرا سیماب کا زبردستی نکاح۔ یہ سب مل کر مجھے بے سکون کر رہے تھے۔ میرے اعصاب پہ ہتھوڑے کی طرح برسنے لگے

تھے۔ اسی لیے اب عشوہ اور میرے آئے دن جھگڑے رہنے لگے تھے۔
"تم امی کا خیال کیوں نہیں کرتیں؟ وہ سارا دن اکیلی پڑی رہتی ہیں؟" اس دن امی کے کمرے سے نکل کر میں سیدھا عشوہ کے پاس آیا تھا اور اس پہ برس پڑا تھا۔ وہ جو مزے سے اپنی کوئی من پسند مووی دیکھ رہی تھی، میرے اس طرح ٹوکنے پہ چلانے لگی تھی۔
"تمہاری ماں مجھے پسند نہیں کرتیں اور بے عزتی کروانے کا مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔" ریموٹ اٹھا کر اس نے ایک طرف پھینکا تھا۔
"تم ان کی خدمت کرو گی تو وہ تمہیں پسند بھی کرنے لگیں گی اور تم سے محبت بھی کریں گی عشوہ۔" لیکن میرے سمجھانے پہ وہ ایسے ہنستی جیسے میں پاگل ہو چکا ہوں جو ایسی بات کر رہا ہوں۔ اس کا یوں ہنسنا بھی مجھے سخت برا لگتا تھا۔
"تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں یہاں تمہاری ماں کی خدمتیں کرنے آئی ہوں۔ مجھے خدمتِ خلق کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں نے شادی تم سے کی ہے تمہارے پورے خاندان سے نہیں۔ کاموں اور خدمت کے لیے نوکر ہوا کرتے ہیں۔ تم کوئی نوکر رکھ لو اپنی ماں کے لیے اگر وہ اتنی ہی تنہائی کا شکار ہو چلی ہیں۔"
"میں انہیں مکمل طور سے نوکروں کے حوالے کیسے کر سکتا ہوں۔"
"چلتی پھرتی ہیں۔ اپنے کام خود کر سکتی ہیں۔ اب خود ہی کمرے میں بستر پہ پڑے رہنے کا شوق ہے تو میں کیا کروں۔ نکلیں باہر، کسی سے ملنے چلی جائیں۔ کہیں گھوم پھر آئیں۔ کوئی کام کر لیں۔ میری اپنی بھی زندگی ہے میں ہر وقت ان کا پہرا نہیں دے سکتی منصور۔ نہ ہی تم مجھے فورس کرو کہ میں اپنی زندگی کو بس تمہاری ماں تک محدود کر لوں۔ میں اپنی کوئی ایکٹیویٹی چھوڑ کر ان کے گھٹنوں سے لگ کر نہیں بیٹھ سکتی۔" اس کا لہجہ اور جملہ دونوں ہی میرے لیے نئے اور حیران کن تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ بہت بدل گئی ہے یا شاید وہ پہلے ہی ایسی تھی۔ میں ہی اسے پہچان نہیں سکا اور اب یہ میں تھا جو بدل رہا تھا۔ ہوش میں آ رہا تھا۔ چیزوں کا مشاہدہ پہلے نہیں کرتا تھا لیکن اب کرنے لگا تھا۔

میں خود تو آفس سے آنے کے بعد امی کے پاس روزانہ جایا کرتا تھا لیکن امی مجھ سے بہت کم بات کیا کرتی تھیں۔ سیماب کے جانے کے بعد سے وہ بہت خاموش ہو گئی تھیں اور ان کی یہ خاموشی مجھے اندر سے ہلا رہی تھی۔ زیادہ تر وہ خاموشی سے اپنی تسبیحات کرتی رہتیں۔ میں جو کچھ پوچھتا تھا اس کا جواب دے دیا کرتی تھیں۔ ان کی آنکھوں کی ویرانی مجھے اندر سے کچوکے لگاتی۔ ان کے خاموش لب میری زبان پہ بھی پہرے بٹھا دیا کرتے تھے۔ اور پھر میں خاموشی سے ان کے کمرے سے اٹھ آیا کرتا تھا۔ عشوہ تو شاید پورا دن ان کے کمرے میں جھانکتی تک نہ تھی۔ اگر جو میں اسے اچھی بہو سمجھتا تھا تو اب میں مان رہا تھا کہ میں مکمل غلط تھا۔ بلکہ اب تو میں یہ بھی مان رہا تھا کہ وہ اچھی بیوی بھی نہ تھی۔ سیماب کے جانے کے بعد مجھے پتا چلا تھا کہ اس گھر کے ساتھ میرے بھی اکثر کام وہی کیا کرتی تھی، عشوہ نہیں۔ عشوہ کو بس اس کے کاموں کو اپنا نام لگا کر میرے سامنے پیش کرنا اور اپنے نمبر بنوانا آتا تھا۔ اب مجھ پہ ساری حقیقت کھل رہی تھی اور میں مزید پچھتاووں کا شکار ہوتا چلا جا رہا تھا۔
تبھی میری زندگی میں ایک نئی تبدیلی آئی تھی۔ نیا جھونکا جس نے زندگی کو تروتازہ کر دیا تھا۔ میں باپ بننے جا رہا تھا اور اس خوشی نے مجھے اندر تک سرشار کر دیا تھا۔ میں جتنا خوش تھا عشوہ اتنی ہی بیزار تھی اس خبر سے۔ پہلے مجھے لگا تھا کہ یہ سب اس کی گری گری طبیعت کے باعث ہے اسی وجہ سے میں اس کا بہت خیال رکھنے لگا تھا کہ وہ خود کو اکیلا نہ سمجھے۔ میں ہر پل اس کے ساتھ ہوں۔ لیکن جلد مجھے احساس ہو گیا کہ وہ ماں بننے کا سوچ کر ہی بیزار ہونے لگتی ہے۔ اولاد کا سکھ سوچ کر اسے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔
"کیا تمہیں یہ بات خوشی نہیں دیتی کہ جلد ہماری زندگی میں ہماری اولاد آ جائے گی؟" میں نے محبت سے عشوہ کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔
"مجھے تو سوچ کر ہی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ بچے

کے بعد بھی کوئی زندگی رہتی ہے۔ ہر چیز پہ پابندی۔ اپنی کوئی لائف ہی نہیں رہتی۔ اوپر سے فکر اور صحت کا الگ کباڑہ۔ اس میں کیا خوشی کی بات ہے بھلا۔" میں حیران سا اس کے خیالات سن رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسی ماں تھی جسے اپنی اولاد کا سوچ کر کسی قسم کی خوشی نہیں ہوتی۔

"لیکن لڑکیوں کو تو شادی کے بعد ماں بننے کا بہت شوق ہوتا ہے۔" وہ ایسی بات پہ مضحکہ خیز انداز میں ہنسی۔

"وہ اور ہی لڑکیاں ہوتی ہوں گی۔ کم از کم میں ایسی نہیں ہوں۔" اور مجھے بھی احساس ہو رہا تھا کہ وہ اور ہی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ گھر بسانے، بچے پالنے والی۔ عشوہ میں ایسا کچھ نہیں تھا۔

"ہم بے بی کی شاپنگ کب کریں گے؟" موضوع اور اس کا دھیان ہٹانے کے لیے میں نے پوچھا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ شاپنگ کا سن کر وہ کچھ خوش ہو جائے گی لیکن اس کا موڈ ہنوز ویسا ہی رہا تھا۔

"جب ہو جائے گا تو شاپنگ بھی کر لیں گے۔ ابھی تو مجھ میں ذرا ہمت نہیں کہ بازاروں کی خاک چھانوں۔" وہی بیزاریت، وہی چڑچڑاپن، میں اس سے جب بھی ہمارے بچے کو لے کر کوئی بات کرتا وہ اسی طرح کے سڑے ہوئے جواب دیتے ہوئے میرا دل برا کر دیتی۔ میری ساری خوشی یوں ہی کرکری ہو جاتی تھی۔

وقت پر لگا کر اڑتا گیا اور میں ایک ننھی منی سی بیٹی کا باپ بن گیا۔ اس کو گود میں لیتے ہی میرے دل کی ساری کلفت دور ہو گئی تھی۔

"اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔ اپنی پھپھو جیسی بدقسمت نہ ہو۔" امی نے اسے گود میں لیتے دعا دی تو میں ایسی دعا پہ سناٹے میں آ گیا تھا اور عشوہ کا تو اتنا موڈ بگڑا کہ وہ خاموش نہ رہ سکی۔

"یہ میری بیٹی ہے۔ اس کا نصیب کیوں برا ہونے لگا آپ کی بیٹی کی طرح۔ خبردار جو آئندہ میری بیٹی کے بارے میں ایسی کوئی بات منہ سے نکالی آپ نے۔" امی نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا اور گہری سانس بھرتے تمنا کو میری گود میں ڈالا۔

"یہ تمہاری بیٹی ہے اسی لیے تو ڈر رہی ہوں۔" امی اٹھ کر چلی گئی تھیں۔ عشوہ غصے سے کھولنے لگی تھی۔

"مطلب کیا تھا ان کا اس بات سے؟" میں خاموشی سے تمنا کو گود میں لیے امی کی کہی بات پہ سوچنے لگا تھا۔ عشوہ نے کیا کہا، میں نے مزید غور نہیں کیا۔ میرے لیے غور طلب بات امی کی تھی جو میرا دل ہولا رہی تھی۔

☆☆☆

"آپ کی سیماب سے بات ہوتی ہے امی؟" اس رات میں امی کے لیے دودھ کا گلاس گرم کر کے لے کر گیا تھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ میں امی سے سیماب کی بات کر رہا تھا۔ امی نے بس ہاں میں سر ہلاتے ہوئے دودھ کا گلاس لے لیا تھا۔ وہ مجھ سے سیماب کے متعلق کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

"اسے تمنا کے بارے میں بتایا؟" نہ چاہتے ہوئے بھی میں پوچھ بیٹھا تھا۔ اتنا برا سلوک کرنے کے بعد میں کیا امید رکھتا تھا کہ وہ بھتیجی کی محبت میں بھاگی آئے گی۔

"بتا دیا تھا۔" روکھا پھیکا سا جواب ملا تھا۔

"پھر؟" نجانے کس امید پہ میں نے یہ اگلا سوال کیا تھا۔

"پھر کچھ نہیں۔"

مجھے لگا کہ امی کہیں گی کہ وہ بہت خوش ہوئی، مبارک دے رہی تھی، ملنے آئے گی۔ لیکن امی نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ وہ کہتی بھی کیوں جس بھائی نے بھی بھائی بن کر نہیں دکھایا، اس کی اولاد کی خوشی بھلا سیماب جیسی بہن کو کیوں ہوتی۔ میں مایوس ہو کر لوٹ گیا تھا۔

کچھ دن بعد امی نے مجھے از خود خوشی خوشی بتایا تھا کہ سیماب کا میڈیکل میں ایڈمیشن ہو گیا ہے۔ میں اس خبر سے کھل اٹھا تھا۔ شاید میرے اندر جو ایک پچھتاوا کرلاتا رہتا تھا کہ میں نے اپنی کم عمر بہن کی شادی ایک رنڈوے سے کر دی۔ اس پچھتاوے کو کچھ ڈھارس ہوئی تھی کہ کم از کم سیماب کو اس کی زندگی کی

کوئی خوشی تو ملی۔

''تمہارے ابو کی بہت خواہش تھی اسے ڈاکٹر بنانے کی۔ شکر ہے کہ ان کی یہ خواہش پوری ہونے جا رہی ہے۔'' میرے ابو کی اتنی بڑی خواہش کو مسز عقیل پورا کرنے جا رہے تھے۔

امی اس دن مجھ سے خود سے باتیں کرنے لگی تھیں۔ امی کے چہرے پہ سکون تھا اور میرے اندر وہی سکون اتر رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار سیماب کی کسی کامیابی نے مجھے خوش کیا تھا۔

میں جب بھی تمنا کی صورت دیکھتا تو نجانے کیوں مجھے سیماب یاد آنے لگتی۔ اب جب وہ اس گھر سے چلی گئی تھی تو مجھے وہ بیٹھے بٹھائے یاد آتی تھی۔ میں اندر ہی اندر اس بات سے ڈرتا تھا کہ کبھی میرا بیٹا ہوا تو وہ بھی تمنا کے ساتھ وہی سب نہ کرے جو میں نے سیماب کے ساتھ کیا تھا۔ نجانے ہم جیسوں کو اپنی اولاد کے گود میں آنے سے اتنے وہم اور خدشات کیوں ستانے لگتے ہیں؟ دوسروں کے ساتھ کی گئی اپنی زیادتیاں کیوں یاد آنے لگتی ہیں؟ اپنی اولاد کی شکل دیکھتے ہی ہماری نظروں کے سامنے ہر وہ چہرہ کیوں گھومنے لگتا ہے جس سے ہمیں عداوت رہی ہوتی ہے؟ ہم اپنی پچھلی زندگی پہ پچھتاتے ہوئے تائب کیوں ہونے لگتے ہیں؟ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

تمنا کے بعد میری اور عشوہ کی لڑائیوں کا محور تمنا ہی بن گئی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ عشوہ تمنا کو اتنی توجہ اور محبت نہیں دے رہی جتنی ایک ماں کو دینا چاہیے۔ عشوہ میری ان باتوں پہ نہ صرف چڑتی تھی بلکہ وہ مجھے طعنے بھی دیتی کہ تمنا کی پرورش میں میرا کردار صفر ہے۔

''تو اب تم کیا چاہتی ہو کہ میں نوکری چھوڑ کر بچی پالنا شروع کر دوں؟ جتنا ہوتا ہے میں کرتا ہوں۔ آفس سے لوٹ کر اس کا فیڈر بناتا ہوں۔ رات میں جب جاگتی ہے اسے لوری دے دے کر میں سلاتا ہوں باوجود اس کے کہ مجھے صبح آفس جانا اور تمہیں گھر پہ ہی رہنا ہوتا۔ تم ارد گرد نہ ہو تو میں اس کا ڈائپر تک چینج کر دیتا ہوں۔ اس سے زیادہ میں کیا کروں یار کہ تمہارا یہ شکوہ دور ہو جائے۔''

''تم نے کیا مجھے بچہ سنبھالنے والی آیا سمجھ رکھا ہے کہ پیدا بھی میں کروں اور پالوں بھی میں۔ نہ میری نیند پوری ہو رہی ہے نہ کمزوری جا رہی ہے۔ مجھ میں مزید اسے سنبھالنے کی نہ ہمت ہے اور نہ ہی طاقت۔ بہتر ہے کہ تم اس کے لیے کسی میڈ کا انتظام کر لو۔'' کچھ دن کی بھاگ دوڑ کے بعد اس نے تمنا سے کنارہ کشی کر لی تھی۔ مجھے یوں لگتا کہ جیسے میں امی کو سیماب سے دور کرنے کی چالیں چلا کرتا تھا، قدرت وہی انتقام مجھ سے عشوہ کی ڈھٹائی اور بے اعتنائی کی صورت لے رہی ہے اور قدرت کے انتقام بہت بھیانک ہوا کرتے ہیں۔ لیکن اس سب میں تمنا کا کیا قصور۔ اپنی بیٹی کو دیکھ کر میں کڑھتا تھا۔ قصور تو سیماب کا بھی کوئی نہیں تھا۔ میرے اندر کوئی ہنستا تھا۔

پھر میں نے تمنا کے لیے ایک میڈ کا بندوبست کر لیا تھا۔ تمنا کو مکمل طور سے میڈ کے سپرد کر کے عشوہ بے فکری سے اپنی دلچسپیوں میں مگن ہو گئی تھی۔ دل کرتا تو اسے دیکھ لیتی ورنہ مکمل میڈ کے سپرد ہی لیے رکھتی۔

''گھر کو وہ نہیں دیکھتی، مجھے وہ نہیں پوچھتی۔ چلو یہاں تک تو ٹھیک ہے کم از کم اپنی اولاد کی ذمہ داری تو سنبھالے۔ نوکروں کو بھی دیکھنا پڑتا ہے ورنہ وہ مالک بن بیٹھتے ہیں۔'' امی جواب تک سارے معاملات خاموشی سے دیکھ رہی تھیں۔ ایک دن اس کی غیر موجودگی میں بول پڑیں۔ میں خاموش بت کی طرح سب سنتا تھا لیکن کہتا کچھ نہیں تھا۔ کہتے وہ ہیں جن کے پاس دلائل ہوں اور میرے پاس عشوہ کی حرکتوں کے لیے کوئی دلائل نہ تھے۔ ہاں صرف ندامت تھی۔

کبھی کبھی میں اپنے فیصلے پہ بہت پچھتاتا تھا۔ ابو نے مجھے ٹھیک اس رشتے سے روکا تھا لیکن اس وقت میں نے ان کی ایک نہ سنی تھی۔ انہوں نے عشوہ کے گھرانے کا رکھ رکھاؤ دیکھ کر ہی یقیناً مجھے منع کیا تھا لیکن مجھ پہ تو محبت کا بھوت سوار تھا۔ کبھی مجھے لگتا کہ مجھے سیماب کی ہائے لگی ہے۔ یہ اس کی بددعائیں ہی ہیں جو مجھ بس کر بھی بسنے نہیں دے رہیں۔ کبھی لگتا کہ امی نے جو کہا تھا کہ

جو رشتہ بنا دعا کے بنتا ہے وہ کبھی سکون اور خوشی کا باعث نہیں بنتا تو میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ نجانے کہاں کہاں مجھ سے غلطی ہوئی تھی کہ زندگی بے سکونی کی آماجگاہ بن کر رہ گئی تھی۔ خوشیاں مجھ سے رخصت ہو گئی تھیں۔ میں تمنا کا بچپن انجوائے کرنا چاہتا تھا لیکن نہیں کر پا رہا تھا۔ نہ اس کی تربیت پہ توجہ تھی نہ ہی پرورش ڈھنگ سے ہو رہی تھی۔

''اگر تم اس گھر سے، مجھ سے اتنا ہی تنگ ہو تو بتاؤ۔ ہم الگ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس نام نہاد رشتے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کسی کو بھی۔'' تنگ آ کر میں نے اس کے سامنے یہ رستہ بھی رکھ دیا تھا۔

''تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہو منصور کہ میں تم سے تنگ ہوں؟'' وہ یوں حیران ہوئی کہ مجھے ہی حیران کر گئی۔

میں ایسا نہ سوچتا تو کیسے سوچتا۔ جس عورت کا گھر، شوہر حتیٰ کہ بچی کی طرف بھی کوئی دھیان نہ ہو بس سارا دھیان مووویز، کھانا پینا، اپنی بیوٹی اور فگر کا خیال رکھنے کی طرف ہی لگا ہو اس کا شوہر میری جیسی سوچ نہیں رکھے گا تو کیا کرے گا؟

''تو پھر تم کیا چاہتی ہو؟'' مجھے لگا کہ میں اپنے بال نوچ کر سڑکوں پہ نکل جاؤں گا۔ اس عورت میں مجھے پاگل کر دینے کے سارے گن موجود تھے۔

''میں تو تمہیں چاہتی ہوں لیکن تم شاید اب مجھے نہیں چاہتے۔'' یکدم وہ روہانسی ہو چلی تھی۔ عجیب تماشا تھا کہ میں جو اسے کٹہرے میں کھڑا کر رہا تھا یکدم خود مجرم بن گیا تھا۔

''تو یہ سب کیا ہے پھر؟ نہ تم گھر دیکھتی ہو نہ مجھے۔ نہ تمہیں ہماری بیٹی کی پروا ہے۔ کیا محبت کرنے والے ایسے ہوتے ہیں؟''

''محبت کرنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں کام والی ماسی یا آیا بن جاؤں تو ہی میں تم دونوں سے زیادہ محبت کرتی ہوں گی۔ گھر نہ سنبھالنے یا تمنا کو نہ دیکھنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں علیحدگی چاہتی ہوں۔ اپنا گھر توڑنا چاہتی ہوں۔ تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ تم جانتے ہو مجھے گھر سنبھالنا نہیں آتا۔ میرا مزاج نہیں ہے ایک مکمل ہاؤس وائف بن کر رہنے کا اور میں شروع سے ہی ایسی ہوں اور تمہارا خیال تو میں ہر طرح سے رکھنے کی کوشش کرتی ہوں نجانے تم کیوں شاکی ہو۔ تمنا میری بھی بیٹی ہے اور مجھے اس کی پروا ہے لیکن میں اس کی وجہ سے بالکل گھر میں قید ہو کر نہیں رہ سکتی منصور۔ میری اپنی بھی کوئی لائف ہے جسے جینے کا مجھے پورا حق ہے۔''

یا تو وہ پاگل تھی یا مجھے بنا رہی تھی۔ میں بس اس کا اپنے کندھے پہ دھرا سر دیکھتے سوچ رہا تھا کہ اب ایسے میں کیا کہوں اور کیا کروں۔ یا تو میں ایک شریف شوہر تھا یا ایک بے بس باپ۔ جو بھی تھا بس میں اسے خود سے الگ نہیں کر سکا۔

☆☆☆

زندگی ایسے ہی گزرتی جا رہی تھی۔ میرا اندر جیسے سب دیکھ سن کر بے حس ہو چلا تھا۔ اب میں نے ہر بات میں خود کو یہی کہنا شروع کر دیا تھا کہ جانے دو، دفع کرو۔ بے سکونی رگ و پے میں اتر گئی تھی۔ میری اس بے قراری کا نہ کوئی نام تھا اور نہ اسے سکون ملتا تھا۔

شاید مجھے عشوہ سے اتنا شکوہ نہ ہوتا اگر وہ تمنا کا ہی کچھ لحاظ کر لیتی۔ تمنا عشوہ کے بجائے مجھ سے زیادہ اٹیچڈ تھی۔ وہ جوں جوں بڑی ہو رہی تھی، سنجیدہ ہوتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی مجھے اس میں بالکل سیماب کی جھلک دکھائی دیتی۔ کبھی لگتا وہ تو سیماب کا ہی پرتو ہے بس نام بدل کر میرے گھر آ گئی ہے۔

وہ مجھ سے اکثر پوچھا کرتی تھی۔

''بابا، ماما ایسی کیوں ہیں؟ وہ میری فرینڈز کی مدرز جیسی کیوں نہیں ہیں؟'' میں اس کی طرف دیکھتا۔ مجھے لگتا سیماب ابو سے سوال کر رہی ہے کہ امی مجھے بھا کی طرح وقت کیوں نہیں دیتیں؟

''تمہارے پاس بابا ہیں نا میری جان۔'' میں پیار سے اس کے گال چھوتا۔ کبھی ابو نے بھی سیماب کو ایسے ہی تسلی دی ہو گی۔

''لیکن ماما تو ماما ہوتی ہیں نا۔'' میں نے سر

ہلایا۔ ہاں ماں تو ماں ہوتی ہے۔ جیسے میں نے امی کو سیماب سے دور رکھا بالکل ویسے ہی تمنا کو اس کی ماں سے قدرت نے دور رکھا تھا۔ یہ میری سزا تھی جو میری بیٹی بھگت رہی تھی اور میں کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔

"بابا، کل ایک آنٹی کی کال آئی تھی۔ وہ مجھ سے بہت دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ وہ مجھ سے اتنے پیار سے بات کر رہی تھیں جیسے سب کی ماما کرتی ہیں، جیسے دادو کرتی ہیں۔" میں چونکا تھا۔ کیا وہ سیماب تھی۔ کیا سیماب تمنا سے بات کرتی تھی؟ کیا وہ اس سے رابطے میں تھی۔

"ان کا فون پہلے بھی کبھی آیا ہے؟" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"لیکن مجھے ان سے بات کر کے بہت مزا آیا۔ وہ کون تھیں بابا؟ وہ ہم سب کو جانتی تھیں۔"

مجھے یقین تھا کہ وہ سیماب ہی تھی جو تمنا سے باتیں کرتی رہی تھی۔ اس کے سوا کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بے اختیار ہی میری آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے جنہیں میں نے تمنا سے چھپا لیا تھا۔

سیماب کی اتنے سالوں میں اپنی کوئی اولاد نہیں ہو سکتی تھی۔ کبھی مجھے وہم ہوتا کہ اس کے پیچھے کہیں وہی جھوٹ کارفرما تو نہیں تھا جو عشوہ نے مسٹر عقیل کو منانے کے لیے بولا تھا۔ میرا دل کانپ جاتا تھا۔ میرا ماضی ایسی کمینگی سے بھرا ہوا تھا کہ میں جتنا بھی سوچتا جھرجھری ہی لیتا جاتا اور ماضی ہم جیسوں کو کبھی حال میں سکھ سے نہیں رہنے دیتا۔

شاید زندگی اسی طرح جاری رہتی اگر ایک روز میں اسفند کے ساتھ اس کے ہونے والے بہنوئی سے ملنے نہ جاتا تو۔ اسفند میرا کولیگ کم دوست تھا۔ اس کے ماں باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بہن تھی جس کی وہ بہت دیکھ بھال کر شادی کرنا چاہتا تھا۔ جہاں وہ اس کا رشتہ طے کر رہا تھا، آج کل اسی لڑکے کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتا پھر رہا تھا۔ میں اسے دیکھتا تو سوچتا کہ بھائیوں کو تو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ بہنوں کے سر کا سایہ اور ان کی طاقت۔ جو میں کبھی نہ بن سکا۔ مجھے اسفند کی بہن پہ رشک آتا جسے اتنا پیارا بھائی ملا تھا اور پھر مجھے خود سے گھن آتی جس نے سیماب کو ایک پل سکھ کا سانس نہیں لینے دیا۔

ہم دونوں اسی لڑکے کے آفس اس سے ملنے گئے تھے۔ اس لڑکے کو دیکھتے ہی مجھے کچھ پل لگے یہ یاد کرنے میں کہ میں اس سے پہلے کہاں ملا ہوا ہوں۔ پھر مجھے سب یاد آ گیا۔ یہ وہی لڑکا تھا ہمارا ہمسایہ جس کے ساتھ میں نے سیماب کو پکڑا تھا۔ دس سال گزر گئے تھے اس بات کو۔ اس وقت وہ جوانی کی دہلیز پہ کھڑا کھلنڈرا سا لڑکا تھا۔ اب وہ ایک سوبر سے مرد کا روپ دھار چکا تھا۔ جسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کبھی ایسا لوفر رہا ہوگا۔ اکثر لڑکے نوجوانی میں ایسے ہی ہوا کرتے ہیں اور بعد میں کوئی ان کی جوانی کے متعلق جاننا تک نہیں کہ وہ کیا کیا کرتے رہے ہیں یہ تو لڑکیوں کا ماضی ہوتا ہے جسے کوئی بھولنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ان کی ذرا سی غلطی انہیں پاتال میں پہنچا دیتی ہے۔ وہ کیسے اس شاندار سے آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک سلجھی ہوئی لڑکی سے اس کی شادی ہونے جا رہی تھی جو ہر لحاظ سے مکمل اور شریف خاندان کی تھی۔ اس کا ماضی ڈھل چکا تھا اور سیماب کا ماضی اسے لے ڈوبا تھا کیونکہ اس کا ماضی اس کے حال اور مستقبل کو بھی تباہ کر گیا تھا۔

"تم......" میرے لبوں سے بے اختیار نکلا اور میں اپنے سامنے پڑی کرسی پہ بیٹھ نہ سکا۔ نجانے وہ مجھے پہچانا نہیں تھا یا نظر انداز کر رہا تھا لیکن میں اسے بخوبی پہچان چکا تھا۔

"تم جانتے ہو اسے پہلے سے؟" اسفند اپنی جگہ چونکا تھا۔ میں نے کڑے تیوروں سے سامنے بیٹھے اس لڑکے کو دیکھا جو اب مجھے گھور رہا تھا۔ شاید پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا یا اس مرحلے سے گزر چکا تھا لیکن اس نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

"بڑی اچھی طرح سے۔ تقریباً دس سال قبل یہ ایک لڑکی کے ساتھ انہی کے ٹیرس پہ پکڑے گئے تھے۔ یاد آیا میاں؟" لڑکی کون تھی اور میں اسے کیسے جانتا تھا یہ میں نے گول کر دیا۔ لیکن جانتے بوجھتے کم

از کم میں اسفند کی بہن کی شادی اسے جیسے تھرڈ کلاس لڑکے سے نہیں ہونے دے سکتا تھا۔ یہ دوست سے غداری تھی کہ میں اپنی عزت بچانے کے لیے اس کی بہن کی زندگی داؤ پہ لگا دیتا اور اب یہ زیادتی میں کسی کی بہن کے ساتھ نہیں کر سکتا تھا جو اپنی بہن کے ساتھ کر چکا تھا۔ اس کی زندگی برباد کرنے کی زیادتی۔

"بہت اچھی طرح سے یاد آیا سر۔ لیکن آپ کی غلط فہمی میں دور کر دوں کہ جس لڑکی کے ساتھ مجھے پکڑا گیا تھا اسے تو میں جانتا ہی نہیں تھا۔ بس آتے جاتے دیکھا تھا۔ نہ ہی وہ مجھے جانتی تھی ملنا تو بہت دور کی بات۔"

میں چونکا تھا۔ یہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ اگر وہ اس لڑکی کو جانتا نہیں تھا تو اس رات اس کے ساتھ کیا کر رہا تھا؟ وہ سیماب کے بے گناہ ہونے کی بات کر رہا تھا وہ بھی دس سال بعد۔

"میں تو اس لڑکی کی بھابھی سے ملنے آتا تھا کیونکہ میرا چکر ایک عرصے سے اس کی بھابھی سے تھا۔"

مجھے لگا کہ میرے سر پہ بم پھٹا ہے جس نے میرے پرخچے اڑا دیے تھے۔ "وہ بے چاری تو بس ہمیں ٹیرس پہ ایک دوسرے کے ساتھ دیکھ چکی تھی۔ ہمارا بھانڈا پھوڑنا چاہتی تھی اسی لیے ہم نے اسے ہی پھنسا دیا۔ اسی پہ سارا الزام لگا دیا کہ میں اس سے ملنے آیا تھا اور یہ سارا پلان اس کی بھابھی کا تھا۔"

مجھے لگا میں سرد برفانی تودے تلے دب گیا ہوں۔ سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا اسی لیے میں نے سامنے دھری کرسی کی ہتھی کو پکڑ لیا۔

"میں جوان تھا اور لڑکیاں اس عمر میں دل کو بھاتی بھی تھیں لیکن جب ایک لڑکی خود پیش رفت کرے تو لڑکے کو اور کیا چاہیے ہوتا ہے۔ ایک شادی شدہ عورت کو جب اپنی عزت کا خود پاس نہ تھا تو میں کیوں اس کی عزت کی پروا کرتا؟ یوں بھی اگر وہ میرے ساتھ دل لگی کر رہی تھی تو میں کون سا سیریس تھا۔ لیکن اس کھیل میں ایک بے چاری وہ پھنس گئی تھی جس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہا تھا۔" کوڑے کی طرح تخ تخ میرے وجود پہ وہ الفاظ برسا رہا تھا۔

"منصور یہ سب کیا ہے۔ یہ کس کی بات کر رہا ہے؟ کون سی لڑکی اور اس کا تم سے کیا تعلق ہے؟ کیا تم ٹھیک ہو منصور؟" اسفند کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہم کس کی بات کر رہے ہیں۔ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ میری طرف میری بری حالت کی وجہ سے بڑھا تھا۔ میں گہرے گہرے سانس لیتا اپنے تنفس کو درست کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسفند کا ہاتھ سہارے کے لیے تھام لیا تھا ورنہ میں اپنے پیروں پہ کھڑا نہ رہتا۔

"آئی ایم سوری سر۔ لیکن جو سچ تھا میں نے بتا دیا۔ اس وقت اس لیے نہیں بتا سکتا تھا کیونکہ مجھے لگا تھا کہ سچ میں میری زیادہ تباہی ہوگی۔ اس وقت خود کو بچانے کے لیے مجھے جھوٹ بولنا پڑا لیکن بعد میں اس لڑکی کا انجام جو ہوا وہ مجھے اب تک دکھی کرتا ہے کہ وہ تو بے گناہ تھی۔ جو قصور وار تھی اسے تو کبھی میں نے دکھی نہیں دیکھا۔ ہاں وہ اپنی ہوشیاری پہ خود کو داد ضرور دیتی تھی۔ اس کے شر سے بچنے کے لیے میں نے وہ گھر بدل لیا تھا ورنہ شاید وہ کبھی نہ کبھی مجھے بھی بری طرح پھنسا دیتی۔"

مزید سننے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔ میں اسفند کا ہاتھ تھام کر اس کے آفس سے باہر نکلا۔ کیسے میں گھر تک پہنچا اور کیسے کمرے تک میں نہیں جانتا تھا۔ اپنا کمرہ بند کر کے بیڈ پہ گر کر میں دھاڑیں مار مار کر رویا تھا۔ کیا اور کوئی سچ تھا جو میرے منہ پہ مارا جاتا؟ میری بہن بے گناہ تھی اور گناہ گار میری بیوی تھی۔ میں بدکردار بہن کا بھائی نہیں تھا میں تو بدکردار بیوی کا شوہر تھا۔ ایسی عورت جو اب بھی میرے نکاح میں تھی۔ میری بیٹی کی ماں تھی۔ یا خدایا...... کیا قیامت اس سے بڑھ کر رسوا کن ہوگی؟ ساری رات میں کمرہ بند کر کے بہرا بنا صرف روتا رہا تھا۔ نجانے کس کس نے کمرے کا دروازہ بجایا، مجھے بلایا، میں نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

صبح ہوتے ہی میں عشوہ کو ڈھونڈتا ہوا باہر نکلا تو وہ مجھے وہیں لاؤنج میں بے سدھ پڑی ملی تھی۔ اسے جھنجوڑتے ہوئے میں نے اٹھایا تھا۔

"صبح صبح کیا مصیبت آگئی ہے منصور؟" یہ مشکل اس نے آنکھیں کھولیں۔ جمائی روکی اور مجھے دیکھا۔
"تم اپنا بوریا بستر سمیٹو اور اپنے گھر دفع ہو جاؤ۔" میرے اس جملے پہ وہ پوری طرح سے جاگ گئی تھی۔ مجھے بغور دیکھتے وہ کچھ ڈری ہوئی تھی کچھ حیران تھی۔
"ایسے کیوں کہہ رہے ہو منصور؟ میں نے کیا کیا ہے ایسا؟"
"یہ تم بہت اچھی طرح جانتی ہو کہ تم نے ایسا کیا کیا ہے۔" وہ ابھی بھی حیران تھی۔
"کل مجھے اسفند ملا تھا۔ ساتھ والا اسفند۔ امید ہے تمہیں یاد ہوگا؟" طنزیہ لہجے میں اسے دیکھتے میں نے کہا تو ایک لمحے میں اس کا رنگ اڑ گیا تھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سب سچ تھا جو اسفند نے بتایا تھا۔ غلطی کا کہیں کوئی امکان نہیں تھا۔
"بکواس کرتا ہے وہ۔"
"میں نے تو بتایا ہی نہیں کہ اس نے کیا کہا تو تمہیں کیسے پتا چل گیا کہ وہ کیا کہتا ہے؟" چور کی داڑھی کا تنکا نکل گیا تھا۔
"وہ...... وہ منصور۔" وہ ہکلاتے بات بنانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے اسے بازو سے دبوچا۔
"اب تم یہاں سے اپنی شکل گم کرو۔ میں تمہیں یہاں کسی صورت نہیں رکھوں گا۔"
"میں تمہاری بیوی ہی نہیں، بیٹی کی ماں بھی ہوں منصور۔ کچھ تو خیال کرو۔" وہ منت پہ اتر آئی۔
"خبردار جو تمنا کی بات بھی کی ہو تو۔ اس سے تمہارا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔"
"ایسے مت کرو منصور۔ میں بھٹک گئی تھی۔ مجھے معاف کردو۔"
ایک الٹے ہاتھ کا تماچا میں نے اس کے گال پہ جڑ دیا تھا۔ کیسی ڈھٹائی سے وہ کہہ رہی تھی کہ وہ بھٹک گئی تھی۔ ایک شادی شدہ عورت بھٹک جائے تو اسے کوڑے مار مار کر سنگسار کر دینا بنتا ہے۔ میں تو اسے بہت سستے میں چھوڑ رہا تھا۔ وہ میری منتیں کرنے لگی تھی۔ شادی کے بعد سے ایک اچھی خاصی رقم میں اس کو دیتا رہتا تھا جس سے وہ اپنے گھر والوں کی اعانت بھی کر رہی تھی اور خود بھی خوب خرچ کرتی تھی۔ یقیناً مجھ جیسا کاٹھ کا الو ملنا مشکل تھا تبھی وہ مجھ سے الگ نہیں ہونا چاہتی تھی۔
"اپنا سامان اٹھاؤ اور نکلو یہاں سے ورنہ میں دھکے مار کر تمہیں نکالوں گا۔" اسے پرے دھکیلتے ہوئے میں نکل گیا تھا۔ اب مجھے خود میں ہمت پیدا کر کے سیماب سے ملنے جانا تھا۔ لیکن مجھے اس کے لیے بہت ہمت چاہیے تھی۔

☆☆☆

دس سال بعد بھا میرے سامنے بیٹھے مجھ سے معافی مانگ رہے تھے۔ مجھے بتا رہے تھے کہ وہ نشوہ کو طلاق دے رہے ہیں کیونکہ وہ اچھی ماں نہیں ہے۔ اس نے ان کی خاص کر تمنا کی زندگی تباہ کر دی ہے۔ وہ اس کے اس گھناؤنے منصوبے کو بھی جان چکے تھے جو اس نے میرے خلاف بنا کر مجھے گھر سے بے گھر کیا تھا۔ وہ مجھ سے کی گئی سبھی زیادتیوں پہ بے حد نادم تھے اور یہ ندامت ان کے پور پور سے چھلک رہی تھی۔ اس کے لیے انہیں کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے کہے بنا بھی میں سب سمجھ رہی تھی۔ خاص کر وہ میری مسٹر عقیل سے شادی پہ بہت شرمندہ تھے اور میں انہیں یہ کیسے بتاتی کہ واحد کام جو انہوں نے میرے حق میں بہترین کیا وہ مسٹر عقیل سے شادی ہی تو تھی جس نے میری زندگی کو بہترین رنگ دیے تھے۔ مجھے ایک آئیڈیل لائف پارٹنر ملا اور فادی کی صورت ایک چھوٹا بھائی، بیٹا اور دوست۔ میں اپنے ڈاکٹر بننے کا خواب پورا کر پائی تھی اور ساتھ اپنی ایک آرٹ گیلری بھی شروع کر چکی تھی۔ وہ محرومیاں جو مجھے میرے اپنے گھر میں ملیں، یہاں آ کر دور ہو گئی تھیں۔
"وہ ایک اچھی عورت نہیں تھی بھا...... اور یہ بات آپ جانتے تھے۔ کیا نہیں جانتے تھے؟ کیا کوئی مرد خود کو بھیجی گئی عریاں تصاویر دیکھ کر بھی اسی عورت کو بیوی بنانے کی ضد کر سکتا ہے جو اس کی گرل فرینڈ بن کر اس حد تک گر جائے؟ اگر ہاں تو وہ مرد اب کیسے

کہہ سکتا ہے کہ وہ اچھی ماں نہیں ہے۔ جبکہ وہ جانتا تھا کہ وہ تو اچھی عورت ہی نہیں تھی۔"

بھا کا حال کسی مردہ گدھ جیسا ہو گیا۔ مزید سیاہ، مزید بدبودار۔

"میں اس کی تصاویر آپ کے کمپیوٹر میں شادی سے پہلے ہی دیکھ چکی تھی لیکن میری حیا نے مجھے اس کی پردہ پوشی کیے رکھنے پہ اکسایا تھا جس نے میرا پردہ نہ رکھا۔ میرا وہ عیب اچھالا جو میرا تھا ہی نہیں۔" کچھ زخم وقت گزرنے کے بعد بھی ویسے ہی ہرے رہتے ہیں۔ ایسا ہی زخم میرا بھی تھا۔

"شاید اسی لیے مجھے ایسی بھیانک سزا ملی ہے۔" ان کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔ وہ اب مجھ سے نظریں بھی نہیں ملا رہے تھے۔

"اسے طلاق دے دیں گے تو تمنا کا کیا کریں گے؟ اسے کیوں ماں سے محروم کر رہے ہیں؟"

"وہ نام نہاد ماں ہے جس کا ہونا نہ ہونا تمنا کے لیے ایک برابر ہے۔"

"اس بچی کو ماں کی ضرورت ہے بھا۔ اس سے ماں مت چھینیں۔"

"کیا تم اس کی ماں بنو گی یمی؟"

اس کے سوال پہ میں حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی زندگی، اپنی بیٹی مجھے سونپنے کی بات کرتا رہا تھا۔ جس لڑکی سے وہ حسد اور نفرت کرتا رہا تھا اسے اپنی اولاد دے کر کیا وہ مداوا کر رہے تھے؟

"میں کیسے؟"

"یہ عشوہ ہی تھی نا جس کے جھوٹ کی وجہ سے تم ماں نہیں بن سکیں؟"

تو اسے یہ لگ رہا تھا۔

"بالکل نہیں۔ اس جھوٹ نے مجھے کوئی نقصان نہیں دیا۔ یہ میرا نصیب تھا۔ میرے نصیب میں اولاد نہیں تھی سو نہیں ملی اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں تھا۔" اس کی غلط فہمی میں نے دور کر دی۔

"تمنا کو تم سے بہتر کوئی نہیں پال سکتا۔ میں تو خود اپنی ذات میں ادھورا انسان ہوں، اسے کیا پورا کروں گا؟ اس کی ماں ایک برے کردار کی عورت ہے۔ یہ تو تمنا کی قسمت اچھی تھی کہ عشوہ نے اسے خود سے دور رکھا ورنہ شاید وہ بھی اسی کی بھٹکی راہ پہ چل پڑتی۔"

میں سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"میں پہلی بار تم سے کچھ مانگ رہا ہوں یمی۔ ساری زندگی تمہیں کچھ دے نہیں سکا۔ لیکن بھکاری بن کر مانگنے چلا آیا ہوں کہ تم میری بیٹی کو اپنا لو۔ جلد یا بدیر میں عشوہ کو چھوڑ دوں گا لیکن تمنا کو ماں کا پیار چاہیے۔ وہ تم سے بات کر کے خوشی محسوس کرتی ہے۔ اسے تم سے ماں کی خوشبو آتی ہے۔ اسے اپنا لو۔ مجھے لگے گا تم نے میرے سارے گناہوں کو معاف کر دیا ہے۔" وہ میرے آگے ہاتھ جوڑے بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے بندھے ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔ اس کی بہتی آنکھوں کو صاف کیا تھا۔ اپنے آنسو میں نے اندر ہی روک لیے تھے۔

"میں مسٹر عقیل سے بات کروں گی۔ امید ہے وہ مان جائیں گے لیکن اس سے پہلے میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔" میں اس کی امید توڑنا نہیں چاہتی تھی اور اسے باندھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ بھا اسی امید کے ساتھ چلا گیا تھا۔

میں سوچ رہی تھی کہ زندگی کیسی عجیب ہوتی ہے نا جو ہم سے طرح طرح کے کھیل کھیلا کرتی ہے۔ وہ شخص جس نے مجھ سے ساری زندگی عداوت کا رشتہ نبھایا تھا آج جب میرے سامنے معافی مانگنے بیٹھا تو میں جو ساری عمر سوچتی تھی کہ اسے کبھی معاف نہیں کر سکوں گی، اس کے ہاتھ جوڑنے سے پہلے ہی دل صاف کر چکی تھی۔ خونی رشتے کیوں ایسے عجیب ہوتے ہیں کہ صدیاں حائل ہونے پہ بھی گنجائش نکال ہی لیتے ہیں۔

میری اولاد کی تمنا، تمنا کی شکل میں پوری ہونے جا رہی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ مسٹر عقیل مان جائیں گے لیکن بھا عشوہ کو چھوڑ کر اور تمنا کو مجھے سونپ کر کیا کریں گے؟ شاید اس سوال کا کوئی جواب نہ میرے پاس تھا نہ بھا کے۔ کچھ لوگوں کو اپنے کیے کا تاوان تا عمر بھگتنا ہوتا ہے۔

☆☆

زارا شجرا

31 دسمبر 2019ء

''ڈیئر ڈائری...... زندگی کے شجر سے اک اور پتا گر گیا۔''

قلم چلتے چلتے رک گیا...... قرطاس کے سینے پہ گوٹا کناری کے لیے جو موتی تارے درکار تھے، وہ اس کی بوسیدہ پوٹلی میں ناپید تھے۔ قلم ہونٹوں میں جا پھنسی...... ذہن ادھر ادھر بھٹکنے لگا۔ پاس ہی اک جگنو چمکا تھا۔ میسج ٹون سوچوں میں مخل ہوئی۔
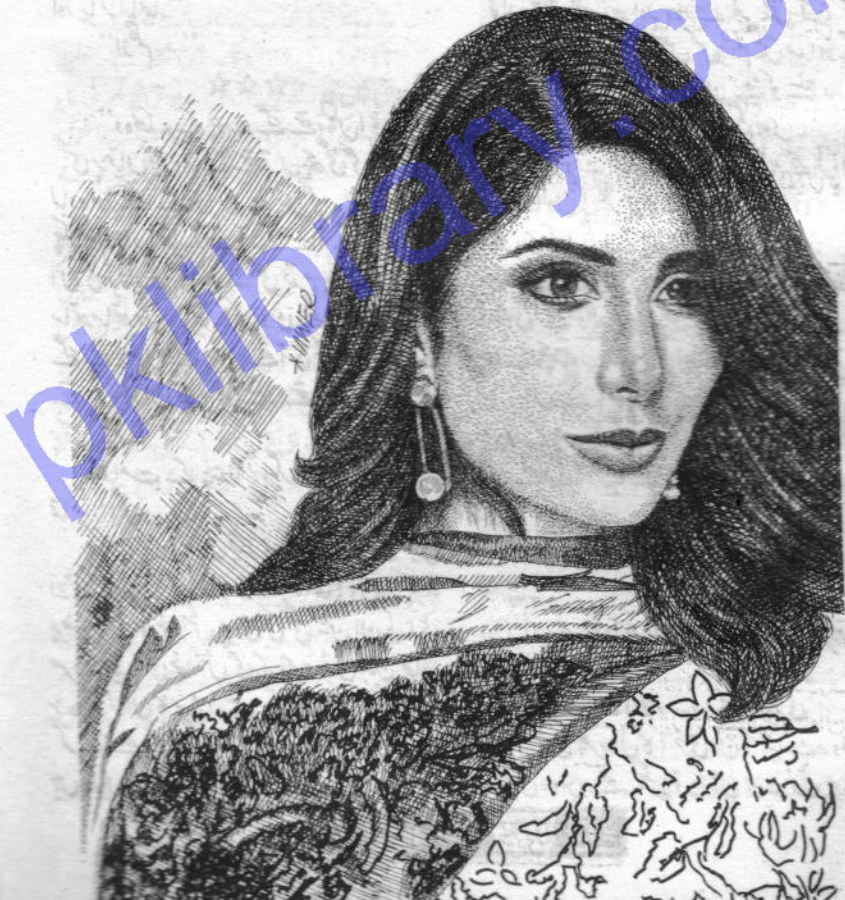
"وی آر گوئنگ ٹو سیلیبریٹ۔"

ساتھ ہی تازہ سیلفی آئی تھی۔ تایا ابو کے دائیں طرف کھڑے زارا، زینب، صائم اور ولید بھائی اور بائیں طرف تائی امی...... چمکتے بشاش چہروں پر پھیلی مطمئن مسکراہٹیں، خوشیوں کے رنگ۔ آئیڈیل تصویر، آئیڈیل گھرانہ، آئیڈیل زندگی منظر آنکھوں میں جم گیا تھا۔

چاروں اور نظر دوڑائی بوسیدہ دیواریں رنگ و روغن سے دور اپنی سفید پوشی کا بھرم تک رکھنے میں ناکام ٹھہری تھیں۔ جھریوں زدہ ستے چہرے پر لہراتی فکریں۔ تلخ لہجے، اکتاہٹ، بیزاری کئی سوال تھے، کئی جواب تھے۔ موازنہ ہوا، احتساب ہوا نتیجہ سامنے تھا۔

"زرد، سوکھا، ٹوٹا پھوٹا کہیں کہیں سے ٹوٹا اک اور پتا گر گیا تھا۔"

"از قلم......"

☆☆☆

"وہ تھک کے چور ہو گئے تھے، لیکن اپنی حالت کسی پر عیاں نہیں کرتے تھے آس بجھ گئی تھی خاموشی کا لبادہ اوڑھے بے بسی ہی بے بسی تھی۔ شب و روز کا چکر چلتا جا رہا تھا۔ وقت آگے سے آگے بڑھ رہا تھا اس کی رفتار تیز تھی، زمانہ بھی قدم بقدم وقت کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اک وہی تھے جو بہت پیچھے رہ گئے تھے برسوں پہلے جہاں تھے آج بھی وہیں کھڑے تھے۔ وہ اڑان نہیں بھر سکتے تھے۔ کیونکہ ان کے پر نہیں تھے۔"

ندامت کے چند آنسو گرے پھر ہچکیوں نے تمام راز اگل دیے۔

انہوں نے ایک فیکٹری میں کام کر کے ہمیں اچھے اسکول میں پڑھایا تھا۔ اچھا کھانا، اچھا کپڑا، ہر ضرورت اور خواہش پوری کی تھی لیکن ان کی اپنی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ ہم دونوں بہن بھائی پڑھ لکھ کر ان کا سہارا بنیں گے۔ ایک پیسہ نہیں جمع کرتے تھے انہیں لگتا تھا جہاں وہ انویسٹ کر رہے ہیں وہاں سے دوگنا منافع ملے گا...... آہ...... ہم دونوں بہن بھائی خود کو بہت عقل مند سمجھتے ہیں نا...... کیا، کیا؟ ان کے خواب کو کرچی کرچی کر دیا۔ ان کا سارا پیسہ کھا گئے اور انہیں خالی ہاتھ کر دیا۔ اب وہ بے بسی سے چپ سادھے دیواریں تکتے ہیں پھر بھی کل کی فکریں ان کے دامن سے ہی لپٹی رہتی ہیں۔

امی کا لہجہ بہت تلخ ہو گیا ہے وہ بھی انہیں ہی سناتی ہیں کہ کیوں ان نااہلوں کو اسکول بھیجا تھا عمر بھر کی پونجی بھی گنوا دی۔ ٹھیک ہی تو کہتی ہیں وہ۔ عفان کے اونچے اونچے خواب۔

"اچھی گاڑی نہیں تو کم از کم بائیک ہی سہی اچھا موبائل سیٹ، سجا سجایا کمرا، ہر سہولت اور خواہش میسر ہو۔ لیکن ہمارے نصیب میں کہاں ہے۔ ہمارے باپ نے ہمارے لیے کچھ کیا ہی نہیں۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور ہمارے گھر میں آج بھی سہولیات کا فقدان۔ پتا نہیں کس جہنم میں پیدا ہو گئے ہم۔" اور وہ بے بسی سے جوان بیٹے کو سنتے رہتے ہیں۔ رہ گئی میں تو میں کیا عفان سے کم ہوں۔

"ہر وقت حساب کتاب...... بجلی کے بل اور آٹے دالوں کی فکریں۔ یہ لوگ ہر وقت اتنی بورنگ باتیں ہی کیوں کرتے ہیں۔

برس ہا برس گزر رہے ہیں اپنی نااہلیوں کو بڑی ڈھٹائی سے والدین پر تھوپتے مگر ہاتھ کچھ نہ آیا سوائے پچھتاوے۔ پشیمانی اور ندامت کے۔"

اس نے ہاتھ کی پشت سے گال صاف کیے رات کے بارہ بج گئے تھے گھڑی ٹک ٹک ٹک چل رہی تھی لمحے سرک رہے تھے اس نے نئے سال، نئے دور میں قدم رکھ دیا تھا۔

"نیا سال نئے عزم، نئے ارادے، نئے خواب۔"

بس پھر باقی صفحہ خالی چھوڑ کے ڈائری بند کر دی تھی۔

31 دسمبر 2020ء...... ڈیئر ڈائری

"آج پھر سال کا آخری دن آ گیا ہے۔ وہی ساعتیں، وہی لمحے۔ لیکن آج میں بہت خوش ہوں

اک اطمینان گھر بھر میں پھیلا ہے، میں نے جو عزم کیے تھے ان پر عملی کوششیں بھی کیں اور آج کامیابی کے جگنو میری مٹھی میں بند ہیں جو میری راتوں کو بھی روشن کرتے ہیں اب رات کی تاریکی سے خوف نہیں آتا۔ میں نے گھر میں ہی تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کر لیا تھا کیونکہ حالات کا یہی تقاضا تھا۔ کالج کا دور تو مجھے راس ہی نہیں آیا تھا۔ سارا دن کھانے پینے اور ہنسنے گانے میں گزارا تھا، نتیجہ ناکامی تھی، سب رشتہ داروں نے مذاق اڑایا تو انہیں مغرور حاسد، کم ظرف کہہ کر اپنا دل ٹھنڈا کیا۔ لیکن دل ایسے کہاں ٹھنڈے ہوتے ہیں یہ تو سچے اطمینان سے ہوتے ہیں اور اطمینان، نااہل سست، کام چور، نکمے لوگوں کو کب نصیب ہوتے ہیں میں بھی بڑی دیر بعد ہی سہی مگر جان گئی۔

وقت کو اب ضائع نہیں کرنا یہ میرا عزم تھا، اپنی پوٹلی میں کچھ کامیابیوں کے موتی تارے جمع کرنے ہیں اور میں نے تگ ودو شروع کر دی تھی۔ ایم اے کی کتابیں دل لگا کر پڑھ رہی تھی۔ سلائی سیکھ کر کپڑے سینا شروع کر دیے تھے۔ تائی نے اپنے محلے سے خواتین کو بھیجنا شروع کر دیا تھا وہ اچھی خاصی اجرت دیتی تھیں۔ میں کند ذہن کبھی نہیں تھی بس کام چور تھی یہ مجھ پر اب واضح ہوا تھا۔ قریب ہی عربی کی پروفیسر تھیں، ان سے قرآن کی تجوید اور تفسیر سیکھی۔ اور محض تین ماہ بعد ہی میں "آن لائن" قرآن تجوید کلاسز دینے لگی۔ مہینے بعد پندرہ ہزار گھر بیٹھے کما لیتی اور سلائی اتنے شوق سے کرتی کہ اکثر رات بارہ بجے تک مشین چلاتی مگر مجھے تھکن نہ ہوتی۔ مہینے کے اختتام پر ابا کے ہاتھ پر جب میں پچیس، چھبیس ہزار رکھنے لگی تو وہ بوڑھا جوان ہو گیا، جھریاں کم ہونے لگیں ان کے چہروں پر لہراتے فکروں کے سائے ختم ہونے لگے۔ گھر کی حالت میں کافی تبدیلی آ گئی کئی سہولیات آ گئیں اور جو سب سے بڑی تبدیلی آئی وہ عفان کی سوچ میں تھی۔

عفان جو "آئی کام" کے بعد ابو کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کالج کے بہانے دوستوں کے ساتھ گھومتا تھا، سگریٹ نوشی بھی کرتا اس نے سچے دل سے عزم کیا تھا اور ابو کی کوششوں اور تایا ابو کی مدد سے اسے جونیئر کلرک کی نوکری مل گئی تھی۔

ہمارے ابو نے ہمیں بہت زیادہ پڑھانے لکھانے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کے خواب دیکھے تھے ہم وہ پورے نہیں کر سکے پر اب ہم اتنے باشعور ہو گئے ہیں کہ کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں۔ ہم نے ان کے خواب پورے نہیں کیے، وہ پھر بھی اب خوش ہو گئے ہیں۔ کاش ہم محنت کرتے اور ان کے اصل خواب پورے کرتے...... کاش! لیکن کوئی بات نہیں اگلے سال میرا M.A مکمل ہو جائے گا اور میں کسی گورنمنٹ سکول میں ٹیچر لگ جاؤں گی عفان بھی پڑھ رہا ہے وہ بھی دن رات محنت کر رہا ہے اگر اسی طرح محنت کرتا رہا تو ابو کا خواب پورا ہو جائے گا ضرور۔

تایا ابو کی بیٹی زارا بینک میں منیجر ہے۔ ولید بھائی دبئی میں ہوتے ہیں انہوں نے ہی تو گھر کی کایا پلٹی تھی۔ صائم ڈاکٹر بن رہا ہے اور زینب اپنے سکول کی ٹاپر ہے۔ یہ وہی ہیں جن کے مسکراتے چہروں نے مجھے سوچنے، سمجھنے اور محنت کرنے پر اکسایا تھا۔

اف! گیارہ بج کر بیس منٹ سب باہر میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ہم سب اور تایا کی فیملی مل کے ابھی باہر جا رہے ہیں سیلیبریٹ کرنے لیکن میں اپنی سال بھر کی کمائی قرطاس کے سینے میں منتقل کیے بغیر کیسے جاتی؟ آج تو نوک قلم کے جھرنوں سے الفاظ کا جو دھارا نکلا تو بند ہی نہیں ہو رہا۔ لیکن اب مجھے جانا ہے۔ میرا یہ سال بہت اچھا گزرا میری اپنی کوششوں اور محنت نے میری زندگی بدل دی اور اب محنت کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ میری زندگی کی پوٹلی اب کامیابی کے موتیوں سے بھری رہے گی۔

میری ڈائری میں اس سال کا آخری صفحہ بھی مکمل ہوا اور اب ہم چلتے ہیں نئے سال کو خیر مقدم کرنے مسکراتے چہروں کے ساتھ اور آپ سب کو بھی ہیپی نیو ایئر۔"

☆☆

آسیہ مرزا

حیات علی کی تین بیٹیاں تھیں۔ یہ ایک متوسط گھرانہ تھا۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ راحیلہ بیگم کے سگھڑاپے کا منہ بولتا ثبوت۔ اولاد کی تربیت میں کہیں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔ نیلوفر تو تھی ہی ماں کی طرح صابروشاکر اور ارسلہ نے اس کا لقب قانع آپا رکھ دیا تھا۔ اریبہ چھوٹی فرسٹ ائیر کی طالبہ تھی۔ بس پڑھائی اور موبائل گیمز سے دلچسپی تھی مگر اماں کا دردسر تو ارسلہ تھی۔
نیلوفر کی منگنی جہاں ہوئی تھی وہ لوگ بہت لالچی تھے اور آئے دن کوئی نہ کوئی مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ ارسلہ کو اس کی خالہ کا بیٹا سکندر پسند کرتا تھا لیکن غربت کی وجہ سے ارسلہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔
مہوش جیلانی اور اکبر جیلانی کے دو بچے ہیں، رومی اور آبص۔ آبص ایک حادثہ کی وجہ سے اپنی زندگی سے بےزار ہے۔
نادیہ شاہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ کالج کے ایک ٹور پر اس کی ملاقات آبص سے ہوتی ہے جہاں دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔
آبص کی ماں کو اس رشتے سے اختلاف ہوتا ہے اور وہ نادیہ شاہ کے گھر جا کر اس کی بہت بےعزتی کرتی ہیں۔ جب وہ اس کے بھائی کو مروانے کی دھمکی دیتی ہیں تو مجبوراً نادیہ شاہ آبص کو چھوڑ دیتی ہے اور اپنا گھر بھی تبدیل کر لیتی ہے۔
ارسلہ کو اپنی دوست رومی کے بھائی آبص میں اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آتی ہے۔ جب اس کے گھر والے آبص کا رشتہ لے کر آتے ہیں تو وہ زبردستی اپنی بات منواتی ہے۔
ارسلہ کی شادی آبص سے ہو جاتی ہے لیکن وہ اس بات سے انجان ہے کہ آبص ایک حادثہ میں اپنی ٹانگ سے محروم ہو چکا ہے۔

آبص کی معذوری کی وجہ سے ارسلہ مہوش کو بلیک میل کرنے لگی تھی، وہ حیلے بہانے، طنز کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔

ابا کو اکبر جیلانی کے آفس میں ایک جاننے والے سے علم ہوتا ہے کہ آبص تو کافی عرصے سے معذور ہے وہ بامشکل گھر پہنچتے ہیں اور اماں کو بتاتے ہیں۔ اماں ہمدردی کا اظہار کرتی ہیں اریبہ سے لیکن اریبہ کہتی ہے کہ وہ آج جو عیش کر رہی ہے، ان کے بیٹے کے اسی نقص کی وجہ سے کر رہی ہے۔

ارسلہ کا لالچ دیکھ کر مہوش کو اپنے کیے کا پچھتاوا ہے۔

نادیہ شاہ اپنی دوست کے ذریعے آبص کے بارے میں معلومات کرواتی ہے۔ وہ اس کو آبص کی شادی کی تصویریں سینڈ کرتی۔ نادیہ شاہ کی بات اس کے کزن حمزہ سے ہو جاتی ہے۔ نادیہ شاہ حمزہ کو اپنے ماضی کے بارے میں بتانے کی کوشش کرتی ہے لیکن بتا نہیں پاتی۔

نیلو کی زندگی شادی کے بعد چھوٹی موٹی تلخیوں کے ساتھ اچھی گزر رہی ہے۔ احمر اس کے لیے ایک ٹھنڈی چھاؤں کی مانند ہے۔

عقیلہ خالہ کی خواہش ہے کہ ارسلہ سے نہ سہی اریبہ کی شادی سکندر سے ہو جائے۔ انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار سکندر اور اپنی بہن راحیلہ سے بھی کر دیا ہے۔ ارسلہ جب یہ سنتی ہے تو ان کے گھر جا کر سکندر کو بہت سنائی ہے۔

تیرہویں قسط

کوئی گھنٹہ بھر بعد وہ خوشبودار ذائقہ دار کھانوں کے شاپرز کے ہمراہ موجود تھا۔

''ارے اتنا سارا لانے کی کیا ضرورت تھی بیٹا۔ ایک آدھ چیز لے آتے بس۔'' امی شرمندہ سی ہو گئیں اتنے شاپرز دیکھ کر۔ چکن کڑھائی، چکن ہانڈی، فرائڈ مچھلی، تل والے نان، چپاتیاں، رائتہ، سلاد، میٹھے میں کھیر کی پیالیاں۔

''اسے بھوکا جو رکھا تھا آپ نے، سوچا سود کے ساتھ قرض ادا کر دوں۔'' وہ کرسی کھینچ کر میز کے آگے بیٹھ گیا۔

امی نے سارا کچھ پلیٹوں میں نکال کر سجا دیا تھا اور پلیٹ صاف کپڑے سے پونچھ کر اس کے آگے رکھتے ہوئے چونک کر پہلے اسے پھر نادیہ کی طرف دیکھا۔

''کیا مطلب، اس نے کوئی الٹی سیدھی بکواس کی ہو گی تم سے۔'' ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ خفگی سے نادیہ کو گھورنے لگیں۔

''ارے نہیں آنٹی......'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اس نے کچھ نہیں کہا یہ تو مجھے ویسے بھی سب لانا تھا۔ تین بار آپ کے گھر کھانا کھا چکا ہوں، ایک بار کھلانا تو میرا بھی فرض بنتا ہے نا۔''

''کوئی فرض نہیں بنتا۔ تم مہمان ہو یہاں۔''

''چلیں خفا نہ ہوں، بسم اللہ کریں۔'' وہ ہاتھ آپس میں رگڑتا مسکراتا ہوا کرسی میز کے نزدیک کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''تم یہ لیزر شعاعیں پھینکنا بند کر کے کھانے میں شریک ہو جاؤ۔'' وہ ذرا سی گردن موڑ کر صوفے میں دھنسی نادیہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ جو مسلسل اسے گھورے جا رہی تھی۔

شاید وہ اپنے جملوں کی ادائیگی پر اب شرمندگی محسوس کر رہی تھی اور امی کی طرح اس کے لائے اتنے سارے کھانوں پر شرمندہ اور خفا تھی۔ ناحق اس نے بتا دیا کہ امی نے کھانا نہیں بنایا اور یہ کہ اسے بھوکا مار رہا ہے۔

تبھی تو وہ اتنا کچھ اٹھا کر لے آیا تھا۔
''تم سے کہہ رہا ہوں۔ کھانے میں شریک ہو جاؤ۔ ورنہ سارا کچھ میں ہی ہضم کر جاؤں گا، سر صبح سے بھوکا ہوں۔'' اس کے انداز میں تحکم تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے ساتھ رکھی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ امی بھی روٹیاں ہاٹ پوٹ میں ڈال کر چلی آئیں۔
''سچ کہہ رہا ہوں آنٹی...... یہ سارا کچھ میں اپنے لیے لایا ہوں۔ ایک عرصے بعد تو مجھے کراچی کے کھانے کھانے کو ملتے ہیں۔ ڈٹ کر کھاتا ہوں۔'' وہ سچ کہہ رہا تھا یا امی اور اس کو شرمندگی سے بچا رہا تھا جس میں وہ مبتلا دکھائی دے رہی تھیں، وہ چپ چاپ کھانے لگی۔
''میرا بس چلے تو یہ سارے کھانے پیک کروا کر اپنے ساتھ ہی جدہ لے جاؤں۔''
''تمہاری اماں تو اتنے عمدہ کھانے بناتی ہے تمہیں کیا ضرورت ہے بھلا اس تردد کی۔'' امی اس کے مذاق کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے بولیں۔ وہ بے ساختہ ہنس دیا۔ اور نادیہ کی طرف اچٹتی نظر پھینکتے ہوئے بولا۔
''یہ تو ہے۔ اب اسے بھی کچھ سکھا دیجیے اپنے جیسی سگھڑ بنا دیجیے خالہ...... میں تو گھر کے کھانوں کا شوقین ہوں اور بیوی کے ہاتھ کے پکائے کھانوں میں تو لذت اور خوشبو ہی اور ہوتی ہوگی۔''
جواباً اس نے رخ موڑ کر کڑے تیوروں سے اسے دیکھا۔ مگر وہ نہایت معصومیت سے نگاہوں کا رخ موڑ کر کھانے سے انصاف کرنے لگا۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی اور چند نوالے کھا کر اٹھ گئی۔ امی اس کی باتوں میں لگی تھیں اس طرف زیادہ دھیان ہی نہ دیا۔
کھانے کے بعد امی چائے بنا رہی تھیں وہ بیٹھک میں چلا آیا، جہاں وہ ٹی وی کھولے کوئی ڈرامہ بے دلی سے دیکھ رہی تھی۔ بے دلی کا اندازہ اس کے چہرے سے صاف لگایا جا سکتا تھا۔ بار بار وہ چینل بدل کر پھر اسی چینل پر رک گئی تھی۔ وہ اس سے ذرا فاصلے پر آ کر بیٹھ گیا تھا پھر ہاتھ بڑھا کر ریموٹ اس کے ہاتھ سے اچک لیا۔
''ضروری نہیں ہے کہ تم مجھے نظر انداز کرنے کے لیے ایسے بے سر و پا ڈرامے دیکھتی رہو۔'' وہ اس کے نزدیک کھسک کر چلا آیا۔ ''نظر انداز کرنے کا مطلب مجھ سے فرار چاہ رہی ہو اور فرار تو ہار قبول کرنے والے ہی ہوتے ہیں۔''
اس کی بھرپور نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں اس کے لہجے میں جذبوں کی تپش نادیہ کو پگھلا کر رکھ گئی۔ وہ نظروں کا رخ موڑ گئی۔
''آؤ کوئی اچھی سی لو اسٹوری دیکھتے ہیں وہ چھیڑنے لگا۔ جواباً اس نے تپ کر اسے گھورا حمزہ محظوظ ہو کر ہنسنے لگا۔
''او کے ہارر موی دیکھ لیتے ہیں لو اسٹوری بعد میں دیکھ لیں گے۔''
''زیادہ چھچھورے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے ریموٹ اس کے ہاتھ سے جھپٹتے ہوئے اسے تیز نظروں سے گھورنا چاہا مگر جانے کیا تھا ان آنکھوں میں وہ فوراً نظریں چرا گئی۔ اس کے دھلے دھلے نکھرے چہرے پر ہلکی ہلکی سرخی اتڈی تھی۔ وہ کشن سے اٹھنے لگی کہ حمزہ نے اس کا ارادہ بھانپ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔
''کل جا رہا ہوں۔ اچھی یادیں لے کر جانا چاہتا ہوں۔ پورے پانچ ماہ بعد آؤں گا۔ پانچ ماہ سمجھتی ہو۔ پانچ سال سمجھ لو۔ بہلنے کو تو کچھ یادیں پاس ہونی چاہئیں۔'' جواباً وہ ایک گہری سانس کھینچ کر رہ گئی۔

''ہمسفر
چاہیے   ہجوم   نہیں

"اک مسافر ہی قافلہ ہے مجھے"

اس کی نرم ہتھیلی پر اس کے مضبوط ہاتھ کا دباؤ ذرا سا بڑھا تو۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔

"میں جانتی ہوں تمہیں سارے شاعروں کے مجموعے ازبر ہیں۔" وہ مصنوعی غصہ دکھانے لگی مگر اس کی طرف زیادہ دیر دیکھ نہ پائی اور یکدم کھڑی ہوگئی۔ اس کے انداز میں اضطراب تھا۔

"یادوں میں اضافہ کرو گے تو۔ بے موت مارے جاؤ گے۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "یادیں جونک کی طرح خون چوستی ہیں اذیت میں اضافہ ہوتا ہے۔" وہ جانے لگی۔

"نہیں نادیہ!" وہ یکدم اٹھ کر اسے روکتا ہوا بولا۔ "یادیں تو جینے کا سہارا بن جاتی ہیں۔ یہ انسان کو تنہائی کے احساس سے نکالتی ہیں۔ انہیں مایوس اور افسردہ نہیں ہونے دیں۔"

حمزہ کا دھیان نہ اس کی آنکھوں کی سرخ پر تھا نہ اس کے لہجے کے بنجر پن پر...... وہ تو اپنے ہی کسی دھیان میں تھا۔ پھر ہلکے سے مسکرایا مگر اس کے چہرے کے پتھریلے پن کو محسوس کر کے چونکا۔ اس سے پہلے کچھ کہتا وہ پلٹ کر بیٹھک سے باہر جا چکی تھی۔ وہ بیٹھک سے نکل کر صحن کی جانب بڑھ گئی تھی دل پر بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ صحن میں آ کر ایک نیم تاریک حصے میں جا کر کیاری پر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

نیلوفر، ابھی ہاسپٹل پہنچی تھی احمر کے ہمراہ اور امی اریبہ اور سکندر پر برس رہی تھی، ساتھ ساتھ روئے جا رہی تھی۔

"تم لوگوں نے مجھے غیر سمجھ لیا۔ اتنا بڑا آپریشن ہو گیا خالہ کا اور مجھے کسی نے کچھ بتانے کی زحمت بھی نہ کی۔ اور تم سکندر! تم اتنے بڑے ہو گئے ہو کہ اب بڑی بہن کی ضرورت بھی ختم ہو گئی۔" اس نے سکندر کے بازو پر دو ہتڑ رسید کیا۔ سکندر یونہی چپ بے حرکت کھڑا رہا۔

"ارے پگلی، تمہاری کنڈیشن کی وجہ سے تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں نے منع کر دیا تھا سکندر کو۔" امی اسے بہلانے لگیں۔

"خالہ سے بڑھ کر میرے لیے کچھ نہیں تھا اماں۔" وہ یکدم اماں کے گلے لگ کر رو پڑی۔ اماں اسے تھپکنے لگیں۔

سکندر بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کھڑکی کی طرف رخ کر کے جیسے باہر کی فضا میں سانس لینے لگا۔

"ارسلہ کو خبر کی یا نہیں، وہ الگ ناراض ہو گی۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے اماں سے بولی پھر سکندر کی طرف دیکھا۔ تو سکندر کا پریشان وجود دیکھ کر چوٹ سی پڑی۔ وہ اس کے پاس چلی آئی۔

"وہ ٹھیک تو ہو جائیں گی نا سکندر۔ ڈاکٹر نے تسلی تو کرا دی ہے نا۔ آپریشن کامیاب تو ہو گیا ہے نا۔"

"ہاں ہاں...... آپریشن کامیاب ہو گیا ہے وہ جلد ہوش میں آ جائیں گی۔ تم فکر نہ کرو۔ یہاں آ کر بیٹھو۔" سکندر اسے تھام کر ایک طرف رکھی کرسیوں کی طرف لے گیا اور وہاں بٹھا دیا۔ جلد ہی انہیں روم میں شفٹ کر دیا جائے گا۔ پھر تم مل لینا۔ تسلی کر لینا۔" وہ اسے تسلی دینے لگا۔

نیلوفر نے احمر کا ہاتھ تھام لیا۔ "سکندر کو حوصلہ دیں آپ بھی پلیز، دیکھیں تو کیا حالت ہو گئی ہے اس کی۔"

"ہاں میں دیکھتا ہوں تم فکر نہ کرو۔" وہ مسکرایا اور اسے تھپک کر سکندر کی طرف چلا آیا۔ سکندر نے اسے تشکر آمیز نظروں سے دیکھا۔

"تمہاری بہت فکر ہے اس کو، بہت چاہتی ہے وہ خالہ کو۔"

"ہاں...... امی بھی نیلو کو بہت چاہتی ہیں۔ اس کی فکر کرتی رہتی ہیں۔ اس کے بچے کے لیے تو انہوں نے

نام بھی سوچ رکھے ہیں۔'' وہ یہ کہتے ہوئے مسکرادیا پھر نیلو کی طرف ایک شفقت بھری نظر ڈالی۔
''یار! اتنا رونے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ احمر بھی بے چارہ پورا ہی ڈوب گیا تمہارے اس سمندر میں۔'' اس کا انداز ہلکا پھلکا مزاحیہ تھا نیلو باوجود افسردگی کے ہنس پڑی۔
''میں چائے لے کر آتا ہوں۔'' احمر سکندر کے کندھے کو تھپک کر چلا گیا۔
وہاں سے ایک کونے میں اریبہ جائے نماز بچھا کر تسبیح پڑھ رہی تھی۔ وہ بے حد افسردہ اور مضمحل دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ابھی سکندر کے ہمراہ دوراتوں کی جاگی ہوئی، خالہ کی خیریت اور لمبی عمر کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ سکندر کی بے قراری اسے بے قرار رکھے ہوئے تھے۔ اس کا دل سکندر کی ہر دھڑکن سے بندھا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔
وہ سب چائے پی کر فارغ ہوئے تھے جب ارسلہ دندناتی ہوئی چلی آئی۔ سکندر لمبی سی راہداری میں ٹہل رہا تھا۔ براؤن رنگ کے شلوار سوٹ اور براؤن لیدر کی چپلوں میں وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ موبائل پر کسی سے بات کرتے ہوئے ارسلہ کو دیکھ کر ذرا سا چونکا پھر گفتگو کا سلسلہ منقطع کر کے موبائل جیب میں ڈالتے ہوئے ریلنگ کے پاس ہی رک گیا۔ وہ اماں پر غصہ ہو رہی تھی وہی شکوہ شکایت کہ مجھے خبر کیوں نہ دی اور دی بھی تو اتنی دیر سے کیوں۔ اماں تردید ہی کر رہی تھیں۔
''چھوڑیں اماں، اب تو خالہ کو بھی میری یاد کہاں رہتی ہوگی۔'' وہ کندھے سے بیگ اتار کر اماں کے ساتھ والی خالی کرسی پر رکھ دیا اور سکندر کی طرف آگئی۔ پھر جائے نماز پر بیٹھی اس نے دعا مانگتی اریبہ پر ایک ترچھی نگاہ ڈال کر سکندر کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگی۔
''اب تو نہ میں خالہ کے دل میں رہی ہوں اور نہ خالہ کے بیٹے کے دل میں۔'' وہ خود بھی ریلنگ سے لگ کر استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔
''بکواس ذرا کم ہی کرو تو بہتر ہے۔'' سکندر نے چڑ کر اسے گھورا۔ ''یہ وقت اور نہ یہ جگہ ایسی فضول باتوں کے لیے ہے۔'' وہ قدرے نیچی آواز میں سرزنش کرتا ہوا بولا۔
''ہاں بھئی یہ وقت تو دعا کرنے کا ہے۔ دیکھو دعا کر تو رہی ہے۔'' سکندر کی خفگی کا قطعی اثر نہ ہوا۔ ابرو اچکا کر اریبہ کی طرف آنکھوں سے اشارہ کیا۔ ''اب تو خالہ کو اسی کی دعاؤں کی ضرورت ہے ہم تو فارغ ہو گئے۔'' وہ ریلنگ سے ٹیک لگا کر بے پروائی سے ہنسی۔ ''خدا اس کی دعائیں رنگ لے آئے۔ تمہیں قلبی سکون عطا ہو۔''
''تم یہاں امی کی خیریت پوچھنے آئی ہو یا جلے پھپھولے پھوڑنے۔ دیر یا سویر اطلاع مل ہی گئی نا۔ بے خبر تو نہیں رکھا نا تمہیں۔'' نیلوفر یکدم اس کے سر پر کھڑی ہو کر دبی زبان میں گھر کنے لگی۔
''میں خود بھی ابھی کچھ دیر پہلے ہی آئی ہوں۔ اماں نے احتیاطاً ہمیں دیر سے خبر دی اور شکر کرو کہ یہاں آ کر ہمیں اچھی خبر سننے کو ملی ہے۔ بس اس پر شکر ادا کرو۔''
''ہاں تو میں کیا غلط کہہ رہی ہوں۔ یونہی ایک چھوٹا سا شکوہ ہی کیا ہے نا اور شکوہ اپنوں سے ہی کیا جاتا ہے۔ کیا میں غیر ہو گئی ہوں۔'' وہ برامان کر بولی۔ ''یا اپنوں کی فہرست سے نکل گئی ہوں۔''
نیلوفر اس کی فضول بکواس پر تپ کر جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔
''تم کیا گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھے ہو۔ کچھ پھوٹو گے بھی یا نہیں۔ خالہ ٹھیک تو ہیں نا۔''
''تم کسی کو بولنے کا موقع تو دو تب کوئی بولے نا۔ ہاں ٹھیک ہیں امی۔''
''تو پھر تمہارے منہ پر بارہ کیوں بج رہے ہیں۔''
سکندر نے سخت بے بسی سے اسے دیکھا اور ہلکی سانس بھر کر اس کی بے تکی بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھتے

ہوئے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ مگر دوسرے پل سگریٹ جلدی سے بجھا دی۔
''ایکسکیوز می، میں آتا ہوں ذرا۔'' وہ سگریٹ اور لائٹر تھام کر راہداری کے دوسری طرف جانے لگا۔
''سنو، میں بھی چلتی ہوں باہر۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''یہاں تو بہت گھٹن ہے دل گھبرا رہا ہے میرا۔ تم اسموکنگ کا شوق پورا کرلو۔ میں ذرا تازہ ہوا کھالوں۔'' وہ چپ رہا۔ وہ ہم قدم چلنے لگی۔
''اسی لیے تمہیں دیر سے خبر دی۔ تم اریبہ کی طرح اور میری طرح اس حبس زدہ ماحول میں رات نہیں گزار سکتی تھیں۔'' باغیچے کے ایک حصے کی طرف آتے ہوئے سکندر اندر کے ابال کو نہ دبا سکا تھا ہلکے طنز سے چوٹ کرگیا۔ ''خیر تمہاری بھی مجبوری ہے۔'' وہ اس کی اٹھنے والی نظروں کو نظر انداز کرگیا۔ ''تم وہاں بیٹھو، میں ایک سگریٹ ختم کرکے آتا ہوں۔''
وہ ایک درخت کے نزدیک رک کر سگریٹ سلگانے لگا اور اسے فاصلے پر بنے سیمنٹ کے شفاف بینچ کی طرف بھیج دیا۔ وہ خلاف عادت بلا چوں چرا اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بینچ پر جا کر بیٹھ گئی اور بے مقصد ادھر ادھر بھاگتے بچوں کو دیکھنے لگی پھر سکندر کو تکنے لگی جو دھیرے دھیرے سگریٹ کے کش لگاتا ہوا کسی گہری سوچ میں گم دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اب بھی اتنا ہی ہینڈسم دکھائی دے رہا تھا مگر اب منچلا لڑکا نہیں ایک سنجیدہ اور میچورڈ آدمی دکھائی دے رہا تھا یہ سنجیدگی اس کی دلکشی میں اضافہ ہی کررہی تھی۔ وہ سگریٹ ختم کرکے اس طرف چلا آیا۔
''سوری۔'' وہ اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔
''یہ تم اسموکنگ کب سے کرنے لگے ہو۔'' وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔
''ہمیشہ سے۔''
''پہلے اتنی تو نہیں کرتے ہوگے نا۔''
''ہاں اب کرنے لگا ہوں۔ خیر تم بتاؤ ٹھیک ہو۔'' وہ بات بدلتے ہوئے بولا۔
''ہاں میں تو ٹھیک ہوں۔ ویسے اسمارٹ لگ رہے تھے اسموکنگ کرتے ہوئے۔'' وہ خاصی بے باکی سے بولی۔ ''لگتا ہے بیا کو بھی اپنے اسی ایٹی ٹیوڈ سے گرویدہ کرلیا ہے۔'' وہ کمینگی سے ہنسی۔ سکندر کو اپنی پیشانی جلتی محسوس ہوئی۔
''چلو اب بیا نے ایک بائیک اور چھوٹے سے فلیٹ پر کمپرومائز کرنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں اس کے نصیب کو بدلنے والے۔ جو خود اپنے نصیب کو بدلنا نہ چاہے۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر ہنس پڑی۔
''تمہارے پاس بیا کے ٹاپک کے علاوہ کوئی اور بات ہے تو کرو ورنہ میں چلتا ہوں۔'' وہ ایک ترش سی نظر اس پر ڈال کر بینچ سے اٹھنے لگا۔
''ارے بیٹھو تو۔'' وہ جلدی سے بولی پھر کھسیانی سی ہنسی ہنس دی۔ ''یہ بھی ٹھیک ہے بے چاری بیا کی کیا اوقات باتیں تو بہت ہیں کرنے کو۔''
''تو کرو۔'' سکندر جھنجھ کر رہ گیا تھا۔ اسے پندرہ بیس منٹ بعد ڈاکٹر ظفر سے ملاقات کرنی تھی اور یہ پندرہ بیس منٹ بس گزارنا چاہتا تھا اسی کھلی فضا میں بیٹھ کر۔ مگر اب یہ کھلی فضا اندر کے حبس سے بڑھ کر ہوگئی تھی اس کے لیے..... ارسلہ کی ہمراہی میں تو اسے ایسا ہی لگ رہا تھا۔
''تمہیں پتا ہے سکندر..... اب میں بھی کوٹھی کی مالک ہونے جارہی ہوں۔ بس چند مہینوں میں سمجھ لو۔'' وہ خاصے رازدارانہ انداز میں سکندر کی جانب جھکتے ہوئے گویا ہوئی انداز میں خاصی پرجوش تھی۔ ''وہ تو تم بن ہی چکی ہو۔ کوٹھی کار کی مالک۔'' سکندر ایک ہلکی سانس کھینچ کر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا اور بینچ کی پشت سے ٹیک لگالی۔

"ارے ایسے نہیں اصل مالک یعنی میرے نام کی کوٹھی۔" وہ بولی تو سکندر نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" وہ اس کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں سر اثبات میں ہلاتے ہوئے مسکرائی۔

"یہ بچہ ایسے ہی تو پیدا نہیں کر رہی ہوں۔ ایک کوٹھی خرید کر میرے نام کر رہا ہے ابھی...... سارے کس بل نکل گئے ایک دھمکی سے ہی بچی۔" اس نے یہ کہہ کر جیسے کسی واقعہ کے تصور سے محظوظ ہو کر قہقہہ لگایا۔ "قسم سے سکندر یہ ماں بیٹے اندر سے اتنے روایتی نکلیں گے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا۔ پہلے پہل تو مجھے یہ بچہ بوجھ ہی لگا تھا مگر جب میں نے ذرا دیکھا کہ اس بچے میں تو ماں بیٹے کی جان پھنسی ہوئی ہے تو۔ بس میں نے بھی لگے ہاتھوں وار کر ہی دیا۔ اس بچے کو ضائع کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ جانتے ہو جس طرح جن کی جان طوطے میں ہوتی ہے اسی طرح آبص کی جان اس بچے میں ہے۔ ایک کوٹھی کیا دس کوٹھیاں بھی لکھ دیتا میرے نام پر۔" وہ ہنس رہی تھی۔ محظوظ ہو رہی تھی اپنی فتح پر سرشار دکھائی دے رہی تھی۔

سکندر کو اپنی کنپٹیاں سلگتی محسوس ہونے لگیں۔ اس کا مسکراتا گلابی چہرہ۔ یکلخت سکندر کو سیاہ، ظالم جادوگرنی کا چہرہ دکھائی دینے لگا۔

سکندر کو ایک دو لمحے اس کی ذہنی پستی پر حیرت اور حیرت کے بعد تاسف ہونے لگا۔

"اس طرح تم آبص کی نظروں میں گر بھی سکتی ہو۔" اس نے مصلحتاً "سکتی ہو" کا لفظ استعمال کیا۔ ورنہ اسے پورا یقین تھا، وہ گر چکی تھی۔ "میں نہیں سمجھتا جو کام خوب صورتی سے ہو سکتا ہے، اس میں بدصورتی کی آمیزش کی جائے۔ تم اس کی بیوی ہو۔ اس کی ملکیت کی مالک بھی۔ پھر تمہیں اس طرح کے حربے استعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"رہنے دو۔ یہ کتابیں باتیں ہیں ساری۔ ہوائی محل تعمیر کرنے والوں میں سے نہیں ہوں میں۔ میرے نام ایک دمڑی بھی نہ کرتا۔ تم کیا سمجھتے ہو۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

"کوٹھی میں رہنے سے کوئی کوٹھی کا مالک نہیں بن جاتا۔ گاڑی میں گھومنے سے گاڑی کا مالک نہیں ہو جاتا۔ مالک وہی ہوتا ہے جس کے نام کاغذات ہوں۔ اس کے ہاتھ میں اختیار ہو۔ ہا...... تو کوٹھی میں ملازم بھی رہتے ہیں اور گاڑی ڈرائیور کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس طرح وہ مالک تو نہ ہوئے نا۔"

"مگر تم ملازمہ نہیں ہو، اس گھر کی بہو ہو۔ آبص کی بیوی ہو۔"

"ہاں۔ بیوی ہوں تو بیوی ہی بنا کر رکھنا چاہتا ہے، مالکہ نہیں۔ اب مہوش آنٹی کی طرح میں خود بھی کوٹھی کی مالکہ بن جاؤں گی۔ کیسا......" اس نے سکندر کے چہرے کی طرف دیکھا اور ابرو کو جنبش دی۔ ایک بار پھر داد چاہی۔

سکندر نے سلگتے کی کیفیت سے نکل کر ہنکارا ابھرا۔

"میرا خیال ہے، ہم باتیں پھر کبھی کریں گے، ابھی مجھے ڈاکٹر ظفر سے ملنا ہے۔ امی کی رپورٹس پر ڈسکس کرنا ہے۔" وہ یک دم بینچ سے اٹھ گیا۔ اسے لگا وہ ایک دو منٹ اور یہیں بیٹھا رہ گیا تو اس کے دماغ کی شریان یقیناً متاثر ہو جائے گی۔ ارسلہ اس کی سوچ سے بھی زیادہ پستی میں اتر چکی تھی۔ دولت کے نشے نے اسے بدمست کر دیا تھا۔ اسے شاید اچھائی، برائی اور اخلاقی ضابطوں تقاضوں کی تمیز نہ رہی تھی۔

اس کے قدم تیزی سے ہاسپٹل کے اندرونی حصے کی جانب اٹھ رہے تھے۔

☆☆☆

ہم سمندر ہیں، ہمیں خاموش رہنے دو

ذرا مچل گئے تو شہر لے ڈوبیں گے

"یہاں کیوں آ گئیں؟" حمزہ اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ وہ نیم اندھیرے میں دیوار کو گھور رہی تھی، درحقیقت آنے والے لمحات کو کھوج رہی تھی۔

"ادھر دیکھو۔ میری طرف...... یہاں زندگی بہت خوب صورت اور روشن ہے، وہاں اندھیرے میں کیا رکھا ہے۔" وہ اس کے کان کے نزدیک منہ کر کے مدھم سرگوشی سے بولا۔

وہ شدید ترین بے بسی محسوس کر کے پلٹی۔ صحیح کہہ رہا تھا وہاں روشنی لپکتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی روشن آنکھیں، روشن مسکراہٹ اسے سمیٹنے کو تیار دکھائی دے رہی تھی۔ یک دم وہ اس روشن مسکراہٹ کو نوچ لینے کے درپے دکھائی دینے لگی۔ اس کے دل میں بددلی چھانے لگی۔

"یقیناً اس طرف روشنی ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ میرے پاس روشنی محسوس کرنے والی آنکھیں نہیں ہیں۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"مگر پتا نہیں کیوں، خوشی کسی خوب صورت منظر کی طرح میرے وجود کے سامنے پھیلی دکھائی دے رہی ہے مگر میں اسے چھوتے ہوئے ڈرتی ہوں حمزہ!" ایک سرد سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ وہ یک دم بے حد نڈھال نظر آنے لگی۔

"کیوں...... وجہ......؟" وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا پتھر کی کنی پر۔ اور حیرت سے استفسار کرنے لگا۔ "روشنی سے کون منہ پھیرتا ہے، خوشی سے کون ڈرتا ہے۔"

"جب دل میں کہیں کانٹا سا گڑا ہو، ایک ناآسودگی کی یخ بستہ اداسی دل کی فضا پر پھیلی ہو تو ملنے والی خوشیوں کے رنگ سنولا جاتے ہیں۔ اندر بہت گھٹن ہے تو باہر کی چھاؤں، چھاؤں نہیں لگتی حمزہ۔ پہلے اندر کی تپش کا ختم ہونا ضروری ہے۔ اندر کے اندھیرے کا دم گھٹنا ضروری ہے ورنہ یہ روشنی بے نور لگتی ہے۔"

حمزہ نے تسلی بھرے انداز میں اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ جس کا ہلکا سا دباؤ محسوس کر کے نادیہ کے چہرے کا تناؤ یک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ سر اٹھا کر اس کی طرف بے فیض نظروں سے دیکھنے لگی۔

"مجھے بتاؤ نادی۔ اتنی اپ سیٹ کیوں ہو تم۔ تمہارے دل میں کیا بوجھ ہے جسے تم لیے لیے پھر رہی ہو۔ مجھ سے کتراتی ہو۔ ہنستے ہوئے بھی ہنستی نہیں ہو۔"

وہ اس کے اعصاب کو جھنجوڑ رہا تھا۔ اس کے وجود پر پھیلا سکوت ٹوٹنے لگا۔ ماضی کا وہ دروازہ جو اپنی شعوری کوشش سے اس نے بند کر رکھا تھا اور کوشش کر رہی تھی کہ اس کا اثر حال پر نہ پڑے، مگر حمزہ کی اس قربت، اس تھپکی اور تسلی نے یک دم وہ دروازہ کھول دیا۔ سب کچھ یاد آنے لگا تھا پوری شدت سے۔ کچھ بھی تو نہیں دھندلایا تھا۔ آ بس اس کی آنکھوں کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ اٹھ گئی اور دیوار سے پشت لگا کر ایک گہری سانس کھینچی۔ اس کا ذہن بہت تیزی سے ماضی میں گردش کر رہا تھا۔

"حمزہ۔ تمہارے آگے ایک خوب صورت اور روشن زندگی پھیلی ہوئی ہے۔ تم اسے چھوڑ کر ان اندھیری الجھی پگڈنڈی پر سفر کرنے کی کوشش نہ کرو۔ تمہیں یہاں کچھ نہیں ملے گا۔ سوائے تکلیف اور دکھ کے۔ ایک مایوس، غم زدہ اور ہاری ہوئی لڑکی تمہارے لیے خوشی کا پیامبر کیسے بن سکتی ہے۔ جس کی اپنی خوشیاں اور روشنیاں کسی اور کی مٹھی میں قید ہوں۔ میں تمہاری زندگی میں قطعاً کوئی اجالا نہیں لا سکتی حمزہ۔"

"اس طرح کی باتیں مت کرو نادی۔ میں تو......"

"سنتے رہو بس۔" وہ اس کی بات کاٹ گئی اور مغموم انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ "جو کہہ رہی ہوں بس وہ سنتے رہو۔"

تمام شب، دل وحشی تلاش کرتا ہے
ہر اک صدا میں تیرے حرف و لطف کا آہنگ

اس نے حمزہ کے آگے سب کچھ کھول کر رکھ دیا تھا۔ دھیرے دھیرے رات اتر رہی تھی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ مگر اس رات سے کہیں زیادہ اندھیرا حمزہ کو اپنے دل میں اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس بے یقینی کی جگہ دکھ، تاسف اور ملال دکھائی دینے لگا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے تپنے لگے تھے۔ وہ یک دم سیمنٹ کی کنی سے کھڑا ہو گیا۔

نادیہ نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور جیسے ماضی کے جال سے نکل آئی۔

حمزہ دل گرفتی سے اسے دیکھ رہا تھا پھر عجیب افسردگی سے دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر گیا۔ یہ حملہ اس کے اعصاب کے لیے یقیناً بہت بھاری تھا۔ اس کا دل بری طرح ٹوٹا تھا اور شاید اس کا مان بھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے بکھرے دل کی تسلی کا معاملہ کرے یا اس کے ٹوٹتی آرزوؤں کا، اس کے جذبہ کا، اس کے یقین کا۔

دکھ کی شدت ہو تو الفاظ یوں بھی بڑے بے معنی محسوس ہونے لگتے ہیں۔ اسے بھی ایسا ہی لگ رہا تھا بلکہ اسے تو لگ رہا تھا اس کی قوت گویائی ہی سلب ہو کر رہ گئی ہو۔ حمزہ کی قلبی کیفیت اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔ اس کی ساری گرم جوشی، سرخوشی، شگفتگی یوں بجھ کر رہ گئی تھی جیسے کسی نے چراغ پر رقص کرتے شعلے کو پھونک مار کر بجھا دیا ہو۔

محبت میں دھوکا میں کھانے کا احساس بہت ذلت آمیز ہوتا ہے اور نادیہ شاہ کو لگا حمزہ بھی اسی احساس سے کٹ رہا ہو۔ وہ چلتی ہوئی اس کے نزدیک آئی۔

"محبت سے میرا ایمان اٹھ گیا ہے پتا نہیں محبت ہوتی بھی ہے یا فقط اس کا نام ہے ایک خوش نما خاکہ ہے باقی کچھ حقیقت نہیں۔" حمزہ نے آنکھیں کھولیں اور اس کی طرف دیکھا۔

"اور میرا بھی ایمان اٹھا دینا چاہتی ہو۔" وہ یوں ہنسا جیسے بہت سے آنسوؤں کو روک رہا ہو۔

"میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا حمزہ۔ خود کو محبت کے بھنور میں مت پھنسا لینا۔ ساحل پر کھڑے رہو تو اس کی لہریں بڑی پرسکون لگتی ہیں مگر گہرائی میں جاؤ گے تو یہ تمہیں اپنے اندر کھینچتے ہوئے ڈبو دیں گی۔ جان لے لیتی ہے یہ محبت، یہ فنا کر دیتی ہے۔"

"بس کرو، بس کرو پلیز، بکواس بند کرو۔" وہ یکدم ہتھے سے گویا اکھڑا تھا اور کیوں نہ اکھڑتا۔ خوش گمانیوں کی چادر جو تان رکھی تھی نادیہ شاہ نے کھینچ کر تار تار پھینکی تھی نہ صرف اتار دی تھی تار تار کر دی تھی۔

"پلیز حمزہ! میرے اندر بہت گھٹن تھی بہت حبس تھا مجھے لگ رہا تھا اگر کوئی کھڑکی نہ کھلی تو میرا وجود پھٹ جائے گا۔" وہ ایک عرصے کے بعد کھل کر آنسو بہا رہی تھی۔

حمزہ کے لبوں پر یاسیت بھری مسکراہٹ ابھری۔ مگر آنکھوں میں سرد سرد سی کیفیت رہی۔ ایک اذیت کے عالم میں اس نے سانس کھینچی اور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"کاش یہ گھٹن تم بہت پہلے نکال دیتیں۔" وہ آہستگی سے بولا اور یکدم پلٹا اور بڑے بڑے قدم اٹھاتا گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔

نادیہ شاہ نے افسردگی سے اسے جاتے دیکھا۔ اس کے اٹھتے قدموں سے اس نے جان لیا تھا کہ اس کے دل میں اس کے لیے جو نرم گوشہ تھا وہ اب باقی نہیں رہا تھا۔ وہ جانتی تھی اس نے بے حد سفا کی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے صحن میں ایک نظر دوڑائی۔ یکدم یوں لگا۔ ہر شے پر خزاں اتر آئی ہو۔ ساری رعنائی ساری رونق وہ اپنے

ہمراہ ہمیشہ کے لیے سمیٹ کر لے گیا ہو۔ وہ نزدیک رکھی کرسی پر بے دم سی گر گئی۔ پتا نہیں یہ سب کہہ کر اس نے اچھا کیا تھا یا برا۔ یوں بھی زخم اندر ہی اندر رستا رہے، اسے بہنے کو جگہ نہ ملے تو وہ ناسور بن جاتا ہے اور اسے بھی کسی غم گسار کی طلب تھی جس کے سامنے وہ اپنا سارا غم بہادیتی۔

"مجھے معاف کر دینا حمزہ۔" آنسو بے آواز اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

اسے خبر نہ تھی کہ امی اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھیں اور بیٹی کی آنکھوں کے ہمراہ ان کی آنکھیں بھی بہہ رہی تھیں۔ اس صورت حال پر وہ پشمان اور غمگین تھیں۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ نادیہ اس طرح اپنا ماضی حمزہ کے آگے کھول کر رکھ دے گی۔ انہوں نے حمزہ کو بکھر کے ٹوٹتے پلٹ کر جاتے دیکھا تو انہیں اپنا دل ایک پل تو بند ہوتا محسوس ہوا تھا۔

سچ کہتے ہیں کچھ لوگوں کی خوشیاں پیڑ پر بیٹھے پرندے کی مانند ہوتی ہیں معلوم نہیں کب پرندہ اڑ جائے اور پیڑ کو داغ جدائی دے جائے۔

"تو گویا نادیہ ایکبار پھر خالی ہاتھ رہ جائے گی۔ اب بھلا وہ حمزہ کے دل میں کیسے جگہ بنا پائے گی۔ اس کا یقین، اس کا مان سب کچھ تو توڑ دیا تھا۔ کیسے ازالہ ہوگا اب......ناممکن تھا۔"

یقین ٹوٹ جائے تو محبت کا کوئی گوشہ باقی نہیں رہتا۔ اور وہ یقین ان کی اس بیٹی نے اپنی حماقت سے کسی کانچ کے گلدان کی طرح اٹھا کر پٹخ دیا تھا۔ اب تو حمزہ کو بھی بس یہ کرچیاں چننی تھیں۔

انہوں نے کھڑکی کا پٹ آہستگی سے بند کر دیا۔

منزلوں سے پہلے بھی
لوگ روٹھ جاتے ہیں
یہ تمہیں بتادوں میں
چاہتوں کے رشتے میں
پھر گرہ نہیں لگتی
لگ بھی جائے تو
اس میں
وہ کشش نہیں ہوتی
ایک پھیکا پھیکا سا
رابطہ تو ہوتا ہے
تازگی نہیں رہتی
روح کے تعلق میں
زندگی نہیں رہتی
بات وہ نہیں رہتی

☆☆☆

عقیلہ خالہ کو کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اماں بے حد خوش دکھائی دے رہی تھیں۔ نیلوفر اور ارسلیہ خالہ سے مل کر جا چکی تھیں۔ سکندر نے اریبہ اور اماں کو بھی بصد اصرار گھر بھیج دیا اماں آخر دم تک نہیں جانا چاہ رہی تھیں۔

"تم اکیلے ہو سکندر کئی راتوں کے جاگے ہوئے۔"

"آپ بھی تو جاگتی رہی ہیں میرے ساتھ، آپ کو بھی آرام کی ضرورت ہے خالہ۔"

"پر بیٹا تم بھی تو تھک گئے ہو۔"

"تھکا ہوا تھا۔ مگر اماں کو صحت یابی کی طرف آتے دیکھ کر ساری تھکاوٹ اتر گئی ہے۔ خود کو تازہ دم محسوس کر رہا ہوں۔" وہ سچ کہہ رہا تھا اس کے چہرے پر خاصی بشاشت تھی۔

اریبہ نے چور نگاہوں سے اسے دیکھا اور دل ہی دل میں جیسے اس کی نظر اتاری۔ وہ ایک مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ کہیں بھی کسی بھی لمحے کمزور نہ ہوا تھا بلکہ ہر ایک کو تسلی دیتا رہا تھا۔ وہ ایک گھنے مضبوط سایہ دار درخت کی مانند محسوس ہوتا تھا اریبہ کو...... جو خود تو ہر دھوپ گرمی سہہ لے مگر اس کے سائے میں آنے والا بھرپور چھاؤں پاتا تھا۔

اماں سکندر کو بہت سی دعائیں دے کر اریبہ اور ابا کے ہمراہ گھر چلی گئیں۔ سکندر وہیں کوریڈور میں ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کوریڈور سنسان پڑا تھا اس کے دل کی طرح...... وہ امی کی طرف سے مطمئن ہو چکا تھا مگر ارسلہ کی باتیں اس کے دل و دماغ پر بوجھ کی طرح لدی پڑی تھیں۔ ارسلہ دولت کی چاہ کی دلدل میں اترتی، دھنستی جا رہی تھی اسے خوف آ رہا تھا۔

وہ یکدم بے چین ہو کر سگریٹ سلگا کر کوریڈور میں ٹہلنے لگا اور سوچ رہا تھا کہ اسے ارسلہ کو سمجھانا چاہیے۔ اس کی رہنمائی ضرور کرنی چاہیے وہ ہمیشہ سے اس کا ایک اچھا ہمدرد دوست رہا تھا اور اسے آباد اور خوش دیکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

میں نے نفیسہ کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔ وہ تمہیں روزانہ فریش جوس دے گی تمہیں فرمانبرداری سے پی لینا ہے اور تمہاری ڈائٹ پر بھی وہ نظر رکھے گی۔ یہ مسالے دار چیزوں سے ذرا پرہیز کیا کرو تم ان دنوں۔" مہوش اسے سمجھا رہی تھیں ساتھ ساتھ نفیسہ کو بھی ہدایتیں دیے جا رہی تھیں کہ اس کی ڈائٹ کا خصوصی خیال رکھے۔

خلاف عادت ارسلہ بھی ان کی تمام ہدایتوں کو نہ صرف برا منائے بغیر سن رہی تھی سر بھی اثبات میں ہلا رہی تھی۔ اور کچھ فاصلے پر چائے کے ہلکے ہلکے سپ لیتا آبص اس کی اس فنکارانہ صلاحیتوں کا دل ہی دل میں معترف ہو رہا تھا۔

مہوش ارسلہ کے مزاج کی اس تبدیلی پہ خاصی خوش اور مطمئن تھیں۔ ارسلہ بھی خاصی فرمانبرداری کا ثبوت دے رہی تھی رومی کی منگنی کی تیاریوں میں اس نے مہوش کی ہر بات کو مقدم رکھا۔ مہوش رومی کے ساتھ ارسلہ کے بھی ڈریسز بڑے ڈیزائنر سے خود تیار کروا رہی ارسلہ نے شاپنگ پر جانے کی بے جا ضد بھی نہ کی تھی۔ وہ خاصی خوش تھیں کہ وہ ایک اچھی بہو کا کردار باخوبی نبھانے لگی تھی۔ شاید اس بچے نے اس کی مزاج کی ترشی ختم کر دی تھی۔ یہ ان کا اپنا خیال تھا۔

ادھر ارسلہ کو اپنے بچے کو دنیا میں لانے کی جلدی تھی۔ بڑی سی کوٹھی کی مالکہ ہو جانے کا تصور ہی بے حد خوش کن تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ بچہ ایک مہینے میں ہی دنیا میں لے آئے۔ اف! یہ اتنے مہینوں کا انتظار۔

"آج تمہاری تابعداری دیکھ کر خاصی خوشگوار حیرانی ہوئی۔ اچھی اداکار ہو۔" آبص اپنے کمرے میں آیا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی اپنے ہاتھوں پر لوشن رگڑ رہی تھی سفید سفید چمک دار ہاتھ کچھ اور چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔

"حیران نہ ہوں بس خوش ہوں۔" وہ لوشن کا ڈھکن بند کر کے بیڈ سے نیچے اتری اور اس پر ایک مسکراتی نظر پھینکی۔ "میں آپ کو خوش کروں گی۔ آپ مجھے خوش کریں گے۔ حساب برابر۔"

"ہوں حساب برابر......" آبص نے بھنویں اچکائیں اور تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ "اچھا پتا چلا تم خاصی بزنس مائنڈڈ ہو۔ نہ صرف ذہین بلکہ چالاک بھی ہو اپنے نفع و نقصان کا حساب رکھتی ہو۔ اچھی بات ہے۔ مگر یہ

بات بھی ذہن نشین رکھنا کہ بزنس میں ہر وقت نفع ہی نہیں ملتا کبھی کبھی نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے اور نقصان کے لیے ایک کاروباری ہر وقت ذہنی طور پر تیار رہتا ہے۔"

"نقصان کیسا؟" وہ چونک کر پلٹی۔

آبص ہلکے سے مسکرایا۔"اب یہ تو کاروبار میں کس کو پتا نہیں ہوتا۔ غیب کا علم تو قدرت کے پاس ہے مگر اتنا ضرور پتا ہے ہوتا ہے نفع کھائیں گے تو کبھی نقصان بھی اٹھا سکتے ہیں۔"

"یہ آپ بزنس کی باتیں میری ذات کے حوالے سے نہ کریں میں نے کوئی کاروبار نہیں کیا ہے۔ میں نے تو فقط ڈیل کی ہے ڈیل میں کوئی نقصان نہیں ہوتا۔" وہ برامان کر بولی۔ شاید نقصان کی باتیں اسے بری لگ رہی تھیں۔

"ہاں، میں تو بھول ہی گیا۔ تم نے تو سودا کیا ہے۔ بہت بڑا فائدے کا سودا۔" آبص نے ہلکے تمسخر سے ابرو اچکایا۔"یہ سودا کہ میرا بچہ مجھے دوگی اس دنیا میں لاؤ گی اور بدلے میں ایک شاندار کوٹھی کی مالک بن جاؤ گی۔ یہ نا یہی سودا نا۔" وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔ اس پل اس کی خوش نما آنکھوں میں ایک سرد مہری اتر آئی تھی۔ وہ یکدم اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹا گیا اور ریک سے اپنی مطلوبہ کتاب ڈھونڈنے لگا۔ پھر جیسے یاد آنے پر بولا۔

"ماما نے تمہیں بلوایا تھا شاید کسی جیولر کے سلسلے میں۔" وہ اپنی پسندیدہ کتاب اٹھا کر بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔"کسی سیٹ وٹ کا آڈر دینا ہے۔ تم سے اسی سلسلے میں ڈسکس کرنا چاہ رہی تھیں۔"

"ارے ہاں، مجھے تو یاد ہی نہیں رہا انہوں نے جیولری پسند کروانی تھی۔" وہ خوشگوار انداز میں بالوں کو جلدی جلدی لپیٹنے لگی۔

"مجھے تو جڑاؤ سیٹ بنوانا ہے ڈائمنڈز بھی ڈلوانے ہیں۔ پورا گولڈن تو مجھے بہت برا لگتا ہے۔ کیا خیال ہے آبص، جڑاؤ اچھا لگے گا ناں۔"

"ایز یو وش۔" وہ کتاب کے ورق گردانی کرتے کرتے غیر دلچسپی سے سر ہلا گیا۔"مجھے ان معاملوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اور نہ ان کی سمجھ۔"

"ہاں آپ کی ساری سمجھ تو عشق و مشک میں خرچ ہو گئی۔" وہ محظوظ ہو کر ہنس پڑی۔"اب میرے لیے تو کچھ نہیں بچا آپ کے پاس۔"

"آبص کے اعصاب میں تناؤ سا پیدا ہوا۔ وہ ایک پل کھنچتے ہوئے محسوس ہوئے۔ تاہم اس نے کتاب سے سر اٹھانے کی کوشش نہ کی اور اس کی غیر شائستہ ہنسی تحمل سے سہہ گیا۔"

"کیا خیال ہے میں ذرا ڈیزائن دیکھ نہ لوں۔" وہ موبائل اٹھا کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی اور گولڈ کی جیولری کے ڈیزائن سرچ کرنے لگی۔

"میرا خیال ہے تم مام کے ساتھ مل کر یہ کام زیادہ بہتر طریقے سے کر سکو گی۔ وہ تمہیں اس سلسلے میں اچھا مشورہ دیں گی۔" وہ اس کی موجودگی میں بے آرامی محسوس کرتے ہوئے بولا۔

"ہوں یہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ اٹھ گئی۔"رومی سے بھی مشورہ کر لیتی ہوں۔ ذرا پتا تو چلے اس کے لیے کیا جیولری آڈر دی جا رہی ہے۔" وہ موبائل اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی آبص نے کتاب دھپ سے بند کی اور سر بیڈ کی پشت سے لگا کر ایک گہری سانس بھرتے ہوئے ذہن کی کسی طنابوں کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

☆☆☆

مہوش کو جو وہ ڈیزائن دکھا رہی تھی وہ سب بڑے اور بھاری بھرکم تھے ایک پل مہوش کا دل چاہا اسے اس کی اوقات یاد دلا دے تاہم رسان سے اس کے ڈیزائن کو رد کرتے ہوئے بولیں۔

"یہ بہت ہیوی ہیں اس طرح کے جڑاؤ سیٹ ایسی چھوٹی موٹی گیدرنگ میں اوور لگیں گے۔ تم رہنے دو میں آڈر دے دوں گی۔"

"ارے نہیں جیولری تو میں اپنی پسند کی ہی لوں گی مجھے تو بھاری بھرکم سیٹ ہی پسند ہیں اور پھر جیولری بار بار کہاں بنائی جاتی ہے اچھا ہے اس طرح پیسہ بھی سیو ہو جاتا ہے۔" وہ مصر رہی۔

رومی نے بے ساختہ مسکراہٹ چھپانے کو سر جھکا کر کیٹ لاگ چہرے کے آگے کر لیا۔ مہوش کے چہرے پر پھیلی نرمی یکلخت مفقود ہو گئی۔ اس کی جگہ جھنجلاہٹ اور بے زاری نے لے لی۔

"ایکچوئلی تم پانچ سو ہزار روپے والے ایمیٹیشن جیولری پہننے کی عادی رہی ہو۔ یہ گولڈ ہے لاکھوں کے بنتے ہیں اور جہاں تک سیونگ کی بات ہے تمہیں اس کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سوچنے کا کام ہمارا ہے تمہارا نہیں۔ تم بس پہنو اور انجوائے کرو۔" مہوش کے لہجے میں دبی دبی تپش تھی۔

"ارے کیوں فکر مند نہ ہوں۔ خرچا آبص کا ہی ہو رہا ہے تو پھر اپنی پسند کا کیوں نہ بنواؤں اور سیونگ کا سوچنا تو اچھی بیوی ہونے کی نشانی ہے۔" وہ بھی تپتے تپتے لہجے میں کہہ کر بیڈ سے اتر گئی۔ مہوش کا طعنہ اسے اندر ہی اندر کاٹ کر رکھ گیا تھا اس کی خوشگواری کم ہو چکی تھی اور لہجے کی ملائمت بھی۔

"بے شک سیونگ کا سوچنا اچھی بیویوں کی نشانی ہے مگر ابھی یہ وقت نہیں ہے ان معاملات میں پڑنے کی۔ او کے، تم رومی سے ڈسکس کرو میں ذرا دوسرے کام نمٹا لوں۔" مہوش اپنی ساڑھی کا پلو سنبھال کر کندھے پر ڈال کر روم سے نکلیں۔

"یہ دیکھو ارسلہ یہ کیا ہے۔" رومی ماحول میں چھائے تناؤ کو دور کرنے کی غرض سے کیٹ لاگ اس کے آگے کرتے ہوئے بولی اور ڈیزائن دکھانے لگی۔ "مجھے تو یہ بہت پسند آیا ہے تم بتاؤ۔"

ارسلہ کے اعصاب یونہی تنے ہوئے رہے۔

"میرا خیال ہے تمہیں آنٹی سے ہی مشورہ لینا چاہیے۔ یوں بھی مرضی انہی کی چلنی ہے تو پھر یہ تردد کیوں۔" وہ زہر بجھے لہجے میں کہہ کر رومی کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

ارسلہ اپنی خوابگاہ میں جارحانہ انداز میں داخل ہوئی اور بیڈ پر دراز ہو گئی۔

آبص نے نائٹ گاؤن تبدیل کر کے بیڈ پر آتے ہوئے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ناخوشگوار انداز میں موبائل اٹھا کر گیم نکال کر کھیلنے لگی پھر بدمزا ہو کر موبائل ایک طرف پٹخ دیا۔ آبص سے نظریں ملیں تو چہرے پر جہاں بھر کر رقت طاری کرتے ہوئے بولی۔

"کچھ پوچھیں گے نہیں کہ کیا ہوا۔ کیوں موڈ آف ہے؟"

"تم خود ہی بتا دو، امی نے کچھ کہہ دیا کیا۔" وہ بیڈ پر آ کر تکیہ درست کر کے بیٹھ گیا اور کتاب اٹھا لی۔

"کچھ نہیں...... بہت کچھ۔" اس نے جھلس کر اس کے ہاتھ سے کتاب اچک کر ایک طرف پٹخی۔ "مجھے مڈل کلاس ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ بس یہی وجہ ہے جو مجھے ان سیکیور کرتی ہے۔ مجھے آپ لوگوں کا بھروسا اسی لیے نہیں ہے کہ جانے کب ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر نکال دیں۔"

"کم آن ایسا کچھ نہیں ہے۔ آخر ہوا کیا۔ جو بات ہے وہ بتاؤ۔" وہ قدرے نرمی سے بولا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔

"آنٹی آخر چاہتی کیا ہیں مجھ سے ہر وقت ان کے لمبے لمبے لیکچر سنتی رہتی ہوں۔ اپنی مرضی ہم پر مسلط کرنا چاہتی ہیں ہر وقت۔ اب یہی دیکھ لیں۔ ایک سیٹ بھی میں اپنی مرضی کا نہیں بنوا سکتی۔ اور تو اور میری عزت نفس بہت مجروح ہوئی ہے آج۔ اتنی ذلت کہ مرجانے کو دل چاہتا ہے۔" وہ یکدم رونے لگی۔ پانچ سو ہزار کی جیولری پہنتی رہی ہوں۔ ہاں بھئی میں گولڈ پہننے کے قابل نہیں ہوں۔"

"ارے نہیں۔ مام اس طرح کی بات نہیں کر سکتیں۔ وہ تمہاری انسلٹ کیوں کریں گی۔"

"تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں۔" وہ دوپٹے کا کونا اٹھا کر آنکھوں کو رگڑنے لگی۔ "آپ کو تو بس آپ کی ماں ہی ہر جگہ درست نظر آتی ہیں اور میں میری کیا اوقات یہی بات ہے ناں۔" وہ جھٹکے سے بیڈ سے اترنے لگی۔ آبص نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑا۔

"ایسی بات نہیں ہے ارسلہ، میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مام کو اس طرح کا رویہ نہیں رکھنا چاہیے تمہارے ساتھ اینی ویز میں صبح ان سے بات کرتا ہوں۔ تم یہ بتاؤ کون سا ڈیزائن پسند کیا ہے تم نے۔" وہ نرمی سے بات بدلتے ہوئے بولا مقصد اس کا دل بہلانا تھا۔ وہ حقیقتاً ہرٹ ہوئی تھی مڈل کلاس والے طعنے پر۔

"میں نے تو ذرا ہیوی سیٹ کیا پسند کر لیا آنٹی مجھے طعنے دینے لگیں مجھے میری اوقات یاد دلا دی۔ ٹھیک ہے نہیں پہنے میں نے کبھی گولڈ کے اتنے قیمتی زیورات۔ مگر اتنی گئی گزری بھی نہیں تھی کہ پانچ سو ہزار کے نقلی زیور پہنتی تھی۔" وہ آبص کو نرم دیکھ کر مزید ضرب لگانے لگی اور رونے میں مزید رقت طاری کر لی۔ "میرا تو دل ہی توڑ دیا انہوں نے۔"

"ارے نہیں ارسلہ یو ڈونٹ وری۔ میں ہوں نا۔ چلو مام کی طرف سے میں سوری کرتا ہوں تم سے۔ انہیں ایسے الفاظ نہیں کہنے چاہیے تھے۔" وہ نادم ہوتے ہوئے بولا۔ "تمہیں جو سیٹ پسند آیا ہے تم اس کا مجھے بتاؤ میں آڈر دے دیتا ہوں۔" وہ اس کی دل جوئی کی خاطر بولا۔

ارسلہ کی آنکھیں یکدم چمکنے لگیں۔ جیسے کسی نے بجھتے دیے میں ڈھیر سارا تیل ڈال دیا ہو۔ مگر دوسرے پل پژمردگی سے ہلکی سانس کھینچتے ہوئے بیڈ کی پشت سے سر ٹکا کر مایوسانہ لہجے میں بولی۔

"آنٹی نہیں مانیں گی۔ وہ برہم ہوں گی۔"

"میں جو کہہ رہا ہوں۔"

"تو پھر مجھے آڈر واڈر پر نہیں بنوانا۔ بلکہ کل میں آپ کے ہمراہ جیولری شاپ پر جا کر تیار سیٹ لے لوں گی۔ جو پسند آئے گا۔ کیا خیال ہے۔" وہ لوہا نرم دیکھ کر چوٹ مارنے لگی۔

"ایز یو وش۔"

"آ...... ونچ۔" اچانک وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر جیسے کراہنے لگی۔ آبص گھبرا کر اس کے اوپر جھکا۔

"کیا ہوا؟"

وہ آنکھیں بند کر کے گہری گہری سانس بھرنے لگی۔

"آر یو او کے......ارسلہ۔"

"شاید نہیں۔" وہ بامشکل آنکھیں کھولنے لگی پھر آبص کو اپنے اوپر جھکے متفکر سا دیکھ کر دل ہی دل میں اپنی ایکٹنگ پر خود کو داد دی۔

"میرا خیال ہے تم ٹھیک نہیں ہو۔ میں مام کو بلاتا ہوں۔"

"نہیں آبص...... میں ٹھیک ہوں۔" وہ بامشکل بولی پھر دھیرے سے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے

بولی۔ "پریشان نہ ہوں بس ذرا سا ٹینشن لیتی ہوں تو پین (درد) شروع ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر نے سختی سے کہا تھا کہ ڈپریشن ٹینشن سے دور رہوں۔ مگر کیا کروں آپ تو جانتے ہیں جو بات دماغ میں پھنس جاتی ہے مشکل سے نکلتی ہے۔" وہ تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گئی۔

"میں نے کہہ تو دیا تم اپنی چوائس سے لے لو میں پے کر دوں گا۔ مام سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ نرمی سے اس کا ہاتھ تھپکنے لگا۔

اس کی اس ایکٹنگ نے آبص کو اچھا خاصا پریشان کر دیا تھا وہ اپنے بچے کے لیے بہت زیادہ حساس تھا۔ یوں بھی اسے ارسلہ پر اعتماد نہ تھا وہ جان بوجھ کر اس بچے کو نقصان پہنچا سکتی تھی، اور وہ ایسا کوئی نقصان سہنے کو تیار نہ تھا۔

ادھر ارسلہ اپنی اس مکارانہ صلاحیتوں پر خود کو دل ہی دل میں داد دے رہی تھی اور بند آنکھوں کے ساتھ گولڈ کا جھلملاتا سیٹ اپنی گردن پر سجا دیکھ رہی تھی۔

آبص نے کتاب رکھ دی اور لائٹ بند کر دی تاکہ وہ گہری نیند لے سکے۔ مگر نیند تو دیدہ زیب جیولری کے تصورات نے اڑا کر رکھ دی تھی دوسری طرف مہوش جیلانی کا پھیکا پڑتا چہرہ تصور میں دیکھ کر مسرور ہو رہی تھی۔

جیتے رہو آبص۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ تمہارے دم سے اور ان کرم نوازیوں سے تو مجھے ابھی اپنی منزل پر پہنچنا ہے۔

☆☆☆

جب بہار آئی تو صحرا کی طرف چل نکلا
صحن گل چھوڑ گیا، دل میرا پاگل نکلا
جب اسے ڈھونڈنے نکلے تو نشاں تک نہ ملے
دل میں موجود رہا، آنکھ سے اوجھل نکلا
اک ملاقات تھی جو دل کو سدا یاد رہی
ہم جسے عمر سمجھتے تھے وہ اک پل نکلا

امی کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی آئیں وہ منہ دھو کر تولیے سے رگڑ رہی تھی۔ امی کے تیور میں غیر معمولی پن دیکھ کر سمجھ گئی کہ وہ نہ صرف خفا تھیں بلکہ مغموم اور مایوس بھی دکھائی دے رہی تھیں جیسے کسی بچے سے اس کا پیارا کھلونا ہمیشہ کے لیے چھین لیا گیا ہو۔

"کیوں کیا تم نے ایسا؟" وہ چھوٹتے ہی بولیں ان کے لہجے میں گہرا ملال اتھا اور نگاہوں میں شکوہ۔

"وہ تولیہ ڈھیلے ہاتھ سے کرسی پر ڈال کر بال لپیٹنے لگی۔"

"تو آپ کو حمزہ نے سب بتا دیا ہے۔"

"نہیں میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے اور آنکھوں سے دیکھا ہے تمہیں اس کا دل توڑتے، ٹکڑے ٹکڑے کرتے۔ تم اتنی سنگدل، اتنی بے رحم کیسے ہو گئیں نادیہ......!" تم نے تو آج تک کسی مکھی کو بھی بے وجہ نہیں مارا پھر حمزہ کو کیوں مار ڈالا تم نے۔ جیتے جی اسے زندہ درگور کر دیا۔"

"پلیز امی......" وہ تڑپ کر رہ گئی۔

"میں نے اس پر کوئی ظلم نہیں کیا ہے میں نے اس کی راہ نمائی کی ہے وہ غلط راستے پر دوڑ رہا تھا جہاں کوئی منزل نہیں تھی۔"

"تم ہی تھیں اس کی منزل۔ مت بھولو تم نے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور تھامے رہتیں تو وہ خوش رہتا۔ تم نے

اسے یہاں تک لا کر ٹھوکر ماردی۔ رشتوں کے تقاضے بھی نباہنے بھول گئیں تم۔ بڑوں کی عزت کا پاس ہی کم از کم رکھ لیتیں۔ تم نے تو ہم سب کا تماشا بنا دیا۔" امی کے انداز میں جلال تھا ان کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اسے جھنجوڑ کر اس کے دل میں حمزہ کی محبت جگا دیتیں مگر اب بازی ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا وہ بدگمان ہو کر جا چکا تھا شاید کبھی پلٹ کر نہ آنے کے لیے۔ افسردگی تھی کہ روح تک تو جلائے دے رہی تھی۔

"تم بس اپنی زندگی میں انگارے بھرتی رہو۔ جب یہ سب کرنا ہی تھا تو اس کے نام کی انگوٹھی کیوں پہنی تم نے۔ پہلے روز ہی اسے اس خوش فہمی سے نکال باہر کرتیں۔"

وہ تڑپ کر امی کو دیکھنے لگی پھر بس اضطراری انداز میں دانتوں میں دباتی بیڈ کے کونے پر بیٹھ گئی۔

"تم تو خود یہ اذیت جھیلتی رہی ہو۔ خود ٹوٹی ہو، نا آسودگی کا یہ بوجھ اٹھائے اٹھائے پھر رہی ہو تو پھر...... پھر حمزہ کو اس جہنم میں کیوں دھکیل دیا تم نے۔ ظلم ہی تو کیا ہے تم نے۔ اب دلیلیں دو گی مگر یاد رکھنا دل ٹوٹ جائیں تو کسی دلیل سے نہیں جڑتا۔ اگر جڑتا ہے تو فقط بے لوث محبت سے جو تمہارے پاس نہیں ہے اس کے لیے۔"

"امی! پلیز......" وہ لپک کر امی کو روکنے لگی۔ جو کمرے سے جا رہی تھیں ناراض اور خفا خفا سی۔ "یقین کریں تب میں نہیں جانتی تھی کہ وہ محبت کرنے لگے گا مجھ سے۔ اتنی توقعات وابستہ کر لے گا۔ میں سچ کہہ رہی ہوں امی، خدا گواہ ہے، اس وقت مجھے آپ کی عزت اور خالہ جان کی محبت کی پروا تھی۔ مگر اب...... حمزہ کی بھی پروا ہونے لگی ہے۔ اس سے محبت نہیں کر سکی تو کیا ہوا، نفرت بھی نہیں کی۔ اس کے خلوص، اس کی وفاداریاں، اس کی سادگی، معصومیت مجھے ہر رات جھنجوڑتے رہتی ہیں۔ سونے نہیں دیتیں۔ اس کا بے غرض، بے ریا وجود مجھے احساس جرم میں مبتلا رکھتا ہے۔ اس کے سامنے آنے پر ہر بار مجھے لگتا ہے، میں منافق ہو گئی ہوں۔ جھوٹی ہوں، اس کے قابل نہیں ہوں۔ اسے دھوکا دے رہی ہوں۔ اس کی محبت کا تماشا دیکھ رہی ہوں۔ میں اسے ڈیزرو نہیں کرتی امی۔ وہ کسی اپنے جیسی پرخلوص لڑکی کو ڈیزرو کرتا ہے۔"

وہ افسردگی سے سچائی بیان کر رہی تھی، امی بھی جانتی تھیں کہ وہ سچ کہہ رہی ہے مگر ملال تھا کہ روح سے چمٹ گیا تھا گویا...... اس کی ندامت سے اسے کیا حاصل ہونا تھا۔

"میں جانتی ہوں میں دہرے جرم کی مرتکب ہوئی ہوں۔ حمزہ اور آپ کا مان توڑا ہے میں نے۔ مجھے معاف کر دیں امی۔" وہ یک دم ان کے سینے سے لگ کر رو پڑی۔ امی ایک سانس بھر کر رہ گئی۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ امی حیران رہ گئیں۔ ایسا تو وہ اس روز بھی نہ روئی تھی جب آبص اس سے جدا ہوا تھا۔ جب اس کی شادی کی تصویریں فضا نے بھیجی تھیں۔

"کیسے مداوا ہوگا، اب تو ازالہ کا امکان بھی نہیں رہا۔ وہ چلا گیا ہے نادی۔ بنا بتائے خامشی سے لوٹ گیا ہے۔" امی کا لہجہ پست تھا جس میں اضمحلال کی گہری تھکن تھی، جن میں تاسف ہلکورے لے رہا تھا۔

"کیا...... چلا گیا......" وہ امی سے الگ ہوئی۔

"ہاں، میں نے فون کیا۔ اس نے جواب نہیں دیا۔ بس میسج کر دیا کہ وہ ایئرپورٹ پر ہے اور جدہ پہنچ کر اطلاع کرے گا، اپنی خیریت کی۔" امی یہ کہہ کر پلٹ کر کمرے سے نکل گئیں۔ شاید وہ بھی اکیلے بیٹھ کر رونا چاہتی تھیں۔ امید کی چادر بنتے بنتے پھٹ گئی تھی۔ پیروں تلے زمین ہی کھینچ لی گئی تھی گویا۔ نادیہ بے چارگی آمیز کرب سے کچھ دیر دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔

"مجھے معاف کر دو حمزہ۔" وہ کرسی پر ڈھے سی گئی۔ "معاف کر دینا مجھے پلیز۔ تم بہت قیمتی تھے، تمہارے

سامنے میری حیثیت ایک پتھر کی مانند تھی۔ تمہارے دل کی مسند بہت بلند تھی۔ بہت عظیم۔ وہاں میرے جیسی حقیر بے مایہ، ارزاں کا گزر کیسے ہوسکتا ہے...... میں تو یوں تمہاری راہ میں آ گئی تھی۔ اس نے کرب سے گزرتے ہوئے سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر جلتی آنکھیں بند کرلیں۔

کہتے ہیں وقت ہر غم بھلا دیتا ہے، مستقل دوری ہر یاد کو مٹا دیتی ہے مگر مستقل دوری سے بھی یادیں نہیں مرتیں۔

یادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دل کی گزر کب ہوتی ہے
اک بخیہ ادھیڑا ایک سیا
یوں عمر بسر کب ہوتی ہے

☆☆☆

اریبہ نے دروازہ ہلکے سے بجایا مگر جواب نہ پا کر ذرا سا اندر جھانکا اور اندر چلی آئی۔ سکندر صوفے پر بازو کا تکیہ بنائے لیٹا تھا۔ آنکھیں بند تھیں مگر وہ جاگ رہا تھا۔ اپنے خیالوں میں مگن تھا اتنا کہ دروازہ بجانے کی اور دروازہ کھلنے کی آہٹ تک محسوس نہ ہوئی۔ یک دم اریبہ کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ چونکا۔

وہ درد کی گولی اور چائے کا مگ لائی تھی۔ سکندر تو بھول چکا تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے کہہ آیا تھا کہ کوئی پین کلر ہو تو اسے دے جائے۔ اس کے سر میں درد ہے۔ وہ نہ صرف پین کلر لائی تھی بلکہ اس کے لیے اسٹرونگ سی چائے بھی بنا کر لائی تھی۔

''ارے اس کی زحمت کیوں کی تم نے۔'' وہ اسے دیکھ کر کچھ خفیف سا ہو کر سرعت سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''سارا دن امی کی خدمت کرتی رہتی ہو، تھک جاتی ہو گی۔''

''ارے، نہیں۔ زحمت کی کیا بات ہے۔'' وہ گولی اور چائے کا مگ اس کے سامنے دھری تپائی پر رکھنے لگی۔ ''چائے تو میں اس لیے بنا لائی کہ مجھے لگا آپ کے سر میں ہلکا نہیں بلکہ شدید درد ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں کی سرخیاں دیکھ کر بولی پھر پلٹ کر کھڑکی کا پردہ ہٹانے لگی اور ہلکی سانس کھینچ کر بولی۔

''آپ کا دم نہیں گھٹ رہا تھا، اتنی دیر سے کھڑکی دروازے بند تھے، شاید اسی وجہ سے آپ کے سر کا درد اور بڑھ گیا ہوگا۔'' وہ اسے کسی عمر رسیدہ عورت کی طرح سرزنش کر رہی تھی۔

نیلے رنگ کی سیاہ کڑھائی والی قمیص پر سیاہ چادر نما دوپٹا سر پر ڈالے وہ بہت سادہ مگر دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ دوپٹے کے نیچے سے اس کے سیاہ سلکی بال جھلک رہے تھے، جن کے کناروں سے نمی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ نہا کر نکلی تھی اور گیلے بال سمیٹنے کے بجائے اسے دوپٹے سے ڈھانپ دیا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی، وہ ابا کے سامنے بھی کھلے سر نہیں آتی تھی، خصوصاً جب بال کھلے ہوتے۔

''تھینک یو بیا۔ واقعی میرے سر میں شدید درد ہے۔'' وہ گولی کے ہمراہ گرم گرم بھاپ اڑاتی چائے دیکھ کر اس کا ممنون ہوا تھا۔ پھر بولا۔ ''امی ابھی تک سو رہی ہیں، یا جاگ گئی ہیں؟''

''سو رہی ہیں مگر نیند کچی ہے۔ لگتا ہے کچھ دیر میں جاگ جائیں گی۔ میں آپ کو بتا دوں گی، وہ جاگ گئیں تو......'' وہ کشن فرش سے اٹھا کر کرسی پر رکھتے ہوئے بولی اور کمرے سے جانے لگی۔ ''کچھ اور چاہیے تو بلا تکلف مجھے آواز دے دیجیے گا۔''

''تھینک یو۔'' وہ جلدی سے بولا۔ وہ رک گئی اور بے ساختہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

''میں تمہارا مشکور ہوں بیا! یہ احسان نہیں چکا سکوں گا جو تم نے مجھ پر کیا ہے۔ امی کا خیال رکھ کر شاید کوئی سگی

بیٹی ہوتی وہ بھی اتنا نہ کرسکتی، جتنا تم نے ان کا اور اس گھر کا خیال رکھا ہے۔" وہ حقیقتاً مشکور دکھائی دے رہا تھا۔

"میں نے کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ خالہ میری ماں کی طرح ہیں اور گھر میرا اپنا ہے غیر کا نہیں۔ اپنوں کے سکھ دکھ میں اپنے ہی کام آتے ہیں، آپ بار بار شکریہ کہہ کر مجھے احساس دلا رہے ہیں کہ میں آپ کے لیے غیر ہوں۔"

"ارے نہیں۔" سکندر جلدی سے بولا پھر یک دم اس کی نگاہوں سے نظریں چرا گیا۔ "غیر کیوں ہونے لگیں تم۔ کبھی سمجھا ہے، آج سے پہلے کبھی غیریت برتی ہے۔" وہ شفقت سے بولا۔

"پہلے نہیں برتی مگر اب برت رہے ہیں۔ پہلے آپ بہت قریب لگتے تھے مگر اب بہت دور ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید اس لیے کہ میں نے آپ کو محسوس کرنا شروع کر دیا اپنے دل کے پاس۔"

وہ قدرے پر اعتماد انداز میں کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

سکندر بے ساختہ ہلکی سانس بھر کر رہ گیا۔ وہ ایک بار پھر شاید اس کے رویے سے ہرٹ ہو گئی تھی جبکہ وہ دانستہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کے لیے بہت معزز تھی۔ وہ کہتی تھی، عزت کیوں محبت کیوں نہیں۔ اسے محبت کی چاہ تھی، وہ اپنی کشتی محبت کے سمندر میں ڈال چکی تھی اور ڈوبنے کو بھی تیار تھی اور سچ تو یہ تھا کہ وہ اسے ڈوبتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

بس بات اس کے دل کی تھی، وہ اسے ہر مقام دے سکتا تھا بس چاہنے کی کوشش میں ناکام ہو جاتا تھا۔ اسے لگتا تھا دل محبت کے کس سے خالی ہو گیا ہے اور خالی ہی رہنا چاہتا ہو۔ چاہے اور چاہے جانے کی طلب ختم ہو چکی ہو۔ شاید یہ کیفیت عارضی ہو۔ وہ بھی جانتا تھا کہ کوئی کیفیت دائمی نہیں ہوتی اور خالہ بھی یہی کہتی تھیں۔ شادی سے پہلے بھلا کون اپنی بیوی سے عشق کرتا ہے۔ یہ رشتہ جب قائم ہوتا ہے تو اس بندھن میں قدرت کی طرف سے محبت انسیت ڈال دی جاتی ہے۔ مگر بات تو یہی تھی کہ وہ یہ تجربہ کرنے سے خوف زدہ سا تھا۔ مگر اب اپنی ماں کے لیے وہ اس خطوط پر سوچ رہا تھا۔ اپنی ذات، اپنی خواہش اور قلبی کیفیت کو ایک طرف رکھ کر ان کی خوشی اور خواہش کے مطابق چلنا چاہتا تھا۔ اس فانی دنیا کے لیے وہ اپنی ماں کو خفا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی ناپائیدار دنیا کے لیے وہ پائیدار آخرت کو کیسے کیونکر بھول جاتا۔

دنیا عشرت کدہ کسی کے لیے بھی نہیں ہے، یہ ماتم کدہ ہے۔ یہی اس کی حقیقت ہے جس نے تسلیم کر لیا، وہ راحت میں رہا۔ ٹھیک ہی کہا کہنے والے نے، دنیا کی ماتم سرائے میں کسی دل کا خوش ہونا، ایسا ہی عجب ہے جیسے شور زمین سے زعفران پیدا ہونا۔

وہ چائے کی چسکیاں بھرنے لگا۔

دنیا کی حقیقت دل پر آشکارہ ہو جائے تو آپ کی ذات اندر سے فنا ہو جاتی ہے اور ذات فنا ہو جائے تو "میں" ختم ہو جاتی ہے۔ کیفیات اور جذبات میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے، خود سر لہریں دم توڑ دیتی ہیں اور زندگی ٹھہرے پانی کی مانند پر سکون ہو جاتی ہے۔ اس ٹھہرے پانی میں کوئی بھی اپنی کشتی اتار دے پار لگ جاتی ہے۔

وہ سوچ رہا تھا، اریبہ نے جو کشتی ڈالی ہے وہ اب پار لگا دینی چاہیے۔ وہ ایک پر سکون زندگی کا خواہش مند تھا جہاں اس کی ماں، اس کی جنت..... باقی ماندہ کسی حسرت میں نہیں بلکہ مسرت سے گزار سکے۔ وہ اریبہ کے بارے میں خاصی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

اسے کئی بار لگا حمزہ مسکراتا ہوا یک دم اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو جائے گا۔ اس کی دہکتی لو دیتی جذبوں سے

پر آنکھیں بڑی آس اور امید لیے اس پر ٹکی ہوں۔ اس ہنسی کی جھنکار کی جس کی تمنا اسے کشاں کشاں یہاں تک کھینچ لائی تھی۔

"آؤ...... آؤٹنگ پر چلتے ہیں۔ یہ جو تمہارا اداس روپ ہے نا، اس پر تھوڑی سی تازگی اور شگفتگی آ جائے گی۔" اسے لگا وہ اپنی چابی جیب سے نکال کر اچھالتے ہوئے اسے چھیڑ رہا ہو۔

وہ افسردگی سے مسکرانے لگی اور اس خالی کمرے پر نظریں دوڑانے لگی، جہاں وہ آخری دن بہت دیر تک بیٹھا تھا۔ پہلے ایک رات امی کے اصرار پر یہیں ٹھہرا تھا پھر دوسری بار خالہ کے ہمراہ دو راتیں ٹھہرا تھا۔

وہ اس کی کمی بے حد محسوس کرتے ہوتے اس کمرے میں چلی آئی تھی۔ اسے لگا وہ پہلا شخص تھا جس کی کوئی بات اسے کبھی بری نہیں لگی تھی۔ اس کے مذاق جو بے حد شائستہ ہوتے تھے، اسے برے نہیں لگتے تھے۔ وہ حقیقتاً اس کی سنگت میں بے حد ہلکی پھلکی ہو جایا کرتی تھی۔ اندر باہر سے خود کو زندہ محسوس کرنے لگتی تھی۔

اس کے یوں چپ چاپ چلے جانے پر امی ابھی تک غم زدہ تھیں اور وہ خود نادم۔ ندامت کا احساس ہر گزرے دن کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ کیا تھا وہ جو یہ سب راز رکھ لیتی۔ اس پر افشا نہ کرتی۔ کیوں کھول کر رکھ دیا اپنا دل اس کے آگے۔ کتنا سفر طے کر کے وہ یہاں تک آیا تھا۔ فقط اس کی مسکراہٹ چننے۔ اس کی ہمراہی میں چند گھڑیاں گزارنے۔ وہ اپنا کوئی نشان چھوڑ کر نہیں گیا تھا، ہاں بس ہمیشہ کی طرح چائے کے خالی مگ میں اس کی سگریٹ کے بجھے ٹوٹے پڑے تھے۔ بجھے ہوئے ٹکڑے اور راکھ...... جو وہ امی سے چھپا کر اس میز کی دراز میں رکھ دیا کرتا تھا۔ وہ بے اختیار کپ اٹھاتے ہوئے مسکرا دی۔

وہ امی سے چھپ کر اس کمرے میں آ کر سگریٹ پیتا تھا۔ وہ امی کا بے حد احترام کرتا تھا۔ وہ جب تک کھڑی رہتیں، وہ خود ان کے بارہا کہنے کے باوجود نہ بیٹھتا۔ کھانا سامنے ہوتا مگر جب تک وہ نوالہ نہ توڑ لیتیں وہ کھانا شروع نہ کرتا۔ سگریٹ کی طلب شدید ہو جاتی، وہ مضطرب دکھائی دیتا مگر امی کے سامنے یہ گستاخی نہ کرتا۔ جوں ہی امی ادھر اُدھر ہوتیں وہ لپک کر اسی کمرے میں چلا جاتا۔ اور وہ سمجھ جاتی، وہ اسموکنگ کر رہا ہوگا خصوصاً کھانے اور چائے کے بعد تو اسے بہت ہی طلب ہوتی تھی۔ امی جان کر بھی انجان بن جاتیں اور وہ دل ہی دل میں ہنستی حمزہ کی معصومیت پر۔

وہ کتنی دیر تک اس مگ کے اندر بجھے سگریٹ کے ٹکڑوں پر نگاہیں جمائے کھڑی رہی۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں کے کناروں میں جلن سی ہونے لگی۔

ہوئی ہے شام تو آنکھوں میں بس گیا پھر تو
کہاں گیا ہے میرے شہر کے مسافر تو
فضا اداس ہے رت مضمحل ہے میں چپ ہوں
جو ہو سکے تو چلا آ کسی کی خاطر تو

اسے یاد آنے لگا جب وہ خالہ کے ہمراہ پہلی بار کراچی آیا تھا، کوئی دس سال بعد...... اور خالہ نے تو اسے دیکھتے ہی فرط محبت سے خود سے چمٹا لیا تھا۔ وہ نزدیک ہی کھڑا تھا، ایک ٹھنڈی سانس یوں کھینچی اسے دیکھ کر جیسے اسے بہت افسوس ہوا ہو اپنے دس سال پاکستان نہ آنے پر۔

وہ اس روز نہا کر نکلی اور یوں ہی بالوں کو پشت پر کھولے دوپٹا قرینے سے بدن پر پھیلائے خالہ کو چائے دے رہی تھی، وہ سامنے ہی کھڑا تھا۔ بلیک ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے لبوں پر دھیمی خوش کن مسکراہٹ سجائے۔ ایسی ہی مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں بھی تھی۔

وہ تو وہ ہے تمہیں ہوجائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو

وہ دھیرے سے گنگنایا۔ جواباً وہ خفگی سے اسے گھور کر رہ گئی۔

"کتنے سالہ تجربہ ہے یہ۔" وہ پلٹ کر اس کے نزدیک سے ہو کر جاتے ہوئے چوٹ کر گئی۔

"کیسا تجربہ؟" وہ اس کے پیچھے لپکا۔

"یہی لڑکیوں پر شعر فٹ کرنے کا۔"

"ارے رے...... ایسا نہیں ہے۔" وہ یک دم ٹپٹایا تھا۔ پھر خفت سے سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "قسم سے میں ایسا بالکل نہیں ہوں۔"

"کیسا؟" وہ ابرو اچکا کر اسے گھورنے لگی اور فریج کھولنے لگی کہ وہ فریج پر ہاتھ رکھ کر اس کی جانب جھکا۔

"جیسا تم نے سمجھا۔ مطلب...... لوفر، آوارہ...... جملے فٹ کرنے والا۔ میں تو یوں ہی بول گیا۔ قسم سے، بہت شریف اور نیک لڑکا ہوں۔ کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔ کسی سے دوستی نہیں ہے، بس کام کام اور کام...... یقین کرو قائداعظم کی تصویر ہوں۔ پوچھ لو بے شک امی سے۔"

اس کے انداز پر وہ اپنی بے ساختہ ہنسی کو امڈنے سے نہ روک سکی۔

"اچھا، ہٹو۔" وہ اسے ایک طرف دھکیل کر فریج سے دہی کا پوٹ نکالنے لگی۔

اس روز سے دونوں کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ اس کے آنے سے سچ تو یہ تھا کہ گھر پر چھائی ویرانی کا جمود ٹوٹ گیا تھا۔ زندگی میں ہلچل آ گئی تھی جیسے برسوں کا سناٹا ٹوٹا ہو۔ افسردگی اور بے نام اضمحلال کے بادل چھٹ گئے تھے، ایک عرصے بعد وہ ہنسی تھی۔

خالہ تو پہلے ہی، چٹکلے چھوڑنے والی طبیعت کی تھیں، امی بتایا کرتی تھیں کہ صبیحہ عرف صبی کو نچلا بیٹھنا آتا ہی نہیں۔ ملنسار، ہنس مکھ اور بے حد مخلص تھیں۔ ہر وقت چہکنے، مہکنے والیں۔ ان کے آنے سے امی بھی بے حد خوش باش، تازہ دم دکھائی دینے لگی تھیں۔ دونوں بہنیں منہ میں منہ دیے دنیا جہاں کی باتیں کرتیں۔ وہ اکیڈمی سے آ کر سوتی اور جب اٹھتی تو حمزہ سے ضرور سامنا ہوتا۔ وہ چائے پر اس کا منتظر ہوتا۔ چائے کے ساتھ امی کے بنائے نگٹس، کباب کھائے جاتے اور کبھی حمزہ ہی نمکو، سموسے، رول کیا کچھ لیے چلا آتا۔ امی ڈانٹتے رہ جاتیں۔ بیمار ہو جاؤ گے، باہر کے کھانے کھا کر۔

"ارے خالہ۔ بہت مضبوط ہوں۔ بیمار نہیں ہوتا۔ یہ چھوٹے موٹے جراثیم مجھے ہرا نہیں سکتے۔ ہاں بس، ایک بڑا جرثومہ جان بھی لے سکتا۔"

"ہائے، خدا نہ کرے۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔"

جواباً اس کے لبوں پر کھیلتی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"محبت کا جرثومہ۔ جانتی ہو، یہ کاٹ لے نا تو بندہ کہیں کا نہیں رہتا۔" وہ امی اور خالہ کے اٹھتے ہی اپنی بات کے سلسلے کو جوڑتے ہوئے بولا۔

وہ چائے کا مگ تھامے، یک دم ساکت سی رہ گئی۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

خوش بخت مشتاق

سدرہ آن ڈائیٹ

بریک فاسٹ۔ آملیٹ کے ساتھ مختلف اقسام کی سبزیاں جنہیں بٹر میں یا کوکونٹ آئل میں فرائی کیا ہوا ہو۔

لنچ۔ گراس فیڈ چکن، یوگرٹ اور ساتھ میں بلیو بیریز اور مٹھی بھر آلمنڈز۔

ڈنر۔ بن کے بغیر چیز برگر ساتھ میں ویجی ٹیبل اور سالسا۔(Salsa) یہ رہا تمہارا ڈائیٹ مینو۔

فضا میں جو اس کی بیسٹ فرینڈ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب نیوٹریشنٹ بھی تھی اسے ڈائیٹ پلان کی ترتیب بتانے کے بعد بولی۔

"ناٹ بیڈ"۔ سدرہ نے اس سے پیپر لیتے ہوئے کہا۔

"کل سے اسٹارٹ کررہی ہو نا۔"

"نہیں بھائی آج سے بلکہ ابھی سے۔"

"گڈ۔" فضا نے اسے سراہا۔

"اس وقت دس بج چلے ہیں بریک فاسٹ فی الحال نہیں کیا اسی مینو کو فالو کرتی ہوں۔"

"سدرہ بیٹا! کل پانچ بجے مسز وقار آرہی ہیں ابھی ان کی کال آئی تھی کل بہترین طرح سے تیار ہو جانا، او کے بیٹا۔"

فضا کے جاتے ہی منزہ اس کے روم میں چلی آئیں۔

"عالیہ آنٹی کیوں آرہی ہیں۔"

"ویڈنگ ڈیٹ فکس کرنے کے لیے۔" وہ سدرہ کے گال کو دھیرے سے چھو کر بولیں۔

"مگر میں نے تو عمر سے کہا تھا کہ کچھ مہینے تک ویٹ کرلے۔"

"تین ماہ ہو چکے ہیں اب اور کتنا ویٹ کروانا ہے۔"

"ایسا نہیں ہوسکتا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اپنے بیڈ روم میں سائیڈ ٹیبل پر پڑے سیل فون کی جانب بڑھی اور عمر کو کال کرنے لگی۔

"کسے فون کررہی ہو؟"

"مما آپ جائیے میں بعد میں آپ سے بات کروں گی۔" وہ منزہ کی جانب دیکھ کر کہنے لگی۔

"عمر ہمارے درمیان کیا طے ہوا تھا۔" اس

کے ہیلو کہتے ہی وہ شروع ہوگئی۔

"تم کیسی ہو؟" وہ اس کی بات کو نظر انداز کر کے بولا۔

"ٹھیک ہوں تو بول رہی ہوں۔ آنٹی کو کیا ضرورت ہے ہمارے ہاں آنے کی۔"

"شادی کی ڈیٹ فکس کرنے کے لیے آ رہی ہیں یار۔"

"انہیں آنے سے منع کر دینا۔"

"اور کتنا ٹائم لینا ہے تمہیں۔"

"کچھ مہینے اور۔"

"یار حد کرتی ہو تم بھی۔"

"پلیز عمر کچھ مہینوں کی تو بات ہے۔"

"مجھے تم ایسے ہی اچھی لگتی ہو۔"

"میں تمہارے لیے یہ سب نہیں کر رہی ہوں۔"

"مجھے خود کو اچھا لگنا ہے۔"

"تم اس طرح ہی کیوٹ لگتی ہو۔"

"تھینکس۔"

"پھر مان جاؤ نا۔"

"عمر...... جو طے ہوا ہے اسی پر عمل ہوگا۔ مجھے تمہاری اس شرط پر حیرت ہے جب مجھے کوئی اعتراض نہیں تو تم کیوں خود کو مشکل میں کیوں ڈال رہی ہو۔"

"کوئی مشکل نہیں ہے۔ آج سے میری ڈائٹ اسٹارٹ ہونے والی ہے ان فیکٹ تم سے بات کرنے سے پہلے میں بریک فاسٹ کرنے کا سوچ رہی تھی۔ ڈائٹ بریک فاسٹ۔" وہ تھوڑا سا مسکرا کر بولی۔

"تو پچھلے تین مہینے تم نے کیا کیا؟"

"سوچا کہ کس طرح سے ڈائٹ شروع کی جائے۔"

"واؤ کیا کہنے تمہارے۔"

"تو کل آنٹی عالیہ نہیں آ رہیں۔"

"جو حکم تمہارا۔"

☆☆☆

"حد ہوگئی ہے سدرہ۔ اتنی آہستہ چل رہی ہو۔ کلاس روم تک پہنچتے پہنچتے لنچ بریک ہو جائے گا۔" حمنیٰ اسے سستی سے چلتے دیکھ رہی تھی رہا نہ گیا تو بول پڑی۔

"یار۔ مجھے ویک نیس سی فیل ہو رہی ہے، تم تو جانتی ہو آج کل ڈائٹ پر ہوں۔ بریک فاسٹ برائے نام ہوتا ہے اسی لیے بیزاری سی محسوس ہو رہی ہے۔"

"کتنے پاؤنڈ ویٹ کم ہوا ہے۔"

"ابھی کہاں یار؟ صرف ہفتہ تو ہوا ہے کچھ مہینے یہ ڈائٹ فالو کروں گی پھر فضا اسے چینج کر کے نیا ڈائٹ پلان مجھے بتائے گی۔"

"مشکل لگ رہا ہے؟"

"بے تحاشا۔"

"کرلو گی؟"

"ضرور۔" وہ آہستگی سے چلتے چلتے بولی۔

"مستقل مزاج تو تم ہو نہیں۔ میں تو تمہارے لیے صرف دعا ہی کر سکتی ہوں۔"

"شٹ اپ حمنیٰ! بجائے اس کے کہ تم ہمت بڑھاؤ تم تو مجھے ڈی گریڈ کرنے پر تلی ہوئی ہو۔"

"ناراض مت ہو۔ تم ضرور کرلو گی اب خوش۔"

"بالکل...... کلاس روم میں ہم موجود ہیں واچ دیکھو لنچ بریک نہیں ہوئی۔" کلاس ختم ہوئی تو حمنیٰ نے سدرہ کو یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"کل شام سات بجے ریڈی رہنا، میں تمہیں پک کرلوں گی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے حمنیٰ! مگر میں تمہیں پہلے سے بتا رہی ہوں، حرا کی بارات پر آ تو رہی ہوں مگر میں کچھ کھاؤں گی نہیں۔ شادی کا کھانا بہت ہیوی ہوتا ہے، فل آف آئل لہٰذا مجھے اس سے دور رہنا ہوگا۔ ویسے بھی تو میں ڈائٹ پر ہوں۔"

"معلوم ہے مجھے، تم صرف گرین ٹی لے لینا، وہ بھی شوگر فری۔"

حمنیٰ نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

"فضا! یہ ڈائٹ پلان تھوڑا ٹف ہے، لنچ میں زیادہ بھوک محسوس ہوتی ہے، یونیورسٹی کی اسٹڈی بھی خاصی مشکل ہے۔ ایگزام ہونے والے ہیں کم کھانے

سے سر میں درد ہوتا رہتا ہے یار کچھ تو چینج کر دو۔"
وہ فضا کے کلینک میں موجود تھی فضا چند پیشنٹ سے فارغ ہو کر اس کی جانب متوجہ ہوئی۔
"اوکے تم ایسا کرو لنچ میں آلمنڈ اور کوکونٹ اسموتھی لے لو اور پروٹین پاؤڈر صرف ایک ٹی اسپون بھی لے لینا اور ڈنر میں ہفتے میں دو بار چیز برگر کی جگہ اسٹیک ویجی ٹیبل کے ساتھ کھا سکتی ہو اب ٹھیک ہے۔"
"ہوں۔"
"پریشان مت ہو۔ آہستہ آہستہ تمہارا ویٹ کم ہو جائے گا۔"
"تم میرا ویٹ دوبارہ چیک کرو۔"
"کر لیا ہے تمہارا ویٹ۔ ابھی کوئی فرق نہیں ہے سدرہ کچھ دن لگیں گے اتنی جلدی ویٹ کم نہیں ہوتا۔" فضا اسے سمجھانے لگی۔
"فضا عمر تو مجھے نہیں چھوڑے گا۔"
تو مان لو اس کی بات کر لو شادی تم اسے اسی طرح سے اچھی لگتی ہو اور یہ ویٹ کم کرنے کا تمہارا اپنا ذاتی پلان ہے بقول تمہارے عمر کو تم اسی ویٹ کے ساتھ نائس اور کیوٹ لگتی ہو۔"
"کیوں نا کروں کم ویٹ، برائیڈل ڈریس جو میں نے ایک مہینے کی جدوجہد کے بعد سلیکٹ کیا ہے۔ تم نے دیکھا ہوا ہے مجھے اس میں، خوب صورت لگنا ہے۔ اور یہ تب ہی ممکن ہے جب میں کم سے کم ٹونٹی پاؤنڈز تک اپنا ویٹ کم کر لوں۔"
"ویسے سدرہ! تم اتنی ہیوی نہیں ہو۔ تھوڑی گداز جسم ہے تمہارا، اسے تم آسانی سے کنٹرول کر سکتی ہو۔"
"جسے تم آسانی کہہ رہی ہو وہ مجھے مشکل کیوں لگ رہا ہے۔"
"فرسٹ ٹائم اسٹارٹ کی ہے آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گی۔"
ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد سدرہ نے اس سے اجازت چاہی گڈ بائے کہہ کر ڈرائیور کے ہمراہ گھر کی راہ لی۔
☆☆☆
"حمنیٰ! یہ جو چکن ہے آئی تھنک اس میں آئل کم ہے میں اسے ٹیسٹ کر سکتی ہوں۔"
"کر لو، لگتا ہے ود آؤٹ شوگر گرین ٹی سے تمہارا پیٹ نہیں بھرا۔" حمنیٰ دھیرے سے مسکرا کر بولی۔
"گرین ٹی پیٹ بھرنے کے لیے نہیں ہوتی۔"
"اوکے ٹرائی دس۔" اس نے چکن کی جانب اشارہ کر کے کہا۔
سدرہ نے چکن کے تین پیس پلیٹ میں لیے اور فوک کی مدد سے کھانے لگی۔
"ویسے حمنیٰ! تم بہت لکی ہو سلم اینڈ اسمارٹ جو ہو جو مرضی کھاؤ کوئی فکر ہی نہیں۔"
"یہ تو ہے۔" وہ بریانی کی پلیٹ ہاتھ میں لیے ہوئے تھی فوراً اسے سدرہ کی تائید کرنے لگی۔
"حمنیٰ! ایک دن کھانے سے کوئی خاص فرق تو نہیں پڑے گا نا۔"
"اس بارے میں، میں کیا کر سکتی ہوں فضا سے پوچھو، شی از یور نیوٹریشنسٹ۔"
"ابھی تو میں اسے فون نہیں کر سکتی، بزی ہو گی۔ کلینک پر جو ہوتی ہے اور اس ٹائم تو اچھا خاصا رش ہو گا۔" اس نے رسٹ واچ دیکھ کر کہا۔ "مجھے نہیں لگتا ایک دن ڈائٹ توڑنے سے کوئی فرق پڑے گا۔ کل سے دوبارہ سے ڈائٹ اسٹارٹ کر دوں گی۔"
اس نے خود سے کہا، اس کے بعد اس نے بریانی کھائی۔ ٹرائفل کچھ زیادہ نہیں بھایا لہٰذا اس کو دوبارہ لینے سے گریز کیا۔ رشین سیلڈ اس کی فیورٹ تھی۔ اس لیے دل کھول کر انصاف کیا اس کے بعد کولڈ ڈرنک کو انجوائے کیا۔
ایک دن سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ رات جو سوتے وقت جب جب اس کے دل نے سرزنش کی اس نے یہی کہہ کر دل کو مطمئن کر لیا۔ رات دیر سے سونے کی وجہ سے صبح وقت پر آنکھ نہ کھلی تو یونیورسٹی سے چھٹی کرنا پڑی۔ رات کے پرتکلف ڈنر کے بعد صبح ڈائٹ بریک فاسٹ اس نے دل پر پتھر رکھ کر کیا۔
"فوزیہ کے بیٹے کی برتھ ڈے پارٹی ہے تم چلو گی۔" منزہ نے اس سے آ کر پوچھا۔

''کب؟'' وہ جو ہینڈز فری لگائے مووی دیکھنے میں مصروف تھی۔ منزہ کو دیکھ کر ہینڈز فری اتار دیے۔
''شام کو چلنا ہے۔''
''مما میں تو بالکل بھول گئی تھی میں ضرور چلوں گی۔ فوزیہ خالہ کے گھر کوئی تقریب ہو اور میں نہ جاؤں ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔''
''ڈریس سلیکٹ کر لو بلکہ ایسا کرو ابھی سے تیاری شروع کر دو۔ تین بج رہے ہیں چار گھنٹے میں تمہارے پاس۔''
''اٹس او کے مما میں وقت پر آپ کو تیار ملوں گی۔''
اس کے، موبائل کی نفیس سی رنگ ٹون نے اسے متوجہ کیا۔
''ایکسکیوز می مما، عمر کا فون ہے۔''
''چندا تم اس کی کال اٹینڈ کر لو میں چلتی ہوں۔''
''اتنے دنوں بعد کیسے یاد آ گئی میری؟''
''پرسوں تو بات ہوئی ہے سدرہ!''
''کل تو تم نے کال نہیں کی پرسوں کی چھوڑو۔''
''پھر یہ تو مت کہو اتنے دنوں بعد۔''
''وہ تو میں نے ویسے ہی کہہ دیا تھا۔''
''سوری بولو۔''
''او کے سوری۔'' سدرہ نے فٹ سے کہا۔
''یہ ہوئی نا بات۔'' عمر خوش دلی سے بولا۔
''کیسے ہو؟''
''تمہارے بغیر اداس۔''
''زیادہ مجنوں مت بنو۔''
''اچھا یہ بتاؤ ایک مہینہ ہونے کو آیا ہے تمہارا ویٹ کتنا کم ہوا؟''
''مجھے کیا معلوم میں نے ویٹ چیک نہیں کیا۔ فضا کے کلینک جاؤں گی تو معلوم ہوگا۔''
''تو گھر پر کر لیا کرو۔''
''جی نہیں گھر پر نہیں کر سکتی۔''
''وہ کیوں؟''
''کیونکہ مجھے گھر پر اپنا ویٹ دیکھ کر ٹینشن سی ہونے لگتی ہے۔ فضا کے سامنے ویٹ کر کے تسلی محسوس ہوتی ہے۔''
''حیرت ہے۔''
''تمہیں تو حیرت ہی ہوتی رہے گی۔''
''تو کیا نہیں ہونی چاہیے۔''
''اچھا چھوڑو اس ٹاپک کو کیا ہو رہا ہے آج کل۔''
''کچھ خاص نہیں ممی کا روز بروز اصرار بڑھ رہا ہے کہ اب ہماری شادی ہو جانی چاہیے۔''
''یار عمر تھوڑا سا انتظار کرو۔''
''سدرہ، ممی بضد ہیں وہ کہتی ہیں یہ کوئی ریزن نہیں ہے شادی کو لیٹ کرنے کا۔''
''انہیں کیا معلوم میری فیلنگ کیا ہیں۔ عمر! شادی زندگی میں صرف ایک بار ہوتی ہے۔''
''اور دعا کرو ایک بار ہی ہو۔'' وہ فوراً بولا۔
''ہاں وہی تو...... دیکھو ہر لڑکی کا ڈریم ہوتا ہے وہ شادی پر خوب صورت لگنے کے ساتھ ساتھ یونیک بھی دکھے، مجھے اپنی شادی پر سلم اینڈ اسمارٹ برائیڈ دکھنا ہے اس میں غلط کیا ہے۔ میرا ڈیزائنر لہنگا اس بات کا متقاضی ہے کہ میں سلم ہو کر اس کو زیب تن کروں۔''
''اس میں کچھ غلط نہیں ہے ڈیئر۔ مگر تمہاری محنت کا رزلٹ مجھے جلد سے جلد چاہیے۔''
''ڈونٹ وری، مل جائے گا۔''
''ٹیک کیئر سدرہ! بائے۔''
''بائے، اپنا خیال رکھنا عمر۔''
☆☆☆
''سدرہ آپی! یہ کیک تو لیں۔''
''آمنہ! میں ڈائٹ پر ہوں۔''
''اتنا سا کھانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میرا دل رکھنے کی خاطر کھا لیں۔'' وہ اتنے پیار سے اصرار کر رہی تھی کہ مجبوراً اسے کھانا پڑا۔
''میرا فیورٹ اسٹرابیری کیک اور اتنا سا چکھا ہے۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اپنے موسٹ فیورٹ کیک کو بھی صرف چکھوں گی۔ وہ سوچنے لگی۔
''کہاں کھوئی ہوئی ہیں۔'' فوزیہ کی بیٹی آمنہ

اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔
"نہیں نہیں۔ آمنہ! کیک تو بہت ٹیسٹی ہے۔"
"اور لاؤں۔"
"نہیں نہیں۔"
"سدرہ! پاستا ٹیسٹ کیا ہے۔" منزہ اسے مخاطب کرنے لگیں جو خاموشی سے ایک طرف بیٹھی شوگر فری کافی پی رہی تھی۔
"نو مما! آئی ایم آن ڈائٹ۔"
"اوکے بیٹا! مگر تھوڑا سا ٹیسٹ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اتنا یمی ہے کہ تم تصور نہیں کر سکتیں یہ نہ کھانا تو۔ یقیناً پاستا کے ساتھ زیادتی ہوگی۔"
منزہ کے جانے کے بعد وہ کتنی ہی دیر خود کو سمجھاتی رہی کہ وہ ایسا کچھ نہیں کھائے گی جو اس کی ڈائٹ کے خلاف ہو۔ پندرہ منٹ تک خود کو سمجھاتی رہی اور اس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہی۔
"پاستا کھانے سے فرق نہیں پڑے گا تھوڑا سا ٹرائی کروں گی۔" دل سے آتی آواز کو اس نے دبانے کی کوشش کی مگر وہ ناکام رہی۔ اگلے دس سیکنڈ تک وہ اسی کشمکش میں رہی کہ کیا کرے آخر دل کی بات مان کر وہ پاستا لے آئی۔ ساتھ میں اپنے من پسند ٹرپل چاکلیٹ کو کیز لانا نہ بھولی۔
☆☆☆
"حمنیٰ! میں سلم لگ رہی ہوں۔"
یونیورسٹی آتے ہی اس نے حمنیٰ سے پوچھا۔ جو کرسی پر بیٹھی اسائنمنٹ بنانے میں مصروف تھی۔
"بالکل بھی نہیں۔"
"دو جیلس۔" سدرہ نے منہ بنا کر کہا۔
"یار مجھے تم سلم نہیں لگ رہیں تو کیسے کہہ دوں۔ تمہیں کوئی خواب آیا تھا کیا؟" اس نے یہ کہتے ہی دوبارہ سے اسائنمنٹ بنانا شروع کر دیا۔
"نہیں خواب تو نہیں آیا بس صبح یونیورسٹی آنے کے لیے تیار ہو رہی تھی تو ڈریس تھوڑا سا لوز فیل ہو رہا تھا۔ سارے راستے میں تو خوشی سے پاگل ہوئے جا رہی تھی۔"
"خوش فہمی اسے کہتے ہیں۔"
"تم مجھے روز دیکھتی ہو اسی لیے تمہیں محسوس نہیں ہوا۔" اس نے خود کو مطمئن کرنا چاہا۔
"تم ایسا کرو ویٹ کر لو پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا۔"
"نہیں حمنیٰ گھر پر ویٹ نہیں کرتی پھر مجھے خواہ مخواہ ٹینشن ہونے لگتی ہے فضا سے ملوں گی وہیں اس کے کلینک پر ویٹ چیک کروں گی۔"
"اف یہ بچوں جیسی باتیں مت کرو اسائنمنٹ تیار کیا ہے۔"
"کہاں یار، ابھی شروع کرتی ہوں۔"
"آؤ اس سائڈ پر بیٹھ جاؤ۔" اس نے دوسری کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
☆☆☆
سدرہ! کیا تمہیں معلوم ہے آج کیا ڈیٹ ہے۔"
"آج ففتھ مارچ ہے۔"
"بس اتنا ہی معلوم ہے۔"
"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے کہ مجھے اتنا اہم دن یاد نہ ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ آج کے دن ہم دونوں ایک خوب صورت سے رشتے میں بندھے تھے۔"
"ڈیٹس گڈ۔" تو ایسا ہے ڈیئر آج رات میں میں نے ایک ریسٹورنٹ میں ڈنر کا اہتمام کیا ہے آٹھ بجے کے قریب لینے آؤں گا ریڈی رہنا۔" عمر نے اسے اپنے رات کے پلان سے آگاہ کیا۔
"کون سا ڈریس پہنوں۔"
"تم جو بھی پہن لو اچھی ہی لگو گی تم تو مجھے ہر ڈریس میں بیوٹی فل لگتی ہو۔"
"بٹرنگ مت کرو۔"
"اٹس ریئلیٹی۔"
تقریباً ایک گھنٹے تک وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔
"یو لکنگ امیزنگ۔" عمر نے اسے دیکھتے ہوئے

کہا۔
"تھینکس۔"
"بیٹھیے میم۔" وہ اس کے لیے کرسی کھینچ کر بولا۔
"عمر! تم بھی ہینڈسم لگ رہے ہو۔"
"یہ تو تمہاری نظر کا کمال ہے۔" عمر کی اس بات پر وہ مسکرادی۔
"کہاں سے شروع کریں۔"
"مطلب؟" وہ ناسمجھی سے پوچھنے لگی۔
"مطلب یہ کہ ڈنر کا اسٹارٹ کیسے کرو گی اپی ٹائزر میں کیا لوگی۔"
"عمر! آئی ایم آن ڈائٹ۔"
"آئی نو۔ سب کچھ تمہارے مطابق ہی ہے میں یہ پوچھ رہا ہوں۔ اسٹارٹر میں ڈرنک چلے گا یا کچھ اور۔"
"ڈرنک نہیں کچھ کھانے کے لیے منگوالو۔"
"اوکے۔" عمر نے ویٹر کو اشارے سے بلایا۔ اور اس کے لیے بسکٹس اور اپنے لیے سوپ منگوالیا۔ پندرہ منٹ بعد ویٹر مطلوبہ آرڈر لے کر آگیا۔
"یہ رہے تمہارے فیورٹ فرائی بسکٹ۔"
"عمر یو آر سو نائس! کتنا خیال ہے تمہیں میرا۔"
"کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے تم سے زیادہ کوئی مجھے اس دنیا میں عزیز نہیں ہے تم میرے لیے بہت اسپیشل ہو۔"
"تم بھی میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہو اور یہ بسکٹس بہت اچھے ہیں تھینک یو۔"
تھوڑی دیر بعد ویٹر دیے گئے آرڈر کے مطابق سدرہ کے لیے گرلڈ چکن اسٹیک وائٹ سوس لے آیا جبکہ اس کے لیے سیزلنگ چکن ود گارلک رائس آ گئے۔
"عمر اسٹیک کھا کر میں تھک چکی ہوں آج شاید میں نہ کھا سکوں۔"
چکن اسٹیک دیکھ کر وہ بیزاری سے بولی۔
"ڈائٹ ہے تمہاری۔ یہی کھانا پڑے گا۔"
"میرا نہیں دل چاہ رہا ہے۔"
"تو پھر کیا کھاؤ گی؟"
وہی جو تم کھا رہے ہو ویسے بھی ایک دن ڈائٹ کرنے سے فرق نہیں پڑتا۔
جیسے تمہاری مرضی عمر نے ویٹر کو وہی آرڈر کیا جو سدرہ کی پسند تھی میٹھے میں اس نے سدرہ کے لیے ونیلا ڈائجسٹ آئس کریم کا کہا مگر سدرہ نے منع کر دیا اور آئس کریم کے لیے اسٹرابیری فلیور سلیکٹ کیا وہ بھی فل کریم پھر لانگ ڈرائیو کے بعد کریمی کافی سے لطف اندوز ہوئی۔

☆☆☆

"کچھ فرق پڑا۔" فضا کے کلینک پر وہ ویٹ چیک کروانے کے بعد پوچھ رہی تھی۔
"سدرہ تم ریگولر ڈائٹ فالو کرتی رہی ہو۔" وہ اس کا ویٹ دیکھ کر تحیر آمیز لہجے میں پوچھ رہی تھی۔
"وہ بات دراصل یہ ہے......"
"یعنی کہ نہیں۔"
"ہوں۔"
"وجہ جان سکتی ہوں۔"
"فضا! پچھلے کچھ دنوں سے روٹین سے ہٹ کر کھا رہی ہوں۔ گیدرنگ بہت رہی، ڈائٹ پراپر طریقے سے فالو نہیں کر پائی۔"
"ویری بیڈ سدرہ۔ اسی وجہ سے تمہارا ویٹ وہیں کا وہیں ہے۔"
"کوئی فرق نہیں پڑا۔"
"کیسے پڑ سکتا تھا، جب تم نے میرے مشورے پر عمل ہی نہیں کیا۔"
"اب کیا ہوگا فضا؟" وہ پرتفکر انداز میں بولی تھی۔
"یہ تمہیں سوچنا ہے۔"
"یار پلیز، مدد کرو۔ عمر کا کل بھی فون پر ہی اصرار تھا کہ اب بہت ہو گیا ڈیٹ فکس کر دینی چاہیے۔"
"سب کچھ تمہیں خود سے کرنا ہے سدرہ۔ جتنی

جلدی سمجھ لو، یہی بہتر ہے تمہارے لیے۔" فضا یہ کہہ کر اپنی چیئر پر بیٹھ گئی۔

"میں سوچ رہی ہوں، جم جوائن کرلوں۔"

"ڈائٹ بھی ساتھ میں کنٹرول کرنی پڑے گی۔"

"او کے او کے کرلوں گی۔ وہی ڈائٹ پلان ہے نا۔"

"جی بالکل۔"

"تو ٹھیک ہے، کل سے ڈائٹ اور جم جانا ساتھ ساتھ چلے گا۔" وہ پر اعتماد لہجے میں بولی۔

☆☆☆

"ممی اب سخت غصے میں رہنے لگی ہیں۔"

"عمر تھوڑا سا ٹائم مزید دے دو۔"

"کب تک سدرہ آخر کب تک۔"

"تم نہیں چاہتے تمہاری بیوی خوب صورت دکھے۔ سب اسے سراہیں۔"

"سب تمہیں ایسے بھی سراہیں گے، تم اس ویٹ کے ساتھ بھی بہت پیاری اور کیوٹ لگتی ہو۔"

"مجھے اس سے زیادہ اچھی دکھنا ہے۔"

"بلیومی سدرہ۔ تم سب سے زیادہ اچھی دکھتی ہو۔ انوسنٹ اور کیوٹ۔"

"تین ماہ دے دو، ان تین ماہ میں میں سکسٹی تک ویٹ کرلوں گی۔"

"ہماری انگیجمنٹ ہوئے ڈیڑھ سال ہونے کو آیا ہے، اب تمہیں مزید ٹائم چاہیے۔"

"صرف تھری منتھ۔"

"او کے۔"

"تم بہت اچھے ہو۔"

"اور تم مجھ سے کم اچھی ہو۔"

"وہ کیوں بھلا؟" سدرہ نے پوچھا۔

"تم میری بات جو نہیں مانتیں۔"

"نیکسٹ ٹائم تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔"

☆☆☆

"جم جا رہی ہو۔" حمنیٰ اور وہ یونیورسٹی میں موجود تھے، کاریڈور سے گزرتے ہوئے حمنیٰ نے پوچھا۔

"تین دن ہی تو ہوئے ہیں جاتے ہوئے۔"

یار اب اتنی سوکھی نہ ہو جانا کہ چہرہ زرد پڑ جائے۔ ایکسر سائز کا اثر سب سے پہلے چہرے پر پڑتا ہے اور کچھ عرصے بعد تمہاری شادی ہے۔ یہ کیوٹ اور فیئر کلر کا چہرہ کہیں پیلا نہ پڑ جائے۔"

"کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑے گا۔"

"بیمار لگوگی......"

"کچھ نہیں ہوتا...... برائیڈل ڈریس تو اچھا لگے گا نا۔ ایک دن کا فوٹو شوٹ ساری زندگی کے لیے یادگار ہوتا ہے اس میں تو لڑکی کو اچھا لگنا چاہیے۔"

"کریزی ہو رہی ہو تم۔"

ایچ ایس وائی کی برائیڈل کولیکشن دیکھ کر کریزی ہوئی تھی اور انہی کا برائیڈل ویئر سلیکٹ کر کے سوچا کہ سلم ہو کر یہ زیب تن کروں گی تو پہلے سے تین گنا اچھی لگوں گی۔"

"ٹھیک ہے، بیسٹ آف لک۔"

"تھینک یو۔"

☆☆☆

"لیکچر اٹینڈ کرنے کا موڈ نہیں کیا؟" وہ پیپر فائل میں رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور حمنیٰ سے مخاطب ہوئی جو بڑے اطمینان سے کرسی پر براجمان تھی۔

"آج انیلا انگیجمنٹ کی ٹریٹ دے رہی ہے ابھی آتی ہوگی۔ تم بھی آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اتنا اہم لیکچر نہیں ہے سر خالد نے آج اسٹوڈنٹ کے ان کوئسچن کے جوابات دینے ہیں جو کل رہ گئے تھے۔"

"او کے لیکن میں کچھ نہیں کھاؤں گی میری ڈائیٹ جو ہے۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے مت کھانا، صرف واٹر سے کام چلا لینا۔"

اسی اثناء میں انیلا نے کلاس روم میں اینٹری دی

ساتھ میں انیلا کی بیسٹ فرینڈ وجیہہ۔ صائمہ اور تنزیلہ بھی تھیں۔ پانچ منٹ بعد وہ تمام آئٹمز آ گئے جو اس نے اپنے ڈرائیور کو آرڈر کیے تھے۔

اینگسل چکن تکہ پیزا، چکن پائی، ڈرم اسٹک، چکن بریڈ اور ساتھ میں رشین سیلڈ۔ یہ تمام آئٹمز اس نے اپنی منگنی کی خوشی کو شیئر کرنے کے لیے اپنی دوستوں کے لیے منگوائے تھے۔

''یہ کیا تم صرف پانی کیوں پی رہی ہو۔'' وہ سب کھانے میں مشغول تھیں جب انیلا نے سدرہ کو دیکھ کر کہا۔

''آئی ایم آن ڈائٹ۔''

''واٹ؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''ڈائٹ ہے یار۔''

''بالکل بھی نہیں۔ میری خوشی کو شیئر کرنا ہے تو نو ڈائٹ۔''

''پلیز انیلا! ضد مت کرو۔'' وہ منمنائی۔

''فیورٹ میں تمام چیزیں تمہاری تھوڑا سا لے لو۔''

تہذیب بیکرز کے آئٹمز سے اس کا ہاتھ رک نہیں سکتا تھا اور اس بیکری کی رشین سیلڈ تو اس کی موسٹ فیورٹ تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہے اس کی جان تھی۔ تہذیب بیکرز کی رشین سیلڈ کھانے کے لیے وہ ہمہ وقت تیار رہتی۔

اس نے دل بھر کر ہر آئٹم سے انصاف کیا۔

''جم جا ہی رہی ہوں آج ایک گھنٹہ مزید ورک آؤٹ کر لوں گی۔'' دل میں سوچتے ہوئے وہ کھاتی گئی۔

☆☆☆

''صرف ایک پاؤنڈ کم ہوا ہے۔''

''صرف ایک پاؤنڈ؟'' سدرہ نے افسوس سے کہا۔

''جس قسم کی تمہارے کھانے کی روٹین ہے اس میں ایسا ہی ہوتا ہے۔'' فضا نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''تو اب میں کیا کروں روز تو جم جاتی ہوں دو مہینے ہو چکے اور ایک پاؤنڈ وزن کم ہوا ہے۔'' تاسف اس کے لہجے میں نمایاں تھا۔

''تم جو آئے دن ٹی پارٹی باربی کیو پارٹی اور ٹریٹ انجوائے کر رہی ہو، اس سے تو تمہارا وزن کم ہونے سے رہا۔''

''اب میں کیا کروں؟''

''سدرہ! تم عمر کی بات مان لو اور شادی کی ڈیٹ دے دو۔ یہ تمہارے بس کا کام نہیں ہے۔''

''فضا! ایسے تو مت کہو۔''

''تو تم ہی بولو کیا کہوں۔''

''مجھے نہیں معلوم۔'' وہ فضا کو دیکھے بغیر بولی۔

''میں تمہیں صرف ڈائٹ پلان دے سکتی ہوں، عمل تو تمہیں ہی کرنا ہے۔''

''میں نے سوچ لیا ہے۔''

''کیا؟'' فضا پرتجسس انداز لیے ہوئے تھی۔

''کل سے بلکہ آج سے ہی میں دو بار جم جایا کروں گی۔''

''اس سے کیا ہوگا؟''

''ویٹ کم ہوگا۔''

''اوکے بیسٹ وشز فرام مائی سائڈ۔''

''تھینکس فضا۔''

☆☆☆

''سدرہ اب بہت زیادہ ہو گیا ہے، کل ممی ڈیٹ فکس کرنے آ رہی ہیں۔''

''عمر! تم تو سمجھو مجھے۔''

''کیا سمجھوں۔ دو سال ہو چکے ہیں اور تمہارا ویٹ کم ہی نہیں ہو رہا ہے۔ مجھے تم اسی طرح قبول ہو، بس فیصلہ ہو چکا ہے اب ڈیٹ فکس ہو کر رہے گی۔''

''پلیز عمر کچھ ٹائم......''

''بالکل نہیں۔''

''عمر! بات تو سنو۔''

''کیا سنوں ہر بات کی حد ہوتی ہے اور تم تو حد سے تجاوز کر چکی ہو۔''

''ایک منتھ اور دے دو۔''

''بالکل بھی نہیں اور غور سے سن لو اگر تم نے مزید ٹائم مانگا تو میں کوئی اور لڑکی ڈھونڈ لوں گا۔''
''واٹ؟'' وہ حیرت میں گم با آواز بلند بولی۔ جبکہ وہاں سے فون بند کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

''سدرہ! میری جان پریشان مت ہو۔ تم دیکھنا برائیڈ بن کر تم بہت بیوٹی فل لگو گی اتنی گڈ لکنگ ہے میری بیٹی۔'' منزہ اسے دلاسے دے رہی تھیں جو عمر کی بات سن کر خاصی متفکر تھی جب اس نے اس بات کا ذکر منزہ سے کیا تو وہ بڑے پیار سے اسے سمجھانے لگیں۔
''آپ تو میری مما ہیں ایسے ہی کہیں گی۔'' وہ اپنے بیڈ پر لیٹے لیٹے بولی۔
''ارے میری جان، میں سچ کہہ رہی ہوں۔''
''مما! عمر نے اچھا نہیں کیا۔''
''ایسے مت کہو بیٹا! اس نے تمہیں خاصا ٹائم دیا ہے اب تم اگر ویٹ کم نہیں کر پائیں تو اس میں اس کا کیا قصور۔''
''مما! کل آنٹی عالیہ ویڈنگ ڈیٹ فکس کرنے آرہی ہیں۔''
''تو کیا ہوا۔ ڈونٹ وری سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چلو اٹھو، فریش ہو کر آجاؤ۔ تمہارے پاپا لان میں تمہارا انتظار کر رہے ہیں اور احمد تو بار بار پوچھ رہا ہے کہ سدرہ آپی کو کیا ہوا ہے۔''
''آپ جائیں مما میں آتی ہوں۔''
''گڈ گرل۔'' منزہ نے پیار سے اسے دیکھ کر کہا۔

☆☆☆

ایچ ایس وائی کا ویڈنگ ڈریس اس نے جو سلیکٹ کیا تھا۔ اس میں یہ تبدیلی کی کہ لہنگے کے بجائے شرارہ منتخب کر لیا تاکہ تھوڑی سی سلم دکھائی دے یہ مشورہ فضا نے اسے دیا تھا کہ لہنگے کی نسبت شرارہ بہتر رہے گا باقی کلر اور ڈیزائن وہی تھا جو اس نے پہلے سلیکٹ کیا ہوا تھا۔
اس کا فوٹو شوٹ ہوا عمر بے تحاشا خوش اور مطمئن تھا۔ خوش تو وہ بھی تھی۔ فوٹو شوٹ اس نے ڈر ڈر کر کروایا یہی فکر دامن گیر تھی کہ کہیں وہ فوٹوز میں ہیوی نہ دکھائی دیتے۔
فضا جب اس کے ساتھ آکر بیٹھی فوٹوز کھنچوا رہی تھی۔ تو ساتھ ہی اسے تسلی دے رہی تھی کہ وہ اچھی لگ رہی ہے اور موٹی تو بالکل بھی نہیں نظر آرہی۔ ہاں کیوٹ لک، زیادہ لگ رہی ہے ایسے گو کہ تسلی تو ہو گئی مگر وہ پوری طرح سے مطمئن نہیں تھی۔ تاوقتیکہ وہ فوٹوز خود نہ دیکھ لے۔

☆☆☆

''عمر! تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ تھوڑا سا ٹائم اور مانگا تھا اور تم نے فوراً کہہ دیا کہ کوئی دوسری لڑکی سلیکٹ کر لو گے...... اٹس ناٹ فیئر یار۔''
''اچھا بس کرو، اب تو شادی ہو گئی ہے۔ پرانی باتیں چھوڑ دو۔ دیکھو تم کتنی پیاری لگ رہی ہو۔''
''اس فوٹو میں دیکھو، میں تھوڑی سی موٹی لگ رہی ہوں۔''
''کہاں یار! اتنی کیوٹ لگ رہی ہے میری وائف۔ اب اتنا تو ہونا چاہیے ہر لڑکی کو۔''
''جی نہیں، مجھے سلم لگنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔''
''مگر مجھے تو تم ایسے زیادہ خوب صورت لگ رہی ہو۔ تمہارا چہرہ پر رونق لگ رہا ہے، ڈائٹ چہرے کی شادابی ختم کر دیتی ہے۔''
''اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔'' باقی فوٹوز گاہے بگاہے وہ دیکھتی رہی جس میں وہ بہتر لگ رہی تھی فضا کا آئیڈیا کام کر گیا تھا شرارہ میں وہ کسی حد تک سلم لگ رہی تھی۔ اس نے فضا کو دل ہی دل میں ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔
''اچھا ایک کام کرو۔''
''کیا؟'' وہ انہماک سے اس کی بات سننے لگی۔
''اب ڈائٹ اسٹارٹ کر دو۔''
''عمر تم......'' اس نے تکیہ کھینچ کر اسے دے مارا۔ عمر ہنسنے لگا۔

☆☆

لبنیٰ جمشید

نام تو اس کا نیلوفر تھا، لیکن اماں جی نے جب گھر آ کر منہ دکھائی کے لیے دلہن کا گھونگٹ اٹھایا تو ان کے منہ سے بے ساختہ ''نیلم پری'' نکلا تھا۔ اس دن کے بعد سے تنویر میاں کے لیے وہ ایسی پری ثابت ہوئی جس کو اپنی خواہشات نہ بھی بتاؤ پھر بھی وہ انہیں پورا کر کے ''اور کیا حکم ہے میرے آقا'' کی صدا لگا دے۔ کہے بغیر اشتہا انگیز کھانے جس کی خوشبو دماغ کو معطر کر دے۔ کپڑے اپنے وقت پر دھل کر استری ہوئے الماری میں لٹک رہے ہوتے۔ صاف ستھرا گھر مجال ہے کہیں تنکا بھی دکھائی دے جائے۔ پری نے جادو کی چھڑی گھمائی اور ترنت سے ہر چیز اپنے ٹھکانے پر جا پہنچی۔

ہاں، اگر کچھ بے ترتیب تھا تو وہ تھا اس کا اپنا وجود...... جسے اپنی بے لوث خدمت کے بدلے تنویر میاں کی ذرا سی محبت اور نظر الفت کی چاہ تھی۔

تنویر میاں کے کیا کہنے، ان کو اپنی رانی سے فرصت ملتی تو مہربان پری نظر آتی۔ یہ عقدہ بھی شادی کے تیسرے روز کھل گیا تھا۔ نیلم پری ساس کے پاس تخت پر بیٹھے ان کو چھالیہ چھیل چھیل کر دے رہی تھی تبھی باہر کا گیٹ زوردار آواز سے کھلا۔ قدرے فربہی مائل خوب صورت آنکھوں، سلکی لمبے بال، بے حد سفید رنگت (جس میں گلابیاں چھلک رہی تھیں) والی حسینہ وارد ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر نیلم پری کو اپنے مہنگے ترین لباس میں ایک احساس کمتری جاگا۔ اس نے اپنی سانولی کلائی پر نظر ڈالی اور لاشعوری طور پر دونوں بازو دوپٹے کے نیچے کر لیے۔

''تو اچھا یہ ہے نیلوفر! میں سمجھی کوئی بڑی حور پری ہوگی۔'' وہ اسے سر سے پاؤں تک تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''دیکھ لیا، چلو اب دفان ہو جاؤ۔'' اماں جی نے اگالدان میں چھالیہ گراتے ہوئے منہ خالی کیا اور قدرے غصے سے گویا ہوئیں۔

''ارے اماں جی! اتنی جلدی کیا ہے تنویر کی دلہن کو منہ دکھائی میں اس کے ہاتھوں سے لکھے محبت نامے تو دان کر دوں بلکہ رکیں میں پڑھ کر سنا ہی دیتی ہوں کیا کیا لکھتا ہے میرے حسن پر میری ہی سامنے بیٹھ کر روزانہ۔'' اس نے تخت پر نیلوفر کے برابر جگہ بنائی اور ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگ کو کھولنے لگی۔

''میں کہتی ہوں رانی۔ اللہ کے قہر سے ڈر پہلے میرا معصوم بچہ پھنسایا پھر رشتہ لے جانے پر اپنے بھائیوں سے بے عزتی کروائی۔ اب کیا چاہتی ہے......؟ اس کا بسا بسایا گھر اپنے اوچھے ہتھکنڈوں سے اجاڑ دے گی، یہ میں کبھی ہونے نہیں دوں گی۔ اسی لیے ایک سمجھ دار ہیرے کا انتخاب کیا ہے میں نے۔'' اماں جی نے ایک عزم سے کہتے ہوئے فخریہ نظروں سے نیلوفر کی جانب دیکھا جو یہ بات سمجھنے کی کوشش میں دونوں کے بیانات سن رہی تھی۔

''ہونہہ! تیرے ہیرے کو واپس کوئلے کی کان میں نہ چھوڑ کر آئی تو میرا نام بھی رانی نہیں۔'' رانی نے تنویر میاں کی طرف سے لکھے خطوط نیلوفر کی گود میں پھینکے اور خود اماں جی کو دھمکی دیتی واپس چلی گئی۔

نیلم پری گود میں رکھے خطوں کے پلندے کو ایک

تواتر سے دیکھے جا رہی تھی جب اماں جی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑ کر انہیں دیکھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ وہ یکدم کھڑی ہوئی اور ان کے گلے جا لگی۔ تمام خطوط فرش پر جا بکھرے۔

''میری بیٹی کیا بتاؤں پچھلی گلی میں چھ ماہ پہلے نئے کرایہ دار آئے۔ تنویر نیا نیا کام پر لگا تھا، شام کو دفتر سے آ کر چھت پر نصیبن (ہمسائی) کے بچوں کی چڑھائیں پتنگیں دیکھنے چلا جاتا اور کب رانی کے دل میں خود کو کٹی پتنگ کی طرح چھوڑ آیا...... کسے خبر......! میں رشتہ لے کر گئی تو اس کے بھائیوں نے انکار کر دیا۔ محلے والوں نے بتایا کہ یہ شادی کرنے کے نہیں صرف کماؤ پوت دیکھ کر پیسہ کھانے کے ہیں، ساری زندگی بیوگی کی چادر اوڑھے رکھی، محنت کی، بیٹے کو پڑھایا، افسر بنایا، اس کی خواہش پر سر بھی جھکا دیا مگر...... اب سمجھ داری اسی میں تھی کہ فوراً واسطے دے کر بیاہ دیتی یہی کیا میں نے۔''

اس نے اماں جی کے آنسو پونچھے۔

"آپ نے اچھا فیصلہ کیا اب میری جو قسمت۔"
نیلوفر ساری بات سن کر دھیمے لہجے میں گویا ہوئی۔

"بہت شاندار قسمت ہوگی تمہاری بس محبت اور توجہ سے شوہر کے دل میں گھر کر لینا میری نیلم پری تو چھڑی گھما کر اس رانی کو غائب کرے گی۔" وہ اسے گر بتانے لگیں۔

☆☆☆

آج اس کی شادی کو پانچ سال مکمل ہو گئے تھے۔ اماں جی کا پچھلے سال کا کار ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے بعد سے وہ خود کو مزید اکیلا محسوس کرنے لگی۔ پھر چند ماہ پہلے اسے نوید ملی کہ اس کے اندر ایک نئی زندگی پنپ رہی ہے تو وہ پھر سے توانا ہو گئی۔

تنویر میاں کے وہی رنگ ڈھنگ تھے صبح دفتر پھر آ کر چھت پر ہوا خوری، اس کے پیچھے کی کہانی وہ خوب جانتی تھی۔ دیوار سے ملی دیوار پھلانگنا کوئی مشکل نہ تھا۔ وہ خاموش رہ کر خود کو واقعی مہربان پری ثابت کرنا چاہتی تھی یا پھر اسے یقین تھا کہ اچھا وقت جلد ہی آئے گا۔ اسی کے سہارے وہ خاموشی سے چاپ چاپ اپنا کام کیے جاتی۔ وہ ایک ایسی مٹی کی مورت بن چکی تھی جس پر کوئی چیز اثر ہی نہ کرتی ہو۔ محلے کی عورتیں اسے اس حالت میں سودا سلف لاتے دیکھتیں اور دانتوں میں انگلی دبا لیتیں۔

تنویر میاں ہر ماہ ایک مخصوص رقم اس کے ہاتھ پر رکھ کر بری الذمہ ہو جاتے تھے۔ اب اس سے گھر کا سودا سلف، نیلوفر کی ضروریات کی اشیاء، ڈاکٹر کا چیک اپ یہ سب کس طرح ہونا ہے ان کو کوئی سروکار نہیں تھا ایک وہی تھی جس کے پروں کی طاقت پر یہ گھر چل رہا تھا مگر اب وہ طاقت اندر پنپتے وجود کو میسر ہونے لگی تو خود اس کا اپنا وجود ڈھے سا گیا تھا۔ باوجود اس کے خود کو گھسیٹتے ہوئے وہ باہر کا رخ کرتی۔ ضروریات زندگی کی تلاش میں۔ چپل بھی آج ٹوٹ گئی تھی۔

سہ پہر کو وہ موٹی سوئی لیے چپل سی رہی تھی جب اسپتال جانے کی حاجت محسوس ہوئی۔ تنویر میاں ابھی دفتر سے آ کر نہا رہے تھے۔ اس نے ان کے باہر نکلنے کا انتظار کیا۔

"تو میں کیا کروں خالہ نصیبن کو بلا لو ویسے بھی یہ عورتوں کا کام ہے۔" ساری بات سننے کے بعد انہوں نے قدرے بے رخی سے کہا اور سیڑھیوں کی جانب چل دیے جہاں آج رانی نے اپنی محبت کی داستان مکمل کر کے اسے سرپرائز دینا تھا۔

نیلوفر کو تنویر سے اس قدر بے اعتنائی کی امید نہ تھی۔ اس کا صبر اپنی حد چھلکنے کو تھا لیکن وہ یہ سوچ کر چپ ہو رہی کہ اولاد جب دنیا میں آئے گی تو ہو سکتا ہے وہ بدل جائے۔ آنسو اپنے دل میں اتارتے ننگے پاؤں ساتھ والے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ نصیبن خالہ نے ہی کھولا تھا اور اپنے سامنے نیم جاں وجود کو دیکھتے فوراً اندر فون کی جانب لپکیں۔ ایمبولینس کی آمد سے قبل ہی محلے کی دائی کے ہاتھوں ایک اور پری نے جنم لے لیا تھا جبکہ نیلم پری زندگی کی تخلیق کے بعد ایک بے جان مٹی کے ڈھیر میں بدل چکی تھی۔

"ارے کوئی تنویر میاں کو بلاؤ، اجو جا بیٹا۔ بھاگ کر چھت سے اتار کے لا کہنا شرم کر لے اب۔ بیٹی ہوئی ہے۔" خالہ نصیبن باہر صحن میں چیخ رہی تھیں جبکہ اندر ان کی بہو اور دائی مٹی کے ڈھیر میں زندگی کی رمق تلاشتے نظر آئیں۔

جس وقت تنویر میاں کمرے کے اندر داخل ہوئے اندر بیٹھے ڈاکٹر نے نیلوفر کی موت کی تصدیق کر دی تھی۔ تنویر میاں حیرت سے گنگ نیلم پری کو دیکھتے جا رہے تھے۔ ابھی ابھی تو انہیں معلوم ہوا تھا کہ رانی ان سے دس لاکھ روپے ہتھیا کر بھائیوں کے ہمراہ کسی اور شہر کو نکل گئی ہے۔ وہ واپس پری کی طرف دوڑے تھے مگر وہ بھی ان کو دھوکا دے گئی۔ زر بھی نہ رہا اور زن سے بھی گئے۔ اب ان میں کچھ اور کھونے کی ہمت نہ تھی اس لیے ننھی پری کو سینے کے لگائے سسک سسک کر رو دیے۔ نیلم پری نے آخر جادو کی چھڑی گھما کر رانی کو غائب تو کر دیا مگر اپنا وجود دان کر باپ بیٹی کی کہانیوں میں امر ہو گئی۔

☆☆

گواہی

☆ اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار اور خدا کے واسطے کے گواہ بنو۔ اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد میں خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مال دار ہو یا غریب اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز رہو اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو جو تم کچھ کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔ (سورۃ النسا......135)

☆ شہادت ہرگز نہ چھپاؤ جو چھپاتا ہے، اس کا دل گناہ میں آلودہ ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں (سورۃ البقرۃ......283)

احادیث نبوی

☆ رسول پاک ارشاد فرماتے ہیں:

"جھوٹی گواہی بت پوجنے کے برابر کی گئی۔ جھوٹی گواہی بت پرستی کے برابر کی گئی۔ جھوٹی گواہی، شرک کے برابر کردی گئی۔" تین بار یہ فرما کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت اس کی سند میں پڑھی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "بتوں کی ناپاکی سے بچوں اور جھوٹی بات سے بچو۔ اللہ تعالیٰ کے لیے باطل سے حق کی طرف مائل ہو جاؤ، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔" (ترمذی، ابن ماجہ وغیرہما)

☆ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

☆ جھوٹے گواہ کے پاؤں جگہ سے ہٹنے نہ پائیں گے کہ اللہ تعالیٰ جہنم واجب کردے گا۔ (ابن ماجہ)

☆ حدیث شریف میں ہے کہ جو گواہی کے لیے بلایا گیا اور اس نے گواہی چھپائی یعنی ادا کرنے سے گریز کیا وہ ویسا ہی ہے جیسا جھوٹی گواہی دینے والا۔ (طبرانی)

ریاست مدینہ

مسجد آخر تک بھری ہوئی تھی لوگ سوالیہ نظروں سے باہم تبادلہ خیالات کرنے لگے کہ امیر المومنین کو آنے میں تاخیر کیوں ہوگئی۔ وہ کہاں ہیں؟ چند لمحوں کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے اور منبر پر چڑھنے کے بعد لوگوں سے معذرت خواہی کرتے ہوئے فرمایا۔

میں اصل میں اپنے کپڑے دھو رہا تھا اور میرے پاس اس کے سوا کوئی اور کپڑا نہیں تھا (احمدی الزہد ۱۲۴ وابن الحوزی فی المناقب ۱۳۸)

سعدیہ وحید سعدی......اسلام آباد

چار چیزیں

(1)۔ چار چیزیں بدن کو برباد کرتی ہیں (1) رنج (2) غم (3) بھوک (4) راتوں کو جاگنا۔

(2)۔ چار چیزیں چہرے کی رونق ختم کردیتی ہیں۔ (1) جھوٹ (2) بے شرمی (3) گناہوں کی کثرت (4) علم حاصل کرنے کی بجائے زیادہ سوال کرنا۔

(3)۔ چار چیزوں سے روزی حاصل ہوتی ہے۔ (1) قیام الیل (2) کثرت استغفار (3) صدقہ کرنا (4) صبح اور شام کو اذکار کرنا۔

(4)۔ چار چیزوں سے روزی رک جاتی ہے (1) صبح کا سونا (2) نماز میں کوتاہی (3) سستی اور کاہلی (4) خیانت۔

(5)۔ چار چیزوں سے چہرے پر رونق کا اضافہ ہوتا ہے (1) شرافت (2) وفاداری (3) سخاوت (4) تقویٰ۔

(6)۔ چار چیزوں سے دشمنی اور نفرت پیدا ہوتی ہے (1) تکبر (2) حسد (3) جھوٹ (4) چغل خوری۔

زرینہ خانم لغاری، مظفر گڑھ

ایک خوبی

ایک دفعہ کسی شخص نے جعفر برمکی سے پوچھا۔ ''آدمی میں کتنے عیب ہوتے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''عیب تو بے شمار ہیں مگر ایک خوبی ایسی ہے کہ اگر وہ کسی آدمی میں ہو تو تمام عیب چھپ جاتے ہیں۔''

سائل نے پوچھا ''وہ خوبی کیا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''زبان پر قابو''

اقصیٰ شہزاد...... ڈھوک اعوان سگھڑ

غور طلب

☆ جو مرد یہ سمجھتا ہے وہ عورت کو جیت رہا ہے۔ درحقیقت وہ عورت کے آگے شکست تسلیم کر رہا ہوتا ہے (سارہ اینڈرسن)

☆ وحشی درندے بھی کسی کو تفریح طبع کے لیے ہلاک نہیں کرتے۔ صرف انسان ہی وہ جاندار ہے جو انسانوں کی موت اور تکلیف سے لطف اندوز ہوتا ہے (جے ای فرواڈ)

☆ بھوکا اور ننگا مزدور جب جبر و ظلم کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو بڑے بڑے بادشاہوں کے تاج اس کی ٹھوکر کی زد میں ہوتے ہیں۔ (برٹرینڈ رسل)

☆ غموں اور غموں کے مقابلے میں بے صبری خون کو زیادہ جلا دیتی ہے۔ (کلے کون)

☆ ہمیں کل کی کچھ خبر نہیں۔ ہمارا کام آج خوش رہنا ہے (سڈنی اسمتھ)

شہرین اسلم...... چوک شاہدہ

پاس عہد

ایڈیسن کی گلی میں ایک ماچس بیچنے والا آیا کرتا تھا۔ اس کی آواز اس قدر کرخت تھی کہ ایڈیسن کے کام میں خلل ہوتا تھا۔ وہ کام سے ہاتھ روک لیتا تھا۔

ایک دن ایڈیسن نے اسے بلا کر دو پونڈ دیے اور کہا۔ ''یہ رقم لو اور آئندہ سے اس طرف نہ آنا۔''

وہ وعدہ کر کے چلا گیا اور اس دن کے بعد سے وہ واقعی اس گلی میں نہ آیا۔ لیکن دو چار دن بعد اس گلی میں ماچس بیچنے والوں کا ایک ہجوم داخل ہوا اور گلا پھاڑ کر چیخنے لگا۔

(اریبہ...... لاٹھیاں والا)

اصول پرست لوگ

یہ 25 اکتوبر 1947 کی بات ہے۔ قیام پاکستان کے بعد پہلی بار عیدالاضحیٰ کا تہوار منایا جانا تھا۔ عیدالاضحیٰ کی نماز کے لیے مولوی مسافر خانہ کے نزدیک مسجد قصاباں کو منتخب کیا گیا اور اس نماز کی امامت کا فریضہ مشہور عالم دین مولانا ظہور الحسن درس نے انجام دینی تھا۔ قائداعظم کو نماز کے وقت سے مطلع کر دیا گیا۔

مگر قائداعظم عید گاہ نہیں پہنچ پائے۔ اعلیٰ حکام نے مولانا ظہور الحسن درس کو مطلع کیا کہ قائداعظم راستے میں ہیں اور چند ہی لمحات میں عید گاہ پہنچنے والے ہیں۔ انہوں نے مولانا سے درخواست کی کہ وہ نماز کی ادائیگی کچھ وقت کے لیے موخر کر دیں۔ مولانا ظہور الحسن درس نے فرمایا۔

''میں قائداعظم کے لیے نماز پڑھانے نہیں آیا ہوں۔ بلکہ خدائے عزوجل کی نماز پڑھانے آیا ہوں۔''

چنانچہ انہوں نے صفوں کو درست کر کے تکبیر فرما دی ابھی نماز عید کی پہلی رکعت شروع ہوئی ہی تھی کہ اتنے میں قائداعظم بھی عید گاہ پہنچ گئے۔ اعلیٰ حکام نے درخواست کی کہ وہ اگلی صف میں تشریف لے چلیں۔ مگر قائداعظم نے انکار کر کے پچھلی صفوں میں ہی نماز پڑھی۔

گڑیا راجپوت...... جاتری شریف

حضرت علیؓ نے فرمایا

☆ زندگی میں خود کو کبھی کسی انسان کا عادی مت بنانا کیونکہ انسان بہت خود غرض ہے۔ جب آپ کو پسند کرتا ہے تو آپ کی برائی بھول جاتا ہے اور جب آپ سے نفرت کرتا ہے تو آپ کی اچھائی بھول جاتا ہے۔

☆ دعا کرنے والا دوست ہمیشہ غریب ہوتا ہے۔

☆ جس نے پریشانی کو بیان کر دیا وہ ذلت پر راضی ہو گیا۔

☆ کسی کے برا کہہ دینے سے نہ ہم برے ہو جاتے ہیں نہ اچھے۔ اپنی زبان سے ہر شخص اپنا ظرف دکھاتا ہے دوسرے کا عکس نہیں۔

زاہدہ محمد خان...... شادیوال ضلع گجرات

ٹیچرز ڈے

ٹیچرز ڈے پر کسی نے اپنے بہت ہی قابل اور محترم استاد کو فون کیا اور کہا کہ میں آج جو بھی ہوں آپ کی وجہ سے ہی ہوں۔

استاد محترم بولے: "دیکھو ہمیں الزام نہ دو ہم نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی۔"

افشاں سمیع...... کراچی

اچھا لیڈر

ایک دفعہ سر ونسٹن چرچل سے کسی نے پوچھا کہ "ایک اچھے لیڈر میں سب سے اہم صلاحیت کون سی ہونی چاہیے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "وہ جو بالکل صحیح پیش گوئی کر سکے کہ کل کیا ہوگا۔ پرسوں کیا ہوگا؟ اور اس سے اگلے دن کیا ہوگا؟ اور پھر بعد میں ووٹروں کو سمجھا سکے کہ اس کی پیش گوئی کیوں غلط ثابت ہوئی۔"

مسکان نور...... لاڑکانہ

سستا علاج

ایک انگریز کو بچپن سے ہی یہ خوف تھا کہ جب وہ سوتا ہے تو اس کے بیڈ کے نیچے کوئی ہوتا ہے۔ لیکن بڑا ہونے کے بعد بھی اس کا یہ خوف دور نہ ہوا۔ وہ ایک ماہر نفسیات کے پاس گیا۔

ماہر نفسیات نے کہا۔ "ایک سال کا تمہارا علاج ہوگا۔ بس ہفتے میں تین دن تمہیں آنا ہوگا میرے پاس۔"

انگریز نے پوچھا۔ "اور آپ کی فیس کتنی ہوگی۔"

"200 ڈالر" ماہر نفسیات نے کہا۔

"چلیں میں سوچ کر بتاتا ہوں۔" انگریز بولا۔

پھر کوئی ایک سال بعد اس گورے اور ماہر نفسیات کی کسی فنکشن پر ملاقات ہوئی تو ماہر نفسیات نے پوچھا کہ تم آئے نہیں میرے پاس۔

انگریز نے جواب دیا۔ "میرا وہ مسئلہ میرے ایک پاکستانی دوست نے صرف ایک بریانی کا پلیٹ اور ایک بوتل پر دور کر دیا اور آپ کی فیس کے پیسے بچا کر میں نے گاڑی خرید لی ہے۔"

ماہر نفسیات نے بڑی حیرانی سے پوچھا۔ "بھئی اس نے ایسا کیسا علاج بتایا مجھے بھی بتاؤ پلیز۔"

انگریز بولا۔ "پاکستانی دوست نے مشورہ دیا کہ بیڈ بیچ دو اور فرش پر گدا ڈال کر سویا کرو۔"

قاضی صبا...... اٹک

خواہشیں سال نو

سال نو، سالہائے گزشتہ کی طرح
ہم سے امید وہی رکھتا ہے
اس کی امید کا مرکز و محور ہم ہیں
پیار سے، امن و محبت سے، رواداری سے
ہم جو چاہیں تو یہ سال مثالی کر دیں
ہم اگر چاہیں دنیا جمالی کر دیں
سال نو سالہائے گزشتہ کی طرح
ہم سے امید یہی رکھتا ہے

علی تاصف

☆☆

بُشریٰ محمود

فائزہ بھٹی، کی ڈائری میں تحریر

ایک خوبصورت نظم

ذرا سا تو ٹھہر اے دل
ابھی کچھ کام باقی ہیں
ابھی آنگن میں مجھ کو موتیے کے کچھ نئے پودے
لگانے ہیں
ابھی اُن شوخ ہونٹوں کے کئی انداز ہیں جن کو
میرے ہونٹوں پہ کھلنا ہے
ابھی اس جسم نے مجھ سے
بہت سی بات کرنی ہے
ابھی اس دل کے جانے کتنے ہی غم ایسے ہیں جن کو
مجھے اپنے بدن میں روح میں بھرنا ہے
اس کے ساتھ جانے کتنے رستے ہیں
اکٹھے جن پہ چلنا ہے
ابھی کچھ باتیں ایسی ہیں کہ جو برسوں سے
میرے ذہن میں تھیں
سوچ رکھا تھا اسے اک دن بتاؤں گی
بتانی ہیں
ابھی کچھ قصے ایسے ہیں کہ جو اس کو سنانے ہیں
کئی کوتاہیاں ایسی بھی ہیں جن پر ندامت ہے
اسے سب کچھ بتا کر
بوجھ اس دل کا گھٹانا ہے
ابھی کچھ دیر پہلے بس ذرا سی دیر پہلے ہی
ذرا سی بات پر وہ مجھ سے روٹھا تھا
ابھی اس کو منانا ہے
ابھی اس کو منانا ہے

فاطمہ شاہد، واعظہ شاہد، کی ڈائری میں تحریر

حسن رضوی کی نظم

کبھی کتابوں میں پھول رکھنا، کبھی درختوں پہ نام لکھنا
ہمیں بھی ہے یاد آج تک وہ نظر سے حرفِ سلام لکھنا

وہ چاند چہرے وہ بہکی باتیں سلگتے دن تھے مہکتی راتیں
وہ چھوٹے چھوٹے کاغذوں پر محبتوں کا پیام لکھنا

گلاب چہروں سے دل لگانا وہ چپکے چپکے نظر ملانا
وہ آرزوؤں کے خواب بُننا وہ قصہ نا تمام لکھنا

مرے نگر کی حسیں فضاؤں کہیں جو ان کا نشان پاؤ
تو پوچھنا یہ کہاں بسے وہ کہاں ہے ان کا قیام لکھنا

کبھی فضاؤں میں سانس لینا عبث ہے اب تو گھٹن ہے ایسی
کہ چاروں جانب شجر کھڑے ہیں صلیب صورت تمام لکھنا

گئی رُتوں میں حسن ہمارا بس ایک ہی تو مشغلہ تھا
کسی کے چہرے کو صبح کہنا کسی کی زلفوں کو شام لکھنا

ماریہ نذیر، کی ڈائری میں تحریر

محسن نقوی کی غزل

مرحلے شوق کے دُشوار ہوا کرتے ہیں
سائے بھی راہ کی دیوار ہوا کرتے ہیں

وہ جو سچ بولتے رہنے کی قسم کھاتے ہیں
وہ عدالت میں گنہ گار ہوا کرتے ہیں

صرف ہاتھوں کو نہ دیکھو کبھی آنکھیں بھی پڑھو
کچھ سوالی بڑے خوددار ہوا کرتے ہیں

وہ جو پتھر یونہی رستے میں پڑے رہتے ہیں
ان کے سینے میں بھی شہکار ہوا کرتے ہیں

صبح کی پہلی کرن جن کو رُلا دیتی ہے
وہ ستاروں کے عزادار ہوا کرتے ہیں

شرم آتی ہے دُشمن کسے سمجھیں محسن
دشمنی کے بھی تو معیار ہوا کرتے ہیں

نسیم انجم کی ڈائری میں تحریر

انشاء اللہ خان انشا کی غزل

ٹک آنکھ ملاتے ہی کیا کام ہمارا
تس پر یہ غضب پوچھتے ہو نام ہمارا

تم نے تو نہیں، خیر یہ فرمائیے بارے
پھر کن نے لیا، راحت و آرام ہمارا

تم نے جو کہا آیئے مجھ پاس تو بولے
کیوں، کس لیے، کس واسطے کیا کام ہمارا

رکھتے ہیں کہیں پاؤں تو پڑتے ہیں کہیں اور
ساقی تو ذرا ہاتھ تو لے تھام ہمارا

ٹک دیکھ ادھر، غور کر، انصاف یہ ہے واہ
ہر جرم وگنہ غیر سے اور نام ہمارا

اے بادِ صبا محفلِ احباب میں کہو
دیکھا ہے جو کچھ حال نہ دام ہمارا

ثانیہ مرید کی ڈائری میں تحریر

حبیب جالب کی غزل

عہدِ سزا

یہ ایک عہدِ سزا ہے جزا کی بات نہ کر
دُعا سے ہاتھ اٹھا رکھ دوا کی بات نہ کر

خدا کے نام پہ ظالم نہیں یہ ظلم روا
مجھے جو چاہے سزا دے خدا کی بات نہ کر

حیات اب تو انہی محبسوں میں گزرے گی
ستم گروں سے کوئی التجا کی بات نہ کر

انہی کے ہاتھ میں پتھر ہیں جن کو پیار کیا
یہ دیکھ حشر ہمارا وفا کی بات نہ کر

ابھی تو پائی ہے میں نے رہائی رہزن سے
بھٹک نہ جاؤں میں پھر رہنما کی بات نہ کر

بجھا دیا ہے ہوا نے ہر ایک دیا کا دیا
نہ ڈھونڈ اہلِ کرم کو دیا کی بات نہ کر

نزولِ حبس ہوا ہے ملک سے اے جالب
گھٹا گھٹا ہی سہی دم گھٹا کی بات نہ کر

کچھ موتی چنے ہیں......ادارہ

محبت

محبت بھی کوئی چیز ہے جو کیڑوں کی خوراک بننے کے لیے، قبر میں سڑنے کے لیے چھوڑ دی جائے۔ عشق تو ایک بے چین مشغلہ ہے کہ جب اپنا عظیم الشان رقص شروع کرتا ہے تو کائنات کو اپنی آغوش میں دبوچ لیتا ہے۔ ایک بے پناہ دریا جو ابھرتا ہے تو بڑی بڑی چٹانوں کو چھیلتا، پیڑوں کو اکھیڑتا اور ریگستانوں کو ڈبوتا چلا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں عمر میں سچی محبت صرف ایک دفعہ ہوتی ہے۔ مگر لوگوں یہ بھی بتا دو وہ ایک "ہے کون؟" انسان لٹو ہے اور اسے ہر سمت قبلہ ہی نظر آتا ہے۔ عشق کی تو گدی میں بھی آنکھیں ہوتی ہیں۔ (عصمت چغتائی)

شہرین اسلم......چوک شاہدرہ

چیلنجز

"راستے پر کنکر ہی کنکر ہوں تو بھی ایک اچھا جوتا پہن کر اس پر چلا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک اچھے جوتے کے اندر ایک بھی کنکر ہو تو ایک اچھی سڑک پر چلنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ یعنی باہر کے چیلنجز سے نہیں بلکہ ہم اپنے اندر کی کمزوریوں سے ہارتے ہیں۔"

(انتخاب......از پاگل آنکھوں والی)

ثانیہ مرید......ڈی جی خان

شیطان اور حکومت آپا

کھانے کے بعد مجھے یونہی خیال آیا کہ شیطان اور حکومت آپا دیر سے غائب ہیں۔ تلاش کرنے پر دیکھتا ہوں کہ دونوں فوارے کے پاس بیٹھے ہیں اور رومان انگیز گفتگو ہو رہی ہے، میں چھپ کر سننے لگا

شیطان بولے۔ "سچ مچ تم بہت پیاری معصوم ہو۔"

حکومت آپا نے کہا۔ "سچ مچ میرے پاس اس وقت روپے نہیں ہیں، ورنہ ضرور قرض دے دیتی۔"

شیطان بولے۔ "یقیناً چند مہینوں میں تمہاری رنگت نکھر آئی ہے، جب تم جون میں آئیں تو تمہاری جون بدلی ہوئی تھی۔"

"یقیناً میرے پاس روپے نہیں ہیں۔"

"روپے کون مانگتا ہے تم سے؟ بھلا ایسی رومان پرور فضا میں جہاں باغ کا ایک گوشہ ہو، فوارہ چل رہا ہو، چاندنی چٹکی ہوئی ہو اور تم سامنے ہو وہاں روپوں کا خیال کیسے آسکتا ہے۔ وہاں تو ایک معصوم سی آرزو دل میں کروٹ لینے لگتی ہے۔"

"سچ مچ۔" آپا شرما گئیں۔

"ہاں، سچ مچ۔"

"بھلا اس وقت آپ کو کس چیز کی آرزو ہے؟"

"کلوروفام کی۔" شیطان بولے۔

(شفیق الرحمٰن......حماقتیں)

سندس بخاری......میر پور میرس

سگریٹ اور نوشی

سگریٹ نوش کو جتنا نقصان سگریٹ نوشی سے ہوتا ہے، اس سے کئی گنا نقصان سگریٹ نوشی کے نقصانات پڑھ کر ہوتا ہے۔ میں جب بھی سگریٹ نوشی کے نقصانات پڑھتا ہوں تو مجھے اختلاج قلب کی بیماری تو اس وقت ہو جاتی ہے۔ سانس میں رکاوٹ بھی محسوس ہونے لگی ہے۔ بلڈ پریشر بھی ہائی ہو جاتا ہے چنانچہ کینسر ہونے سے پہلے میں اخبار لپیٹ کر پرے رکھ دیتا ہوں۔ میرا ایک دوست تو سگریٹ نوشی کے نقصانات پڑھ کر اس قدر خوف زدہ ہوا کہ اس نے سگریٹ بھی چھوڑ دی اور نوشی بھی چھوڑ دی حالانکہ بے چاری نوشی کا کوئی قصور نہیں تھا۔

(عطاء الحق قاسمی)

حریم سلمان......کراچی

جب کسی سے محبت کی جاتی ہے تو دل میں ایک قبرستان بھی بنایا جاتا ہے۔ اس میں اپنے محبوب کی تمام خامیاں دفن کر دی جاتی ہیں اور پھر ان کے کتبے نہیں لگائے جاتے۔

(بیلی راجپوتاں کی ملکہ......نمرہ احمد)

اقصیٰ شہزاد......ڈھوک اعوان سکھر

مدیرہ کرن

نامے میرے نام

زرتاشیہ نعمان......ملتان

آخر کار یہ سال اختتام پذیر ہوا، پورا سال بے ثبات سی زندگی رہی، ذہن شدید الجھنوں میں گھرا رہا۔ خاص طور پہ لاک ڈاؤن وجہ سبب بنا۔ یقین جانیں اگر یہ رسائل نہ ہوتے تو پہیہ زندگی تو بالکل ہی مفلوج ہو جاتا تھا۔ رسالے پڑھنا پھر خط لکھنا یہی واحد سرگرمی رہی، اس گھٹن زدہ ماحول میں جو ہوا کا تازہ جھونکا ثابت ہوئی تھی۔ اب تو اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ ہم سب پر رحم فرمائے اور اس وبا کا یکسر خاتمہ ہو جائے آمین۔

اب آتی ہوں تبصرے کی طرف۔۔حمد اور نعت پڑھ کے دل کو منور کیا۔ مہوش افتخار کو ''دامن سحاب'' کے ساتھ ویلکم کرتی ہوں۔ لگ رہا ہے اس ناول کو ساتھ سفر شاندار رہے گا بیسٹ آف لک مہوش جی۔ اس بار ''کنار خواب جو'' مار کٹائی، کڈنیپ، ثمامہ میڈم کی بھیانک سازش، شازمہ کی عبدل کی اور بڑھتی دست درازیاں لیے ہوئے دلچسپ قسط رہی۔ ''میرے چارہ گر'' پھولوں اور چاکلیٹس کی مہک سے بھرا ناول بے حد پسند آیا......نہایت ہی عمدگی سے لکھا نوشین فیاض نے ''سدرۃ المنتہیٰ'' کے ناولٹ ''آخری کنارے پر'' اس کے لیے یقین جانیں میرے پاس توصیف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ کتنی خوب صورتی سے سینت سینت کے لکھا گیا ہے یہ ناولٹ۔ پڑھتے ہوئے ایک بار تو دل میں آیا کہ چھوڑ دوں، سمجھ میں نہیں آ رہا......لیکن پھر دماغ نے کہا پڑھو تو سہی، آگے ہوتا کیا ہے؟ اور واقعی جب اینڈ تک پڑھا تو میں بے اختیار اش اش کر اٹھی۔ اب بات ہو جائے شبانہ شوکت کے ناولٹ ''جوگا یک پھولوں جیسا ہو'' زبردست تھا ایک وکھری سی لو اسٹوری تھی۔ ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' میں ارسلہ تو ذہنی مریض ہی بنتی جا رہی ہے......ماں بننے کی خوشخبری بھی اس کی منہ زور باطل خواہشوں پہ بند باندھنے سے قاصر رہی...... افسانے ''چورنی''۔ ''علاج''، ملن سے پہلے۔ ہائے میری ساس۔ وہ ایک اردو داں'' اور ''فسانہ حقیقت'' سبھی اچھے لگے۔ ''مقابل ہے آئینہ'' میں طوبیٰ ممتاز ملاقات کر کے اچھا لگا......دعا ہے کہ ان کا ایڈمیشن ان کی من پسند یونیورسٹی میں ہو جائے۔ (آمین) ''کچن اور آپ'' میں جھانکا تو وہاں عاصمہ یامین ملک کو کھڑے دیکھا، جن کے ہاتھوں میں ''السی کے لڈو۔ گڑ کے چاول۔ دال کا حلوہ اور گجریلا'' نظر آیا۔ منہ میں پانی ہی آ گیا۔ پیاری بہن کسی ایک کی ترکیب ہی لکھ دیتیں۔ ہی ہی ہی ''نامے میرے نام'' ڈیئر بشریٰ یامین ملک، کرن نومبر میں جو نعت شائع ہوئی تھی وہ مجھ ناچیز نے ہی لکھی تھی آپ کی پسندیدگی کے لیے ڈھیروں جزاک اللہ خیر......اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے، صحت و تندرستی کے ساتھ (آمین) اچھا! ایک بات بتائیں آپ اور ''عاصمہ یامین ملک'' بہنیں ہیں؟ فہمیدہ جاوید صاحبہ کو بھی میرا سلام پہنچے۔ ''کرن کتاب'' بھی ہمیشہ کی طرح مفید معلومات سے سجی ملی۔ خاص کر آنسوؤں پہ فیچر پسند آیا مجھے۔ ''کچھ موتی چنے ہیں'' کے سب موتی ہی شاندار لگے لیکن ''عابدہ غوری'' کی پسند ''ارتقاء'' از مستنصر حسین تارڑ ''چترال سے داستان'' سب موتیوں سے سبقت لے گیا۔

ج: زرتاشیہ جی! ''کرن'' کو پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ بے شک ''کرونا'' اللہ تعالیٰ کا عذاب لگتا ہے۔ جو پوری دنیا پر نازل ہے شکر ہے کے پاکستان پر اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہے۔ ہمیں اپنے قارئین کی پسندیدگی کا اندازہ ہے اس لیے مشکل حالت میں بھی ڈائجسٹ کی اشاعت جاری رکھی۔

شہرین اسلم ......چوک شاھدرہ بہاولپور

ٹائٹل بہت پسند آیا۔ نازنین الطاف صاحبہ کی باتیں اچھی لگیں۔ انعم فیاض کے انٹرویو کے لیے تھنکیس شاہین جی پلیز، سجل، سارہ اینڈ عمران عباس، دانش تیمور کے انٹرویو کی فرمائش پوری کر دیں پلیز اور ہاں ایف ایم ون زیرو ون کے آر۔ جے عدیل شاہد کا انٹرویو شائع کر دیں

پلیز، ''مقابل ہے آئینہ'' میں گڑیا راجپوت کے جوابات پسند آئے ہمیں بھی شرکت کرنی ہے پلیز ضرور شائع کیجیے گا۔ فائزہ بھٹی کے کزنز کی شادی کو بہت انجوائے کیا۔ فائزہ جی، منگنی بہت بہت مبارک۔ پتا ہے کیا مجھے کچھ زیادہ خوشی ہوئی کیونکہ آپ پاک آرمی کے نوجوان سے منسوب ہیں آئی لو پاک آرمی۔ آپ کی شادی کے بعد پہلا سلیوٹ ان کی سسٹر کی طرف سے کیجیے گا۔ یاد رکھیے گا فائزہ جی۔ بالآخر ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' اختتام پذیر ہوا مگر جیسا سوچا تھا ویسا نہیں ہوا اختتام۔ خزینہ کو پتا ہونا چاہیے تھا اپنے بیٹے کے بارے میں۔ جہانداد کو سرے سے غائب ہی کر دیا خیر جو ہوا اچھا ہوا۔ ''کنارہ خواب جو'' فرح جی کیا کہوں میں آپ کی تعریف میں اللہ پاک آپ کو ترقی دے اسی طرح ہمارے لیے ناولز لکھتی رہیں، منعم ملک صاحبہ قسم سے آپ نے تو رلا دیا اچھا میسج دیا آپ نے آج کی نوجوان نسل کو یوسف کی موت کا منظر پڑھا نہیں جا رہا تھا آنسوؤں کی وجہ سے بہت دکھ ہوا پڑھ کر۔

ج: شہرین جی! ''کرن'' کی پسندیدگی کے لیے ہم آپ کے شکرگزار ہیں۔ امید ہے کہ یہ آپ کا آخری خط نہیں ہوگا۔ آپ باقاعدگی سے اس محفل میں شرکت کریں گی، آپ کی فرمائش ہم شاھین رشید تک پہنچا دیں گے لیکن کچھ اداکارا اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ وہ انٹرویو کے لیے ٹائم نہیں دیتے۔

فہمیدہ جاوید......ملتان

دسمبر 2020ء کا سرورق بہت ہی پسند آیا پورے 10 میں سے 10 نمبر دوں گی۔ مجھے دلہن والے سرورق زیادہ پسند ہیں۔ سدرہ جبار کا میک اپ، ڈریس اور بالوں کا انداز واہ دیکھتی رہوں دل کر رہا ہے۔ نزہت جبیں کی بیٹی کی شادی کا احوال اچھا لگا۔ ''مقابل ہے آئینہ'' کے سوالات بھی اچھے تھے۔ (مجھے بھی کرن کے کچن اور آئینہ کے سوالات میں جگہ دینا کہ دلچسپ لکھنے کی کوشش کی ہے) ''دامن سحاب'' کا آغاز اچھا لگا مکمل امید ہے کہ یہ میرا پسندیدہ ناول بنے کہ مہوش کی تحریریں بھی مجھے پسند ہیں۔ آسیہ جی کا ناول بھی ٹھیک ہے ہیروئن اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہی ہے دولت اور مرتبے کو سب کچھ سمجھ کر جب کہ دولت اچھی زندگی کی ضمانت نہیں۔ فرح بخاری کے ناول کو 10 میں سے 9 اور مصباح کے ناول کو 10 میں سے 10 نمبر دوں گی۔ ''جو گاہک پھول جیسا ہو'' بھی ٹھیک تھا سدرہ المنتہیٰ اپنے انداز میں آئیں جبکہ افسانے مکمل نہیں پڑھے شمائلہ دالعبار کا افسانہ پسند آیا اور دوسرا اور تیسرا بھی اچھا تھا۔ ''کرن کتاب'' بھی مفید رہی ہمارے لیے ہر لحاظ سے کرن کی سالگرہ آ رہی ہے تو میری خواہش ہے کہ کرن اور کرن کے شماروں سے مختلف ہو۔ تو آپ اداروں کے تینوں شماروں کے صرف سالگرہ نمبرز کو صرف 100 یا نہیں 150 روپے کا کر دیں یا بہنوں سے اس شمارے میں پوچھیں کہ ہم صرف سالگرہ نمبر کی قیمت 150 یا 100 کر دیں؟ جو جواب زیادہ ہوں تو ویسے عمل کر لیں۔ تمام بہنوں سے مخصوص سطور میں یہ تجویز کے متعلق پوچھیں اور پھر سالگرہ نمبرز میں ہوں زیادہ اور طویل مکمل ناول و ناولٹ + زیادہ افسانے + سالگرہ سے متعلق زیادہ سروے جس میں بہنوں کا سروے الگ اور رائٹرز کا سروے الگ ہو اور سوالات شماروں سے متعلق ہوں اور کسی بڑی رائٹر کا دھماکے دار طویل انٹرویو اور ادارے کی پورے مہینے کی کارکردگی کے جائزے پر مبنی مضمون اور ادارے کے لوگوں کا تعارف ہو سمجھ گئی ہوں گی۔ آپ ہمیں خطوط میں جواب دیتی ہیں بہت ہی اچھا لگتا ہے کہانیوں سے بھی زیادہ پتا نہیں کیوں۔ شاید اتنی طویل رفاقت ہے اور ہم سب کا بغیر دیکھے اور سنے ایک دوسرے سے پیار و انسیت کا رشتہ ان صفحات کے ذریعے۔ اللہ آپ سب کو ہمیشہ صحت کے ساتھ لمبی عمر دے اور ماں، جان، عزت اور رزق میں مزید برکت دے اور آپ جو رسالوں کی صورت میں معاشرے کی اصلاح میں حصہ ڈال رہے ہیں کہ یہ ایک صدقہ جاریہ ہے۔

ج: فہمیدہ جی! آپ نے جو تجاویز دی ہیں ان پر ہم غور کریں گے۔ قارئین اس بارے میں آپ کا خط پڑھ کر رائے دے سکتے ہیں۔ لیکن کچھ مسائل ہوتے ہیں جن کی وجہ سے کچھ تجاویز پر عمل کرنا مشکل ہوتا ہے۔

صدف ناز انصاری، مقدس ناز انصاری، طوبیٰ شوال انصاری.....ملتان

ہم پہلی مرتبہ ''کرن'' میں شمولیت کررہے ہیں۔ ویسے تقریباً ایک درجن سال سے اس ماہنامے سے تسلسل کے ساتھ منسلک ہیں یعنی کم وبیش 12 برسوں کا ساتھ ہے۔ سب سے پہلے ''کرن'' کے تمام ورکرز اور جملہ پڑھنے والوں کو نیا سال 2021ء بہت بہت مبارک ہو۔ خدا سے دعا ہے یہ سال 2020ء کی طرح نہ ہو کیونکہ جس طرح یہ سال ہندسوں کے لحاظ سے منفرد تھا یعنی دونوں ہندسے ریپیٹ تھے، اسی طرح کورونا وائرس + مہنگائی کے باعث بھی ناقابل فراموش بن گیا۔ خیر پہلے روزانہ کے اخبارات، پھر ہفتہ وار میگزینز اور اب ماہانہ ڈائجسٹوں کی کانٹ چھانٹ کے بعد صرف آپ کے ادارے کے تینوں رسالے خریدتے اور پڑھتے ہیں سوائے ''عمران ڈائجسٹ'' کے ویسے کیا اس میں خواتین بھی لکھتی ہیں؟ ہمیں کرن کی تمام خاص وعام قارئین بے حد پسند ہیں۔ خطوں میں ان کے احوال اور دلچسپیاں جان کر از حد مسرت ہوتی ہے (اب سب بہنیں سوچ میں پڑ گئی ہوں گی کہ کون کون خاص ہے؟) تاہم آپ سے گلہ ہے کہ خطوط میں قاری بہنوں نے جو سوال پوچھے ہوتے ہیں، اکثر ان کے جوابات نہیں دیے جاتے خاص کر ایسا خواتین وشعاع میں ہوتا ہے۔ اس طرف بھرپور توجہ دیا کریں۔ آپ کو اپنے شہر کا بھی تعارف کروانا تھا مگر پھر سوچا ہمارے شہر کے بارے میں تو آپ کو سب پتا ہوگا پھر بھی سب کی آسانی اور معلومات کے لیے ایک لائن میں بتا دیتے ہیں کہ سوہن حلوہ، گرمی، آم، مزارات اولیائے کرام، ملتان سلطان اور قدیم ہونا اس شہر باکمال کی پہچان ہیں۔ ویسے ملتان کا ایک اہم حوالہ ہماری اپنی ہفت رنگی ذات بھی ہے (آہم!) دوسری شکایت یہ کہ بعض اداکاروں اور دیگر شخصیات کے انٹرویوز بہت جلد دوبارہ کرلیے جاتے ہیں جبکہ قارئین اپنے پسندیدہ بندوں کی فرمائش کرکے تھک جاتے ہیں جسے محض نوٹ کرلیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے یاد آیا کہ آپ جو کہتی ہیں کہ مشورہ یا فرمائش نوٹ کرلی ہے تو کیا واقعی کسی رجسٹر پر نوٹ کرتی ہیں یا اپنے ذہن میں ریکارڈ کرلیتی ہیں؟ یہ مذاق نہیں بلکہ معصومانہ سوال ہے۔ ''کرن'' اور دونوں باقی رسالوں کے کافی سارے مستقل سلسلے ہیں جو بے حد اچھے اور باعث تفریح واصلاح تھے پر ختم کردیے گئے جن میں ''آواز دے کہاں ہے۔ دو کا پہاڑہ، پیا کا گھر پیارا لگے۔ آواز کی دنیا سے۔ بول کہ لب آزاد ہیں تیرے۔ خامشی کو زباں ملے۔ کوچہ ثقافت سے۔ ان روز وشب میں۔ شاعری سچ بولتی ہے۔ ماں جی۔ میرا بچپن میری گڑیا میرے جگنو، روشن حرف وہ سارے'' سمیت دوسرے بہت سے شامل تھے اور تو اور ''کرن'' کی اصل پہچان کرن کتاب کو پے درپے مراحل کے بعد قصہ پارینہ بنادیا گیا لہٰذا کرن کے آخر سے بھی اس کا ہیش ٹیگ الگ کردیں۔ اتنے سلسلے تو کرن میں ویسے ہی آجائیں گے جبکہ ''نہلے پہ دہلا'' اور ''مجھے یہ شعر پسند ہے'' جیسے عالیشان اور بنیادی مستقل سلسلے بھی منظر سے ہٹائے جا چکے ہیں۔

اداریے، حمد ونعت اور مستقل سلسلوں سے مستفید ہونے کے بعد آغا طلال سے ملاقات کی اور آغا مصطفیٰ حسن کی بھی۔ ساتھ ہی اپنی ہم نام بہن طوبیٰ ممتاز کا آئینے کے مقابل ہونا بھی ملاحظہ کرلیا۔ نزہت جبیں ضیاء کی بیٹی کی شادی کا احوال دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ مہوش افتخار کے نئے قسط وار ناول ''دامن سحاب'' کی پہلی قسط کا مطالعہ کیا۔ بعد ازاں تینوں قسط وار کہانیاں ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' کے شاندار اختتام کے بعد زیر مطالعہ آئیں۔ ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' کنار خواب جو اور کانچ سے سائبان'' تینوں اسٹوریز دل جمعی سے پڑھیں۔ سب کی اگلی اقساط کا طویل انتظار مہینہ بھر کرنا پڑے گا۔ ''جوگا یک پھولوں جیسا ہو'' شبانہ شوکت اور ''آخری کنارے پر'' سورہ المنتہیٰ دونوں کے ناولٹ زبردست رہے۔ نوشین فیاض کا مکمل ناول ''میرے چارہ گر'' بھی جاندار تھا۔ قانتہ رابعہ، فرح طاہر، شمائلہ دلعباد اور زارا ہنجراچاروں کہنہ مشق مصنفین کے افسانے قابل داد تھے۔ کرن کتاب کے تمام مضامین حسب معمول معلومات سے بھرپور تھے۔

ج: صدف، مقدس، طوبیٰ جی! ''کرن'' میں ہم بہ

دل سے آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہمیں گلہ ہے کہ بارہ سالوں میں آپ نے پہلی دفعہ شرکت کی۔ امید ہے کہ آئندہ شرکت کرتی رہیں گی۔ سب سے پہلے انٹرویوز نہ دینے کی وجہ صرف یہ ہے کہ کچھ اداکار اور اداکارائیں انٹرویو کے لیے ٹائم نہیں دیتیں۔ جس کے لیے ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں "کرن" پرانے سلسلے جو ختم کر دیے گئے اس کی وجہ آپ قارئین ہی ہیں جب آپ لوگ شرکت کرنے میں عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں تو ہم کو مجبوراً وہ سلسلے ختم کرنا پڑتے ہیں کہ یکسانیت سب کو اکتاہٹ کا شکار کر دیتی ہے۔

زرینہ خانم لغاری......مظفر گڑھ

ٹھوڑی پر ہاتھ ٹکا سمپل سی سوچتی آنکھوں والی حسینہ اچھی لگی۔ "ہوائیں رخ بدل گئیں" پر پہنچے اتنا خوب صورت اینڈ بہت پسند آیا ہمیں غزنی اور خزینہ کی بہت فکر تھی جانے اس کے حالات کیسے سلجھیں گے لیکن کتنی آسانی سے سارا مسئلہ حل ہو گیا۔ غزنی کو جازی کا بھی بتا دینا چاہیے تھا کہ جازی بڑی مما کے پاس رہے گا۔ ہنی تمہارے پاس ہے شہرینہ کے دل کی دھڑکنوں نے بڑی جلدی اور بروقت شور مچا دیا۔ واہ! ارسلہ بیگم ماں بننے جا رہی ہیں پھر تو اس کے نخرے اور بڑھ جائیں گے مہوش کو مزید زچ کرے گی خیر بھگتیں مہوش۔ آبص اور نادیہ میں جدائی ڈالنے کی مجرم ہیں سزا تو ملنی چاہیے۔ مشہور ناولز سے موتی چنے جائیں یہ کیا بات ہے؟ بھئی موتی تو موتی ہیں کہیں سے بھی چنے جا سکتے ہیں۔ میری کزن کا نام فوزیہ نذیر ہے کافی عرصہ پہلے "مقابل ہے آئینہ" لکھا تھا۔ میں نے بھی ایک کہانی رب راضی تو سب راضی لکھی تھی اس کا کیا بنا۔ کچن اور آپ بھی بھیجا تھا۔ "گڑیا راجپوت" کا "مقابل ہے آئینہ" پسند آیا اور ان کا اصلی نام کا بھی پتا چلا پہلے شک تو تھا یہ نک نیم ہوگا۔ خوب صورت جواب دیے ہیں ہماری گڑیا نے بھلے ان کا نام کچھ بھی ہمارے لیے تو وہ صرف گڑیا ہے۔

ج: زرینہ جی! خط لکھنے کا شکریہ۔ اصل میں کچھ موتی چنے ہیں سلسلہ یہی ہے کہ اس میں مشہور رائٹرز کے اقتباس شامل کیے جائیں۔ کہانی کے بارے میں "کرن" کے آفس میں فون کر کے معلوم کیجیے۔ فوزیہ نذیر کا "مقابل ہے آئینہ" ہمیں موصول نہیں ہوا۔ دوبارہ ارسال کیجیے۔

سحر وقاص راجپوت......لاہور

سال 2020ء کا آخری شمارہ خلاف معمول 10 تاریخ کو ملا سرورق بہت ہی خوب صورت تھا دلہن کا ڈریس بمعہ جیولری اور انداز سب کچھ ہی اعلیٰ تھا۔ اس کے بعد پہنچے فہرست پر تو سب سے پہلے "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" پڑھا۔ یہ ارسلہ تو اپنی سوچ سے بھی زیادہ لالچی نکلی آبص کی ہمت کی داد دیتی ہوں جو اسے برداشت کر رہا ہے۔ ادھر سکندر کی بے وقوفی پر حیرت ہوتی ہے کہ جو اس کی عزت، محبت کے قابل ہی نہیں تھی، اس کی خاطر روگ لگا بیٹھا ہے اریبہ بلاشبہ اس کی اچھی شریک حیات ثابت ہوگی۔ مصباح علی سید بڑی خوب صورتی سے "کانچ سے سائباں" کو ختمی مراحل تک لے آئیں مانا کہ ہائم نے غصے میں اسے طلاق دی پھر پشیمان بھی ہے منانے بھی آیا پھر یہ ردابہ کیوں انا کا مسئلہ بنا رہی ہے۔ خواہ مخواہ میں انا کے ہاتھوں اپنا گھر تباہ کر لیا شاید اسے معلوم نہ تھا کہ انا کی جنگ میں اکثر محبت ہار جاتی ہے۔ اب آخری قسط کا انتظار رہے گا۔ اب آتی ہوں میرے پسندیدہ ناولٹ کی طرف "کنار خواب جو" کتنی گھٹیا نکلی ثمامہ۔ جب تک سوار کنعان تک پہنچ نہیں گیا تب تک دل دھڑکتا رہا اور سانسیں اٹکی رہیں۔ اب سوار کے ماضی کا راز بھی کھول دیں کہ وہ کیوں اپنا گھر اور خاندان چھوڑ کر آیا ہے۔ یہ شازمہ بی بی آخر کرنا کیا چاہتی ہیں پہلے وقاص کو اپنی اداؤں کے جال میں پھنسایا۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے سب سے پہلے قانتہ رابعہ کا "علاج" پڑھا بالکل صحیح کہا انہوں نے کہ ماضی کی وہ یادیں انسان اپنی یادداشت سے ڈیلیٹ کر دے جو لمحہ بہ لمحہ اذیت دیتی ہیں۔ "چورنی" واہ کمال زارا جی مبارک باد یہ مائیں بھی نا اولاد کو ہر مشکل، مصیبت سے بچانے کے لیے کتنی مہربان رہتی ہیں۔ سجو نے اپنی اماں کی بات مانتے ہوئے اچھا ہی کیا اگر بھول چوک ہو جاتی تو ہمیشہ کے لیے بھائی کی نظر میں

گر جاتی۔ ویسے حیرت ہے ایسی بھابھیوں پر میری بھی نند ہے اور اس کے چار شرارتی بچے بڑا تو اتنا شرارتی کہ اللہ کی پناہ مگر مابدولت کبھی ان کے آنے پر اعتراض نہیں کیا بلکہ اگر زیادہ دن گزر جائیں تو خود فون کھڑکا دیتی ہوں کہ آؤ بھئی کتنے دن ہو گئے ملاقات کو۔ میں کہتی ہوں کہ بھائی کا گھر تو بہن کا وہ میکا ہوتا ہے جو ماں باپ کے دنیا سے جانے کے بعد بھی قائم رہتا ہے، بابل ہمارے معاشرے کی صحیح عکاسی کی کہ بیٹیوں کو باہر کی دنیا کو زیادہ پتا ہوتا ہے لڑکیاں نہیں جانتیں مگر والدین تو جانتے ہوتے ہیں پھر چوہدری صاحب کو بیٹے پر اندھا بھروسا کرنے کا نتیجہ بڑھاپے میں ملا۔ ''ہائے میری ساس'' واقعی بڑے بزرگوں سے تو گھر میں برکت ہوتی ہے رونق ہوتی ہے بنا کہے کتنی ہی مشکلیں مسائل اپنے تجربے کی بنا پر حل کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ میری ساس کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے آمین۔ وہ بھی بنا کہے میری بہت سارے کاموں میں مدد کر دیتی تھیں۔ ''وہ ایک اردو داں'' ارے بھئی واہ کمال ہو گیا۔ زینب کی اتنی شستہ اردو نے تو مجھے بھی ایک لمحے کو حیران کر دیا چلو بھئی مبارک باد قبول کرو زین سے شادی کی کہ جسے چاہا اور دعاؤں میں مانگا اللہ تعالیٰ نے قسمت میں لکھ بھی دیا۔ ''ملن سے ذرا پہلے'' آج کل تو رواج ہی بن گیا ہے کہ لڑکی دیکھنے جانا کھانے سے اچھی طرح انصاف کرنا اور گھر آ کر کسی چھوٹی سی بات کو لے کر لڑکی کو ریجیکٹ کر دینا اللہ ہی ہدایت دے ایسی ماؤں کو۔ ''فسانہ حقیقت'' بالکل صحیح کہا لکھاری نے کہانیوں کے ہیروز سے متاثر خواتین کی اپنی زندگی کا ہیرو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب آتے ہیں ناولٹ کی طرف تو جناب شبانہ شوکت صاحبہ نے خوب لکھا ہمارے یہاں اکثر ہی ایسا ہوتا ہے کہ دولت کمانے کی دوڑ میں بے چارے دیہاتی غریبوں کے ساتھ یہی کچھ کر رہے ہیں۔ سدرۃ المنتہیٰ کا ناولٹ بھی اچھا لگا ''آخری کنارے پر'' زندگی میں کیسے کیسے اتفاقات ہوتے ہیں کیسا اتفاق تھا کہ فرحینہ زندہ بچ گئی اور ولید بھی مگر دو الگ الگ جگہوں پر زندگی گزارتے رہے بے شک ''جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے'' مہر و شہمیر کی محبت پر شک کو جگہ دے کر ذکریا کو دل میں بسا بیٹھی۔ فرحینہ کو اس کے صبر کا صلہ شہمیر کے ساتھ کا ملا۔ واقعی وہ رشتوں میں اعتدال رکھ سکتا تھا۔ پروفیسر معیز بالکل ٹھیک کہتے تھے کہ اکیلے زندگی نہیں گزرتی زندگی بہت لمبی ہے اور تنہا نہیں گزر سکتی۔ ''کرن کتاب'' لازوال دسترخوان میں پٹیالہ چکن ٹرائی کروں گی۔ ''کچھ موتی چنے ہیں'' فوزیہ ثمر بٹ کا موتی سب سے خوب صورت لگا۔ فائزہ، آپ کا افسانہ بہت اچھا اللہ پاک اور کامیابیاں دے آمین۔ اپنی منگنی کی مبارک باد قبول کرو اور شادی کی مٹھائی ضرور کھلانا سب قاری بہنوں کا سلام دعاؤں میں یاد رکھیے گا اور سب کو ایڈوانس نیا سال مبارک ہو۔

ج: سحر وقاص جی! ''کرن'' ہم کہانیاں شائع کرتے وقت اس چیز کا خیال رکھتے ہیں کہ ان کو پڑھ کر سبق بھی حاصل ہو اور کہانی میں دلچسپی اور مزا بھی قائم رہے اور کہانی ہمارے معاشرے کی عکاسی کرتی ہو۔ ڈائریکٹ نصیحت پڑھنے والے کو بور کر دیتی ہے۔

ساجدہ جاوید سندیلو......ٹنڈو محمد خان

نیا سال آیا ہے نئے غم ملیں گے
ستمگر بہت، باوفا کم ملیں گے

سب کرن کے دیوانوں کو میری طرف سے نیا سال مبارک۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ٹائٹل اے ون تھا۔ حمد و نعت سے دل کو ٹھنڈک ملی۔ مہوش افتخار کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ہماری بہت ہی پیاری پرانی رائٹر اس بار کرن میں چھا گئیں۔ پہلی قسط شاندار لگی دوسری کا بے چینی سے انتظار ہے۔ ''آخری کنارے پر'' سدرۃ المنتہیٰ آپی آپ کا بھی کیا کہنا ویلڈن۔ اگر افسانے کی بات ہو جائے تو میں تو ایوارڈ شائلہ دالعباد کے ''بابل'' کو دوں گی واقعی میں بچیاں بہت سمجھ دار ہوتی ہیں آج کے اس جدید دور میں صرف بیٹے نہیں بیٹی کا بھی پورا حق ہے کہ وہ اپنے سپنے ساہو کار کریں۔ (چورنی) زارا ہنجرہ کا افسانہ بھی بیسٹ تھا۔ بڑے بزرگوں کی باتوں میں ایک سبق ہوتا ہے۔ (ملن سے ذرا پہلے) فرح طاہر جی کافی زبردست لکھا آپ نے بار بار لڑکی ریجیکٹ ہونے پر ایسا تو ردعمل لڑکی کا ہوتا ہے۔ مگر سسرال میں اپنی ساس کا دل جیت لینا بھی

ایک فن ہے۔ ''ہائے میری ساس'' صبا بہار نے بھی ڈائن
مطلب ساس کی نوک جھوک پر اچھا خاصا لکھ ڈالا یہ غلط
ہے کہ ساس بہو کی دشمن ہوتی۔ بہو کو بھی وہ صحیح راستہ بتاتی
ہے مگر بہوؤں کی یہ سوچ معاشرے میں پھیل چکی ہے کہ
ساس کبھی ماں نہیں بن سکتی ہاں جہاں جہالت ہے۔ وہاں
ساس ڈائن بھی ہوتی ہے۔ یہ بھی درست ہے، ہماری
ساس بہت اچھی تھی، اللہ پاک انہیں جنت الفردوس میں
جگہ دیں آمین۔ ''فسانہ حقیقت'' سمیرا سرفراز کا کچھ سمجھ
میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ سوری سمیرا جی۔
''کنار خواب جو، کانچ سے سائباں، میرے ہم نفس'' تو
ہیں ہی بیسٹ ''مقابل ہے آئینہ'' میں اس بار طوبیٰ ممتاز
جو خط اب نہیں لکھتی کے جوابات کچھ کم نہیں تھے مطلب
30 سوال و جواب میں 29 جواب۔ یار میں بھی تو راہوں
میں بیٹھی ہوں کہ کب میری باری آئے اور میں ''مقابل
ہے آئینہ'' میں شامل ہو جاؤں۔ میرے آنے سے پہلے
یہ سلسلہ ختم نا ہو جائے اور 30 سوالوں میں سے صرف دو
ہی نہ رہ جائیں پلیز، نئے سال میں یہ سلسلہ بند مت کر
دینا۔ ابھی تو بہت ساری فرینڈز نے آئینے کو کھرا کھرا
جواب دینا ہے۔ انٹرویو میں صرف آغا مصطفیٰ حسن کا پڑھا
اچھا لگا آغا طلال سے ملاقات خاص پسند نہیں آئی۔
''کچن اور آپ'' عاصمہ یامین ملک کی ماں کا پیار ''اندھی
ہو جائیں گی'' پڑھ کر ہنسی نکل گئی۔ تو عاصمہ امی جی سے کہہ
دیتیں چشمہ لگ جائے مگر کرن ضرور پڑھوں گی۔ ''میری
طرح میں بھی نظر کی کمزوری کی وجہ سے عینک یوز کرتی
ہوں بقول میرے ہزبینڈ کے اور پڑھو ڈائجسٹ۔ اف
پھٹی ایڑیوں کا تو پوچھو ہی مت۔ سردیاں کیا آئیں پیروں
کی تو رونق چلی گئی مگر یار یہ چیزیں مجھے بنا کر کون دے گا۔
''فلورل جیولری'' من کو بھا گئی۔ پتا نہیں کس کے من کو،
ہمیں جیولری خاص پسند نہیں۔ تو ہم لیتے بھی نہیں۔ ''کچھ
موتی چنے ہیں'' میں سب کے موتی چرا کر اپنے نئے
دوپٹے میں لگا دیے (ہاہاہا)۔ یار میں چور نہیں ہوں مگر
اتنے اچھے موتی تو چھپا لیتی ہوں کبھی کبھی چوری کر کے۔
''کرن کرن خوشبو'' کی ہر طرف خوشبو میرے گھر میں معطر
کر گئی۔ مدیرہ آپی آپ سے ایک ریکویسٹ ہے۔ کوئی
اسلامی تعلیم کا سلسلہ شروع کریں جس میں قاری بہنیں
سوال کریں اور کوئی مفتی صاحب اس کا جواب دیں۔ اس
بار سارا کرن ہی اے ون تھا۔

ج: ساجدہ جی! ہم صرف وہ سلسلے ختم کرتے ہی
جس میں قارئین حصہ لینا بند کر دیتے ہیں۔ جب تک
قارئین حصہ لیں گے ''مقابل ہے آئینہ'' شامل ہوتا رہے
گا۔ اسلامی تعلیم کے سلسلے کا جو مشورہ دیا ہے آپ نے ہم
اس پر غور کریں گے۔

اقراء سرور......ڈی جی خان

سب سے پہلے کرن پر تبصرہ کیونکہ یہ کرن کا حق ہے
آج پندرہ دسمبر ہے لیکن میں نے ابھی تک شعاع میں
کرن کا صرف اشتہار دیکھا ہے سو دسمبر کے شمارے پر نہیں
بلکہ نومبر کے شمارے پر تبصرہ ہو جائے۔ افسانوں میں
نمبر ون ام اقصیٰ کا ''اژدھے'' لگا اس کے بعد میں عبیر
فاطمہ عندلیب زہرا نے حقیقت لکھی ہے سو اچھا لگا۔
عندلیب پیاری! اب افسانوں کے بعد ناولٹ بھی لکھو
ہمیں انتظار رہے گا۔ باقی تینوں افسانے بالکل فضول
تھے۔ اس سے اچھے تو میرے افسانے ہیں خیر......
(معذرت)۔ نگہت جی نے سرشار کر دیا شہرینہ اور حمزہ کو ملا
کر۔ خوشی سے چیخ ہی نکل گئی میری (ہاہاہا) ''کنار خواب
جو'' بہت پتے کی بات معلوم ہوئی ہے مجھ۔ میرا اندازہ
ہے (ہو سکتا ہے غلط ہو) کہ شازمہ کی ہیلپ کرنے والا
عبدل ہی دراصل سوار علی ہے ماضی میں کسی وجہ سے عبدل
کے ہاتھوں شازمہ قتل ہوئی ہو گی جس کی وجہ سے اس کے
گھر والوں نے اسے نکال دیا ہو گا۔ جس جس کو میرا اندازہ
ٹھیک لگے بتائے۔ فرح بخاری کیا تعریف کروں الفاظ ہی
نہیں مل رہے دل کی بات لکھ دیتی ہیں آپ وہ بھی اتنی
گہرائی سے کہ قاری حیران رہ جائے کہ اس بندی
کو میرے دل کا حال بھی معلوم ہے بس دل کر رہا ہے اس
ناول کا اینڈ نہ ہو۔ (ہاہاہا) کنعان نام بھی بہت اچھا لگا۔
خود کنعان بھی ''جھانسی کی رانی'' کیا بیٹیوں کی ماں صرف
بن سکتی ہے گھر کی نوکرانی......؟ یہ کیسا المیہ ہے......بیٹیاں
زیادہ پیدا کرنا گناہ بنا کر بدقسمتی سے اس گناہ (ناکردہ) کو

پھر دھڑلے سے عورت کے کھاتے میں کیوں ڈال دیا جاتا ہے بات ہے سوچنے کی، سمجھ کر اس مسئلے کو حل کرنے کی، حل کر کے ختم کرنے کی "بچھڑنا بھی ضروری تھا" اس کے لیے اتنا کہوں گی کیا اس کہانی کو شائع کرنا ضروری تھا (معذرت) بالکل ہی فضول کہانی "کانچ سے سائباں" مصباح جی! جزاک اللہ! معاشرے کی تلخ حقیقت لکھ دی گئی۔ غصہ دشمن۔ بہت دکھ ہوا ہائم کے طلاق دینے پر۔ آسیہ مرزا یقیناً بہت اچھا لکھتی ہیں ان کا ناول مجھ سے پہلے نازیہ اور ثانیہ پڑھ کر مجھے سنا بھی دیتی ہیں اس قسط کو پڑھ کر یہی لگتا ہے کہ نادیہ آبص کو نہیں ملے گی۔ سکندر کی اریبہ، ارسلہ کا کھونٹا آبص سے بندھ گیا اور نادیہ شاہ کو حمزہ لے کر ہی جائے گا۔ نیلوفر کی نند، نیا کردار بہت ہنسایا لگتا ہے اینڈ ہونے والا ہے۔ آخر میں منعم ملک جی! کیا بہترین لکھا آپ نے اب تو آپ سے ملنے کی ہٹرک دل میں پیدا ہو گئی ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے منعم ڈی جی خان میں ہو اور اقراء سروران سے مل نہ سکے۔

"نامے میرے نام" جو تھے بہت خوب تھے اور اس بار زیادہ بھی تھے۔ سب پہلے اس بندے کو مبارک باد جن کی ہماری فائزہ بھٹی سے منگنی ہو گئی ہے (ہاہاہا) ماشاء اللہ فائزہ بہت بہت مبارک۔ میں آؤں گی تمہاری شادی پر میں نہیں تو میری دعائیں ضرور تم سے ملنے آئیں گی۔ تمہاری دعائیں ہیں دیکھو! میں گم نہیں ہوئی۔ (ہاہاہا) تم بھی شادی کے بعد گم نہ ہو جانا۔ بس کرن میں تمہاری تحریر کا انتظار ہے باتیں تو بہت کرنی ہے تم سے یہ تبسم اور ماہا کہاں گم ہیں دونوں پلیز! واپس آجائیں ہم سب بہنیں آپ دونوں کے لیے بہت پریشان ہیں۔ عاصمہ اور بشریٰ دونوں کا خط لاجواب تھا اور عاصمہ لکی یار! تمہارے تو دو خط تھے۔ واہ بھئی واہ...... اقصیٰ شہزاد دعا کے لیے جزاک اللہ۔ ثناء شہزاد آپ کا بھی بہت بہت شکریہ کیا آپ دونوں سسٹرز ہیں۔ شکیلہ سہیل حسن مجھے آپ کا "مقابل ہے آئینہ" بہت پسند آیا تھا اللہ آپ دونوں کی یہ خوب صورت جوڑی سدا سکھی اور سلامت رکھے، آمین۔ گڑیا راجپوت تم میری دعاؤں تک رسائی کر گئی ہو۔ اللہ کرے بہت جلد میری آنکھیں تمہاری تحریر پڑھیں اور تمہاری آنکھیں میری...... آمین بولو یار اور مسکرا دو۔ بہت لکی ہو تمہاری کوئی آنٹی تمہیں خط پوسٹ کر دیتی ہے۔ اگر کسی کو میری کوئی بات بری لگی ہو تو معذرت تمام بہنوں سے دعاؤں کی درخواست؟ آخر میں اپنا ایک دکھ شیئر کرنا چاہوں گی۔ 23 نومبر کو میری کزن کی بیٹی صغراں کینسر سے جنگ لڑتے ہوئے زندگی کی بازی ہار گئی اٹھارہ برس کی معصوم صغراں ...... !!! آپ سب سے درخواست ہے کہ صغراں کی بخشش کے لیے دعا کر دیجیے۔

ج: اقراء جی! اللہ تعالیٰ صغراں بیٹی کو جنت میں اعلا مقام عطا فرمائے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ جو کہانیاں آپ کو پسند آئیں ان کے لیے شکریہ اور جو پسند نہیں آئیں ان کے لیے معذرت خواہ ہیں۔

مسکان نور......لاڑکانہ

اس بار کرن بہت انتظار کے بعد دس تاریخ کو ملا۔ جتنا پڑھا اتنا تبصرہ حاضر ہے۔ ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ اداریہ توجہ سے پڑھا۔ حمد و نعت بہت پیاری تھی۔ آغا مصطفیٰ کا انٹرویو پسند آیا۔ آپی۔ آپ کب رائٹرز کے انٹرویو کر رہی ہیں۔ پلیز آپی جان۔ پہلے ایمل رضا پھر سدرۃ المنتہیٰ کا انٹرویو دیجیے گا۔ پلیز "مقابل ہے آئینہ" دوست نے اچھے جواب دیے۔ ویری گڈ، پیاری طوبیٰ شادی مبارک ہو یاد آیا فائزہ بھٹی تمہارا شادی مبارک ہو پڑھ کر بہت بہت انجوائے کیا تھا۔ اب تمہارے گھر میں یا خاندان میں شادی ہو تو اس کا احوال ضرور لکھنا۔ جوریہ آپی ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ "دامن سحاب" شروعات تو بہت اچھی ہیں۔ لگتا ہے کہانی آگے بہت زبردست ہو گی۔ "میرے ہم نفس" اف ارسلہ آنٹی ہی ہی ہی ارے ارے ناراض نہ ہوا ایسے ہی منہ سے نکل گیا تھا۔ ہاہاہا سچ میں بہت ناشکری ہیں آپ "کنار خواب جو" مجھے ثمامہ اور شازمہ دونوں کردار پسند نہیں ہیں۔ دونوں ہی خود غرض ہیں۔ "چورنی" اف کوئی اتنا کم ظرف بھی ہوتا ہے۔ جیسی سجو کی بھابھی تھی۔ احسان ماننے کے بجائے وہ اس کا برا کرنے چلی تھی۔ لیکن خود بری بن گئی۔ یہ ہوئی نہ بات۔ "آخری کنارے پر" سدرہ آپی نے بہت بہت اچھا لکھا۔ "بابل" بہت زیادہ پسند آئی۔ سب سے بیسٹ افسانہ تھا۔ "کانچ سے سائباں" ردابہ نے خود اپنے ساتھ ظلم کیا۔ انا عورت پر اچھی بالکل نہیں لگتی۔ آج میں نے یہ

جانا۔ آخری قسط کا بہت انتظار ہے۔ "علاج" پسند آئی ہائے میری ساس صدف روئی بھی تو اپنا فائدہ یاد کر کے افسوس "فسانہ حیات" زبردست لگی۔ "کرن کرن خوشبو" اس بار بہت زیادہ پسند آئی۔ "یادوں کے دریچے" سب کی غزل پسند آئی۔ "کچھ موتی چنے ہیں" سب کے زبردست تھے۔ مگر میری پیاری دوست فائزہ کا سب سے زیادہ پسند آیا۔ "کرن کتاب" میں چقندر کے فوائد پڑھے۔ پھر آنسو نہ روکیں۔ حیرت ہوئی تھی پڑھ کر۔ بہت شکریہ اتنی معلومات دینے کا۔ "کچن اور آپ" واہ واہ۔ میری دوست عاصمہ تم تو اچھا گئیں "نامے میرے نام" بس اتنے خط پر میری دوستوں کے پسند آئے۔ بشریٰ عاصمہ یامین۔ ثریا راجپوت، کیا آپ میری دوست بنیں گی۔ شکیلہ سہیل، فائزہ بھٹی میری دعا ہیں کہ اللہ آپ دونوں کو ہزاروں خوشیاں نصیب کریں آمین۔ شکیلہ اب جلدی سے واپس آجاؤ تمہارے بنا یہ محفل اداس ہے اور میں بھی میری پیاری شکیلہ ہمیشہ خوش رہو۔ آمین

ج: مسکان جی! رائٹرز کے انٹرویو کے لیے ہم کام کر رہے ہیں۔ جیسے ہی مناسب موقع ہوگا ہم ان شاء اللہ یہ سلسلہ شروع کریں گے۔

آمنہ، واعظہ، فاطمہ شاہد......اوکاڑہ

میری والدہ خواتین، شعاع اور کرن کی پچیس سال سے خاموش قاری ہے، ہم تینوں بہنیں بچپن سے ہی ان رسائل سے آشنا ہے۔ نا صرف ہم میرے ماموں بھی ان کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ میں اس وقت بی ایس سی کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ واعظہ انٹر اور فاطمہ مڈل کی اور ہم آپ کا رسالہ شوق سے پڑھتے ہیں۔ مگر خط لکھنے کی ہمت صرف میں نے کی۔ اب آتے ہیں رائے کی جانب سب سے پہلے بات کرتے ہیں "کنار خواب جو" میری بہنوں کا پسندیدہ ناول بہت شوق سے پڑھتی ہیں فرح اتنے اچھے ناول کے لیے دل کی گہرائیوں سے شکریہ۔ "ہوائیں رخ بدل گئیں" اچھی تحریر تھی امید ہے مہوش افتخار کا ناول "دامن سحاب" پسند آئے گا۔ "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" وقت کے ساتھ ساتھ اپنے رنگ جمارہا ہے۔ انٹرویو میں نازمین الطاف کو پڑھا کافی باہمت خاتون ہیں بہت کچھ سیکھنے کو ملا انعم فیاض بس ٹھیک تھیں "جھانسی کی رانی" بھی بہت عمدہ تحریر تھی۔ "کانچ سے سائبان" میں آہستہ آہستہ ماضی پر سے پردے اٹھ رہے ہیں۔ ناول "سوز عشق" اگر تھوڑا سا واضح کر دیا جاتا تو اچھا تھا۔ تھوڑا نا مکمل لگا۔ منعم ملک کا "بالوشے" میری مما کو بہت پسند آیا تھا اور میں بھی یہ خواہش ظاہر کروں گی کہ رائٹرز کے بھی انٹرویو لیے جائیں۔ باقی سلسلے بھی اچھے ہیں خاص کر "مقابل ہے آئینہ" اس سلسلے میں ہم اپنی قاری بہنوں کے بارے میں کچھ کچھ جان لیتے ہیں "شادی مبارک ہو" کیا یہ کوئی نیا سلسلہ ہے۔ فائزہ بھٹی اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے آمین۔ منگنی کی مبارک۔ شکیلہ سہیل حسن آنے والی زندگی آپ کے لیے ڈھیروں ڈھیر خوشیاں لائے شادی مبارک اور ہاں شادی کے بعد کرن سے ناتا نہ توڑنا۔ فاطمہ ناز آپ بھی اچھے سے کھانے بنانے سیکھیں اللہ آپ پر بھی یہ وقت خیر سے لائے۔ قارئین کی ایک دوسرے کے لیے دوستی اور پیار دیکھ کر دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ سب کو اسی طرح ایک دوسرے سے ملائے رکھے۔ آپ سے ایک درخواست ہے کہ سمیرا حمید سے کوئی ناول لکھوائیں پلیز۔ اب مجھے اجازت نئے لکھنے والوں میری طرف سے آل دی بیسٹ اور اپنی ہر قاری بہن کے لیے میں دعا گو ہوں جو اپنے اپنے گھروں میں کسی نہ کسی طرح کی پریشانیوں کا شکار ہے۔ اللہ سب کے حق میں بہتر کرے آمین۔

ج: آمنہ، واعظہ اور فاطمہ شاہد! ہم آپ کو "نامے میرے نام" کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ امید ہے آپ باقاعدہ اس محفل میں شریک ہوں گی۔

عاصمہ شبیر......راولپنڈی

سب سے پہلے تو ڈھیروں سلام تمام پڑھنے والوں کو کرن پڑھتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ ہوش سنبھالتے ہی کرن کو اپنے آس پاس دیکھا۔ ہم کرن کی خاموش قاری ہیں۔ ہم میں بدولت میری مما عابدہ سلطانہ اور خالہ ساجدہ سلطانہ شامل ہیں۔ اب ہمت کر کے کاغذ، قلم سنبھالا اور بیٹھ گئے کرن میں خط

لکھنے۔ جب سے بہنوں کے خطوط پڑھنے شروع کیے ہیں۔ دل میں شوق پیدا ہو گیا ہے کہ میں بھی تبصرہ لکھوں۔ گو عبدالرافع کی مما بننے کے بعد ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ مگر کرن کی اپنی جگہ ہے۔ اب پڑھتے ہیں شمارے کی طرف۔ سرورق ہمیشہ کی طرح منفرد لگا۔ حمد و نعت سے دل کو منور کیا۔ آغا طلال اور آغا مصطفیٰ سے ملاقات اچھی لگی۔ "شادی مبارک ہو" میں نئے جوڑے کے نام ڈھیر ساری دعائیں اور نیک تمنائیں۔ ایک ساتھ سات افسانے اور سب ایک سے بڑھ کر ایک۔ سب سے پہلے زارا ابنجرا کا "چورنی" پڑھا۔ اچھا لگا۔ مطلب نکل جانے پر لوگ آنکھیں ماتھے پر رکھ لیتے ہیں۔ شمائلہ دلعباد کا "بابل" پڑھ کر دل اداس ہو گیا۔ آج بھی اکثر گھرانوں میں بیٹیوں سے زیادہ اہمیت بیٹوں کو دی جاتی ہے۔ بیٹوں کی اہمیت اپنی جگہ مگر ان کی وجہ سے بیٹیوں کی آنکھوں سے خواب تو نہ نوچ کر پھینکیں۔ پھر ہم بڑھے "ملن سے ذرا پہلے" کی طرف۔ گڈ۔ فرح طاہر سچ میں لڑکوں کی مائیں لڑکی دیکھنے جائیں تو اس کا ایسے معائنہ کرتی ہیں جیسے قربانی کے لیے جانور لینا ہو۔ اور آخر میں کھا پی کر انکار۔ کوئی تک ہے بھلا؟ قانتہ رابعہ کا "علاج" بھی اچھا لگا۔ پھر ہم بڑھے ہائے میری ساس کی طرف۔ بزرگوں کے جانے کے بعد ہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تو گھنی چھاؤں تھے ہماری۔ ناولٹ اس دفعہ دونوں ہی سو سو تھے۔ باقی رسالہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔

ج: عاصمہ جی! "کرن" میں آپ کو ہماری طرف سے خوش آمدید امید ہے کہ آئندہ بھی خط لکھیں گی۔ اگر قاری بہنیں ہمیں اپنی رائے سے آگاہ نہیں کریں گی تو ہمیں کیسے علم ہو گا کہ آپ سب کو "کرن" کی کہانیاں پسند آ رہی ہیں یا نہیں۔

گڑیا راجپوت...... جاتری شریف

چونکہ نومبر کا کرن 29 کو ملا تو میں نے سوچا نومبر اور دسمبر کا تبصرہ اکٹھا ہی کروں گی۔ دسمبر سے زیادہ نومبر کا سرورق پر سجا ٹائٹل پسند آیا۔ نازمین الطاف سے ملاقات اچھی رہی۔ "میری بھی سنیے" میں نہیں پڑھتی اس لیے "مقابل ہے آئینہ" گڑیا راجپوت (نومبر) اور طوبیٰ ممتاز (دسمبر) دونوں سے مل کر اچھا لگا۔ اینڈ تھینکس مجھے شامل کرنے کے لیے۔ "ہوائیں رخ بدل گئی" کا اینڈ ٹھیک تھا۔ نگہت عبداللہ اتنا مزے کا ناول لکھنے پر مبارکاں۔ "کنار خواب جو" ہائے اللہ یہ کیا سے کیا ہونے جا رہا ہے فرح بخاری سے ریکویسٹ ہے کنعان کے ساتھ برا مت کریں۔ سوار کی پراسراریت ختم کریں "کانچ سے سائبان" مصباح علی کیا عورت اتنی بے وقوف ہوتی ہے۔ ردابہ زیادہ ہی جذباتی ہو رہی ہے۔ ہائم کے حال پر رحم کرو۔ فلیش بیک عجیب بھیانک سا ہے۔ کیوٹ منہل ہر بار معصوم سے معصوم لگتی ہے "پھانسی کی رانی" صدف آصف اچھا سبق دیا "روپ کے شیدائی" سوری مجھے پسند نہیں آیا۔ "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" آسیہ مرزا جس دن ارسلہ نے منہ کی کھائی اس دن عقل پائی والا حساب ہونے والا ہے سمجھ جا بدتمیز، چالاک، لالچی، بدمزاج لڑکی۔ "میرے چارہ گر" نوشین فیاض کیا کمال کا ناول لکھا۔ اس سے پہلے بھی میں نے اس عنوان سے ایک ناول پڑھا ہے۔ وہ قسط وار تھا پلاٹ تو ذہن میں آ رہا ہے۔ رائٹر یاد نہیں آ رہی (کسی کو یاد ہے تو بتا دیں پلیز......) "جوگا بک پھولوں جیسا" شبانہ شوکت کا ہلکا پھلکا سا ناولٹ تھا۔ "آخری کنارے پر" ابھی پڑھا نہیں اس لیے تبصرے سے قاصر ہوں۔ نومبر دسمبر کے دونوں ڈائجسٹ میں قابل تعریف جو افسانہ لگا وہ "اژدھے" ہے۔ ام اقصیٰ میں نے آپ کو پہلی بار پڑھا۔ واقعی میں بیمار ذہنیت کے لوگ خود تو سکون سے جیتے نہیں دوسروں کا جینا بھی حرام کیے رکھتے ہیں۔ "کرن کتاب" ابھی دونوں کی نہیں پڑھی۔ "نامے میرے نام" بشریٰ یامین ملک بہت مزے کے خط لکھتی ہیں۔ ماریہ نذیر اتنا لمبا خط لکھتی ہیں گویا افسانہ ہو۔ ماریہ آپ میں مزاح کی حس موجود ہے مزاح پر افسانہ لکھو اور فوزیہ ثمر بٹ نے جب بھی کوئی ناول لکھا دیکھنا اس کا ہیرو "سڑو" ہو گا۔ غصہ مت کرو مذاق کر رہی تھی مجھے ڈاکٹر فریال، تبسم اور ہما کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ مجھے نبیلہ عزیز کے ناول بہت یاد آتے ہیں سنا ہے وہ بھی ڈنگہ کی رہنے والی ہیں تو تبسم اور ہما کیا خیال ہے دریافت ہی کر لو ہاہاہاہا...... اور ایک ٹکڑا سا مکمل ناول لکھوا لینا،

دعاؤں میں یاد رکھنا...... بائے۔

ج: گڑیا جی! خط لکھنے کا شکریہ آپ کو جو کہانیاں پسند نہیں آئیں اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔

گل رخ نوید...... کراچی

آپ کے رسالے میں پہلی دفعہ شرکت کر رہی ہوں۔ آپ کا رسالہ اپنی تعریف آپ ہے۔ تعریف کے لیے الفاظ کم ہے۔ کرن کا اپنا ہی اک منفرد انداز ہے۔ کرن میں سارے ہی سلسلے بہت ہی زبردست ہیں اگر مجبور کیا ہے خط لکھنے کے لیے تو وہ ہے "کنارے خواب جو" سلسلے وار ناول فرح بخاری کیا کہوں کچھ بھی کہنا مشکل ہے کیا رائٹر ہیں آپ کمال، کمال، کمال کی اور دوسرا ناول "بالوشے" منعم ملک کی تخلیق واہ پڑھ کر جو بے اختیار روئی ہوں شاید ہی کسی تحریر کو پڑھ کر روئی۔ اتنا شاندار ناول کے لیے مبارک باد۔ باقی مصباح علی سید کا "کانچ سے سائبان" بھی کافی اچھا جا رہا ہے۔

"میرے ہم نفس میرے ہم نوا" آسیہ مرزا کا شاندار ناول ہے لیکن جو اس میں سکندر ہیں نا وہ مومن کی کاپی لگتا ہے۔ "کرن کرن خوشبو" بھی اچھا ہے کچھ موتی چنے ہیں بھی زبردست ہے باقی رسالے میں کوئی کمی بھی نظر نہیں آتی۔ مگر پلیز ماورا حسین کا انٹرویو کریں۔ حرامانی کا بھی باقی تبصرہ اگلے ماہ ان شاء اللہ۔

ج: رخ جی! "کرن" کی محفل میں آپ کو خوش آمدید۔ قارئین بہنوں سے گزارش ہے کہ وہ ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہا کریں تا کہ ہمیں ان کی پسند اور نا پسند کا اندازہ ہو سکے۔

مریم خان ...... پھلروان، سرگودھا

نادرہ آپی! السلام علیکم خیریت ہے خیریت مطلوب ہے۔ "دامن سحاب" پر تبصرہ محفوظ ہے۔ "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" اچھی چل رہی ہے مگر اس میں میرے لیے ارسلہ کا رویہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ اچھا میں نے اکتوبر میں دو تین لائنوں کا خط لکھا تھا اس میں میں نے فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران، آمنہ رئیس، مریم فاطمہ جو گجرات سے ہیں ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے مجھے پیشگی مصنفہ کا لقب دے دیا پھر میں نے ان کی حوصلہ افزائی پر ایک افسانہ "نظر" کے نام سے بھیجا۔ پتا نہیں دونوں چیزیں ملی یا نہیں اگر مل گئیں تو پلیز مجھے بتائیں کہ میرا افسانہ شائع ہو سکتا ہے یا نہیں۔

ج: مریم جی! آپ کا افسانہ موصول ہو گیا ہے اس کے بارے میں "کرن" کے آفس میں فون کر کے معلوم کیجیے۔

ثانیہ بلال...... عالیوالہ

السلام علیکم کے بعد عرض کرتی ہوں کہ کرن میں نے ساگر کنارے کے لیے لینا شروع کیا تھا۔ اس سے پہلے میں صرف کرن کتاب پڑھتی تھی لیکن جب سے میں نے کرن لینا شروع کیا۔ کرن کتاب بند ہو گی۔ اب میں صرف "کنارہ خواب جو" کے لیے کرن لیتی ہوں۔ سوار علی کا راز اب کھول بھی دیں۔ کنعان پہلے مجھے اچھی لگتی تھی اب نہیں لگتی۔ "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" میں مجھے ارسلہ پر بہت غصہ ہے سکندر پر ترس آتا ہے اور اریبہ پر مجھے حیرت ہوتی ہے۔ کوئی لڑکی خود سے اقرار کیسے کر سکتی ہے پھر بھی سکندر کو، اس پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ "کانچ سے سائبان" بہت بور کر رہا ہے لیکن ہے بہت اچھا۔ "میری بھی سنیے" میں احمد بٹ کو انٹرویو کے لیے بلائیں۔ "ملاقات" میں مایا علی کو انٹرویو کے لیے بلائیں۔ صبور علی کو بھی انٹرویو کے لیے بلائیں۔ آپ کی عین نوازش ہو گی۔ (میں اس وقت کالج کے گراؤنڈ میں بیٹھی عائشہ سے خط لکھوا کر رہی ہوں) وہ خود تو نہیں پڑھتی لیکن اس کی امی پڑھتی ہیں۔ دمہ کے لیے کوئی اچھی سی دوا بتائیں۔ سب بہنوں سے گزارش ہے کہ میرے اور میری امی کے لیے دعا کریں کہ اللہ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے (آمین)۔

ثانیہ جی: اللہ تعالیٰ سے دعا ہے آپ کی امی کو صحت و تندرستی عطا فرمائے، آمین۔ آپ نے جو گزارش کی ہے جلد ہی پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

☆☆

کرن
کتاب

بیوٹی باکس

آپ کا کچن...... بالوں کا پارلر

ہم میں سے ہر کسی کو ایسے حالات سے گزرنا پڑتا ہے جب بجٹ کو بہت ٹائٹ رکھنا پڑتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو نہ چاہتے ہوئے ہوجاتی ہیں اور اکثر ہی ہوجاتی ہیں۔

ایسی صورت میں ہر خاتون اپنے مختلف اخراجات میں کمی کرتی ہے۔ ادھر اُدھر سے کٹوتی کرکے بجٹ کو متوازن کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان میں سے ایک زبردست کٹوتی مہنگے ہیئر کیئر پروڈکٹس کا ہے۔ ان کی جگہ آپ کے کچن میں موجود اشیا آسانی سے لے سکتے ہیں جو سستے بھی ہیں اور آزمودہ بھی۔ تو آیئے دیکھتے ہیں کہ آپ اپنے گھر میں ہیئر کیئر کے حوالے سے کیا کچھ تیار کرسکتی ہیں۔

سرکہ۔ پانی میں ملانے کے بعد یہ ایک بہترین دھونے والی چیز بن جاتا ہے۔ بالوں میں قدرتی تیل کی زیادتی ہوجائے تو یہ اسے دور کرتا ہے۔ یہ بالوں میں چمک پیدا کرتا ہے اور الجھے بالوں کو سلجھانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ کھوپڑی میں موجود قدرتی بیکٹیریا کی گروتھ میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کچھ ماہرین کا خیال ہے یہ خشکی میں بہت مفید ہے۔ سرکہ کیسا ہونا چاہیے...... اس کا انتخاب آپ کو کرنا ہے۔ آپ سرکہ سے بالوں کو واش کریں یا پھر ان کو بطور لیوان کنڈیشنر کے استعمال کریں۔ بہرصورت فائدہ ہوگا۔

کیلا۔ پژمردہ بالوں میں زندگی کی لہر دوڑا دیتا ہے۔ اسے زیتون کے تیل میں مکس کرکے پیسٹ بنالیں۔ بالوں میں شیمپو کرنے سے قبل اسے اچھی طرح بالوں میں لگالیں۔ بالوں میں اوپر سے نیچے تک کنگھا کریں۔ بیس منٹ سے ایک گھنٹہ تک اسے لگا رہنے دیں (ڈھکیں یا نہ ڈھکیں، یہ آپ کی مرضی ہے) بعد میں شیمپو کرکے بالوں کو اچھی طرح واش کرلیں۔ آپ دیکھیں گی کہ بالوں میں لچک پیدا ہوچکی ہوگی اور ان کی چمک میں بھی اضافہ ہوچکا ہوگا۔

انڈے۔ یہ بالوں کی چمک کو برقرار رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ الجھے بالوں کو سلجھانے کے کام بھی آتے ہیں۔ انڈے میں قدرتی چکنائی والے ایسڈ ہوتے ہیں جس سے دومنہ والے بالوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور بالوں کی بڑھوتری میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ انڈے کی زردی، زیتون کا تیل اور پانی ملاکر ایک گھریلو کنڈیشنر تیار کریں اور اسے ایک کنڈیشنر کے طور پر باقاعدگی سے استعمال کریں اور پانچ منٹ تک سیٹ ہونے کے لیے چھوڑ دیں۔ اگر آپ کے بال پہلے سے خشک ہیں تو پھر دس منٹ کا وقت دیں۔ اس کے بعد بالوں کو واش کرلیں۔

کیچپ۔ اسے تب استعمال کریں جب تازہ تازہ بالوں میں شیمپو کیا گیا ہو۔ سوئمنگ پول کے کیمیاوی پانی سے جو نقصان بالوں کو پہنچتا ہے، یہ اس کا ازالہ کردیتا ہے۔ بالوں میں لگانے کے بعد اوپر سے نیچے تک خوب اچھی طرح کنگھا کیا جائے...... اور بیس سے پینتالیس منٹ تک سیٹ ہونے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ اس کے بعد واش کرلیں۔ اور اپنے انداز میں بالوں کو سنواریں۔

لیموں کا رس۔ اسے پانی میں ملاکر استعمال کریں۔ یہ ہلکے براؤن اور بلونڈے بالوں کو چمک عطا کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا ہے۔ ایک کوارٹر کپ میں ایک کپ پانی ملاکر مکسچر بنالیں اور اسے کسی اسپرے بوتل میں ڈال دیں۔ جب بھی دھوپ میں نکلنا ہوتو اس کا اسپرے کرلیا کریں۔ اس کا استعمال بہرحال تواتر کے ساتھ نہیں کرنا چاہیے ورنہ بال خشک ہوجائیں گے۔

نام کا پہلا حروف...... شخصیت پر اس کے اثرات

ماہرین کہتے ہیں کہ نام کا پہلا حرف انسانی شخصیت کے سربستہ راز افشاں کر دیتا ہے اسی وجہ سے آپ کی دلچسپی کے لیے ہم انگریزی حروف تہجی کی خصوصیات بتا رہے ہیں۔ اس کی مدد سے نہ صرف آپ اپنی بلکہ دوسروں کی شخصیت کا تجزیہ بھی کر سکتے ہیں۔

"A"(1)

جن افراد کا نام A سے شروع ہوتا ہے، ایسے لوگ انفرادیت کے قائل ہوتے ہیں، ان کے اندر لیڈر بننے کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ ایسے افراد زیادہ تر شرمیلے ہوتے ہیں۔

"B"(2)

جن افراد کا نام B سے شروع ہوتا ہے، ایسے افراد دوسروں کے زیر نگرانی کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ ان کی اپنی شخصیت نہیں ہوتی کیونکہ یہ لوگوں سے دور رہتے ہیں اور اپنے خول میں ہی بند رہنا پسند کرتے ہیں۔

"C"(3)

اس حرف سے محض انگریزوں کے نام ہی شروع ہوتے ہیں، یہ کسی فرد کی محدود صلاحیتوں کو ظاہر کرتا ہے۔

"D"(4)

ایسے لوگ بہت جوشیلے اور ضدی ہوتے ہیں، اپنی راہ میں آنے والی رکاوٹوں سے گھبرا جاتے ہیں۔

"E"(5)

یہ افراد زندگی اور جوش سے بھرپور ہوتے ہیں۔ ضدی ہونے کے ساتھ غصیلہ مزاج رکھتے ہیں۔

"F"(6)

جن افراد کا نام F سے شروع ہوگا، وہ اداکاری کی فیلڈ میں آنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ محض زبانی عدل و انصاف کے دعوے دار ہوتے ہیں، عملی طور پر اس پر عمل نہیں کرتے۔

"G"(7)

جن افراد کا نام G سے شروع ہوتا ہے، وہ اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ پراعتماد ظاہر کرتے ہیں۔ ہمدرد اور خیر خواہی کے جذبے سے مالا مال ہوتے ہیں۔ زیادہ لوگوں سے ملنے سے گھبراتے ہیں۔

"H"(8)

ایسے افراد یا تو بہت کامیاب ہوتے ہیں یا بہت ناکام۔ انہیں رہنمائی کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

"I"(9)

ایسے لوگ تحکم مزاج اور غصیلے ہوتے ہیں، انہیں دوسروں پر اپنی مرضی مسلط کرنے کی عادت ہوتی ہے۔

"J"(10)

ایسے افراد ثقافت و رسم رواج کے صحیح علمبردار ہوتے ہیں۔ ان کے اندر مقناطیسی کشش پائی جاتی ہے۔

"K"(11)

ایسے افراد ضرورت سے زیادہ پراعتماد ہوتے ہیں۔ اس لیے انہیں اوور کانفیڈنٹ کہا جاتا ہے۔ یہ بہت زیادہ "رومان پسند" ہوتے ہیں۔

"L"(12)

ایسے لوگوں میں خود اعتمادی کا فقدان ہوتا ہے۔ ان کا حلقۂ احباب بہت محدود ہوتا ہے۔

"M"(13)

یہ افراد دوسروں کے بہت ہمدرد اور خیر خواہ ہونے کے ساتھ بہت سیدھے سادے ہوتے ہیں۔

"N"(14)

ایسے افراد محنت سے جی نہیں چراتے۔ سادہ طبیعت اور بلند حوصلے کے مالک ہوتے ہیں۔

"O"(15)

ایسے افراد میں جذباتی پختگی نہیں ہوتی۔ ترقی کرنے کا جذبہ بھی کم ہوتا ہے۔ ایسے افراد محنتی اور اچھے حاکم ثابت ہوتے ہیں۔

"P"(16)

ایسے افراد کھلے ذہن کے مالک ہوتے ہیں۔ وسیع النظری ان کے مزاج کا خاصہ ہے۔

"Q"(17)

ایسے افراد دوسروں کے ہمدرد اور بہت زیادہ محنتی ہوتے ہیں اور مشکلات سے نہیں گھبراتے۔

"R"(18)

R انگریزی حروف تہجی میں طاقت ور حروف مانا جاتا ہے۔ یہ افراد ہر فن مولا ہوتے ہیں، خوش اخلاق اور با ادب ہوتے ہیں۔

"S"(19)

یہ افراد نہایت پرکشش شخصیت کے مالک ہوتے ہیں، دوسروں کے ہمدرد ہوتے ہیں۔ محنتی اور حوصلہ مند ہوتے ہیں۔

"T"(20)

یہ افراد نہ صرف اچھی صفات بلکہ نہایت اعلا صلاحیتوں کے بھی حامل ہوتے ہیں مگر یہ اپنی صلاحیتوں سے صحیح استفادہ نہیں کرتے۔

"U"(21)

یہ لوگ ہمدرد اور منکسر المزاج ہونے کے ساتھ غصیلے اور حاکمیت پسند ہوتے ہیں۔

"V"(22)

ایسے افراد کائنات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں، انہیں دوسروں کو پہچاننے کا گر آتا ہے۔

"W"(23)

ان کے اندر روحانی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ ایسے لوگ تحقیق میں آگے رہتے ہیں۔ کائنات کے مخفی راز جاننا چاہتے ہیں۔

"X"(24)

اس حروف سے کوئی نام عموماً شروع نہیں ہوتا۔

"Y"(25)

ایسے افراد جذبہ تجسس سے لبریز ہوتے ہیں۔ کم گو ہوتے ہیں مگر بہت اچھے سامع ہوتے ہیں۔

"Z"(26)

ایسے افراد جن کا نام Z سے شروع ہوتا ہے۔ بے پناہ صلاحیتوں کے حامل ہوتے ہیں، شرمیلے بھی ہوتے ہیں۔

ہمارے خیال میں اب آپ یقیناً نہ صرف اپنی بلکہ دوسروں کی شخصیت کے بارے میں کافی حد تک اندازہ لگا سکتے ہیں۔

بہت کام آئے ...... ادرک کی چائے

ادرک میں موجود وٹامن سی، میگنیشیم اور منرلز انسانی جسم کے لیے انتہائی مفید ہیں۔ آئیے آپ کو اس کے چند فوائد کے بارے میں تفصیل سے بتاتے ہیں۔

قے سے نجات: اگر آپ کو سفر کے دوران تھکاوٹ اور قے کی شکایت ہے تو سفر شروع کرنے سے پہلے ادرک کی چائے پی کر سفر شروع کریں کیونکہ اس سے آپ ان مسائل سے بچے رہیں گے۔

معدے کی بہتری کے لیے: ادرک میں موجود میگنیشیم انسانی معدے کے لیے انتہائی مفید ہے۔ اگر آپ کو معدے میں جلن یا کھانے کے بعد تکلیف ہو تو ادرک والی چائے پئیں اور اپنی تکلیف سے نجات پائیں۔

سانس کی تکلیف کے لیے: اگر آپ سردی کی وجہ سے سانس لینے میں مشکل محسوس کر رہے ہیں تو ایک کپ ادرک کی چائے روزانہ استعمال کریں اور سانس کی دشواری سے چھٹکارا پائیں۔

مخصوص ایام: ان ایام میں خواتین کو کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے لہٰذا اگر وہ ایک کپ ادرک والی چائے شہد ملا کر پئیں تو کافی سکون ملے گا۔ اس کے ساتھ ادرک والے گرم قہوہ میں کپڑا گیلا کر کے پیٹ کے نیچے لگانے سے درد سے بھی نجات ملے گی۔

ذہنی دباؤ سے نجات: ادرک کی چائے میں ایسے اجزا پائے جاتے ہیں جن سے جسم کو آسودگی ملتی ہے اور ہم ذہنی تناؤ سے بچ سکتے ہیں۔

دوران خون کی بہتری: ادرک میں موجود وٹامنز، لحمیات اور امینو ایسڈ کی بدولت خون صاف رہتا ہے اور اس میں ٹیومر نہیں بنتے جس کے ذریعے انسان دل کی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔

قوت مدافعت میں بہتری: ادرک میں موجود اینٹی آکسیڈنٹس کی بدولت انسانی جسم کی قوت مدافعت مضبوط ہو جاتی ہے لہٰذا ادرک والی چائے کا استعمال کریں اور بیماریوں سے محفوظ رہیں۔

جوڑوں کی سوجن کے لیے: جسم میں زہریلے کودے کے رکنے سے جسم میں سوجن ہونا شروع ہو جاتی ہے لیکن اگر آپ ادرک والی چائے کا استعمال شروع کر دیں تو اس سے نجات مل جائے گی۔ اس طرح آپ جوڑوں کے درد سے

محفوظ رہیں گے جبکہ آپ کے پٹھے بھی مضبوط ہو جائیں گے۔

احتیاط۔ یاد رکھیں کہ ادرک کی چائے کی تاثیر گرم ہوتی ہے۔ اس لیے چائے میں ادرک کی مناسب مقدار ڈالیں۔ آپ کی چائے میں جتنی زیادہ ادرک ہوگی، اتنی ہی اس کی تاثر گرم ہوگی۔ اسی لیے یہ چائے پانچ سال سے کم عمر بچوں اور مریضوں کو نہیں دینی چاہیے۔

گلے میں خراش؟ نزلہ، زکام، کھانسی؟

تازہ ادرک کا تقریباً ڈیڑھ انچ کا ٹکڑا کاٹ لیں۔ اب آپ اسے قاشوں کے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیں یا گرینڈر یا سل بٹے پر کچل لیں۔ پھر پانی ابال لیں اور خوب کھولتے ہوئے ایک کپ پانی میں اس کٹے یا کچلے ہوئے ادرک کو پانچ سات منٹ تک چھوڑ دیں۔ بعد ازاں پانی میں ادرک کو پانچ سات منٹ تک چھوڑ دیں۔ بعد ازاں پانی میں ادرک کو خوب اچھی طرح نچوڑ کر نیم گرم پانی پی لیں۔ آپ کو دن بھر میں تین کپ ادرک کی چائے پینی چاہیے جس کے بعد آپ کا نزلہ، زکام دور ہو جائے گا اور طبیعت بحال ہو جائے گی۔ جو لوگ اپنا وزن کم کرنے کے خواہش مند ہیں، وہ بھی ادرک کی چائے پی کر اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔

نفسیاتی اور معاشرتی مسائل

انا ...... شادی شدہ زندگی کی دشمن

آج کل شادی کو نباہنا شادی کرنے سے بھی زیادہ مشکل ہو گیا ہے، ان ٹوٹتی شادیوں کے پیچھے چھپی وجہ بھی بہت آسان ہے، ہم اپنی زندگی میں ہر ایک چیز کو اپنے حساب سے ہوتے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اس چکر میں ہم دوسروں کو ٹھیس پہنچا دیتے ہیں اگر یہ چوٹ اپنے کسی عزیز کو لگ جائے تو تعلقات میں دراڑ پڑنے میں دیر نہیں لگتی ہے۔ کئی بار انا جیسا چھوٹا لفظ شادی کو طلاق کی دہلیز تک لے جاتا ہے۔ ایک خوش حال زندگی برقرار رہنے کے لیے اپنے رشتوں کو پیار سے سنبھالنے کی ضرورت ہے۔ شادی شدہ زندگی سے تکبر کو دور بھگانے کے لیے آپ کے لیے کچھ تجاویز لائے ہیں۔ شادی شدہ زندگی میں انا سے آنے والے مسائل سے نمٹنے کے لیے ذیل تجویز پر ایک نظر ڈالیں۔

گھمنڈ: گھمنڈ، تکبر کو جنم دیتا ہے اور مغرور شخص خود کو دوسروں سے بہترین مانتا ہے۔ شادی شدہ زندگی میں گھمنڈ ایک دوسرے کے درمیان جھگڑے کا سبب بنتا ہے جبکہ ہر شخص میں خصوصیات اور وصف ہوتے ہیں لہٰذا آپ کا پارٹنر آپ جتنا ہی ذہین و ذمہ دار ہے۔ یہ بات آپ سمجھ لیں۔ اسے اپنے سے کم نہ سمجھیں۔

ہمیشہ اپنی تعریف نہ کریں: اوروں کے سامنے خود کی تعریف کر کے ہم دوسروں کو نہیں بلکہ خود کو خوش کرتے ہیں۔ اس سے ہماری انا میں اضافہ ہوتا ہے اگر آپ کو یہ عادت پڑ چکی ہے تو فوراً اس عادت سے چھٹکارا پالیں ورنہ یہ عادت آہستہ آہستہ آپ کے شادی شدہ زندگی پر بھی اثر ڈال سکتی ہے۔

کبھی بھی اپنے پارٹنر کو نیچا نہ دکھائیں: اپنی شادی شدہ زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے دونوں شراکت دار برابر کی شراکت دیتے ہیں۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہمیں ہمیشہ اپنے پارٹنر کی عزت کرنی چاہیے۔ مذاق میں بھی دوستوں اور رشتہ داروں کے سامنے ان کے ایک دوسرے کو مذاق کا موضوع نہیں بنانا چاہیے۔

اپنے پارٹنر کی تعریف کریں: کئی بار ہم اپنے پارٹنر کے ساتھ ویسے ہی سلوک کرتے ہیں، جیسے ہم اوروں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس درمیان ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارا پارٹنر ہماری زندگی میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے ان سے بات کرنے کا طریقہ کار الگ ہونا چاہیے۔

وقت وقت پر ان کی تعریف کرنے سے آپ اپنی رشتے کو اور گہرا بناتے ہیں۔

ایک دوسرے کو کمزوریوں کو جاننا: ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہیں کہ اپنی کمزوریاں اس میں منفی تاثر پیدا کرتی ہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں اپنے پارٹنر کو اس کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ قبول کرنے کی ضرورت ہے۔ اس دوران اگر انا کو درمیان میں لایا جائے تو حالات بہتر ہونے کے بجائے بدتر ہو سکتے ہیں۔

خود کو بہترین نہ سمجھیں: اگر میاں بیوی میں برتری کا احساس آ جائے تو رشتوں میں انا گھر کر لیتی ہے، یہ احساس خصوصیات، طور یار تبے کو لے کر بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ انا پرستی کی وجہ سے شخص اپنے پارٹنر کی قدر نہیں کرتا لہٰذا اس کی طرف سے کیا گیا کوئی بھی کام سراہا نہیں جاتا ہے۔ شادی شدہ زندگی نبھایا جانے والا رشتہ ہے۔ اسے مضبوط بنانے کے لیے آپ کو اپنے پارٹنر کو محبت و احترام دینے کی ضرورت ہے لہٰذا انا کو درمیان میں لا کر اپنے رشتے کو کھوکھلا نہ بنائیے۔

ایک دوسرے کے ساتھ وقت بتایئے: کہتے ہے کہ بات چیت ہر مسئلے کو حل کر دیتی ہے۔ اس کے لیے ہمیں اپنی مصروف طرز زندگی میں سے کچھ وقت کو نکالنے کی ضرورت ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ گزارا گیا وقت آپ کو ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد کرے گا اور رشتے میں محبت کو بڑھائے اور یہ محبت آپ کے اندر چھپے انا کو بھی آہستہ آہستہ ختم کر دے گا۔

انیلا طالب

س: آپ کیا سمجھتی ہیں کہ کھانے کے لیے جیا جاتا ہے یا جینے کے لیے کھایا جاتا ہے؟"

ج: "سچ تو یہ ہے کہ کھانا ضرورت زندگی ہے لیکن میں ذائقے دار کھانوں کی شوقین ہوں، خاص کر جنک فوڈ اور باربی کیو تو میں کھانے کے لیے جیتی ہوں۔ آپ کو مزے کی بات بتاؤں کہ میں کبھی بیمار بھی ہو جاؤں تو بریانی اور زنگر برگر نہیں چھوڑ سکتی۔ طعنہ بڑا ملتا ہے اور ڈانٹ بھی بڑی پڑتی ہے مگر وہ انیلا ہی کیا جو کھانے پینے کے حوالے سے سدھر جائے۔"

س: "گھر کے کام کاج خصوصاً کچن میں آپ کی دلچسپی کس حد تک ہے یا پڑھنے کا شوق ان بکھیڑوں سے دور رکھتا ہے؟"

ج: "مجھے پڑھنے کے ساتھ ساتھ کچن سنبھالنے کا بھی بڑا شوق ہے، کچن میں میری دلچسپی بہت زیادہ ہے۔ دس سال کی تھی کہ کچن میں گھسی ابھی تک نہیں نکلی۔ نت نئی ڈشز ٹرائی کرنے کا بہت شوق ہے۔ کام کے حوالے سے ذمہ دار ہوں مگر کبھی موڈ نہ ہو تو تنکا بھی نہیں اٹھاتی اور موڈ ہو تو سارا گھر بغیر کیسے صاف کردوں۔ مجھے دوسروں کاموں سے موت پڑتی ہے لیکن کھانا پکانے کا دل چاہتا ہے اور شوق بھی ہے۔"

س: "ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ کھانا مزے دار ہے۔ کبھی کبھی نتائج برعکس بھی ہوتے ہیں، ایسے میں کھانے والوں کے کیا تبصرے ہوتے ہیں؟"

ج: "زیادہ تر تو اچھا ہی بنتا ہے نہ اچھا بنے تو امی تو شروع ہو جاتی ہیں کہ ابھی تک پکانا نہیں آیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے کیونکہ الحمدللہ کوکنگ بہت اچھی ہے۔ میری گیسٹ وغیرہ کے لیے میں ہی بناتی ہوں تو تعریف ہی ہوتی ہے...... اور امی بھی اتنی باتیں نہیں کرتیں۔ تھوڑی بہت عزت افزائی ہی ہوتی ہے۔"

س: "کون سی رائٹر کو پڑھتے ہوئے کھانا دھواں ہوا؟ اس سے متعلق کوئی یادگار واقعہ؟"

ج: "جناب ہم تو خود دو کتابوں "دعا تقدیر ہوتی ہے" اور "چھو لو آسمان" کے لکھاری ہونے کے ساتھ ناول نگار اور افسانہ نگار بھی ہیں۔ پاکستان میں نثری آزاد مجموعہ لکھنے والی پہلی بائیو شاعرہ بھی۔ تو کھانا دھواں آج تک نہیں کیا کیونکہ میرا موسٹ فیورٹ ریڈنگ ٹائم رات کا ہے، دو گھنٹے لازمی مطالعہ کرنا۔"

س: "پہلی بار کون سی ڈش بنائی تھی اور گھر والوں کے کیا تبصرے تھے؟"

ج: "آلو اور مٹر کے بالز...... چکن بروسٹ یہ ابتدائی ڈشز تھیں، گھر والوں نے کافی پسند کی تھیں۔"

س: "لوگ زیادہ تر آپ سے کس ڈشز کی فرمائش کرتے ہیں؟"

ج: "رشین سیلڈ کی۔ حیدر آبادی بریانی اور دودھ دلاری کی بھی۔ ویسے میں اکثر اچھا بناتی ہوں کیونکہ روزمرہ کی روٹین میں نہیں بناتی، صرف مہمانوں کے لیے تو پھر دل لگا کر بناتی ہوں۔"

س: "عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے دل میں اترنے کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔ آپ اس خیال سے کہاں تک اتفاق کرتی ہیں؟"

ج: "بالکل صحیح بات ہے، اگرچہ ہمارے ان کا دور دور تک کوئی اتا پتا نہیں مگر اتنا جانتی ہوں کہ مرد کو واقعی لذیذ کھانے متاثر کرتے ہیں اور ہم تو ہیں ہی کھانا پکانے کے شوقین (مگر صرف نت نئی ڈشز) عام کھانا بناتے جان جاتی ہے۔"

س: "ایسے کون سے آپ کے رشتے دار یا شوہر کے دوست احباب ہیں جن کی خاطر تواضع کے لیے کچن میں جانا ناگوار گزرتا ہے؟"

ج: "نہیں۔ ایسے تو کوئی نہیں۔ ابھی ہیں ہی نہیں تو ان کے دوست کہاں سے ہو گئے (مسکراتے ہوئے) میں شکر کرتی ہوں کوئی مہمان آئے تو ڈشز بنیں۔ زیادہ سے زیادہ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ اور تعریفیں سننے کا بھی (ہاہاہا)۔"

س: "کون سی ڈش دیکھ کر آپ کے والد اور بھائی کو غصہ آجاتا ہے؟"

ج: " والد کو تو بالکل بھی نہیں، چھوٹے بھائی ہیں میرے۔ شرارتی بہن کے شرارتی بھائی۔ انہیں ٹنڈے، کدو اور مونگ کی دال بالکل بھی اچھی نہیں لگتی۔ تو بس پھر باہر سے منگوا لیتے ہیں۔ برگر یا کوئی بھی چیز۔ میں ہوٹل کے کھانوں کی بے حد شوقین ہوں، خاص کر لال قلعہ اور پومی کی۔ تو مجھے تو بہانا چاہیے ہوتا ہے۔"

س: "گھر والوں کی پسند کی ڈش جو آپ کو بنانا ناگوار گزرے؟"

ج: "ایسی کوئی بھی ڈش نہیں جو مجھے ناگوار محسوس ہو بنانے میں۔"

س: "آپ کے خاندان کی اسپیشل ڈش؟"

ج: "مٹن کڑاہی اور املی آلو بخارے کی چٹنی جو بہت لذیذ ہوتی ہے۔ بچوں اور بڑوں کی فیورٹ ہے ہمارے ہاں تو......"

کرن کا دستر خوان

خالدہ جیلانی

لبنانی تندوری مچھلی

اجزاء:۔

رہو مچھلی	سوا سے ڈیڑھ کلو کا پورا ٹکڑا
سرخ ثابت مرچ	آٹھ عدد
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
ہری مرچ	چھ عدد
نمک	دو چائے کے چمچے
پسا لہسن	دو کھانے کے چمچے
پسا دھنیا	آدھا چائے کا چمچہ
پسا ادرک	ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	دو عدد

ترکیب:۔

مچھلی کے ٹکڑے کو صاف کر کے چھ گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ پھر نمک لگا کر ایک پیالے یا پلاسٹک کے شاپر میں ڈال کر فریج میں رکھ دیں مزید چھ گھنٹے کے لیے۔ اس کے بعد سرکے اور پانی سے دھولیں۔ اب گرائنڈر میں لہسن، ثابت سرخ مرچ، پسا دھنیا، ہلدی، ادرک، ہری مرچ اور لیموں کا عرق ملا کر پیس لیں۔ مچھلی پر اچھی طرح مل دیں پھر ایلمونیم فوائل میں لپیٹ کر پندرہ منٹ کے لیے پہلے سے گرم مائیکرو ویو میں یا تندور میں پکائیں۔ آلو بخارے کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

یمی چکن

اجزاء:۔

چکن	چار عدد لیگ پیس
ادرک لہسن اور ہری مرچ کا پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
پسا دھنیا	آدھا چائے کا چمچہ
پسی کالی مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
پسا زیرہ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
سویا ساس	ایک چائے کا چمچہ
چلی ساس	ایک چائے کا چمچہ
نمک	آدھا چائے کا چمچہ
میدہ	ایک کپ
لہسن پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
آئل	تلنے کے لیے

ترکیب:۔

ایک پین میں چکن اور دودھ ڈال کر پانچ منٹ کے لیے پین ڈھانپ کر پکائیں۔ پھر لیگ پیس نکال کر دوسرے میں رکھیں اور اس میں آئل، لہسن پاؤڈر اور میدے کے علاوہ سارے اجزا اچھی طرح ملا دیں۔ اب ایک پلیٹ میں میدہ لیں اور اس میں لہسن پاؤڈر ملائیں۔ پھر اس میدے کو چکن پر اچھی ملیں۔ پھر لیگ پیسز کو پانی میں ڈبوئیں اور دوبارہ اچھی طرح میدہ ملیں اور پہلے سے چولہے پر رکھی کڑاہی میں ڈال دیں۔ پہلے پانچ منٹ تیز آنچ پر پکائیں پھر آنچ کو ہلکا کر دیں، سنہرا ہونے پر نکال لیں۔

مونگ پھلی کی چکی ♦ گوند مکھانے کے لڈو

گوند مکھانے کے لڈو

اجزاء:۔

گوند	سوگرام
مکھانے	سوگرام
کٹے پستے	سوگرام
بیسن	پانچ سوگرام
کٹے بادام	پانچ سوگرام
خشک کھوپرا	ڈیڑھ پاؤ
کشمش	پچاس گرام
خشخاش	بیس گرام
خشک کھجور	سوگرام
گڑ	آدھا کلو
دیسی گھی	آدھا کلو

ترکیب:۔

ایک کڑاہی میں تھوڑا گھی ڈال کر گوند، مکھانے، پستے کشمش اور کھجور ڈال کر باری باری بھونیں اور الگ ٹرے میں رکھ دیں۔ کھوپرا اور خشخاش کو ایک دوسرے پین میں ہلکی آنچ پر بھونیں۔ گوند اور مکھانوں کو ٹھنڈا ہونے پر پیس لیں۔ کڑاہی میں باقی بچا ہوا گھی ڈالیں اور اس میں گڑ ڈال کر چولہے پر پکائیں۔ چمچے سے مستقل ہلاتی جائیں۔ جب گڑ گاڑھا ہو جائے، اس میں سارے میوے ڈال کر اچھی طرح ملائیں۔ ایک پین میں تھوڑا گھی ڈال کر بیسن کو بھونیں اور پھر گڑ اور میوے والے آمیزے میں ملا دیں، ٹھنڈا ہونے پر لڈو بنائیں۔
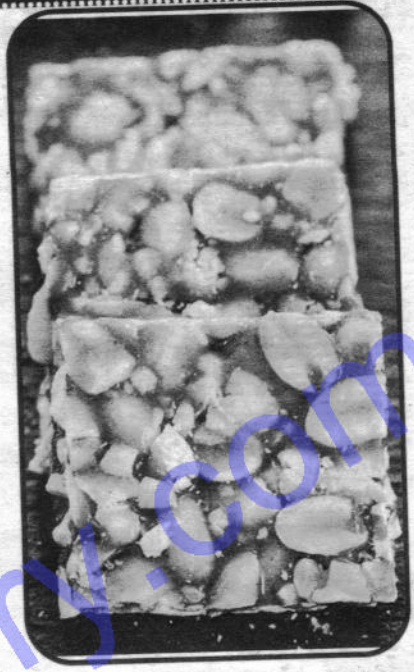
مونگ پھلی کی چکی

اجزاء:۔

بھنی مونگ پھلی	ایک کپ
گڑ	3/4 کپ (کٹا ہوا)
گھی	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب:۔

پہلے ایک ٹرے پر اچھی طرح گھی لگائیں۔ مونگ پھلی کے چھلکے اتار لیں۔ نان اسٹک پین میں گڑ ڈالیں اور ہلکی آنچ پر پکائیں، چمچہ چلاتی رہیں۔ یہاں تک کہ گڑ پگھل جائیں۔ اس میں مونگ پھلی شامل کر دیں اور جلدی سے اس آمیزے کو گھی لگی ٹرے پر پھیلا دیں اور بیلن سے سطح کو ہموار کر لیں اور گھی لگی چھری سے جتنے بڑے پیسز رکھنے ہیں کٹ لگا دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر ہوا بند ڈبے میں رکھیں۔

نوٹ: گڑ کی جگہ چینی بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

حجامہ ......بہترین علاج

حجامہ کیا ہے؟

حجامہ انسانی جسم سے خراب، فاسد خون نکالنے کو کہتے ہیں اور یہ طریقہ علاج سنت بھی ہے اور نہایت مفید بھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج پر تشریف لے گئے تو فرشتوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اپنی امت سے کہیں کہ وہ حجامہ کروائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی حجامہ لگوایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ترغیب بھی فرمائی۔ چنانچہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اگر تمہاری دواؤں میں سے کسی دوا میں شفا موجود ہے تو وہ حجامہ میں ہے۔“ اور ایک جگہ فرمایا کہ ”حجامہ سے علاج کرنے والا کیا ہی اچھا آدمی ہے کہ (فاسد) خون نکال دیتا ہے اور پشت کو ہلکا کر دیتا ہے اور نظر تیز کرتا ہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سر مبارک پر اور دونوں کندھوں کے درمیان حجامہ لگوایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ”جس شخص نے حجامہ کے ذریعے اپنا خون نکلوایا تو اب اسے اس بات سے کوئی خدشہ نہیں کہ وہ کسی بیماری کا کوئی علاج نہ کرائے۔“

حجامہ کن تاریخوں میں لگانا چاہیے؟ قمری مہینے کی 17، 19 اور 21 تاریخوں میں حجامہ لگانا چاہیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین دن جن میں تم حجامہ لگواتے ہو، وہ سترہویں، انیسویں اور اکیسویں کے دن ہیں اور ایک جگہ ارشاد فرمایا ”جو چاند کی سترہ تاریخ کو حجامہ لگوائے تو یہ حجامہ لگوانا (اس کے لیے) ہر بیماری سے شفا ہے۔“

حجامہ کے فائدے:۔

☆ خون صاف کرتا ہے اور حرام مغز کو فعال بناتا ہے۔
☆ شریانوں پر اچھا اثر ڈالتا ہے۔
☆ پٹھوں کے اکڑاؤ کو ختم کرنے کے لیے مفید ہے۔
☆ دمہ اور پھیپھڑوں کے امراض اور انجائنا کے لیے مفید ہے۔
☆ سر درد، چہرے کے پھوڑوں، دانتوں کے درد کے لیے آرام دہ ہے۔
☆ آنکھوں کی بیماریوں میں مفید ہے۔
☆ گٹھیا اور عرق النساء۔
☆ نقرس کے دوروں میں مفید ہے۔
☆ فشار خون (ہائی بلڈ پریشر) میں آرام پہنچاتا ہے۔
☆ کندھوں، سینہ اور پیٹھ کے درد میں مفید ہے۔
☆ کاہلی، سستی اور زیادہ نیند آنے کی بیماریوں میں مفید ہے۔
☆ مواد بھرے زخموں کے لیے مفید ہے۔
☆ الرجی میں فائدہ مند ہے۔
☆ جسم کے کسی بھی حصے میں درد ہو تو اس جگہ حجامہ لگانے سے فائدہ ہوتا ہے۔
☆ صحت مند افراد بھی حجامہ لگوا سکتے ہیں کیونکہ یہ ایک سنت طریقہ علاج ہے اور اس میں بیماریوں سے روک تھام ہے۔ نیز یہ طبیعت میں نشاط کا باعث ہے۔ شفا کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے کہ وہ جس کو چاہے شفا دیتا ہے۔ البتہ حجامہ لگانے سے اگر مکمل شفا حاصل نہ ہو تب بھی سنت کی نیت سے حجامہ لگوانے والے کو ثواب ضرور مل جائے گا۔

جدید تحقیق۔ حجامہ یا پچھنے لگوانا متبادل طریقہ علاج کی ایک قدیم صورت ہے جس میں معالج مخصوص نوعیت کی پیالیاں چند منٹ کے لیے کھال پر لگاتا ہے تاکہ وہ خون کھینچ سکیں۔ لوگ مختلف طبی مسائل مثلاً درد، سوزش، خون کے بہاؤ، آرام اور صحت کی بہتری کے لیے اس طریقہ علاج کو آزماتے ہیں۔ اس میں شیشے کی پیالیوں کے علاوہ مٹی اور سلیکون کی پیالیاں بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ اگرچہ دور جدید کی مشہور و معروف مغربی شخصیات بھی حجامہ میں اب دلچسپی لے رہی ہیں لیکن یہ نیا طریقہ علاج ہرگز نہیں۔

حجامہ میں پیالی کے اندر خلا پیدا کرنے کے لیے آگ جلانے کے بجائے ایک ربر پمپ استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات تھراپسٹ سلیکون کے کپ بھی استعمال کرتے ہیں جنہیں وہ جلد پر ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت دے کر مساج کی طرح کام لیتے ہیں۔ ہر قسم کے حجامہ میں تین منٹ تک پیالیوں کو جلد پر رکھا سے کچھ ابھارا جاتا ہے اس کے بعد پیالی ہٹا کر ایک چھوٹے سے نشتر سے جلد پر ہلکا زخم لگایا جاتا ہے۔ بعد ازاں دوبارہ پیالیاں چپکا کر جلد سے تھوڑی مقدار میں خون نکالا جاتا ہے۔ برٹش کپنگ سوسائٹی کے مطابق پہلی بار تین سے پانچ پیالیاں مریض پر استعمال کی جا سکتی ہیں یا اگر کوئی چاہے تو تجرباتی طور پر ایک پیالی بھی آزما سکتا ہے۔ پانچ سے سات پیالیوں سے زیادہ کی ضرورت شاید ہی کبھی پڑتی ہے۔ فصد کھلوانے کے بعد انفیکشن سے حفاظت کے لیے اینٹی بایوٹک مرہم اور بینڈیج کے استعمال کا مشورہ دیا جا سکتا ہے۔ عموماً دس دنوں کے اندر جلد دوبارہ معمول کے مطابق ہو جاتی ہے جو لوگ حجامہ طریقہ علاج کے حامی ہیں، انہیں یقین ہے کہ ہر حجامہ کے ذریعہ یعنی جس میں خون جلد سے خارج کروایا جاتا ہے، جسم سے نقصان دہ اور زہریلے فاسد مادے خارج ہو جاتے ہیں بعض معالجین سوئیوں کی مدد سے بھی حجامہ کرتے ہیں جس میں پہلے ایکوپنکچر کی سوئیاں جلد میں چبھوئی جاتی ہیں اور پھر ان پر پیالیاں رکھی جاتی ہیں۔